شناخت
علیم الحق حقی

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من **اردو بکس** آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

1۔ گروپ میں یا گروپ ایڈ من سے کوئی بھی بات / درخواست / فرمائش کرتے وقت **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** کو فروغ دیں۔

2۔ ایڈ منز یا دیگر ممبرز جو بھی اچھی پوسٹ کریں اس پر کمنٹس / شکرز / رائے لازمی کریں تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دیگر ممبران کو بھی اس کتاب / پوسٹ کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

3۔ گروپ ایڈ منز سے پرسنل سوالات مت کیجئے۔ صرف کتب کے متعلق دریافت کریں یا درخواست کریں۔

4۔ ایڈ منز اور ممبرز سے اخلاق سے پیش آئیں۔ اگر ہم ادبی گروپ میں موجود ہیں لیکن ہماری اخلاقیات معیاری نہیں تو ہمیں ادبی گروپ کا ممبر کہلانے کا بھی خوئی حق نہیں۔

5 گروپ میں یا ایڈ من کے انباکس میں وائس میسیج، ویڈیوز بھیجنے کی حرکت مت کریں ورنہ بلاک کر دیئے جائیں گے۔

6۔ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخِ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

7۔ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے فری آف کاسٹ وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

7۔ ہمارا گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں اور وٹس ایپ سلیکٹ کر کے جوائن کر لیں۔ صرف ایک ہی گروپ جوائن کریں اگر پہلے سے "اردو بکس" جوائن ہیں تو اس کو سکپ کر دیں۔

1. https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2. https://chat.whatsapp.com/Koqfq0iOsCm0F88xfiaLQ1
3. https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈ من سے وٹس ایپ پر میسیج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔

0343-7008883　　　　　　0333-8033313

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

فہرست

پیش لفظ

"شناخت" کتابی شکل میں حاضر ہے، اس روپ میں اس کی اشاعت میرا خواب بھی تھی اور ذمے داری بھی۔ ذمے داری اس لئے کہ میں نے جنوری 96ء میں اپنے قارئین سے اسے پڑھنے کی پرزور فرمائش کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ کہانی ان کے پاس موجود نہیں تو میں انہیں فراہم کروں گا۔ خواب کے معاملے میں عجیب بات ہے کہ خواب کی تعبیر کتنی ہی دیر سے ملے، جلدی ہی کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ تعبیر دینا اس کا کام ہے، جس نے آنکھوں کو سچے اور اچھے خوابوں کی اور دلوں کی اچھی آرزوؤں کی تلقین عطا کی ہے۔ سو میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں، جس نے پہلے مجھے خواب سونپا اور پھر تعبیر عطا فرمائی۔

وعدے کا معاملہ برعکس ہے۔ وعدہ کتنی ہی جلدی وفا ہو جائے، اس کا شمار تاخیر ہی میں ہوتا ہے۔ یہاں تو پھر واقعتاً بڑی تاخیر ہوئی ہے۔ اس پر میں شرم سار ہوں۔ میرا وعدہ سچا اور مبنی بر خلوص تھا۔ اسے مارچ 96ء تک ایفا ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن جنوری 96ء ہی سے مجھ پر وقت اور حالات کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ مہلت ہی نہیں ملی۔ ابھی تک اس گرداب سے نہیں نکلا ہوں۔ لیکن اللہ کا کرم ہے کہ اس نے وسائل سے محرومی کے باوجود غیب سے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام فرمایا۔ بہرکیف میں ان لوگوں سے نادم ہوں، جو میرے وعدے پر یقین کرتے ہوئے کتاب کے منتظر رہے۔ مگر یہ بات شاید وہ بھی مانیں گے کہ

تاخیر سے ایک فائدہ ہوا۔ وہ یہ کہ کتاب اس وقت شائع ہو رہی ہے، جب ہم وطن عزیز کا پچاسواں جنم دن یعنی گولڈن جوبلی منانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہم اس سوال پر غور کرنے کی بجائے کہ پاکستان نے ہم کو کیا دیا، اس حقیقت پر شرمندہ ہیں کہ ہم نے پاکستان کو کچھ نہیں دیا۔

میں بے حد عاجزی سے آپ سب کو یہ یاد دلا رہا ہوں کہ اللہ نے ہمیں یہ بے حد حسین اور آزاد وطن عطا فرمایا۔ اس نے ہم سب کو مسلم پاکستانی پیدا کیا۔ تو پھر ہم اپنے عمل سے خود کو مسلم پاکستانی ثابت کیوں نہیں کرتے۔ پتا نہیں کیوں، یہ یقین میرے اندر برسوں سے موجود ہے کہ اسلام کے فیصلہ کن عروج سے پہلے حق و باطل کی آخری جنگ میں مسلم پاکستانی اسلام کا ہراول دستہ ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے یقین میں شامل ہو جائیں۔ یاد رکھیں، ہمیں پہلا جہاد اپنے اندر، اپنے خلاف کرنا ہے۔

کہنے کو بہت کچھ ہے۔ مگر صفحات کی تنگی آڑے آ رہی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ پہلا چراغ جلا ہے جو چراغاں کا نقیب ہے۔ انشاء اللہ میری کہانیاں، ناولٹ اور ناول باقاعدگی سے شائع ہوں گے۔ چنانچہ آپ سے باتوں کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد آپ کی آراء اور مشوروں کا منتظر ہوں۔ خط بھیجتے رہیے۔ والسلام۔

فقط

آپ کا اپنا

علیم الحق حقی

شناخت

شرفو پان والے کی دکان پر میلہ سا لگا ہوا تھا۔ شام کے وقت ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ دونوں بینچوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ ادھر ادھر کھڑے تھے۔ ان میں جوان بھی تھے' ادھیڑ عمر بھی اور بوڑھے بھی۔ وہ لوگ بھی تھے جو کام سے واپس آئے تھے اور تھکن اتارنے کے لئے گپ شپ کی غرض سے پان سگریٹ کے بہانے رک گئے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے لڑکے بھی تھے......... اور وہ لڑکے بھی' جنہیں کوئی کام نہیں ہوتا۔

پان کی دکان کسی بستی میں ہو تو بستی کے تھرما میٹر کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ سرکاری سطح پر کسی بھی قسم کا سروے کرنے والے اگر ہر بستی میں شام کے وقت کسی پان کی دکان پر ایک گھنٹہ گزار لیں تو بستی کے تمام کوائف سے واقف ہو جائیں......... مزاج' درجہ حرارت' تعلیم اور بیروزگاری کا تناسب' منشیات استعمال کرنے والوں کی تعداد اور ان کے سدھرنے یا نہ سدھرنے کے امکانات......... غرض سبھی کچھ پان کی دکان پر طشت ازبام ہو جاتا ہے۔

اس وقت انسانی شناخت کے اس اسٹاک ایکسچینج میں ملا جلا رجحان چل رہا تھا۔ کچھ لڑکے بابرا شریف کے قدو قامت پر تبصرہ کرتے ہوئے اداکار ندیم سے اس کی شادی کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دوسری طرف سنجیدہ قسم کے لوگ سیاست پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک بزرگوار انہیں بار بار ٹوک رہے تھے۔ ”بھائی' اس ملک میں سیاست کا کیا کام۔ سیاست میں دماغ کی' ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے......... طاقت کی نہیں۔ یہاں تو صرف دھڑلا چلتا ہے۔ اور کوئی بات کرو میاں“۔

”اگر ہمارے ہاں سیاست نہیں چلتی تو یہ سیاست داں کہاں سے آئے“۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا۔

”اور کیا“۔ دوسرے نے ان کی تائید کی۔ ”ان کی سیاست کی دکان نہ چلتی ہوتی تو پرچون کی دکان نہ کھول لیتے“۔

”میاں......... سیاست کیا' یہ سب تو پیٹ بھروں کی باتیں ہیں“۔

پھر اچانک دیکھتے ہی دیکھتے موضوع بدلا۔ کسی نے محمد احمد کے نئے کرائے دار کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بازار میں یک لخت تیزی کا رجحان پیدا ہوا۔ تمام پارٹیاں اپنے اپنے موضوعات سے دستبردار ہو کر یکجا ہو گئیں۔

شہناز نے کوڑا سمیٹ کر کوڑے دان کے طور پر استعمال ہونے والے زنگ آلود کنستر میں ڈالا۔ وہ پلٹ ہی رہی تھی کہ باہر نئے کرائے دار کا تذکرہ چھڑا۔ وہ ٹھٹک گئی اور ٹاٹ کے پردے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ پان کی دکان کے عین سامنے گھر ہونے کی وجہ سے اس قسم کی گفتگو آئے دن سننا پڑتی تھی، مگر وہ اس میں کبھی دلچسپی نہیں لیتی تھی البتہ آج بات کچھ اور تھی۔ اس نئے کرائے دار سے اس کا بس سٹاپ پر تین دن سے سامنا ہو رہا تھا۔ اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن نیا کرائے دار بے حد وجیہہ تھا۔ اس کے چہرے بشرے اور انداز و اطوار سے شرافت ٹپکتی تھی۔ انداز میں عجیب سی تمکنت اور وقار تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نہ جانے کیوں وہ جانا پہچانا معلوم ہوتا تھا۔

"دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں"۔ کرکٹ پر تبصرہ کرنے والے لڑکوں کی ٹولی میں سے ایک بولا۔

"میاں......... شکل و صورت پر کبھی نہیں جانا چاہئے"۔ ایک بزرگوار نے ٹوکا۔

"جی ہاں......... ویسے بھی وہ چھڑا ہے"۔ ایک اور صاحب نے تائید کی۔

"میں تو کہتا ہوں، چھڑوں کو کرائے پر مکان دینا ہی نہیں چاہئے"۔ ایک تجربے کار بزرگ نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں"۔ ایک صاحب نے، جو تنہا رہنے کے گناہگار تھے......... گویا چھڑے تھے، صفائی پیش کی۔

ذرا سی دیر میں ہی وہاں گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ نئے کرائے دار کی آمد کو صرف تین دن ہوئے تھے اور کسی کو اس کا نام تک معلوم نہیں تھا پھر بھی حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی طرفداری بھی کی جا رہی تھی۔ شہناز مسکرا کر رہ گئی۔

اس مجمع میں شرفو کی حیثیت آبزرور اور جج کی سی تھی۔ وہ ہر موضوع پر تا دیر خاموشی سے معلومات جمع کرتا تھا۔ اس دوران اس کے ہاتھ کتھا چونا لگانے میں مصروف رہتے تھے۔ درمیان میں حسب ضرورت وہ طلبگاروں کو سگریٹ، ماچس، فانٹا کی کھٹی میٹھی گولیاں اور دیگر چیزیں بھی دیتا رہتا تھا۔ پھر وہ جمع کردہ معلومات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتا اور اس فیصلے کے بعد کسی بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ بات نہیں کہ محلے والوں کے نزدیک اس کا شمار دانش مندوں میں ہوتا تھا، البتہ وہ اس سے اختلاف کے مہلک نتائج بھگت چکے تھے۔ دراصل شرفو اعصابی مریض تھا۔ فیصلے سے اختلاف کے بعد اس کے ہاتھ لرزیدہ اور بے قابو ہو جاتے تھے۔ اس کے نتیجے میں کتھے اور چونے کا توازن بری طرح بگڑتا تھا۔ قیامت پان کھانے والوں کی

زبانوں پر گزرتی تھی ایسے میں زبان درازی کون کرے۔

اس وقت بھی اس نے پان کے ایک ٹکڑے پر ڈبل چونا پھیر دیا۔ سب لوگ چوکنے ہو گئے۔ فیصلہ آنے والا تھا۔ پھر شرفو نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "اپن تو ایک بات جانتے ہیں اصول کی۔ اچھائی نظر نہ آئے، تب بھی آدمی کو اچھا سمجھو۔ پر برا اس وقت تک نہ کہو، جب تک اس کی برائی سامنے نہ آئے"۔

نیا کرائے دار اور وہ بھی چھڑا، لہٰذا کچھ لوگ زبان کٹنے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گئے۔ یہ اختلاف ان کے نکتہ نظر سے بے حد ضروری تھا۔ انہوں نے زخمی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے کمر ہمت کس ہی لی۔ "لیکن شرفو........."

بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی لمحے وہ شخص نمودار ہوا جس کے قصیدے پڑھے جانے والے تھے۔

وہ تیس بتیس سال کا خوش رو آدمی تھا۔ اس کا لباس قیمتی نہیں تھا، مگر اس کو خوش ذوق ثابت کر رہا تھا۔ چال ڈھال اور انداز و اطوار سے وقار اور متانت جھلکتی تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت دل موہ لینے والی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اختلاف کرنا آسان نہیں تھا۔

پان کی دکان پر لگی ہوئی محفل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھڑی شہناز کی سمجھ میں اس کی وجہ فوراً ہی آ گئی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ ممدوح کی آمد کے ساتھ ہی مدح سرائی موقوف ہو جاتی تھی۔ وہ پردے کے کچھ اور قریب ہو گئی۔ دھڑکنوں کی لے کچھ تیز ہو گئی تھی۔

نیا کرائے دار پان کی دکان پر پہنچ کر رکا اور اس نے بہ آواز بلند سلام کیا۔ اس کی آواز بے حد شیریں اور لہجے میں حلاوت تھی۔ دکان پر موجود لوگوں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ سب کے لہجے جدا جدا تھے......... اپنی اپنی سوچ کے مطابق۔

نئے کرائے دار نے شرفو کی طرف دس کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا "ایک پیکٹ ولز......... اور ایک ماچس دے دیجئے"۔

"شرفو نے بڑی پھرتی سے پیکٹ اور ماچس بڑھایا۔ پھر گلے میں ہاتھ ڈالا اور باقی پیسے دینے کا سامان کرنے لگا۔

محلے کی بزرگ پارٹی نے مہلت کے اس لمحے سے استفادہ حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"نئے دکھائی پڑتے ہو میاں"۔ انصاری صاحب نے مصرع طرح پیش کیا۔

"نئے کرائے دار کے جی میں آئی کہ کہے، یہ بات آپ خوب جانتے ہیں......... بلکہ گزشتہ تین دن سے مجھ پر ہی تبصرے کر رہے ہوں گے آپ۔ لیکن وہ یہ بات محض سوچ کر ہی رہ گیا۔ جارحیت اس کی فطرت میں بہت زیادہ نہیں، لیکن تھی ضرور۔ یہ اور بات کہ وہ اسے دبا

کر رکھتا تھا۔ اسے ایسے موقع پر استعمال کرنے کے لئے سینت سینت کر رکھتا تھا' جب اس کے مثبت نتائج نکلنے کا امکان ہو۔ بنیادی طور پر وہ نرم خو تھا اور محبت کو اسم اعظم قرار دیتا تھا۔

"جی ہاں"۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر محمد احمد کے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں محمد احمد صاحب کے مکان میں کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہوں۔ تین دن ہوئے ہیں مجھے آئے ہوئے"۔

"چھڑے ہو تم؟" کھوکھر صاحب نے پوچھا۔ لیکن نہ جانے کیوں الفاظ ادا کرتے ہی انہیں شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ ان کا صرف لہجہ ہی سخت نہیں تھا انہیں احساس تھا کہ لفظ چھڑا تو خود ہی اتنا سخت ہے کہ دل پر پتھر کی طرح لگتا ہے۔

نئے کرائے دار کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ناگواری جھلکی۔ پھر وہ مسکرا دیا لیکن دل سے درحقیقت ٹیسیں اٹھی تھیں۔ یہ لفظ سن کر ہمیشہ ایسا لگتا تھا' جیسے اسے بے مائیگی کا احساس دلایا جا رہا ہو......... بتایا جا رہا ہو کہ ابھی تم معاشرے میں معتبر نہیں ہو۔ اسے اس سوچ پر حیرت ہوتی تھی۔ مکروہ سوچوں کا شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہونے سے کیا تعلق ہے۔ اس نے ایسے بے شمار شادی شدہ مرد دیکھے تھے' جن کا انداز فکر بے حد مکروہ تھا۔ برائی اور بے راہ روی کا انحصار تو آدمی کے میلان طبع اور اس کی قوت ارادی پر ہوتا ہے۔

"جی ہاں......... میں تنہا ہوں"۔ اس نے لفظ تنہا پر زور دیتے ہوئے کہا۔

شہناز نے ٹاٹ کا پردہ ذرا سا سرکا کر جھری سی بنالی۔

"کرتے کیا ہو؟" لاشاری صاحب نے پوچھا۔

"کتابوں کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔ کباڑی کہہ لیجئے۔ کریم آباد پر ٹھیلا لگاتا ہوں میں"۔

"معلوم تو پڑھے لکھے ہوتے ہو"۔ خان صاحب بولے۔

"کتابوں سے محبت اس کا ثبوت نہیں ہے کیا؟"

"پھر بھی تعلیم کہاں تک ہے تمہاری؟"

"گریجویٹ ہوں"۔

"تو ڈھنگ کی ملازمت کیوں نہیں کرلی تم نے؟" انصاری صاحب نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"ڈھنگ کی کجا' یہاں تو چپراسی کی جاب بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ ویسے بھی میں اس پیشے میں بہت خوش ہوں۔ کتابوں سے مجھے محبت ہے.... اور اس پیشے میں کتابوں کی قربت ملتی ہے اور پھر آزادی الگ..........."

"کیا کما لیتے ہو؟" کھوکھر صاحب نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ عزت سے دال روٹی چل جاتی ہے۔ ویسے بھی میرے اخراجات زیادہ

نہیں"۔ اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ اس پیشے میں خدمت خلق بھی ہوتی ہے۔

ایسے ہی کچھ اور سوالات کے بعد انٹرویو گویا ختم ہوا۔ تعارف کا مرحلہ شروع ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب کم از کم وہ ناپسندیدہ شخصیت نہیں رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ جلد ہی وہ اپنی محبت سے لوگوں کے دل جیت لے گا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ کچھ دل تو وہ اس وقت بھی جیت چکا ہے۔

ٹاٹ کے پردے کی جھری سے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں حیرانی سے اسے تک رہی تھیں۔

"ارے میاں......... تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں ہم نے"۔ انصاری صاحب بولے۔

"مسلم پاکستانی"۔

"مسلم پاکستانی؟"

"یہ کیا نام ہوا؟"

"ارے میاں......... مسلم پاکستانی تو سبھی ہیں"۔

"سبھی ہوں گے' مگر کہلوانا تو پسند نہیں کرتے۔ اور یہ بات عمل سے ثابت بھی نہیں کرتے" وہ کہتے کہتے رک گیا......... اور کھو سا گیا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

کتاب زندگی کھلی۔ یادداشت کے پہلے صفحے پر آنسوؤں کی دھندلی سی عبارت تھی۔ دھندلا سا عکس تھا' جس کا فہم و شعور سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یادوں کے اس فریم میں بھی تنہائی تھی......... جلتی دھوپ تھی اور کولتار کی بے رحم سڑک۔ دور دور تک کوئی سایہ نہیں تھا۔

وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ سڑک کے کنارے ریت پر ایک عورت خون میں لت پت پڑی تھی۔ اسے ایک بدمست گاڑی نے روند ڈالا تھا۔ جس وقت لہراتی ہوئی وہ گاڑی عورت کے سر پر پہنچی' عورت نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنی گود کے بچے کو پوری قوت سے ایک طرف اچھال دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی تھی......... مگر بے سود۔ گاڑی اسے روندتی ہوئی آگے نکل گئی تھی پھر آگے جاکر گاڑی کی رفتار کم ہوئی..... مگر اس کے بعد اس نے دوبارہ رفتار پکڑی اور بدستور لہراتی ہوئی' سڑک پر رواں ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔

بچے کی عمر ڈھائی' تین سال ہوگی۔ وہ سڑک سے خاصی دور ریت پر گرا تھا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ درد اور تکلیف کے باوجود اس سے رویا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ بے بسی سے ساکت و صامت پڑا آسمان کو گھورتا رہا۔ اس میں ہاتھ پیر ہلانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ بچہ وہ خود تھا......... مسلم پاکستانی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس طرح ریت پر کتنی دیر پڑا رہا تھا۔ تکلیف پر مستزاد جھلتی ریت تھی۔ البتہ اب وہ سمجھتا تھا کہ ابتداء میں وہ ریت مہربان ثابت ہوئی ہوگی۔ اس گرم ریت نے اس کے ہلتے ہوئے جوڑ جوڑ کی......... دکھتی ہوئی ہڈیوں کی سکائی کی ہوگی۔

وہ بمشکل اٹھا......... لیکن ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ وہ چیخ مار کر پھر ریت پر ڈھیر ہوگیا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا جو سڑک کے کنارے مڑی تڑی پڑی تھی۔ اس وقت وہ اس کے بکھرنے کے غیرفطری انداز کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔

وہ کچھ دیر جھلتی ریت پر بیٹھا روتا رہا......... ماں کو بلاتا رہا۔ مگر ماں کے جسم میں جنبش نہ ہوئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ماں تو اس کی پکار سنتے ہی اس کی طرف لپکتی تھی۔ اس کے ننھے سے دل میں خوف جاگ اٹھا۔ اسے احساس ہوا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے' یقیناً بہت خراب ہوا ہے' لیکن کیا ہوا ہے' یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد جسم کی دکھن کم ہوئی۔ وہ اٹھا اور ماں کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ ریت پر بیٹھ گیا۔ "ماں......... ماں' اٹھو ماں"۔ اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ "ماں......... میرے درد ہو رہا ہے"۔

ماں بے حس و حرکت پڑی رہی۔

اس نے پھر کوشش کی۔ اس کے بعد پھر کوشش کی۔ اس کے بعد اس نے ماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی ضرورت صرف اس وقت پڑتی تھی' جب وہ ماں کو سوتے سے جگاتا تھا لیکن اس بار ماں جھنجوڑنے پر بھی نہ اٹھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ ماں کی آنکھیں کھلی ہیں جبکہ وہ آنکھیں بند کرکے سوتی تھی۔ اس نے سوچا' ممکن ہے' کھلی آنکھوں سے بھی سویا جاتا ہو۔

وقت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ موجود نہیں تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ ماں کو جھنجوڑتا رہا۔ جسم کی تکلیف کم ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس نے درد کی شکایت موقوف کر دی۔ اب وہ کہہ رہا تھا......... "ماں اٹھو......... ماں! گھر چلو نا......... ماں' اٹھو نا"۔ ماں کی مسلسل بے اعتنائی نے اسے رونے پر مجبور کر دیا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اب وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ رونے کے دوران بھی اس کا ننھا سا دماغ کام کر رہا تھا۔ ماں ہمیشہ کی طرح اٹھ کر اسے سینے سے کیوں نہیں لگاتی؟ کیا گڑبڑ ہے؟ یہ کیسی نیند ہے کہ جھنجوڑنے پر بھی ماں کی آنکھ نہیں کھلتی.........؟ لیکن ماں کی آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔

ماں کی بے مہری کے باوجود وہ ڈٹا رہا۔ روتا رہا......... ماں کو جھنجوڑتا' اسے پکارتا رہا۔

شاید مہینے گزر گئے......... یا برس......... یا صدیاں.........

پھر اس کی فرمائش کی لے بدل گئی۔ ماں......... اٹھو' مجھے بھوک لگی ہے ماں' اس کے بعد وہ......... مجھے بھوک لگی ہے ماں!......... کی گردان کرتا رہا۔ مگر ماں نے کروٹ تک نہیں بدلی۔

ریت پہلے سے زیادہ گرم ہوگئی تھی......... اور وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ نیکر اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں جھلسنے لگے تو وہ جھنجلا گیا۔ "ماں......... ماں' تمہارے پاؤں نہیں جل رہے؟ میرے پاؤں جل رہے ہیں ماں' مجھے گود میں اٹھا لو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے ماں' مجھے کھانا دو"۔ وہ روتا اور ماں کو جھنجھوڑتا رہا۔ اس کے پیروں کے تلوؤں میں سوزش ہونے لگی۔

ننھے سے ذہن کے لئے وہ کشمکش بہت بڑی تھی۔ گرمی بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی۔ پاؤں جل رہے تھے۔ ماں اٹھنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دونوں سمتوں میں سڑک کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ باقی دو سمتوں میں ریت' ٹیلوں' چٹانوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ننھے سے ذہن میں گھر کا حوالہ تھا۔ گھر بستی میں تھا' جہاں لوگ چلتے پھرتے' کام کرتے نظر آتے تھے۔ گویا یہاں دور دور تک کہیں گھر نہیں تھا۔

اس نے ذہن پر زور دیا۔ ماں اسے گود میں اٹھائے اس راستے پر جا رہی تھی تو اس راستے پر گھر ہی ہوگا۔ اب اسے گھر یاد آنے لگا۔ وہاں فرش ٹھنڈا ہوگا۔ ماں چادر بچھا کر اسے لٹا دے گی۔ مگر ماں تو یہاں گرم ریت پر لیٹی ہے......... اٹھ ہی نہیں رہی ہے۔

اس بار وہ بری طرح خوفزدہ ہوگیا۔ موت سے وہ ناواقف تھا لیکن جبلت اس کی رہنمائی کر رہی تھی اندر......... بہت اندر.... گہرائی میں ایک یقین ابھر رہا تھا۔ ماں اب کبھی نہیں اٹھے گی.... اسے کبھی کھانا نہیں دے گی......... اسے سینے سے کبھی نہیں لگائے گی۔ اسے کبھی پیار نہیں کرے گی۔ ماں کو کچھ ہوگیا ہے۔ وہ کچھ کیا ہے' اس کا اس کے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ وہ اس کچھ کے بارے میں سوچتا تو نہ جانے کیوں خوفزدہ ہو جاتا......... کانپنے لگتا۔

پھر ایک خیال پوری شدت اور قوت سے ابھرا۔ ماں اس راستے پر جا رہی تھی......... سڑک کے کنارے۔ ماں گھر جا رہی تھی۔ تو اس طرف گھر ہے۔ اسے گھر کی طرف چلنا چاہئے۔ گھر میں ٹھنڈا فرش ہوگا' لیکن ماں تو نہیں ہوگی۔ محبت نے اعتراض کیا۔ گھر کی طرف چلو' اس طرف گھر ہے' جبلت نے رہنمائی کی لیکن ماں تو اٹھ ہی نہیں رہی ہے۔ اسے چھوڑ کر جایا جاسکتا ہے؟ محبت نے سوال کیا۔

وہ بری طرح الجھ گیا۔ فطری طور پر اس کا ردعمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ماں کو ایک بار پھر پوری قوت سے جھنجھوڑ دے۔ پھر اسے سرخ رنگ میں نہائی ہوئی ماں پر پیار آگیا۔ اس نے ماں کے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھ سرخ ہوگئے۔ چند لمحوں کے لئے وہ اپنی الجھن بھول گیا۔ مگر پھر پیٹ میں ہونے والی اینٹھن نے الجھن یاد دلا دی۔

اس بار پاؤں کے تلوؤں کی سوزش نے اسے فیصلے پر پہنچا دیا۔ اسے ماں کے بغیر ہی گھر جانا ہوگا۔ وہ اٹھا اور اس طرف چل دیا جس طرف ماں جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات سنسنا رہے تھے۔ ماں سو رہی ہے' ماں اب کبھی نہیں اٹھے گی۔ اچانک اسے ایک بھولا ہوا فرض یاد آگیا۔

ماں ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے کہتی......... "ماں کو پپا نہیں کرے گا؟" پھر وہ اسے خود پر جھکا لیتی اور وہ ماں کا رخسار چوم لیتا۔ اب ماں سو رہی ہے تو پپا بھی لازم ہے۔
ماں کبھی نہیں اٹھے گی۔ جبلت چیخی۔

وہ پلٹا' ماں کے پاس پہنچ کر وہ جھکا اور اس نے ماں کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہونٹ چپچپا گئے۔ کڑوا سا ذائقہ اس کے دہن میں اتر گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اسی لمحے اسے قے ہوگئی......... بے حد تکلیف دہ قے۔ پیٹ میں تھا ہی کیا جو نکلتا۔ قے کر کے وہ سنبھلا اور گھر کی طرف چل دیا۔

وہ ڈگمگاتے قدموں سے سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ بار بار پلٹ کر وہ ماں کی طرف دیکھتا۔ ہر بار اسے گمان ہوتا کہ ماں اب اٹھ کھڑی ہوئی ہوگی......... اور بھاگتی ہوئی اس کی طرف آ رہی ہوگی۔ ہر بار اسے مایوسی ہوتی کیونکہ ماں اسی طرح بے حس و حرکت پڑی نظر آتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ واپس.... پلٹ کر جائے اور ایک بار پھر ماں کو جگانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے اندر کوئی چیختا... ماں اب کبھی نہیں اٹھے گی۔ وہ پھر آگے بڑھ جاتا۔

پھر فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ واپسی کا تصور ہی ممکن نہ رہا۔ ویسے طے کرنے والا فاصلہ بہت زیادہ تھا......... اور واپس جانے کے مقابلے میں زیادہ دشوار تھا لیکن انسانی فطرت کے اوصاف عرصہ بحران ہی میں کھلتے ہیں۔ یہ اس کی فطرت تھی' جس نے اسے یہ سمجھا دیا کہ واپس جانے میں خود کو تھکانا بے کار ہے۔ منزل کتنی ہی دور ہو' اس کی طرف بڑھنا ہے کیونکہ یہ مجبوری ہے' زندگی کی مجبوری۔ جبلت تین سال کے اس بے یارو مددگار بچے کو سمجھوتا کرنا سکھا رہی تھی۔

وہ ننھی ننھی کمزور ٹانگوں کے زور پر چلتا رہا۔ تلوؤں کی سوزش بڑھتی رہی۔ کبھی وہ گرم ریت سے پناہ کے لئے سڑک کا رخ کرتا اور پھر سڑک کو جھلستا پا کر دوبارہ ریت پر اتر آتا۔ ماں سے فاصلہ بڑھ جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر وہ تھک کر گر گیا۔ تین سال کا بچہ اور وہ بھی افلاس زدہ گھر کا۔ ایسی ٹانگوں میں دم ہی کتنا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ رکا نہیں۔ ابھی وہ گھٹنوں کے بل چلنا نہیں بھولا تھا۔ گھٹنوں چلنا چھوڑے ہوئے ابھی اسے زیادہ عرصہ ہوا بھی نہیں تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل چلتا رہا' لیکن سڑک ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ منظر بدل ہی نہیں رہا تھا کسی طرح۔ اس کے گھٹنے' ہتھیلیاں اور پاؤں کے انگوٹھے چھل گئے تھے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ بھوک کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ پیاس البتہ شدت سے لگ رہی تھی۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ سڑک اب بھی اتنی ہی باقی تھی۔ کم از کم اسے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا' لیکن گرم ریت جیسے ہی آبلوں سے مس ہوئی'

اس کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ اب چلنا اس کے لئے ناممکن تھا۔

دیر تک وہ سڑک کے کنارے بیٹھا روتا رہا۔ گھر کی...... ٹھنڈے فرش کی خواہش نے اسے پھر گھٹنوں چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ چلتا رہا...... رک رک کر دم لیتا اور پھر چل دیتا۔ وہ اس وقت تک چلتا رہا' جب تک بھوک' پیاس' آبلوں کی جلن' چھلے ہوئے گھٹنوں اور ہتھیلیوں کی سوزش' دھوپ کی شدت' جھلستی ریت اور سڑک کی سختی برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے حیرانی اور اذیت بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کہیں سایہ نظر آ جائے۔ مگر وہاں خود رو جھاڑیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

اب اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ ایک بڑی جھاڑی کی طرف بڑھا اور اس کی آغوش میں دبک گیا۔ سایہ بھی تپ رہا تھا لیکن بھری دھوپ میں پا برہنہ' آبلہ پا چلنے والے کے لئے تو وہ سایہ بھی بہت بڑی نعمت تھا۔

مسلم پاکستانی نے گہری سانس لی اور اپنے بدن کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ یہ یادیں تصور میں مجسم ہو جاتیں۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا...... اس سے گزرتا...... اور اس پر لرزہ چڑھ جاتا۔ وہ منظر ایسا ہی خوفناک تھا۔ بے اماں دھوپ اور...... سنسان راستہ...... ایسے میں وہ تین سال کا بچہ یوں لگتا تھا کہ بھری کائنات میں اکیلا ہے۔ اس کی کسمپرسی کا تصور کرکے مسلم پر لرزہ چڑھ جاتا۔ وہ صرف اتنا یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ خود ترسی نہیں۔ کیا ہے' اس کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ خوف تھا...... ماضی کی دہشت تھی' جو حال کے سینے پر چڑھ بیٹھی تھی۔

یادوں کی ٹوٹی فلم پھر سے جڑ گئی......

نہ جانے کتنی دیر تک وہ جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا رہا۔ دھوپ کی تمازت دم توڑنے لگی۔ دکھتے ہوئے بدن کو ذرا سا آرام ملا تو بھوک اور پیاس نے سر ابھارا۔ ساتھ ہی ماں کا خیال آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس دوران کچھ گاڑیاں وہاں سے گزریں لیکن کسی کو بھی جھاڑیوں میں دبکے ہوئے اس چھوٹے سے بچے کی موجودگی کا پتہ نہ چلا۔

وہ روتا رہا۔ رونا اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس سے پہلے ایسے موقعوں پر ماں اسے اپنے سینے سے بھینچ لیتی اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے' نرم اور خواب ناک لہجے میں سرگوشیاں کرتی رہتی...... میرا لاڈلا...... میرا شہزادہ۔ کیا ہوا میرے لال کو' چپ ہو جا۔ میں ابھی تیرے لئے بسکٹ لاتی ہوں...... ڈھیر ساری مٹھائیاں بھی لاؤں گی۔ تو نہ رویا کر میرے لال۔ میرا دل ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اچھا...... اب ذرا ہنس کے تو دکھا...... اور وہ جھٹ ہنس دیتا۔ ماں بڑی محبت سے اس کے آنسو پونچھ دیتی لیکن ماں نے وعدے کے مطابق نہ کبھی بسکٹ لاکر دیئے اور نہ ہی ڈھیر ساری مٹھائیاں' بس کبھی کبھی وہ تل کا ایک لڈو لا دیتی اسے' جو بہت سخت ہوتا اور کبھی جلدی ختم نہیں ہوتا تھا مگر اسے ماں کی وعدہ خلافی کبھی بری نہیں لگی۔ ماں کا

وہ میٹھا میٹھا خواب ناک لہجہ اسے دنیا بھر کی مٹھائی سے زیادہ شیریں معلوم ہوتا۔ اس کا ننھا سا وجود شیرینی سے بھر جاتا۔

اب اس وقت بھوک' پیاس' تھکن اور تنہائی میں اسے چمکارنے' سینے سے لگانے' محبت بھری سرگوشیاں کرنے' پیار سے اس کے آنسو پونچھنے اور تل کا لڈو لاکر دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے ننھے سے ذہن کو ایک بہت بڑی کمی...... ایک بہت بڑے خلا کا احساس ہونے لگا...... اور وہ رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اور شدت سے رونے لگا۔

جس طرف اسے جانا تھا' اس سمت سے دو سائیکل سوار آ رہے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور باتیں کرتے جا رہے تھے۔ جھاڑی کے پاس سے گزرنے کے فوراً بعد انہوں نے بیک وقت بریک لگائے۔ اور اپنے پیر سڑک پر ٹکا دیئے۔ دونوں کڑیل جوان تھے...... پہاڑوں کی طرح بلند و بالا۔

"کریم بلوچ...... او یارا' یہ کیسا آواز ہے؟" سرور خان نے اپنے جگری دوست کو مخاطب کیا۔

"کوئی بچہ رو رہا ہے"۔

"یاں بچے کا کیا کام؟"

"اوئے...... کھڑا باتیں کرتا رہے گا۔ دیکھے گا نئیں۔ ادھر جھاڑی کی طرف چلو"۔

دونوں دوستوں نے سائیکلیں سڑک کے نیچے اتار کر کھڑی کیں اور اس جھاڑی کی طرف لپکے' جدھر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ جھاڑی کے قریب پہنچ کر وہ بری طرح ٹھٹکے۔ جھاڑی میں دبکے ہوئے بچے کا حال بہت برا تھا۔ آنکھیں سوج گئی تھیں اور سرخ ہو رہی تھیں۔ ہاتھ اور ہونٹ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ گھٹنے چھلے ہوئے تھے اور پاؤں کے چھالوں سے پانی رس رہا تھا۔

بچے کو ان کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ بدستور روتا رہا۔

"خدایا...... او میرے خدا"۔ سرور خان نے کراہتے ہوئے کہا۔

بچہ یہ سن کر چونکا۔ اس نے رونا موقوف کیا' نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور سہم کر رہ گیا۔

"یہ تو بہت زخمی ہے"۔ بلوچ کے لہجے میں تاسف تھا۔

"پر یارا...... یہ یاں آیا کیسے؟"

"تو ہمیشہ سوچنے لگ پڑتا ہے' ہاتھ پیر چلانے کے بجائے"۔ بلوچ نے سرور خان سے کہا' جو بچے کی حالت دیکھ کر بری طرح دہل گیا تھا اور اب بچے سے نظریں چرا رہا تھا۔

بلوچ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بچہ سہم کر پیچھے ہٹا۔

"ڈرو نہیں میرا بچہ...... میرا بیٹا"۔ بلوچ نے اسے چمکارا۔

مزید پسپائی کی گنجائش نہیں تھی۔ ویسے بھی بچہ نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو بلوچ کے سپرد کر دیا۔ بلوچ نے اسے اٹھا کر اپنے کشادہ سینے سے بھینچ لیا۔ بچہ اور کچھ سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو، لمس کی زبان خوب سمجھتا تھا۔ وہ مردانہ گرفت اس کے لئے سخت اور نئی تھی، لیکن اس میں محبت کا گداز بھی تھا۔ وہ محبت کا لمس تھا، جسے وہ خوب پہچانتا تھا۔ اس گرفت میں سختی تھی، مگر اس میں ممتا بھی تھی۔ اپنی زندگی کے سب سے پہلے اور بڑے بحران میں مہربان لمس کو ترسا ہوا وہ بچہ اس لمس کو پا کر بلک بلک کر رو دیا۔ بلوچ اس کی پیٹھ تھپکتا، اسے چمکارتا، اس سے سرگوشیوں میں باتیں......... وعدے کرتا رہا، بسکٹوں کے، مٹھائیوں کے وعدے۔

پھر بلوچ کی نظر سرور خان پر پڑی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں اس کی عجیب عجیب شکلیں بن رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ وہ بھی بچے ہی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بلوچ بوکھلا گیا۔ ایک بچہ ہی کیا کم تھا کہ بڑا بچہ بھی شامل ہو گیا۔

"سرور خان......... اوئے تم کو کیا ہو گیا؟" بلوچ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"یہ بچہ..... اتنا زخمی........" سرور خان نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"اوئے، تم کیسا پٹھان مرد ہے، غیرت کرو۔ خون تمہارے لئے کوئی نیا چیز ہے"۔

"لیکن سرور خان روتا رہا۔ پھر اس نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔ "یہ سچ ہے۔ خون امارے لئے کوئی نیا چیز نئیں۔ پر بچے کا خون ہم نئیں دیکھ سکتا۔ اپنا خون ہو یا دشمن کا، ہم کو پروا نئیں ہوگا۔ پر یہ ماصوم بچہ........."

بچے اور سرور خان کی گریہ و زاری ایک ساتھ ختم ہوئی۔ بچے کے چپ ہونے کے بعد بلوچ نے اسے اپنے سامنے کیا تاکہ زخموں کا جائزہ لے سکے۔ ایک نظر ہی میں اسے اندازہ ہو گیا کہ بچے کے چہرے اور ہاتھوں پر کوئی زخم نہیں ہے۔ اس نے بچے کے خون میں لتھڑے ہوئے ہونٹوں اور رخساروں کو رگڑا لیکن خون جم چکا تھا اور پانی کے بغیر صاف نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا کرتا ہے بلوچ"۔ سرور خان دہاڑا۔

"اوئے کم عقل..... یہ زخم نہیں ہے۔ کسی اور کا خون لگا ہے اسے"۔ بلوچ نے اسے ڈانٹا۔

"شکر ہے معبود کا"۔ سرور خان نے آسمان کی طرف منہ کر کے بڑے خلوص سے کہا۔

"پر یارا، یہ ہے کس کا بچہ؟"

بچہ اب قدرے مانوسیت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر طمانیت ابھر آئی۔ محبت اور خلوص کی اپنی ایک خوشبو، اپنا ایک لہجہ ہوتا ہے......... اور بچے اس خوشبو کو بہت جلدی اور بہت دور سے بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ بچے نے جان لیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

"تمہارا باپ کیدھر ہے"۔ سرور خان نے مہربان لہجے میں بچے سے پوچھا۔

بچہ حیرت سے ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ذخیرہ الفاظ میں، یادداشت میں یہ لفظ تھا نہیں۔

"یتیم معلوم ہوتا ہے بیچارہ"۔ سرور خان آبدیدہ ہو گیا۔

"ماں کدھر ہے تمہاری؟" اس بار بلوچ نے سوال کیا۔

بچے کی آنکھوں سے یک لخت خوف جھلکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی ریں اس طرف اٹھ گئیں، جدھر سرور خان اور بلوچ جا رہے تھے۔

"شاباش میرا بیٹا"۔ بلوچ نے اسے چمکارا۔ "بتاؤ، تمہاری ماں کدھر ہے؟"

"ماں......... وہاں..... سو رہی ہے۔ جاگتی نہیں"۔ بچے نے اٹک اٹک کر کہا۔

کریم بلوچ اور سرور خان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہیں تاسف کی زبان میں ب بات کہہ رہی تھیں لیکن انہوں نے لب نہیں کھولے۔ کچھ دیر بعد سرور خان نے کہا۔ ب چلو یاں سے"۔

بلوچ نے بچے کو سائیکل پر آگے بٹھایا اور اسے ہینڈل مضبوطی سے پکڑنے کی ہدایت ی۔ دونوں سائیکلیں سڑک پر چل پڑیں۔ تھکا ماندہ سورج تیزی سے مغرب کے کنوئیں کی طرف ہ رہا تھا۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔

کوئی ایک میل آگے جا کر انہیں عورت کی لاش نظر آئی۔ بچہ ماں۔ ماں کہہ کر اتنی رت سے مچلا کہ بلوچ اسے نہ سنبھال سکا۔

نیچے گرتے ہی بچہ سنبھل کر اٹھا۔ اس میں جیسے ایک بار پھر جان پڑ گئی تھی۔ اس کے ن میں بس ایک ہی خیال تھا۔ شاید ماں نیند پوری کر چکی ہوگی......... اور اب جاگ جائے گی۔ ں نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور شکایتوں کے انبار لگا دیئے۔ "ماں اٹھو۔ میں بھوکا ہوں ماں، ھے پیاس لگی ہے۔ میرے پاؤں دکھ رہے ہیں ماں........." اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ے تے ہو گئی۔ دھوپ میں پانچ چھ گھنٹوں سے پڑی لاش سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

بلوچ نے بچے کو پیچھے گھسیٹ لیا۔ لاش دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ سرور ان پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف چہرہ کر کے فریاد کرنے والے انداز میں ہا۔ "او میرا خدایا......... اپنی مرضی تو ہی جانتا ہے"۔

"اب جلدی کر سرور۔ نعش ہم ابھی نہیں لے جا سکتے۔ گاڑی لے کر آنا ہوگا"۔ بلوچ نے کہا اور بچے کو گود میں اٹھائے سائیکل کی طرف چل دیا۔

اس بار بچہ سائیکل پر بیٹھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ ماں، ماں پکارے جا رہا تھا۔

تمارا اماں سو گیا ہے، اب کبھی نئیں جاگے گا"۔ سرور خان نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

بچے کو جبلت یہ بات پہلے ہی بتا چکی تھی۔ جبھی تو وہ ماں کو چھوڑ کر گھر کی طرف چل پڑا ھا۔ وہ دردناک آواز میں رونے لگا۔ تاہم اس نے ہاتھ پیر چلانا موقوف کر دیا۔

دونوں سائیکلیں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔

سرور خان اور کریم بلوچ صرف گہرے دوست ہی نہیں تھے' ان کے درمیان بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں ایک ہی مل میں کام کرتے تھے۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ دونوں نے شادی برادری سے باہر کی تھی۔ دونوں اولاد سے محروم تھے۔ دونوں ہی طبیعت کے بے حد کھرے اور کھُرّے تھے۔ خدا ترسی' محبت اور مذہب سے لگاؤ دونوں کی فطرت میں تھا۔ یہی وجوہات تھیں کہ دونوں ایک ہی چار دیواری میں رہتے تھے۔ یوں مکان کے کرائے کا بوجھ بھی کم ہوگیا تھا۔ پھر ان کی بیویاں بھی مزاجاً" ایسی ہی نہ ہوتیں تو وہ یکجا نہیں رہ سکتے تھے لیکن وہ بھی ان سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے گھر میں کبھی معمولی سی کھٹ پٹ بھی نہیں ہوئی تھی ورنہ تو ایک گھر میں دو سگے بھائیوں کا اپنی بیویوں سمیت رہنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

اس شام دروازے پر دستک ہوئی تو سرور خان کی پنجابی بیوی جیناں نے دروازہ کھولا۔ دونوں مرد اپنی سائیکل لئے کھڑے تھے......... مگر ان کے ساتھ ایک تین سال کا بچہ بھی تھا۔ دونوں مردوں کے چہرے ہنستے ہوئے تھے۔ بچہ بہت بے حال نظر آ رہا تھا۔

جیناں نے سلام کیا اور ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیا۔ ان کے اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کرکے کنڈی لگادی۔ "ایہہ کون اے؟" اس نے پوچھا۔

اتنی دیر میں زینب بھی کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس کا تعلق کراچی سے تھا۔ سندھ کی محبت اور مہمان نوازی میں گندھی ہوئی مٹی سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔

سرور خان اور کریم بلوچ نے پوری کہانی انہیں سنا دی۔ دونوں عورتوں نے بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے اسے نہلایا دھلایا۔ بچے کے لئے کپڑے البتہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ جیناں نے سرور خان کا ایک پرانا جوڑا کاٹ پیٹ کر اس کے لئے لباس سیا۔ پھر اسے کھانا کھلایا۔

دونوں مرد فوراً ہی چلے گئے تھے۔ وہ لاش لے کر آئے......... اور پھر اس گمنام عورت کا جنازہ انہی کے گھر سے اٹھا۔

مسلم پاکستانی کبھی کسی چیز کے کھو جانے کا غم نہیں کرتا تھا۔ اس نے بہت بچپن میں سیکھ لیا تھا کہ مشیت کے سامنے کوئی سر نہیں اٹھا سکتا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے' اس میں بہتری ہوتی ہے' جو ضروری نہیں کہ آدمی کی سمجھ میں آ ہی جائے۔ اسے سبق ہی ایسا ملا تھا۔ اس نے ایک ماں کو کھویا تھا تو اس کے بدلے اسے دو محبت کرنے والی مائیں اور دو شفیق باپ ملے تھے۔

یہ پوری کہانی اس نے اپنی بے ربط یادوں اور سرور خان' بلوچ' جیناں اور زینب کے بکھرے بکھرے بیانات کو یکجا کرکے مربوط و مکمل کی تھی۔ یہ اس کی زندگی کی کہانی تھی' جس پر حقیقت کے بجائے افسانے کا گمان گزرتا تھا۔

بعد کے واقعات بھی اسے کچھ کچھ یاد تھے۔ اس رات کھانے کے بعد گھر کے چاروں افراد کا موضوع گفتگو اسی کی ذات تھی۔ مسئلہ اس کے نام کا چھڑا ہوا تھا۔ "اوئے میرا بیٹا...... کلمہ آتا ہے تم کو؟" سرور خان نے پوچھا تھا۔

بچے کو ماں یاد آگئی' جو ہمیشہ کہتی تھی......... بیٹا' ہمیشہ کلمہ پڑھ کر سونا چاہئے......... اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "ہاں"۔

سرور خان کی بتیسی نکل پڑی۔ اس نے فخریہ نظروں سے دونوں عورتوں کو اور اپنے دوست کو دیکھا' پھر بچے سے بولا۔ "سناؤ"۔

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" بچے نے کلمہ سنایا۔

جیناں نے جھٹ اسے سینے سے لگالیا۔ "کنا سوہنا لگدا اے......... میرا پتر"۔

"لیکن اسے اپنا نام معلوم نہیں"۔ بلوچ نے کہا۔ "نام تو ہمیں ہی رکھنا پڑے گا"۔

"تو یہ کیا بڑی بات ہے"۔ سرور خان بولا۔ "اوئے یارا......... کلمہ پڑھنے والا کون ہوتا ہے؟"

بلوچ چند لمحے سوچتا رہا پھر اچھل پڑا۔ "واہ خان واہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کا نام مسلم ہے"۔

نام کا مسئلہ حل ہوا تو جھگڑا اٹھا بچے کے حق ملکیت کا۔ لیکن وہ جھگڑا بے حد محبت بھرا' مخلصانہ اور دوستانہ تھا۔ وہ چاروں......... یعنی دونوں پارٹیاں بچے کو اپنا بیٹا بنانے پر مصر تھیں۔ دیر تک تکرار ہوتی رہی۔ بالآخر بلوچ کو جمہوریت یاد آگئی۔ "اوئے خاناں......... یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ بچے سے کیوں نہیں پوچھتا"۔

اب وہ چاروں بچے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "تو میرا بیٹا ہے نا؟" چاروں کا ایک ہی سوال تھا' لہجے اور نگاہوں میں التجا۔ وہ اس لمحے ایسے بچے کی طرح تھے' جنہیں اجتماعی طور پر ایک کھلونا میسر آگیا ہو۔

بچہ حیرت سے ان چاروں کو دیکھتا رہا۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھا' اس میں صرف قانون ضرورت کی اہمیت ہوتی ہے۔ ماں کے سو جانے کے بعد وہ ایک گھونٹ محبت کو ترس رہا تھا۔ ان چاروں نے محبت کا سمندر دے ڈالا تھا اور اب وہ اس سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو قبول کرلے۔ وہ الجھتا رہا۔ اس کا دل باری باری ان میں سے ہر ایک کی طرف کھنچ رہا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس کی نظریں بلوچ پر جم گئیں۔ ماں کے بعد وہ پہلا شخص تھا' جس نے اسے سینے سے لگایا تھا۔ "میں تمہارا بیٹا ہوں"۔ اس نے بلوچ کے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔

بلوچ کی مسرت قابل دید تھی۔ اس کے دانت نکل پڑے۔ اس نے چڑانے والی نظروں سے سرور خان کو دیکھا' جو بجھ سا گیا تھا......... بچوں کی طرح۔

بچہ اب سرور خان کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ماں کے بعد وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کی تکلیف پر آنسو بہائے تھے۔ اس نے سرور خان کی آنکھوں کو انگلی سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "اوڑ میں تمہارا بیٹا ہوں"۔

سرور خان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

بچہ اب زینب کی طرف مڑا۔ ماں کے بعد وہ پہلی ہستی تھی، جس نے اسے نہلایا تھا۔ "میں تمہارا بیٹا ہوں"۔

زینب نے اس کا ہاتھ تھام کو ہونٹوں سے لگالیا۔

بچے نے جیناں کے ہاتھ تھام لئے۔ یہ ماں کے ہاتھوں کے بعد وہ پہلے ہاتھ تھے، جنہوں نے اس کے لئے کپڑے سیے تھے۔ "اور میں تمہارا بیٹا ہوں"۔

سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ اب سرور خان اس کا بابا تھا، بلوچ ابا، جیناں بے بے تھی اور زینب ماں جی۔

دن پر لگا کر اڑتے رہے۔ اس گھر میں اسے محبتیں ہی محبتیں ملیں۔ اب وہ سکول جانے لگا تھا۔ اس کا نام تھا مسلم ولد سرور کریم۔ اسے سبھی کچھ میسر تھا لیکن کبھی کبھی تپتی دھوپ میں پڑی اس جھلتی سڑک کی اذیت ناک یادیں ابھر آتیں جس کے اطراف میں ریت اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا......... نہ کوئی پارۂ ابرِ رواں، نہ کوئی شجرِ سایہ دار۔ ایسے میں اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار......... کم از کم ایک بار وہ اس سڑک کو دوبارہ دیکھے۔

اس نے اس سلسلے میں سرور خان اور کریم بلوچ سے ضد کی۔ انہوں نے بتایا کہ سب کچھ بدل گیا ہے لیکن وہ نہ مانا۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر وہ اسے اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا کر لے گئے......... اسی دن کی طرح، جب وہ اسے ملا تھا۔

وہ حیران ہوگیا۔ یہ وہ جگہ تو نہیں تھی......... ہرگز نہیں۔ سڑک اب چوڑی ہو گئی تھی۔ اطراف میں ریت اور جھاڑیوں کی جگہ کچے پکے مکانوں نے لے لی تھی۔ وقت نے صرف زخم ہی مندمل نہیں کیا تھا.... داغ بھی مٹا ڈالا تھا۔ اب وہ سڑک صرف اس کی یادوں میں تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ محبتوں کے سائے میں پھلتے پھولتے چودہ سال کا ہوگیا۔ اب وہ آٹھویں جماعت میں تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اسے دنیا کی ہر نعمت میسر تھی، لیکن مشیت کچھ اور ہی چاہتی تھی۔

اگست کا مہینہ تھا۔ تین دن سے بارشیں ہو رہی تھیں۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ سرور خان اور کریم بلوچ کی چھٹی تھی۔ مسلم گوشت ترکاری خریدنے کی غرض سے گھر سے نکلا۔ اس وقت بھی تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ سودا سلف خرید کر واپس آیا تو اس کی کائنات ایک بار پھر اجڑ چکی تھی۔ مکان کی جگہ اب ملبے کا ڈھیر تھا اور لوگ ملبہ ہٹا کر لاشیں نکال رہے تھے۔ اس کی چاروں محبوب ہستیوں میں سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکا تھا۔

لیکن اب وہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ موت سے اس کی شناسائی ہو چکی تھی۔ اس نے بے پناہ صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اور تدفین کے ہر مرحلے میں آگے رہا۔ محلے کے لوگوں کو بھی اس سے ہمدردی تھی انہی میں ماسٹر جی بھی تھے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔

ماسٹر جی بھی دنیا میں اکیلے تھے۔ ایک زمانے میں ان کا بھرا پرا گھر تھا، بیوی بچے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے پورے خاندان کے ساتھ پاکستان کا رخ کیا لیکن راستے میں ایسے لٹے کہ ان کے اپنے شکستہ وجود کے سوا کچھ نہیں بچا۔ بیوی بچے ان کی نظروں کے سامنے شہید کر دیئے گئے۔ اب ان کے سامنے زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا......... پاکستان کے لئے نئی نسل اور مستقبل کی تعمیر میں حصہ لینا، اور اس کام کو وہ عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ وہ اسی اسکول میں ٹیچر تھے جس میں مسلم پڑھتا تھا۔ وہ مسلم کی ذہانت اور اخلاقی اوصاف سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اب جبکہ مسلم اچانک ہی اکیلا رہ گیا تھا تو انہیں گویا اس کے روپ میں اپنا کھویا ہوا بیٹا مل گیا۔

مسلم کو ایک بار پھر ایک شجر سایہ دار مل گیا تھا۔ ماسٹر جی اسے تعلیم کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں سمجھاتے۔ ملک کی اہمیت اور قدر و قیمت کے متعلق بتاتے۔ ان قربانیوں کی تفصیل بتاتے، جن کے نتیجے میں مسلمانوں کو یہ مملکت خداداد ملی تھی۔ ایسے میں ان کی آنکھوں کی طرح آواز بھی بھیگ جاتی۔ لہجے میں ایسا گداز ہوتا کہ دل میں کھب کر رہ جائے۔ پھر وہ تاریخ اسلام کی طرف آتے اور بتاتے کہ مسلمانوں کو جتنا نقصان عصبیت سے پہنچا ہے، کوئی دشمن بھی نہیں پہنچا سکا۔ عرب اور عجم کے جھگڑے، عقائد کی بنیاد پر پلنے والی نفرتیں ہمیشہ ان کی جڑیں کاٹتی رہی ہیں۔

مسلم کے تعلیمی اخراجات ماسٹر جی کے ذمے تھے۔ مسلم نے لاکھ چاہا کہ وہ کوئی کام کرے، لیکن ماسٹر جی کی محبت اس کے پاؤں کی زنجیر بنی رہی۔ وہ انٹر میں تھا کہ ماسٹر جی کا انتقال ہوگیا لیکن اب وہ اس قابل تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس نے گھروں میں اخبارات اور رسائل پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور بالآخر بی اے کرلیا۔

ماسٹر جی نے اسے پاکستانی......... ایک اچھا پاکستانی ہونے کا جو درس دیا تھا وہ اس پر عمل پیرا ہوگیا۔ اب وہ مسلم پاکستانی تھا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

صرف محبت اور خلوص کی خوشبو ایسی ہوتی ہے، جو جان پہچان ہونے سے پہلے ہی دلوں کو چھو لیتی ہے۔ مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلم پاکستانی کی محبت اور خلوص میں گندھی ہوئی شخصیت بستی کے تمام لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ عورتیں ہو یا لڑکیاں، بوڑھے ہوں، جوان ہوں یا بچے، سب اس کی عزت کرنے لگے۔ اسے وہاں رہتے ہوئے چند

مہینے ہوئے تھے' لیکن لگتا تھا' وہ برسوں کا جانا پہچانا ہے۔ قدرت نے اسے بے حد حساس اور دردمند دل دیا تھا۔ اس سے کسی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ ہر ایک کے کام آتا۔ عورتوں اور لڑکیوں سے نگاہ جھکا کر بات کرتا۔ بزرگوں کے سامنے اس کی آواز کبھی اونچی نہ ہوتی۔ نوجوانوں کے لئے وہ بہترین دوست تھا اور بچے تو اس کے دیوانے تھے۔ وہ انہیں ٹافیاں دیتا۔ عجیب عجیب کہانیاں سنا کر ہنساتا' اگر کبھی موڈ ہوتا تو ان کے ساتھ کھیلنے بھی بیٹھ جاتا۔ محلے کے طلبہ کی تو چاندی ہوگئی۔ کورس کی کوئی کتاب شارٹ ہوتی تو وہ اس سے کہتے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے کتاب انہیں لا دیتا پیسوں کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اول تو وہ پیسے لینے ہی نہ چاہتا۔ اصرار کے بعد لیتا بھی تو واجبی قیمت۔

اس کا یہ رویہ اپنے محلے یا بستی تک محدود نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی محرومیوں کے حوالے سے دوسروں کی محرومیوں کا احساس اور مداوا کیا تھا۔ اس روز وہ کریم آباد کی چورنگی پر اپنا ٹھیلا لگائے کھڑا تھا۔ ایک جانب کورس کی کتابوں کا انبار تھا' دوسری طرف پرانے ڈائجسٹ اور ایک جانب انگریزی ناول رکھے تھے۔ ایک نوجوان کورس کی کتابیں ٹٹول رہا تھا۔ مسلم بڑے غور سے اسے دیکھتا رہا۔ نوجوان کا لباس صاف ستھرا تھا لیکن اسے ایک نظر دیکھ کر ہی احساس ہو جاتا تھا کہ اس کا تعلق اس طبقے سے ہے' جس کی جیب بھی تنگ ہوتی ہے اور جسے اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی رکھنا ہوتا ہے۔

وہ رش کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ وہ فرصت سے نوجوان کو دیکھتا رہا جو تدریسی کتابوں میں بڑے انہماک سے کوئی خاص کتاب تلاش کر رہا تھا۔ پھر مسلم نے نوجوان کو ٹھٹکتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک سی لہرائی اور دوسرے ہی لمحے ماند پڑ گئی۔

مسلم نے جلدی سے نظریں پھیرلیں۔ لیکن ان طرف سے نظریں ہٹانا بھی ناممکن تھا۔ چنانچہ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ ضرورت کے ہر روپ کو پہچانتا تھا۔ اس کے پیشے نے اسے انسانوں کو پہچاننے کی بھی تربیت دی تھی۔ اب اس وقت بھی اس کے لئے نوجوان کے کئی متوقع رد عمل تھے۔ نوجوان موقع پا کر کتاب لے کر کھسکنے کی بھی کوشش کر سکتا تھا۔ ایسا بارہا ہوا تھا۔ ایسا کرنے والے لوگ بھی کئی طرح کے ہوتے تھے۔ ان میں کچھ تو واقعتاً ضرورت مند ہوتے۔ ضرورت کی بھی کئی قسمیں تھیں۔ کسی کو اس کتاب کی ضرورت ہوتی۔ کسی کو پیسوں کی ضرورت ہوتی۔ بعد میں ایک اور ضرورت بھی سامنے آئی تھی۔ نشے کی لت میں گرفتار نوجوانوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی تھی کہ وہ کیا چرا رہے ہیں۔ وہ تو بس چرائی ہوئی چیز کسی کے ہاتھ بیچ کر نشہ خریدنے کے چکر میں ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو وہ بغور دیکھتا۔ ایسے لوگ ہمیشہ کشمکش میں مبتلا رہتے۔ ضمیر انہیں کچوکے دیتا کہ وہ چوری کر رہے ہیں۔ ضرورت جیب ٹٹولنے کے بعد اعلان کرتی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایسے لوگ کتاب لے کر کھسکتے تو وہ نظریں چرا لیتا' جیسے ان کی

طرف سے بے خبر ہے۔ اس کا تجربہ تھا کہ ایسے اسی فیصد لڑکے یا تو کسی اچھے دن آکر کتاب کی قیمت دے جاتے ہیں یا امتحان کے بعد کتاب واپس کر جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگوں کو وہ پکڑ لیتا اور بڑے دوستانہ انداز میں ان سے چوری کی وجہ معلوم کرتا۔ پھر وہ ان کی بیان کردہ وجوہ کو اہمیت کی کسوٹی پر پرکھتا۔ انہیں سمجھاتا کہ ضروریات پوری نہ ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی کو چوری کا لائسنس مل گیا ہے۔ آدمی کو صبر بھی کرنا ہوتا ہے۔ یہی تو پل صراط ہے۔ اسی لئے تو خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے۔ آدمی ایک ذرا سی ضرورت کی خاطر اپنے بلند مرتبے کو کیوں گنوائے۔ وہ تو زمین پر اللہ کا نائب ہے لیکن اگر وہ محسوس کرتا کہ ضرورت فوری طور پر پوری ہونا چاہئے تو ایسے شخص کی حتی المقدور مدد کرتا۔

برابر والے ٹھیلے کے ردی فروش نے اس سلسلے میں کئی بار اسے ٹوکا تھا۔ "اے.... یہ تم لیکچربازی کیوں کرتے ہو؟ سالے کو پولیس کے حوالے کر دو"۔

"ایک بات بتاؤ۔ تم رات کو اپنا ٹھیلا گھر لے کر جاتے ہو؟" اس نے جواباً پوچھا۔

پڑوسی نے اسے یوں دیکھا' جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو۔ "جو تم کرتے ہو اپنے ٹھیلے کا' وہی میں کرتا ہوں"۔

"میں تو بھائی ٹھیلے پر یہ بڑا والا پلاسٹک لپیٹتا ہوں' سُتلی سے اسے باندھتا ہوں اور ٹھیلا یہیں چھوڑ جاتا ہوں"۔

"تم جانتے ہو کہ میں بھی یہی کرتا ہوں' پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟" پڑوسی نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہم لوگوں نے کوئی چوکیدار بھی نہیں رکھا ہوا ہے"۔

"تو پھر؟"

"میرا دل دکھتا ہے یہ دیکھ کر۔ دیکھونا......... معمولی سے معمولی دکان میں بھی تالا لگایا جاتا ہے۔ گویا چوری کا خدشہ رہتا ہے۔ کتاب وہ چیز ہے' جسے ہمارے ہاں کوئی چراتا بھی نہیں۔ یہ قومی ذوق کا پیمانہ ہے۔ کتابیں خریدنا تو درکنار' ہم کتاب چوری کرنا بھی پسند نہیں کرتے"۔

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ ہماری کتابیں چرائی جانے لگیں"۔

"ہاں......... کبھی کبھی تو یہی جی چاہتا ہے۔ خدا کی قسم' اگر کوئی شخص پڑھنے کی غرض سے کتاب چرائے تو مجھے بہت خوشی ہو۔ لیکن یہاں تو کتاب کا ذوق ہی نہیں۔ ویڈیو کیسٹ پر پیسے برباد کر دیں گے' لیکن کتاب نہیں خریدیں گے۔ پڑھے لکھے لوگوں تک کا یہی حال ہے"۔

"بات کچھ اور ہو رہی ہے"۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم کتابیں یونہی چوراہے پر چھوڑ کر اطمینان سے گھر چلے جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر ہمیں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہمارا ٹھیلا لٹ سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کبھی بلا ضرورت نہیں چرائی جاتی۔ کوئی مطالعے کی غرض سے کتاب

چرائے تو میں نظرانداز کر دوں۔ لیکن کوئی پیٹ کی خاطر کتاب چرائے تو اسے سمجھانا بہت ضروری ہے۔ معاشرہ مہذب تبھی ہوگا' جب لفظوں کا.......... کتابوں کا احترام کیا جائے گا.......... انہیں اہمیت دی جائے گی"۔

"معاشرہ اور تہذیب جائے جہنم میں"۔ پڑوسی نے بھنا کر کہا۔ "میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری لیکچربازی کا کیا فائدہ۔ کسی پر اثر نہیں ہوتا اس کا۔ لوگ لیکچر سے چڑتے ہیں"۔

"ممکن ہے اثر ہوتا ہو۔ دوچار پر بھی اثر ہوگیا تو یہ میرے نزدیک اس توانائی کا مناسب نعم البدل ہے' جو میں نے بکواس کر کے خرچ کی ہے۔ جہاں تک لوگوں کے چڑنے کا تعلق ہے تو وہ تو آئینہ دیکھنے سے بھی چڑتے ہیں۔ یہ انحطاط کی نشانی ہے کہ لوگوں کو فضولیات اور تفریح کے سوا کچھ بھی نہ بھائے۔ ورنہ شخصیت میں توازن تو سنجیدگی سے پیدا ہوتا ہے"۔

تیسری قسم کے لوگ یعنی نشے باز الگ ہی نظر آ جاتے تھے۔ ان کے ساتھ وہ سختی سے پیش آتا تھا۔ کبھی دو ایک ہاتھ بھی جڑ دیتا۔ ان کی ضرورت پوری کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

ان کے علاوہ ایک قسم اور تھی کتاب کے چوروں کی۔ وہ عادی چور اور اٹھائی گیرے ہوتے تھے۔ لمبا ہاتھ مارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی تو کتابوں پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔ انہیں وہ چوری کے انجام سے ڈراتا تھا۔ کوشش کرتا تھا کہ ان کے دلوں میں خوف پیدا ہو۔

بہرحال اس نے اب تک کسی کو پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس طرح اصلاح کے بجائے بگاڑ پیدا ہوگا۔

وہ کن انکھیوں سے نوجوان کو دیکھتا رہا۔ وہ یقینی طور پر پہلی قسم سے تعلق رکھتا تھا.......... پہلی قسم کے پہلے درجے سے یعنی اسے اس مخصوص کتاب کی ضرورت تھی۔

نوجوان نے کتاب اٹھائی۔ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کتاب واپس رکھ دی لیکن اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا اضطراری انداز میں انگلیاں چٹخاتا رہا۔ پھر اس نے کتاب دوبارہ اٹھالی۔ وہ مسلم کی طرف توجہ ہوا' جو بڑی بے تعلقی سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے دوبارہ کتاب واپس رکھ دی۔ وہ بہت مضطرب معلوم ہو رہا تھا۔ بالآخر اس سے ضبط نہ ہوا۔ اس نے کتاب اٹھائی اور مسلم کی طرف بڑھ آیا۔

"یہ کتنے کی ہے"۔ اس نے کتاب مسلم کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

مسلم نے کتاب کا ٹائیٹل دیکھا۔ انگلینڈ کا پرنٹ تھا۔ کتاب اکاؤنٹنگ کے موضوع پر تھی.......... اور آسانی سے ہرگز نہیں ملتی تھی۔ کتاب کا ٹائیٹل دیکھنے کے بعد اس نے نوجوان کا بھرپور جائزہ لیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کی جیب کی کیا پوزیشن ہے۔ وہ کشمکش سے دوچار ہوگیا۔ اسے وہ کتاب ہر قیمت پر اس نوجوان کے ہاتھ فروخت کرنا تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس کی کیا قیمت بتائے۔ جانتا تھا کہ اس کتاب کے ڈیڑھ سو روپے بہ آسانی مل سکتے ہیں' لیکن بات ڈیڑھ سو روپے کی نہیں.......... ضرورت کی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ

نوجوان کی قوت خرید کے متعلق کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ "جو جی چاہے' دے دیں"۔ بالآخر اس نے کہا۔

"مذاق کر رہے ہیں"۔

"نہیں' دل سے کہہ رہا ہوں۔ جو چاہیں' دے دیں"۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی"۔ نوجوان جھنجلا گیا۔ "اگر میں دو روپے دوں تو کیا آپ یہ کتاب مجھے دے دیں گے"۔

یہ بہت نازک موڑ تھا۔ مسلم جانتا تھا کہ ایسے لوگ بہت خوددار ہوتے ہیں۔ محرومی اور خودداری کا امتزاج انا کو شدید کر دیتا ہے۔ اگر وہ کہتا کہ ٹھیک ہے' دو روپے ہی سہی.......... تو خدشہ تھا کہ نوجوان کتاب وہیں رکھ کر آگے بڑھ جاتا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس صورتحال میں ہر شخص جیب میں موجود پوری رقم کا حوالہ نہیں دے سکتا۔ گویا امکان تھا کہ نوجوان کی جیب میں کم از کم دس روپے ہوں گے۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی"۔ اس نے نوجوان ہی کے لہجے میں دہرایا۔ "اس کتاب کے دو روپے دیں گے آپ؟"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں' آپ قیمت بتا دیں"۔

"آٹھ روپے"۔ اس نے دل کڑا کر کے کہا۔

قیمت سن کر نوجوان کی آنکھوں میں جو چمک لہرائی' اس نے مسلم کے دل میں روشنی بھر ی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

نوجوان نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ کے دو نوٹ نکال کر یوں اس کی طرف بھائے' جیسے اسے خدشہ ہو کہ کہیں وہ اپنا ارادہ نہ بدل دے.......... قیمت نہ بڑھا دے۔

مسلم نے اسے دو روپے واپس دیئے۔ نوجوان کتاب لے کر تیز قدموں سے چلنے لگا۔

"سنئے.........." اس نے پکارا۔

نوجوان نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں خوف تھا' اندیشے تھے۔

"ایک درخواست ہے آپ سے۔ امتحان کے بعد یہ کتاب اتنے ہی پیسوں میں مجھے دے یئے گا۔ کسی ضرورت مند کے کام آئے گی"۔

نوجوان کی آنکھوں میں تفہیم اور تشکر کی روشنی چمکی۔ وہ سمجھ گیا کہ کباڑی کتاب کی ت اور اہمیت سے خوب واقف ہے۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں' رور۔ میں امتحان سے فارغ ہوتے ہی کتاب واپس دے جاؤں گا"۔ پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔ ا بار اس کی چال میں خود اعتمادی تھی.......... ہمواری تھی۔

پڑوسی ٹھیلے والا خاموشی سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ نوجوان کے جانے کے بعد بھنا کر

بولا۔ "تم جیسے پاگلوں نے دھندا ہی خراب کر دیا ہے"۔

مسلم مسکرا دیا۔ اسے کیا بتاتا کہ ایسے ہی وقت سے وہ خود گزر چکا ہے۔

ان دنوں وہ بی اے میں تھا۔ ماسٹر جی کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ گھروں میں اخبار ڈال کر اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اسے علم معاشیات پر ایک خاص کتاب کی ضرورت پڑی۔ جیب میں زیادہ پیسے نہیں تھے لہٰذا بک اسٹال کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ فٹ پاتھ پر...... ٹھیلوں پر وہ کتاب ڈھونڈتا رہا۔ دو ہفتے کی مشقت کے بعد وہ کتاب اسے ایک فٹ پاتھ پر نظر آئی۔ اس نے جیب ٹٹولی' جیب میں سات روپے تھے۔ اس نے کتاب پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر کباڑی سے قیمت پوچھی۔

"پندرہ روپے"۔

وہ چند لمحے گنگ سا رہ گیا۔ پھر اس نے ہمت کر کے کہا۔ "میرے پاس سات روپے ہیں"۔

"تو میں کیا کروں؟" کباڑی نے تنک کر کہا۔

اسے کباڑی کا وہ کرخت لہجہ ابھی تک یاد تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ کس طرح اس کا جی چاہا' وہ کتاب اٹھا کر بھاگ کھڑا ہو لیکن اندر کوئی چیخ رہا تھا...... یہ چوری ہوگی...... یہ چوری ہوگی۔ وہ خود پر ضبط کر کے چلا آیا۔

اس کے بعد وہ ہر روز وہاں جاتا' کتاب دیکھتا' اپنی جیب تھپتھپاتا اور واپس آ جاتا۔ پیسے پورے ہونے میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ جس روز اس کے پاس پندرہ روپے ہوئے' وہ کتاب خریدنے کی غرض سے وہاں پہنچا...... لیکن کتاب بک چکی تھی۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

مسلم تیار ہو کے گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔ اس روز وہ کچھ دیر سے بیدار ہوا تھا۔ لیکن کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ وہ کسی کا پابند تو تھا نہیں۔ دل چاہتا تو چھٹی کر لیتا' لیکن عام طور پر وہ ایسا کرتا نہیں تھا۔ خالی رہتا تو وحشت ہونے لگتی۔ خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا......

دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کیا ہوئی' کسی نے دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر صغریٰ خالہ کھڑی تھی۔ وہ قریب ہی رہتی تھی۔

"کیا بات ہے خالہ؟" اس نے پوچھا۔

"جلدی سے چلو...... وہ...... وہ...... فاطمہ......"

مسلم ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ فاطمہ' شہناز کی ماں کا نام تھا' یہ وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔ راستے بھر صغریٰ کا بیان جاری رہا۔ فاطمہ خالہ کے پیٹ میں اچانک درد اٹھا تھا۔ وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ شہناز ہسپتال جا چکی تھی اور وہ گھر پر اکیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ شہناز کسی ہسپتال میں نرس کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔

فاطمہ کی چیخیں سن کر پاس پڑوس کی تمام عورتیں اس کی خیر خبر کی غرض سے پہنچیں تو انہوں نے فاطمہ کو بری طرح تڑپتا پایا۔ انہوں نے اپنے طور پر دوا بھی دی اور سینہ بہ سینہ چلے آنے والے ٹوٹکے بھی آزمائے لیکن فاطمہ کی تکلیف کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ وہ سب گھبرا گئیں۔ دشواری یہ تھی کہ گھروں میں نہ مرد تھے' نہ لڑکے۔ مرد اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے اور لڑکے اسکول۔ جو لڑکے پڑھتے نہیں تھے' وہ کام پر گئے ہوئے تھے...... اور جو بے کار تھے' ان کے لئے آوارہ گردی سے بڑا کوئی کام نہیں تھا۔ غرض محلے میں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

اچانک متوحش خواتین میں سے کسی کو مسلم کا خیال آگیا۔ بارہا وہ ان میں سے ہر ایک کے کام آیا تھا۔ چنانچہ صغریٰ دل ہی دل میں یہ دعا کرتی کہ وہ کام پر نہ گیا ہو...... گھر پر ہی موجود ہو...... اس کے گھر کی طرف چل دی۔

فاطمہ کو ایک نظر دیکھتے ہی مسلم کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ تکلیف کی نوعیت تو اس کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس اسے یہ احساس بہرحال ہو گیا کہ یہ ہسپتال کا کیس ہے۔ "آپ انہیں سنبھالیں"۔ اس نے صغریٰ خالہ سے کہا۔ "میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔ انہیں ہسپتال لے کر جانا ہوگا"۔

وہ جلدی سے جا کر ٹیکسی لے آیا۔ بیشتر خواتین کے گھر اکیلے تھے البتہ صغریٰ خالہ کی بیٹی موجود تھی۔ فاطمہ کو ٹیکسی کی پچھلی نشست پر لٹایا گیا۔ صغریٰ خالہ بھی وہیں بیٹھیں...... اور انہوں نے فاطمہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مسلم اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو وہ جناح ہسپتال چلنے کی ہدایت پہلے ہی دے چکا تھا۔

ہسپتال میں وہ پرہجوم اوقات تھے۔ مسلم نے ڈاکٹر کی خوشامدیں کر کے' اسے سمجھا بجھا کے پہلے فاطمہ کا معائنہ کرنے پر مجبور کیا۔ معائنہ کرنے پر پتہ چلا کہ اپنڈکس کا کیس ہے اور فوری طور پر آپریشن کرنا ہوگا۔ دشواری یہ تھی کہ متعلقہ وارڈ میں کوئی بیڈ خالی نہیں تھا۔ مسلم کے کہنے سننے پر ڈاکٹر نے فاطمہ کے لئے علیحدہ سے ایک بیڈ ڈلوا دیا۔

اس روز وہ کام پر نہ جا سکا۔ فاطمہ کے ساتھ صغریٰ خالہ تھیں لیکن ہسپتال کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ کسی وقت بھی کسی بھی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ باہر کے یہ معاملات نمٹانے کے لئے کسی مرد کی ضرورت لازماً ہوتی ہے۔ صغریٰ خالہ اسے ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ وہ بول پڑا۔ "آپ بے فکر رہیں خالہ' میں یہاں موجود ہوں"۔ وہ اسے متشکرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئی وارڈ میں چلی گئیں۔

آپریشن ہوتے ہوتے شام ہو گئی۔ آپریشن کے بعد مسلم اور صغریٰ خالہ نے سکون کا سانس لیا۔

شام کے وقت شہناز گھر پہنچی تو دروازے پر تالا پایا۔ برابر والے گھر میں پوچھنے پر اسے

ماں کے متعلق علم ہوا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ صغریٰ خالہ جاتے وقت چابی برابر والوں کے دے گئی تھیں۔ شہناز کو پریشانی یہ تھی کہ اسے یہ علم نہیں تھا کہ ماں کہاں ہے۔ بہرحال چابی لے کر وہ اپنے گھر آئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کپڑے بدلنے کے بعد معلومات حاصل کرے گی۔ ممکن ہے کہ پڑوس میں کسی کو علم ہو کہ امی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔

اس نے لباس تبدیل کیا ہی تھا کہ صغریٰ خالہ آگئیں اور اس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ صغریٰ خالہ نے سے پوری تفصیل بتائی.......... اور یہ بھی بتایا کہ اس وقت ہسپتال میں فاطمہ کے پاس مسلم موجود ہے۔

شہناز نے ہسپتال کا رخ کیا۔ مسلم اسے وارڈ کے باہر ٹہلتا ملا۔ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہ کر سکی۔ پہلے اسے ماں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھیں۔ وہ ڈاکٹر سے ملی۔ نرس ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ ہر ممکن تعاون کے لئے تیار تھا۔

شہناز نے ڈاکٹر کے کمرے سے اسے ہسپتال فون کیا' جہاں وہ کام کرتی تھی۔ اب ماں کو وہاں لے جانا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی صورتحال پریشان کن نہیں تھی۔ آپریشن ہو چکا تھا۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے ہسپتال والوں نے ڈاکٹر سے بات کی.......... فاطمہ کے لئے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کر دیا گیا۔

فاطمہ کے پرائیویٹ روم میں منتقل ہونے کے بعد شہناز پرسکون ہوئی' تب اسے مسلم کا خیال آیا۔ مسلم کمرے کے باہر کھڑا ملا۔ اس کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ "آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آجایئے"۔ شہناز نے اس سے کہا۔

وہ کمرے میں چلا آیا۔ فاطمہ ہوش میں تھی۔ "خالہ.......... اب آپ کیسی ہیں؟" اس نے فاطمہ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں"۔ فاطمہ کی آواز میں نقاہت تھی۔

شہناز کو صغریٰ کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ اس کٹھن وقت میں مسلم ہی کام آیا ہے اور سائے کی طرح دن بھر ان کے ساتھ لگا رہا ہے۔ فاطمہ البتہ اس بات سے بے خبر تھی۔ اسے تکلیف کے علاوہ کسی بات کا احساس ہی کہاں رہا تھا۔

"آپ اپنی سنایئے"۔ شہناز نے مسلم سے کہا۔ اس کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ کیوں نہ ہوتی' وہ تو اسے شروع ہی سے اپنا اپنا سا لگا تھا۔ اور اب وہ اس کا محسن بھی تھا۔ "کھانا بھی کھایا آپ نے؟"

مسلم' بری طرح چونکا۔ دن بھر اسے بھوک کا خیال ہی نہیں آیا تھا مگر اب کھانے کا تذکرہ سنتے ہی اسے بھوک لگنے لگی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ اس نے مختصراً کہا۔ کھانے کے متعلق وہ جواب دینے سے دانستہ بچا تھا۔

"آپ اب گھر جائیں۔ کھانا کھائیں.......... اور سو کر فریش ہو جائیں"۔ شہناز نے کہا۔

پھر اس نے مسلم کا چہرہ تمتماتے دیکھا تو جلدی سے بولی۔ میں آپ کو یہاں سے بھگا نہیں رہی ہوں۔ جو کچھ آپ نے کیا شکریہ اس کے لئے بہت چھوٹا.........."

"ایسی باتیں نہ کریں"۔ مسلم نے احتجاج کیا۔ "یہ میرا فرض تھا۔ اگر اللہ نے میری ماں کو زندگی دی ہوتی تو میں ان کا اسی طرح خیال نہ کرتا کیا۔ خالہ میرے لئے اپنی ماں کی طرح ہیں"۔

اس بار شہناز کے رخساروں پر لہو دوڑ گیا۔ وہ کتنی سادگی سے بے پناہ اپنائیت کا اظہار کر گیا تھا۔ لیکن شہناز نے فوراً ہی خود کو سمجھایا.......... کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں بی بی۔ یہ تو سبھی کے لئے اس طرح اپنائیت محسوس کرتا ہے.......... سبھی کے کام آتا ہے۔

فاطمہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی.......... ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"اور یہ بھی سن لیں کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اس بار مسلم کے لہجے میں شوخی تھی۔ "اور میں یہاں سے ٹلنے والا نہیں۔ خالہ کو ساتھ ہی لے کر جاؤں گا"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو آپ جا کر کھانا تو کھا آئیں"۔ شہناز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر"۔ مسلم نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر پوچھا۔ "آپ کو کچھ منگوانا تو نہیں؟"

"ضرورت کی تمام چیزیں میں گھر سے لے آئی ہوں"۔ شہناز نے جواب دیا۔

مسلم کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فاطمہ نے مستفسرانہ نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔ شہناز نے جو کچھ صغریٰ خالہ سے سنا تھا' ماں کو بتا دیا۔

"بہت اچھا لڑکا ہے۔ سبھی کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے"۔ فاطمہ نے کہا۔

"لیکن اپنے دکھ درد میں کسی کو شریک نہیں کرتا' شہناز نے دل ہی دل میں سوچا۔

کچھ دیر بعد مسلم واپس آیا۔ وہ بے حد ترو تازہ لگ رہا تھا۔

وہ دونوں بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ فاطمہ خواب آور دواؤں کے زیر اثر تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے.......... ایک دوسرے کے بارے میں جاننا چاہتے تھے مگر ایسے میں زبان کہاں کھلتی ہے۔ چنانچہ دیر تک وہ اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے۔

مسلم کی یادداشت پر وہ لمحہ مرتسم ہو چکا تھا' جب شہناز نے اسے گھر جا کر کھانا کھانے کو کہا تھا۔ شہناز کا لہجہ بے حد اکھڑا تھا لیکن اتفاق سے مسلم کی نظر اس کی آنکھوں پر تھی۔ آنکھیں اس کے لہجے کی نفی کر رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اس کے لئے بے پناہ اپنائیت تھی۔ اس لمحے کو' ان آنکھوں کی کیفیت کو یاد کرتے ہوئے.......... تصور میں تازہ کرتے ہوئے' مسلم کو حیرت ہونے لگی۔ وہ کبھی کسی لڑکی سے اس انداز میں متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کسی

لڑکی کے متعلق اس طرح سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کوئی مخصوص لڑکی اس کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ مگر شہناز کو دیکھنے کے بعد اس کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ خیال بار بار اسے چھیڑ رہا تھا......... یہ تمہاری ہے' تمہارے لئے' اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں گھر کا خیال ابھر آیا۔ گھر......... جس کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے تو بس اب تک ایک ٹھکانے پر گزارہ کیا تھا......... شب بسری کا ایک ٹھکانہ۔ ٹھکانے کو چاہے کوئی نام دے دو۔ وہ گھر تو نہیں ہوتا۔ گھر میں ویرانی نہیں ہوتی......... رونق ہوتی ہے۔ گھر تو صرف ایک شہناز کے دم سے ہوتا ہے.... چاہے اس میں کوئی سامان آسائش نہ ہو۔

مسلم پاکستانی زندگی میں پہلی بار محبت سے متعارف ہو رہا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے ایک خیال نے اسے لرزا دیا۔ اسے احساس ہوا کہ محبت کا احساس اسے بہت غیر مناسب وقت پر ہوا ہے۔ اب وہ اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کیا سوچے گی؟ کیا سوچے گی اس کے بارے میں؟ یہی نا کہ وہ بے حد چھچھورا اور عام سا آدمی ہے۔ اس کی ماں کو ہسپتال لایا ہے تو گویا کوئی احسان کیا ہے......... اور اس احسان کا صلہ ہاتھ کے ہاتھ وصول کرنا چاہتا ہے اور یہ سب کچھ تو فلموں اور افسانوں میں ہوتا ہے......... ہیرو ہیروئن کے ساتھ۔ جو لوگ فلموں اور افسانوں سے متاثر ہوتے ہیں' وہ ایسی سچویشنز کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انہیں ہیرو بننے کے لئے بس ایک موقع درکار ہوتا ہے۔ تو کیا شہناز اسے ایسے ہی لوگوں میں شمار نہیں کرے گی.........!

ادھر شہناز بھی اس کے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ بھی حیران تھی۔ اجنبی لوگ بغیر جان پہچان کے اتنے جانے پہچانے بھی لگ سکتے ہیں' یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی حیرانی مسلم کے مقابلے میں کم تھی۔ اس لئے کہ وہ اکثر پردے کے پیچھے سے دیکھتی رہی تھی اور ہر بار وہ اسے اپنا سا لگا تھا لیکن اب وہ اس کے قریب تھا......... بے حد قریب۔ وہ اسکے ساتھ ہسپتال کے اس کمرے میں تنہا تھی۔ وہ اسے شروع ہی سے اور لوگوں سے مختلف لگا تھا۔ پھر اس نے بہت تھوڑے عرصے میں بستی میں وہ عزت کمالی تھی' جسے تنہا لوگ ترستے ہیں۔ اکیلے لوگوں کو کوئی بستی بہ آسانی قبول نہیں کرتی۔ قبول کرلے' تب بھی اسے اعتبار کی سند نہیں دیتی۔ لیکن اسے اعتبار کی سند مل گئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کی شخصیت غیر معمولی ہے۔

"آپ گھر نہیں جائیں گی؟"

وہ بری طرح چونکی۔ "جی؟" اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اس نے صرف آواز سنی تھی' الفاظ نہیں.........

"آپ کو اب گھر جانا چاہئے"۔ مسلم نے دہرایا۔

"میں گھر کیسے جاسکتی ہوں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس کے ذریعے' بس نہ ملے تو رکشہ سہی' کہیں تو میں آپ کو چھوڑ آؤں"۔ مسلم نے سادگی سے کہا۔

"نہیں' میں امی کے پاس رہوں گی"۔

"یہاں میں جو ہوں"۔

"نہیں' آپ نہیں سمجھتے۔ امی کو میری ضرورت ہوگی۔ میں نرس ہوں۔ ہر اونچ نیچ سے واقف۔ گھر میں ویسے بھی میں اکیلی ہوں گی۔ ہسپتال والوں نے بھی مجھے چھٹی دے دی ہے۔ دو تین دن ہی کی تو بات ہے"۔

مسلم نے سر کو تفہیمی جنبش دی' لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

"البتہ آپ گھر چلے جائیں۔ ہم نے آپ کو بہت زحمت........."

"کم از کم آپ کے منہ سے یہ پر تکلف الفاظ بہت برے لگتے ہیں"۔ مسلم نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ اس رسم کے جواب میں رسماً جو کہا جاتا ہے' وہ میں دل کی گہرائیوں سے' پوری سچائی کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ اب آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہی ہیں"۔

شہناز شرمندہ ہوگئی۔ واقعی خلوص کو زحمت قرار دینا بے حد توہین آمیز ہوتا ہے۔

"بات صرف رسمی نہیں تھی"۔ اس نے صفائی پیش کی۔ "میں آپ کی بے آرامی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ آپ کو صبح کام پر بھی جانا ہوگا"۔

"اس کی فکر نہ کریں آپ اور یقین کریں' میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گا......... کسی قیمت پر بھی نہیں"۔

دل میں پھول سے کھل گئے۔ وہ کتنی سادگی سے عمر بھر ساتھ دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ مگر فوراً ہی شہناز نے ان فضول سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اس رات کی صبح ہوئی تو وہ دونوں حیران حیران سے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے اپنی زندگی کی کتاب کھول کر رکھ دی تھی۔ مسلم زیادہ حیران تھا۔ اس سے پہلے اس نے اتنی ذاتی گفتگو کسی سے نہیں کی تھی......... کبھی نہیں۔

اس ایک رات میں وہ ایک منہ زور جذبے کی نازک مگر مضبوط ڈور میں بندھ گئے تھے۔ تکلف کی تمام دیواریں گر گئی تھیں۔ حجاب باقی تھا۔ محبت کی وہ نوخیز کلی بہت معصوم تھی' جو بیک وقت ان دونوں کے دلوں میں کھلی' مسرتوں اور سرشاریوں کی خوشبوئیں لٹا رہی تھیں۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

فاطمہ ہسپتال سے گھر واپس آچکی تھی۔ زندگی پھر اپنے معمولات کی طرف پلٹ آئی لیکن کچھ معمولات کا اضافہ بھی ہوگیا۔ مسلم ہر شام فاطمہ کے پاس جاتا......... ان کی خیریت دریافت کرنے......... اور وہ کبھی خالی ہاتھ نہ ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلدستہ ہوتا.........

رنگ برنگے، مہکتے پھولوں کا وہ خوبصورت دستہ وہ پھول والے سے بطورِ خاص بنوا کر لاتا۔

پہلے دن جب اس نے گلدستہ فاطمہ کو دیا تو فاطمہ نے اسے شکریے کے طور پر بے شمار دعاؤں سے نوازا۔ پھر ہنس کر بولی۔ "میں اسے رکھوں گی کہاں؟ یہاں تو گل دان بھی نہیں ہے"۔

دوسرے دن مسلم گلدستے کے ساتھ خوبصورت سا، نازک سا ایک گلدان بھی لے آیا۔ فاطمہ نے شہناز کو گل دستہ دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹی......... اسے گلدان میں سجا دو"۔ نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہوگیا کہ مسلم وہ گلدستہ اور گلدان اس کے لئے نہیں، شہناز کے لئے لایا ہے۔ مائیں ایسے معاملات میں بہت حساس ہوتی ہیں......... بالخصوص وہ مائیں، جن کے ساتھ ایک جوان بیٹی ہو اور سر پر کوئی سائبان بھی نہ ہو..... نہ شوہر، نہ بیٹا۔ ایسی خوددار اور غیرت مند مائیں بہت شکی ہو جاتی ہیں......... اور بیٹی کے قریب کوئی سایہ بھی نظر آئے تو بھڑک جاتی ہیں۔ فاطمہ بھی ایسی ہی ماں تھی......... لیکن جہاں دیدہ تھی۔ اس نے تو خود اپنی جوانی بیوگی کے ریگزار میں بچ بچ کر گزاری تھی۔ نظروں کو پہچاننے کا ہنر اسے وقت نے بہت اچھی طرح تعلیم کیا تھا۔ مسلم کا وہ رجحان اس کے لئے بے حد خوش کن تھا۔ وہ اس معاشرے میں بیٹی کی ماں تھی، جہاں کسی لڑکی کو اس کے اوصاف کے حوالے سے نہیں پہچانا جاتا۔ جہاں بیٹی کی شادی کے لئے جہیز کے نام پر بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ درحقیقت ترازو کی اس مساوات میں دو پلڑے دولہا اور جہیز ہوتے ہیں۔ دلہن تو محض پاسنگ کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ حقیقت پسند فاطمہ جانتی تھی کہ شہناز کو اچھا بر صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مل سکتا ہے ورنہ بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں اور مسلم اسے اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی کا روپ نظر آتا تھا۔

یہ بات شہناز بھی جانتی تھی کہ مسلم گلدستہ ماں کے لئے نہیں اس کے لئے لاتا ہے۔ وہ ان پھولوں کو بڑے اہتمام سے گلدان میں سجاتی۔ رات کو ماں کے سونے کے بعد وہ خود سونے سے پہلے گہری سانسوں کے ذریعے ان کی معطر کن خوشبو کو سینے میں اتارتی۔ صبح اٹھتے ہی وہ گلدان کو پانی کے چھینٹے دیتی۔ ہسپتال سے واپس آتے ہی اس کی نظر گلدان پر پڑتی۔ پھول مرجھا چکے ہوتے۔

مسلم ہر روز بے چینی سے شام کا انتظار کرتا۔ شام ہوتے ہی وہ گھر کے لئے روانہ ہوتا۔ راستے میں پھول والے کے پاس رکتا۔ پھول والا اب اس کے معمول سے واقف ہو چکا تھا لہٰذا اس کے آنے سے پہلے ہی گلدستہ تیار رکھتا۔ مسلم اپنے گھر جانے سے پہلے شہناز کے گھر رکتا۔ گلدستہ فاطمہ کو دیتا اور کن انکھیوں سے شہناز کو دیکھتا، جو ماں سے گلدستہ لے کر یوں سج سج گلدان کی طرف بڑھتی، جیسے اس کے ہاتھوں میں پھول نہیں، نازک جذبوں کی رنگ برنگی مچلتی تھرکتی تتلیاں ہوں، جنہیں وہ چھوڑنا بھی نہیں چاہتی اور رنگوں سے محروم کرنا بھی نہیں چاہتی۔ اس کا وہ انداز دیکھ کر مسلم کے دل میں پھول کھلنے لگتے......... آنکھوں میں خواب مچلنے

لگتے......... ایک گھر کے آنگن کے خواب، جس میں پھول ہی پھول ہوتے۔ پھولوں پر تتلیاں رقص کر رہی ہوتیں۔ وہاں اس کے اور شہناز کے سوا کوئی بھی نہ ہوتا لیکن ان خوابوں میں بھی ان کے درمیان فاصلوں کا حجاب ہوتا۔ بے شمار پھول ہوتے۔

مسلم کو شاعری سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی، لیکن اب پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ شاید ہر شخص کے اندر ایک شاعر چھپا ہوتا ہے، جو دل میں کوئی لطیف جذبہ جاگنے پر ابھر آتا ہے......... چھا جاتا ہے اور جو لوگ شعر نہیں کہہ سکتے، وہ شعر سوچتے، شعر محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ایسے خیال ذہن میں آتے ہیں کہ ایسے میں کوئی ٹوک دے، چونکا دے تو اپنے اندر چھن سے کچھ ٹوٹنے کا احساس ہوتا ہے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے جانا کہ محبت شاعری ہے۔

لیکن اس کے لب سلے رہے۔ وہ شہناز سے سب کچھ کیا، کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ خود کو گھٹیا ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ جب بھی سوچتا، اسے فلموں پر، افسانوں پر اور افسانہ نگاروں پر غصہ آنے لگتا، جنہوں نے اظہار کو رسوا کر دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شہناز بھی شاعری کی اس بھیگی بھیگی کیفیت سے گزر رہی ہے لیکن اس یقین کی بنیاد صرف محسوسات پر تھی۔ شہناز نے کبھی کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ لڑکیاں تو جذبوں کو بہت سینت سینت کر رکھتی ہیں۔

دوسری طرف شہناز سب کچھ جانتی تھی مگر اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ جذبہ محبت محتاج لفظ و نوا ہو۔ محبت میں تو تمام حسیں، انسان کا پورا وجود گویائی اور سماعت ہوجاتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں زبان سے، دو ٹوک الفاظ میں یہ سب کچھ سنے بغیر یقین کامل نہیں ہوتا۔ سب کچھ وہم وہم سا، خواب خواب سا لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مسلم پر جھنجلانے لگتی۔ اس کے لائے ہوئے پھول بولتے، اس کا ہر انداز اظہار محبت کرتا، لیکن لب کبھی نہ کھلتے۔

تیسری طرف فاطمہ بھی مسلم کے لبوں کی جنبش کی منتظر تھی۔ جانتی تھی کہ مسلم دنیا میں اکیلا ہے۔ گویا شہناز کے سلسلے میں اسے خود بات کرنا ہوگی۔ چنانچہ وہ اسے بات کرنے کے مواقع فراہم کرتی۔ کسی بہانے سے شہناز کو وہاں سے ہٹا دیتی......... باورچی خانے کی طرف بھیج دیتی تاکہ مسلم اس سے بات کرسکے۔ بات اب صرف ضرورت کی نہیں رہی تھی۔ شرمیلا مسلم اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ایک ماں کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہوتی گئی۔ کچھ تو یہ تھا کہ وہ بیٹے سے محروم تھی اور کچھ مسلم بھی محبت کا مستحق تھا۔ اسے ہسپتال کے دن یاد تھے۔ مسلم کے ایثار کی بے غرضی اور خلوص میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔

لیکن جب مسلم کی زبان کسی طور نہ کھلی تو وہ پریشان ہوئی، دل میں طرح طرح کے

وسوسے سر اٹھانے لگے۔ کہیں یہ سب کچھ محض اس کا گمان تو نہیں۔ کہیں مسلم کی بے غرضی بالکل بے داغ تو نہیں۔ ممکن ہے وہ محض ہمدردی میں یہاں آتا ہو......... اس کا خیال رکھتا ہو......... اور وہ خواہ مخواہ آس لگائے بیٹھی ہو۔ جانتی تھی کہ اب تک محلے میں صرف اس لئے باتیں نہیں بنیں......... انگلیاں نہیں اٹھیں کہ سب لوگ مسلم کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن زبان کھلنے اور احترام اٹھنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بالآخر اس نے طے کرلیا کہ اب اس بات کو طے کرکے ہی دم لے گی۔ خود تذکرہ نکالے گی۔ بہرحال یہ مرحلہ اس کے لئے دشوار تھا۔ آخر وہ بیٹی کی ماں تھی۔ سوچتی رہی کہ بات کس طرح شروع کرے کہ معیوب بھی نہ ہو اور اس کے لئے شرمساری کا باعث بھی نہ ہو۔ سوچنے ہی سوچنے میں مہینے گزر گئے۔

یوں یہ سہ جہتی خاموش محبت پروان چڑھتی رہی۔ یہ محبت کا عجیب اور انوکھا مثلث تھا۔ دو ضلعے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ تینوں ضلعے مل جانا چاہتے تھے' لیکن ذرا سا فاصلہ پاٹنا ان کے لئے دشوار ہوگیا تھا۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ بالآخر فاطمہ کو بات شروع کرنے کا طریقہ سوجھ ہی گیا۔ اس طرح اس کی سبکی بھی نہیں ہوتی اور بات بھی ہو جاتی۔

وہ کوشش کرنے لگی کہ مسلم رات کا کھانا انہی کے ہاں کھائے۔ مسلم تکلف کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر فاطمہ نے کہا۔ "تم یہاں تکلف نہ کیا کرو۔ میں یہ سوچ سوچ کر کڑھتی ہوں کہ تم ہوٹل کا کھانا کھاتے ہو۔ صحت کے لئے اچھا تو نہیں ہوتا......... ہوٹل کا کھانا"۔

"کیا کیا جائے خالہ' مجبوری ہے"۔

"مجبوری کیسی' کب تک کھاتے رہو گے ہوٹلوں میں"۔

مسلم سے کوئی جواب نہ بن پڑا' وہ خاموش رہا۔

"تم شادی کیوں نہیں کرلیتے؟" فاطمہ نے کہا۔ اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔

مسلم کا دل دھڑکنے لگا۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا' اس کے لئے یہ اسے پہلا موقع مل رہا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ فاطمہ نے دانستہ اسے یہ موقع فراہم کیا ہے۔ "کیا کروں خالہ' میری ماں ہوتی تو سب کچھ آسانی سے ہو جاتا۔ اب میں خود تو کسی کے ہاں رشتہ لے کر جانے سے رہا"۔

"تو کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟" فاطمہ برا مان گئی' اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

"یہ بات نہیں خالہ' میں تو آپ کو اپنی ماں کی طرح سمجھتا ہوں"۔

"اور میں تمہیں بیٹا نہیں سمجھتی؟"

"یہ بات بھی نہیں"۔ مسلم شرمندہ ہوگیا۔

"مجھے بتاؤ' میں کراؤں گی تمہاری شادی' کوئی لڑکی پسند ہے تمہیں"۔ فاطمہ نے کہا۔

اس کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔ فیصلہ کن لمحہ آپہنچا تھا' اب فیصلہ ہو جائے گا کہ وہ

شہناز کو چاہتا ہے یا نہیں۔

"جی' ایک لڑکی پسند تو ہے مجھے"۔ مسلم نے دل کڑا کرکے کہا۔ "لیکن خالہ' آپ میری بات ماں بن کر سنیں گی"۔

"تمہیں اس میں شک کیوں ہے؟"

"شک تو نہیں' بس ڈر لگتا ہے"۔

"تم کہہ کر تو دیکھو"۔ فاطمہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

مسلم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ سامنے ہی باورچی خانہ تھا۔ شہناز کھانا نکال کر ٹرے پر رکھ چکی تھی اور اب باورچی خانے سے نکل رہی تھی۔ "خالہ' میں......... مجھے......... شہناز اچھی لگتی ہے"۔

فاطمہ اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکی۔ شہناز دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی۔ فاطمہ نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔

"تم فکر نہ کرو۔ البتہ اس وقت بات نہیں ہوسکتی۔ کل صبح کام پر جانے سے پہلے میرے پاس آنا"۔

اس رات فاطمہ اور مسلم سے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا گیا......... دونوں ہی بہت خوش تھے۔ اپنی اپنی دانست میں دونوں ہی نے معرکہ سر کیا تھا۔ شہناز اس سارے چکر سے بے خبر تھی لہٰذا سکون سے کھاتی رہی۔

اس رات مسلم ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں سکا۔ اچٹتی نیند میں وہ خواب دیکھتا رہا۔ وہ خواب میں ایک گھر دیکھتا' ویسا گھر جیسا اسے کریم بلوچ' سرور خان' زینب اور جیناں نے دیا تھا مگر خواب میں ان چاروں میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ ہاں......... شہناز تھی' پھر اچانک زلزلہ سا آتا اور اس گھر کی دیواریں بیٹھ جاتیں۔ ہر طرف ملبہ ہی ملبہ ہوتا' یہ خواب اس نے کئی بار دیکھا۔ ہر بار اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو پسینے میں تر بہ تر پایا۔

صبح وہ جلدی اٹھ گیا اور وقت گزاری کے لئے چہل قدمی کی غرض سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ رات فاطمہ نے بات کیوں نہیں کی۔ وہ شہناز کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی تھی اور یہ ٹھیک بھی تھا' وہ خود بھی شہناز کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔

شہناز بس اسٹاپ کی طرف جاتی نظر آئی' وہ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ فاطمہ برتن دھو رہی تھی۔ اس نے اسکے سلام کا جواب دیا اور برتن چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے کی طرف چل دیا۔

"بیٹھو"۔ فاطمہ نے کہا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"مجھے بے حد خوشی ہے کہ تم نے مجھے اپنی ماں سمجھ کر بات کی۔۔۔۔۔۔ تم مجھے بیٹے ہی

کی طرح عزیز ہو"۔ فاطمہ نے کہا۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس بات کے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

"تم ہر اعتبار سے بہت اچھے ہو......... دیکھے بھالے۔ باقی سب کچھ نصیب کے ہاتھ"۔

مسلم نے سوچا کہ اب بیٹی کی ماں بول رہی ہے' وہ اس بار بھی خاموش رہا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ' تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"اسی شہر سے ہے میرا تعلق' یہیں پیدا ہوا تھا"۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے' میں پوچھ رہی ہوں' تم ہندوستانی ہو نا؟"

"یہ سوال مسلم کے لئے نیا نہیں تھا۔ جن دنوں وہ ملازمت کے چکر میں دھکے کھا رہا تھا' ہر شخص یہی پوچھتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسے توہین کا احساس ہونے لگا۔ اس سوال سے بچنے کے لئے تو اس نے ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا تھا' وہ اس سوال سے بہت چڑتا تھا۔ اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "میں پاکستان میں پیدا ہوا ہوں اور پاکستانی ہوں"۔

"تم میرا مطلب اب بھی نہیں سمجھے۔ تمہارے والدین ہندوستان سے ہجرت کرکے آئے تھے نا؟"

"مجھے اپنے والدین کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں' مجھے تو ماں کی صورت بھی یاد نہیں"۔ مسلم کی چشم تصور میں ایک ویران' سنسان سڑک لہرا گئی' جس پر سورج آگ برسا رہا تھا اور دور و نزدیک کوئی سایہ نہیں تھا' چھاؤں نہیں تھی۔

فاطمہ اس کا جواب سن کر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے شوہر کا انتقال ہوا تو شہناز دو سال کی تھی۔ اس کا شوہر سید تھا اور نام و نسب کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا' غربت بری چیز نہیں لیکن نام و نسب کی کمتری قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ پھر اس میں ایک تبدیلی آئی تھی۔ اس نے اپنی بہن کی شادی مقامی لوگوں میں کی تھی اور بدقسمتی سے وہ کچھ اچھے لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے اس کی بہن کو بہت برے حال میں رکھا۔ وہ بے چاری ہر اعتبار سے ان سے مختلف تھی۔ زبان جدا' رسم و رواج جدا' رہن سہن جدا اور اس پر مستزاد اس پر ہونے والے ستم۔ رحمٰن سب کچھ دیکھتا اور دل مسوس کر رہ جاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ شیر خوار شہناز کو غور سے دیکھتا اور کہتا......... "کچھ بھی ہو' میں اپنی بچی کو اپنوں میں بیاہوں گا......... اہل زبان لوگوں میں' یہ بات وہ قسم کھا کر کہتا تھا۔

فاطمہ کو اس وقت اس کی دونوں باتیں یاد آگئیں۔ وہ پریشان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے' کیا کرے۔

"کیا بات ہے خالہ؟" مسلم نے پوچھا۔ اسے وہ خاموشی ناگوار اور توہین آمیز لگنے لگی۔

"لگتے تو تم مہاجر ہی ہو"۔ فاطمہ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"میں مہاجر نہیں ہوں' پہلے مسلمان ہوں اور پھر پاکستانی........." مسلم نے ترش لہجے

میں جواب دیا۔

"تم اتنا زور دے کر کیوں کہتے ہو یہ بات؟"

"اس لئے کہتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جس ماں نے مجھے جنم دیا......... وہ کون تھی لیکن مجھے اس سے غرض بھی نہیں۔ وہ کوئی بھی ہو' پہلے مسلمان اور پھر پاکستانی ہوگی۔ مجھے اس کی آغوش کی گرمی یاد نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ سندھ اور پنجاب نے مجھے ماتا دی' سرحد اور بلوچستان نے شفقت پدری سے نوازا اور اپنا سب کچھ لٹا کر ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے والوں نے مجھے تعلیم دی' شعور دیا۔ یہ سب مل کر پاکستان ہی تو بناتے ہیں۔ میں پیدائشی مسلمان ہوں پھر پاکستان کے احسانات کی وجہ سے پاکستانی ہوں"۔

"تم اپنے باپ کو نہیں جانتے؟"

"نہیں' کریم بلوچ اور سرور خان سے پہلے میں اس لفظ کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جب وہ میرے لئے ایک دوسرے سے الجھے تو مجھے پتہ چلا کہ باپ کیا ہوتا ہے۔ دونوں مجھے اپنا بیٹا کہتے تھے اور عمل سے ثابت بھی کرتے تھے"۔

فاطمہ سناٹے میں آگئی۔ کون جانے.... کون جانے' اس کا باپ......... تقسیم کے دنوں میں تو ہندوؤں اور سکھوں کے جبر نے ایسی بہت سی یادگاریں چھوڑی تھیں۔ کیا پتا' سید ہونا تو دور کی بات ہے' یہاں تو یہ بھی یقین نہیں کہ یہ لڑکا اپنے باپ کی جائز اولاد ہے یا نہیں' اس سے آگے وہ سوچ نہ سکی۔ مسلم ذاتی طور پر اسے بے حد پسند تھا۔ وہ اسے گنوانا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اس کے ڈوبتے ذہن نے تنکے کا سہارا لیا۔ "لیکن تم اردو تو بہت اچھی بولتے ہو"۔

"میں تو پنجابی' سندھی' بلوچی اور پشتو بھی بہت اچھی بولتا ہوں"۔ مسلم نے کہا۔ "کہیں تو بول کر دکھاؤں"۔

فاطمہ کی الجھن اور بڑھ گئی۔ ایک طرف مرحوم شوہر کی خواہشات تھیں جو اس کے دل کو بھی لگتی تھیں۔ خیر سیّد والا مسئلہ تو اتنا اہم نہیں تھا۔ آزادی کے بعد سب کچھ غلط ملط ہوکر رہ گیا تھا۔ جس کے پاس چار پیسے آئے' وہ سیّد بن بیٹھا۔ دوسری طرف سیّد زادے روزگار کے ہاتھوں یوں حقیر ہوئے کہ اپنے نام کے ساتھ سیّد لگانے کی ہمت بھی کھو بیٹھے۔ سو اب سیّد ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ فاطمہ اس پہلو سے صرف نظر کرسکتی تھی لیکن دوسرے پہلو کو وہ کیسے نظرانداز کرتی۔ نند کا حشر دیکھ چکی تھی۔ اکلوتی بیٹی کے لئے یہ خطرہ کیسے مول لیتی۔

"کس سوچ میں پڑگئیں خالہ؟" مسلم نے اسے چونکا دیا۔

"تم کچھ بھی کہو' لگتے تم مہاجر ہی ہو"۔

"دیکھو خالہ' میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں اس سلسلے میں بے خبر ہوں۔ ویسے مجھے پتا ہوتا' تب بھی میں یہی رہتا' جو ہوں۔ میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ مسلم پاکستانی ہونا میری شناخت ہے' مجھے اور کسی پہچان کی ضرورت نہیں"۔

اس کے لہجے میں اتنا استحکام تھا کہ فاطمہ کو سانپ سونگھ گیا۔ اب کہنے کو رہا بھی کیا تھا۔
"اب میری بات کا جواب دو خالہ"۔
فاطمہ کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ "کس بات کا جواب مانگ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔
"رات والی بات کا"۔
فاطمہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "میں اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں کیسے دے سکتی ہوں، جسے نہ اپنے نام و نسب کا پتہ ہو نہ اپنی قومیت کا، یہ تو اندھا کنواں ہے میں شہناز کو اس میں کیسے دھکیل دوں"۔
"نام و نسب اور قومیت کی کیا اہمیت ہے۔ کیا میرے کردار، عادات و اطوار میں کوئی عیب نظر آیا ہے تمہیں؟"
"نہیں، یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، تم بہت اچھے ہو، سچ تو یہ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو اتنا اچھا نہیں دیکھا"۔
"تو پھر میرے کردار کی، عادات و اطوار کی کوئی اہمیت نہیں ہے"۔
"تم صرف اتنا کہہ دو کہ تم مہاجر ہو"۔
"کیسے کہہ دوں"۔ مسلم جھنجلا گیا۔ "خالہ تم نہیں جانتیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری اچھائیوں کو مسترد کرکے تم مجھے برا بننے کی ترغیب دے رہی ہو۔ آدمی بہت کمزور ہوتا ہے خالہ"۔
"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں"۔ فاطمہ نے آہ بھر کر کہا۔ "تم جس دن میرا پسندیدہ جواب دے دو گے، شہناز تمہاری ہوگی"۔
مسلم اٹھ کھڑا ہوا۔ "جب تم ماں بننے کا دعویٰ کر رہی تھیں خالہ تو میں نے کہا تھا نا کہ مجھے شک تو نہیں، بس ڈر لگتا ہے۔ یہی ڈر تھا مجھے۔ تم میری ماں بننے کا دعویٰ کر رہی تھیں مگر صرف بیٹی کی ماں بن کر رہ گئیں"۔
فاطمہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "سچ کہہ رہی ہوں، تم اب بھی میرے لئے بیٹے جیسے ہو میں تمہیں اپنی مجبوری نہیں سمجھا سکتی۔ میرے انکار کی وجہ اور ہے اور اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا، تم میرے لئے بیٹے ہی رہو گے۔ تم میرے بیٹے کی حیثیت سے اس گھر میں جب چاہو آسکتے ہو۔ جوان بیٹی کی ماں منہ بولے بیٹے پر اس سے زیادہ اعتماد کر سکتی ہے؟ بس، شہناز کے رشتے کے لئے تمہیں میری یہ شرط پوری کرنا ہوگی"۔
مسلم اسے سلام کرکے نکل آیا۔ اس کے دل پر بوجھ تھا۔ وہ بہت اداس ہوگیا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ فاطمہ اس سے زیادہ اداس ہے۔
فاطمہ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھتی رہی۔ وہ عجیب کشمکش سے دوچار تھی۔ دل

ا تھا، اسے آواز دے کر بلالو، سب کچھ بھول جاؤ۔ مقدر پر، اللہ پر یقین رکھو۔ لیکن عقل تی تھی...... نہیں، عمر بھر کی کمائی ایک بیٹی ہی تو ہے۔ اسے دکھی دیکھو گی تو جیتے جی مرجاؤ ۔ اس کے ہونٹ لرزتے رہے، وہ زیر لب اسے پکارتی رہی۔ جانتی تھی کہ وہ دروازے کی ٹ پار کرگیا تو فیصلے میں کبھی ترمیم نہیں ہوگی۔
وہ چلا گیا تو دل، دماغ پر حاوی آگیا۔ وہ دروازے کی طرف لپکی کہ اسے بلالے لیکن گلی ان تھی۔ کوئی بچہ بھی نہیں تھا کہ وہ اسے بلوالیتی۔ کمزور لمحہ گزر گیا تھا۔ اس نے دیر کردی ، وہ بوجھل دل اور قدم لئے اندر چلی آئی۔ اداسی دل میں قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی۔
بیٹوں سے محروم مائیں، بیٹیوں کو شاید اسی لئے زیادہ محبت دیتی ہیں کہ بالآخر وہ انہیں بیٹا لادیں گی...... بیٹا، جو بازاروں میں نہیں ملتا۔
وہ دن بھر سوچتی رہی اور آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ عقل کا فیصلہ درست تھا۔ عام طور پر ہوتا ہے۔ دل کے فیصلوں کو صرف کسی کمزور لمحے میں بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ کمزور لمحہ زر جائے تو وہ عقلی فیصلوں سے ہار جاتے ہیں۔
فاطمہ کو بھی سکون آگیا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

اس روز مسلم بہت اداس اور ملول رہا۔ اسے اپنے استرداد کا دکھ نہیں تھا۔ غم یہ تھا کہ اہم معاملے میں ہمیشہ یہ ایک سوال کیوں سامنے آتا ہے۔ شناخت کا مسئلہ کیوں ابھرتا ہے۔ ی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی آزادی نے ہر شخص کو اس کی شناخت دیدی ۔ پھر لوگ دور غلامی کی یادگار شناختوں کا حوالہ کیوں طلب کرتے ہیں اور خود گمراہ ہیں تو سروں کو گمراہی پر کیوں مجبور کرتے ہیں۔
وہ سوچتا اور خود کو ٹٹولتا رہا۔ اسے شہناز سے محبت تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ۔ اس شادی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اسے ایک ماں بھی مل جاتی۔ ظاہر ہے، فاطمہ کو تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا، لیکن فاطمہ نے بہت کڑی شرط عائد کردی تھی۔ وہ یہ شرط پوری نہیں رسکتا تھا۔
اسے فاطمہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بے چاری تو اپنے گھر تک محدود عورت تھی، ں کی سوچیں، خیالات، جذبات اور احساسات محدود تھے۔ اس کے ذہن میں وسعت کہاں سے تی۔ اس نے تو بیوگی کا روگ گلے سے لگا کر بڑی جدوجہد سے اپنی بیٹی کو پروان چڑھایا تھا۔ بقا ا جدوجہد آدمی کو کچھ سوچنے ہی کب دیتی ہے۔ اب بیٹی شادی کے قابل ہوگئی تھی تو اسے یہ ر لاحق ہوگئی تھی۔ غربت کے ساتھ بیٹی کی آبرومندانہ رخصتی بھی اس زمانے میں ہنسی کھیل یں، وہ اس کے اصرار کی وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ فاطمہ نے اپنے محدود سے گرد و پیش میں کچھ یسے دیکھے ہوں گے۔ اس کا محدود ذہن یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں۔

انسانوں کے معاملے میں کلیے بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ انسان ہر اعتبار سے کلیوں کے مقا
میں بڑا ہے پھر اپنی نیت اور مشیت پر ہر چیز منحصر ہے لیکن بے یقین لوگ یہ بات کہاں
ہیں۔ سمجھ لیں تو مانتے نہیں۔

لیکن وہ یہ سب کچھ فاطمہ کو کیسے سمجھاتا؟ اگر شہناز کی غرض بیچ میں نہ ہوتی تو وہ
کوشش ضرور کرتا لیکن غرض کا رشتہ مضبوط دلائل کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ گویا وہ اسے قا
کرنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک دشوار فیصلہ کر لیا۔ اب وہ شہناز کا نام کبھی زبا
نہیں لائے گا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆
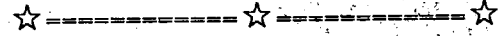
شہناز کو پہلے ہی دن تبدیلی کا احساس ہو گیا لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تاہم یہ ضرور ہوا کہ وہ بجھی بجھی رہنے لگی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلم اور ماں کے درمیان کچھ کشیدگی ہے......... اور کشیدگی کا سبب کسی نہ کسی طور پر اس کی اپنی ذات ہے۔

گلدستے والا معمول اب بھی جاری تھا۔ مسلم گل دستہ لاتا اور ماں کو دیتا۔ ماں اسے پکارتی اور گلدستے اس کی طرف بڑھا دیتی۔ وہ پھولوں کو لے جا کر گلدان میں سجا دیتی مگر نہ جانے کیوں گلدستہ ہاتھ میں لے کر وہ اداس ہو جاتی۔ پہلے ان پھولوں کو چھوتے ہوئے مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ اب وہ مسرت کسی موہوم اور نامعلوم اداسی میں بدل گئی تھی۔

گلدستہ دینے کے بعد مسلم پانچ دس منٹ بیٹھتا۔ اس سے اور ماں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا۔ اس کے انداز سے کبھی ناراضی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ ماں بھی ہمیشہ کی طرح اس سے بہت محبت سے بات کرتی۔ تقریباً ہر روز وہ مسلم سے کھانے پر اصرار کرتی لیکن مسلم کا ایک ہی جواب ہوتا۔ میں کھانا کھا کے آیا ہوں خالہ' پانچ دس منٹ بعد وہ اٹھ کر چلا جاتا۔ ماں کچھ دیر خاموش بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ گھر کی فضا پر عجیب سی اداسی مسلط ہو جاتی۔

شہناز نے کئی بار سوچا کہ اس سلسلے میں ماں سے استفسار کرے لیکن یہ ارادہ کر کے وہ چور سی ہو جاتی۔ کہیں ماں اس کی دلچسپی کا راز نہ جان لے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی خاموشی دن بہ دن بڑھتی گئی۔

فاطمہ بھی بیٹی میں ہونے والی تبدیلی سے بے خبر نہیں تھی۔ مسلم اور شہناز کی خاموش محبت' ممکن ہے وہ پہلے نہ بھانپ سکی ہو لیکن شہناز کی خاموشی نے اسے بتا دیا کہ آگ دو طرفہ ہے۔ وہ اور اداس ہو گئی لیکن اپنے فیصلے سے ہٹنا اسے قبول نہیں تھا۔

ایک رات مسلم کے جانے کے بعد فاطمہ نے شہناز سے پوچھا۔ "کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی' آپ کیوں پوچھ رہی ہیں یہ بات؟"

"کئی دن سے تم بہت چپ چپ رہنے لگی ہو"۔

"کام کی زیادتی ہے' بہت تھک جاتی ہوں میں"۔ شہناز نے بات بنائی۔

لیکن فاطمہ مطمئن نہیں ہوئی۔ وہ حقیقت جانتی تھی اور اس کے خیال میں شہناز کو ر
کچھ بتا دینا بہت ضروری تھا۔ "مسلم نے مجھ سے بات کی تھی"۔ فاطمہ نے کہا۔ شہناز متفر
نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ "تمہارے سلسلے میں"۔ فاطمہ نے مزید وضاحت کی۔

شہناز کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے سر جھکا لیا' اگر مسلم نے اس کے سلسلے میں کوئی بات
تھی تو یہ کشیدگی بتاتی تھی کہ امی نے انکار کر دیا ہو گا مگر کیوں؟ امی تو اسے بہت پسند کرتی ہیں!
انکار کیوں؟ یہ سوال اس کے ذہن میں چبھتا رہا۔ وہ کوشش کے باوجود اس سوال کا جوا
تلاش نہ کر سکی۔

"میں نے انکار کر دیا تھا"۔ فاطمہ نے مزید کہا۔

شہناز خاموش رہی۔ اسے اپنا دماغ سن ہوتا محسوس ہوا۔

"وجہ نہیں پوچھو گی انکار کی؟"

"کیا کروں گی پوچھ کر۔ جب آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی فیصلہ کر دیا تو یقیناً کوئی بڑ
بڑی وجہ ہوگی"۔ شہناز نے آہستہ سے کہا۔

فاطمہ نے سب کچھ اسے بتا دیا لیکن شہناز اسے وہ سب کچھ نہ بتا سکی جو مسلم نے اسے
بتایا تھا۔ وہ بتانا چاہتی تھی لیکن حیا آڑے آ گئی۔ امی کیا سوچیں گی؟ گمان کریں گی کہ ہسپتال م
ہم دونوں نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے اور مسلم کے پاکیزہ تعلق کے سلسلے م
کسی کی بھی بدگمانی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم اس نے اتنا ضرور کہا۔ "امی' یہ اتنی بڑی وجہ
نہیں کہ آپ ان کی تمام خوبیوں کو نظرانداز کر دیں"۔

جواب میں فاطمہ نے اسے اس کے باپ کی خواہش کے بارے میں تفصیل سے بتا
اس نے اپنی نند کی حالت زار بھی سنا دی جو اب نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ سب کچھ سنا
کے بعد اس نے شہناز سے پوچھا۔ "اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

شہناز بہت کچھ کہنا چاہتی تھی' وہ کہنا چاہتی تھی کہ اب نام و نسب سے انسان کی درست
شناخت کا تصور ختم ہو چکا ہے اور اچھے برے ہر طبقے میں' ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ضروری نہ
کہ جو کچھ اس کی پھوپھی کے ساتھ ہوا' وہ اس کے ساتھ بھی ہو' یہ تو مقدروں کے کھیل ہ
وہ ماں کو مسلم پاکستانی کی زندگی کی کہانی سنانا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ کچھ کہنے
فائدہ نہیں تھا' وہ سمجھ گئی تھی کہ ماں اپنے نظریات کے معاملے میں اٹل ہے۔

فاطمہ نے اسے اداس اور دل گیر دیکھا تو تڑپ گئی۔ "خدا گواہ ہے شہناز! مجھے صر
تمہاری بہتری کا خیال ہے' ورنہ........"

شہناز جلدی سے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولی۔ "

جانتی ہوں امی' مجھے یقین ہے"۔ وہ جانتی تھی کہ اس لمحے وہ چاہے تو ماں اپنا فیصلہ بدل دے گی
لیکن اسے جھنجلاہٹ تھی کہ ماں نے انکار کرنے سے پہلے اس سے پوچھنے کی زحمت کیوں نہیں
کی۔

اگلی صبح اس نے میٹرن سے کہہ کر اپنی ڈیوٹی نائٹ شفٹ میں کرالی۔ وہ شرمندہ تھی۔
مسلم کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی شفٹ تبدیل ہونے پر فاطمہ کو حیرت ہوئی کیونکہ
شہناز نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ نئی میٹرن آئی ہے اور یہ اس کا فیصلہ ہے۔ فاطمہ نے مزید
گفتگو نہیں کی۔ وہ اس تبدیلی کے اصل سبب سے خوب واقف تھی۔

مسلم اب بھی اپنے مقررہ وقت پر آتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب شہناز نہیں ہوتی
تھی۔ فاطمہ خود گلدستے کو گلدان میں سجاتی۔ شہناز کی غیر موجودگی کی وجہ سے مسلم اب زیادہ
دیر تک بیٹھنے لگا۔ وہ فاطمہ سے بڑی خوش مزاجی سے گفتگو کرتا لیکن شہناز کے تذکرے سے
گریز کرتا۔ کئی بار فاطمہ کا جی چاہا کہ اس سے کہے۔ میں اپنی شرط سے دستبردار ہو رہی ہوں'
لیکن کوئی باطنی قوت اسے یہ کہنے سے روک دیتی۔ اس کے لبوں پر جیسے قفل پڑ جاتے۔

مسلم کو معلوم تھا کہ شہناز صبح واپس آتی ہے۔ کام پر جاتے ہوئے وہ گلی سے گزرتا تو
دل بے ایمان ہو جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس کے گھر جائے' اسے خاموشی سے دیکھے' کم از کم
ایک بار' لیکن اس کا اپنا فیصلہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن گیا تھا' وہ اس فیصلے سے انحراف نہیں کرنا
چاہتا تھا' چنانچہ وہ سر جھکائے گلی سے گزر جاتا۔ اس کی نظریں ٹاٹ کے پردے کی طرف کبھی
نہیں اٹھیں۔ اسی لئے اسے پتا بھی نہ چلا کہ کبھی کبھی ٹاٹ کی جھری سے دو بڑی بڑی سیاہ اداس
آنکھیں اس کے قدموں میں نگاہوں کے سجدے نچھاور کرتی ہیں۔

شہناز صبح سویرے ہسپتال سے تھکی ہاری واپس آتی۔ جذباتی کشمکش اور شب بیداری
سے اس کی صحت متاثر ہو رہی تھی' وہ آتے ہی منہ ہاتھ دھوتی' دانت برش کرتی اور خواہش نہ
ہونے کے باوجود ماں سے ناشتے کی فرمائش کرتی۔ ماں کے باورچی خانے کی طرف جاتے ہی وہ
گلدان کی طرف لپکتی' جس میں رات کے پھول سجے ہوتے' وہ ان پر پانی کا چھینٹا دیتی' انہیں
بڑی نرمی سے سہلاتے ہوئے زیر لب کہتی۔ "تو تم کل رات بھی آئے تھے۔ بڑے مستقل
مزاج ہو مگر اب کیوں آتے ہو' کیوں؟ امی نے تمہاری آس توڑ دی' تم امی کی آس کیوں نہیں
توڑ دیتے"۔ وہ اسی طرح کی باتیں کرتی اور جواب میں اسے خوشبو کی زبان میں باسی پھولوں کی
سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ وہ اور پھول دیر تک باہم باتیں کرتے رہتے۔ ماں کے قدموں کی آہٹ
سن کر وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ آتی۔

فاطمہ سبزی ترکاری لینے جاتی تو شہناز دروازے پر آکھڑی ہوتی۔ عام طور پر مسلم انہی
اوقات میں وہاں سے گزرتا۔ وہ پردے کی جھری سے اسے گزرتا دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ
اسے پکارے لیکن شرمندگی آڑے آ جاتی۔ ہر روز وہ دعائیں کرتی کہ کاش ایک بار..........

صرف ایک بار وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھے۔ ان آنکھوں کو دیکھے؛ ان کی گفتگو سنے مدت گز
گئی۔ مگر اس کی دعا کبھی پوری نہ ہوئی۔ وہ نظریں جھکائے گلی سے گزر جاتا۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

پھر ایک برے وقت کا آغاز ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی فضا بدلنے لگی۔ قومیتوں کی بنی
پر تنظیمیں قائم ہونے لگیں۔ نفرتیں پروان چڑھنے لگیں۔ صرف تنظیمیں بننا کچھ ایسا تشویشناک
نہیں تھا۔ چھوٹے ذہن کے، محبت کی خو سے محروم لوگ برسوں سے یہ کاروبار کر رہے تھے
لیکن عوامی سطح پر ان تنظیموں کی پذیرائی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہوتی بھی کیسے، یہ شہر، شہر
قائداعظم تھا۔ تضادات کا شہر.......... غریب پرور، مہمان نواز شہر، یہ روشنیوں کا شہر تھا، مملکت
پاک کا دل تھا۔ یہ شہر جہاں زندگی چوبیں گھنٹے دھڑکتی تھی۔ روشنیوں کے اس شہر میں
اندھیرے تھے تو کیا ہوا۔ روشنیوں کے جلو میں اندھیرے ہوتے ہی ہیں۔ وطن کو.......... ہر اہل
وطن کو اس شہر پر ناز تھا.......... اس سے عشق تھا۔ اس شہر نے اپنے دامن میں ہمیشہ ضرورت
مندوں کو پناہ دی تھی۔ صرف محنت کی خو ہو تو یہاں ہر شخص کو روزگار مل جاتا تھا۔ غریب آد
دو روپے میں پیٹ بھر لیتا تھا۔ محنت کشوں کو خوب نوازتا تھا یہ شہر۔ ایسے شہر تو خدا کی رحمت
کے مظہر ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں کے بڑے مسائل تو ہوتے ہی ہیں۔ خاص طور پر ان بڑے
شہروں کے جو توسیع کی شاہراہ پر دوڑے جا رہے ہوں مگر ان کے وسائل میں اضافے کی رفتار
سست ہو۔ ایسے شہروں میں زندگی کی رفتار تو تیز ہوتی ہی ہے۔ اس میں شکایت اور طنز کی کو
بات نہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی سے ملنے کی فرصت نہیں۔ جہاں زندگی بغیر رکے بھاگ رہی ہ
وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس شہر میں ملک کے ہر علاقے کا، ہر جگہ کا رہنے والا آباد ہے۔ یہی ا
غریب پرور، مہمان نواز شہر کی پہچان ہے۔

سو قومیتوں کی بنیاد پر تنظیمیں قائم ہونا اچھا تو نہیں تھا مگر ایسا تشویشناک بھی نہیں تھ
عوامی سطح پر کبھی ایسی تنظیموں کی پذیرائی نہیں ہوئی تھی مگر پھر ایک تحریک میں شہر کے سب
بڑے طبقے کے نوجوانوں کی اکثریت شامل ہوگئی۔ اس تحریک کی زبردست پذیرائی ہوئی۔

☆ ============ ☆ ============ ☆

مسلم پاکستانی سوچتے ہوئے ذہن کا مالک تھا۔ قوت تجزی پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا درد م
دل یہ سب کچھ دیکھ کر تڑپ اٹھا، وہ حقیقت پسند بھی تھا اور غیر جانب دار بھی۔ اس نے مدنیا
سے سیاسیات تک تعلیم حاصل کی تھی۔ جانتا تھا کہ منفی سوچ اجتماعی ہو تو بے سبب کبھی نہیں
ہوتی۔ اس کے پیچھے محرومیاں ہوتی ہیں۔ لفظ ایکسپلائیٹیشن استعمال کرنا بہت آسان ہے لیکن
تو سوچنا چاہئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، بغیر کسی جاندار سبب کے لوگوں کو اجتما
طور پر بہکایا نہیں جا سکتا۔ گویا منفی سوچ اجتماعی ہو تو تجزیے کی متقاضی ہے۔ اسے کچلنے
کوشش کی جائے تو اور پھیلتی ہے۔

بدقسمتی سے ارباب اقتدار یا تو قوت تجزی سے محروم تھے یا اس نفاق و انتشار سے ان
کے مفادات کی آبیاری ہو رہی تھی۔

دردمند مسلم پاکستانی بہت دنوں سے بہت دنوں سے عجیب اور نئے نئے تماشے دیکھ رہا
تھا۔ نت نئے مسائل سر اٹھا رہے تھے۔ وہ ان کے بارے میں سوچتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔
مسائل کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اندرونی مسائل کے اندرونی اسباب تو تھے
ہی، کچھ اندرونی مسائل بین الاقوامی صورت حال میں تبدیلی کے سبب سے تھے۔ ایران میں
انقلاب آیا تھا اور افغانستان میں غاصب روسی گھس آئے تھے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان ہیروئن
اور اسلحے کی اسمگلنگ کی لپیٹ میں آگیا۔ ہیروئن اور اسلحہ عام ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ جرائم کی
بھرمار ہوگئی۔ ہیروئن کے ہاتھوں وہ نسل تباہ ہونے لگی جو وطن عزیز کے لئے مستقبل کی حیثیت
رکھتی تھی۔ مسلم سوچتا تو اسے حیرت ہوتی۔ اس کے بعض ہم وطن آسانی سے اور بہت تیزی
سے دولت کمانے کے لئے اپنی ہی قوم کے ہاتھوں موت فروخت کر رہے تھے، مستقبل کو زہر
دے رہے تھے۔ یہ سب کیا ہے؟ اس نے تڑپ کر سوچا اور پھر اس نے ان اجل فروشوں کو ہم
وطن اور ہم مذہب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسے لوگوں کو نہ کوئی قومیت ہوتی ہے، نہ کوئی
مذہب.......... انہیں تو انسانیت کے زمرے سے بھی خارج کر دینا چاہئے۔

اندرونی مسائل میں ہولناک مسئلہ بے روزگاری تھا۔ جن لوگوں کو روزگار کی فراہمی
کیلئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا تھی اور پھر ان منصوبوں پر عمل کرنا تھا، وہ صرف اپنے اقتدار کی
طوالت کی فکر میں گم تھے۔ وہ کبھی نہیں سوچتے تھے کہ ہر سال ہزاروں نوجوان مختلف قسم کی
ڈگریاں لے کر عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں، جہاں ان کا سامنا بے روزگاری کے
عفریت سے ہوتا ہے۔ ہر سال لاکھوں نوجوان میٹرک کرتے ہیں۔ ان میں بھی ہزاروں ایسے
ہوتے ہیں، جن کے لئے مزید تعلیم کا حصول ممکن نہیں ہوتا، وہ بھی فکر معاش میں نکلتے ہیں، وہ
سب ذہین بھی ہوتے ہیں اور ان کا خون بھی گرم ہوتا ہے اور مایوسی ایسی خطرناک چیز ہے جو
ذہانت کو بڑی آسانی سے منفی راہ پر ڈال دیتی ہے اور یہ بات قوم کے لئے مہلک ہے۔

ملک کا صنعتی ڈھانچہ 1968ء تک کے صنعتی منصوبوں کے بل پر کھڑا تھا جب کہ
ضرورت روزگار میں سینکڑوں فیصد کے حساب سے اضافہ ہوا تھا۔

دوسری طرف جمہوری عمل رکا ہوا تھا۔ ایسے میں قوم کی جمہوری تربیت کیسے ہوتی۔
لوگوں کا جمہوری مزاج کیسا بنتا۔ چنانچہ قومی مزاج یہ بنا کہ اختلاف کسی بھی نوعیت کا ہو، اسے
ذاتی اور ناقابل قبول سمجھا جاتا۔ ہر شخص اپنی قوت کے مطابق مخالف سے نمٹنے کی کوشش کرتا۔
انفرادی رویے میں اجتماعی رویوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی اجتماعی مزاج ٹھہرا۔ متصادم
نظریات کو سمجھنے، ان کا تجزیہ کرنے اور افہام و تفہیم کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی خو ختم
ہوگئی۔ ہر شخص اور ہر گروہ اپنے نظریات سے متصادم نظریات اور ان کے حامل شخص یا گروہ کو

مسترد کرنے اور کچلنے کی بھرپور کوشش کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہو گیا۔ ایسے میں حبتیں کہاں پنپتی ہیں۔ شعور کی نمو کہاں ہوتی ہے۔ ایسے میں تو اندھی اور بہری جذباتیت کو فروغ ملتا ہے۔

قومیت کی بنیاد پر قائم ہونے والی وہ تنظیم دیکھتے ہی دیکھتے تحریک بن گئی۔ عوامی سطح پر اس کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ اکثریت کی ہمدردیاں اسی تحریک کے ساتھ تھیں، یہ سب کچھ دیکھ کر دیگر قومیتوں سے تعلق رکھنے والے شہریوں کو عدم تحفظ کا احساس ہوا.......... یا احساس دلایا گیا۔ جذبات ابھارے گئے۔ نفرتیں پھونکی گئیں۔ حالانکہ ایسی تنظیمیں، ہر قومیت کی ایسی تنظیمیں برسوں سے سرگرم عمل تھیں لیکن یہاں ایک اور بات بھی تھی۔ اس تحریک نے موت کے سوداگروں کو چیلنج کر دیا تھا۔ تحریک کی عوامی قوت دیکھ کر موت کے سوداگر خوفزدہ ہو گئے۔ وہ اس تحریک کو طاقت سے کچلنا چاہتے تھے لیکن کھل کر سامنے آنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جگہ جگہ افواہیں پھیلانے کے لئے اپنے ایجنٹ چھوڑ دیئے۔

اور موت کے وہ سوداگر بہت طاقت ور تھے ان کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی قوت، دولت کی وجہ سے تھی، وہ لوگوں کو زہر کا عادی بنا کر زہر کو سونے سے مہنگا بیچ رہے تھے۔ وہ سرکاری عمالوں کو ہر سطح پر منہ مانگے داموں خریدتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کی کوئی حد نہیں تھی۔ دیکھا جائے تو باطنی طور پر وہی حکمراں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سہراب گوٹھ کا نام اندرون ملک ہی نہیں، بیرون ملک بھی اجنبی نہیں تھا۔ ہر قسم کا نشہ اور اسلحہ وہاں کھلے عام فروخت ہوتا تھا اور سامنے ہی پولیس کی چوکی تھی۔

غیر جمہوری اور جذباتی مزاج رکھنے والوں کو مشتعل کرنا کچھ دشوار نہیں ہوتا۔

مسلم پاکستانی کو دکھ اس بات کا تھا کہ مشتعل ہونے والوں نے صورت حال کو گہرائی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ورنہ امکانات خاصے واضح تھے۔ کراچی وہ شہر تھا، جہاں سیاسی شعور سب سے زیادہ تھا۔ پچھلی آمریتوں کو کراچی سے اٹھنے والی تحریکوں ہی نے سرنگوں کیا تھا۔ چنانچہ غیر مقبول حکمرانوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ اس شہر میں بدامنی کی فضا پیدا کی جائے۔ اسی لئے محرومیوں کا تدارک کرنے کی کوئی تدبیر نہیں سوچی گئی۔ حالانکہ 1971ء میں اسی بنیاد پر ملک دولخت ہوا تھا۔

بالآخر مفاد پرستوں کی سازشیں رنگ لائیں۔ بدنام زمانہ سہراب گوٹھ پر موت کے سوداگروں نے خون کی ہولی کھیلی۔ رد عمل کے طور پر پورا شہر ہنگاموں اور کرفیو کی لپیٹ میں آ گیا لیکن یہ اندازہ کسی کو نہیں تھا کہ اب یہ ہنگامے اور کرفیو اس شہر کا معمول بن جائیں گے اور روز محنت کر کے روزی کمانے والے بھوک کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔

سہراب گوٹھ پر فائرنگ اور زبردست تصادم کے بعد شہر کے بیشتر علاقوں میں کشیدگی پھیل گئی۔ اس کا اثر اس بستی پر بھی پڑا، جہاں مسلم پاکستانی رہتا تھا۔ وہاں ملی جلی آبادی تھی۔

ں کے رویے ایک دوسرے کے ساتھ معاندانہ تو نہیں ہوئے لیکن وہ ایک دوسرے کو لوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس کا سبب افواہیں تھیں جو بے حد منظم طریقے سے پھیلائی جا ی تھیں۔ تاہم علاقے میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، وہ کرفیو سے بھی محفوظ ہی رہا۔

اس روز دوپہر کے وقت مسلم کسی کام سے گھر سے نکلا۔ وہ دھندے پر نہیں گیا تھا۔ باہر ے ہی گلی میں اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ محلے کے کچھ لڑکے ایک پھیری والے کو گھیرے ڑے تھے جو چھابڑی میں امرود، کیلے اور دوسرے پھل لاتا تھا۔ لڑکوں کے تیور بے حد خراب ے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے۔ پھیری والا بری طرح سہما ہوا تھا۔

مسلم لرز کر رہ گیا۔ وہ تیزی سے لڑکوں اور پھیری والے کے درمیان آ گیا۔ "کیا بات ہے، کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"مسلم بھائی، آپ بیچ میں نہ آئیں۔" ایک لڑکا بپھر کر بولا۔ "ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

پھیری والا خاموش کھڑا تھا۔ اس میں بھاگنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

"لیکن اس کا قصور کیا ہے؟" مسلم نے پوچھا۔

"ان لوگوں نے ہمارے نہتے بھائیوں پر گولیاں چلائی ہیں۔ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔" دوسرا لڑکا بولا۔

مسلم نے پلٹ کر پھیری والے کو دیکھا۔ اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اس کا دل کھنے لگا۔ "تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اس نے پوری زندگی میں کبھی ایک بار بھی کسی پر گولی ہلائی ہوگی۔" وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا۔

"اس نے نہیں، اس کے بھائی بندوں نے تو چلائی ہیں گولیاں۔"

"اس کے بھائی بندوں میں تو تم بھی شامل ہو اور میں بھی ہوں، ہم سب کلمہ گو مسلمان یں۔"

"مسلم بھائی، آپ ہٹ جایئے" لڑکے جھنجلا گئے۔

"دیکھو، تم لوگ بچے ہو اور بچپنا کر رہے ہو۔ یہ بھی میری طرح، تمہارے محنت کش باپوں کی طرح غریب آدمی ہے، یہ دن بھر مارا مارا پھرتا ہے، تب کہیں اتنا کماتا ہے کہ جا کر بیوی بچوں کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرے۔ ہماری طرح اس نے بھی کبھی زندگی میں کسی بھی قسم کا اسلحہ نہیں دیکھا ہوگا۔"

"مسلم بھائی.........."

"میرے بیٹے.......... میرے بھائی، تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ اس کا روزگار خدمت ہے، یہ صرف اپنی روزی ہی نہیں کماتا، ہمیں ہماری ضرورت کی چیزیں گھر پہنچاتا ہے اور پھر یہ بھی سوچو کہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا تو یہ یہاں آنے کی جرات بھی نہ کرتا.........."

"مسلم بھائی، ہٹ جائیں۔"

"ٹھیک ہے، تم پتھر مارو، مگر مجھے گرائے بغیر تم اسے نہیں مار سکتے۔" مسلم، پھیری وا
کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

تمام لڑکے ٹھٹک گئے، وہ مسلم کا بہت لحاظ کرتے تھے، علاقے میں اس سے زیادہ م
والا، ہر شخص کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں تھا، ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ جھک گئے لیکن ایک
کچھ زیادہ ہی جذباتی تھا، اس کا ہاتھ گھوم گیا، پتھر مسلم کی ناک پر لگا۔ اس کی ناک سے خو
فوارہ پھوٹ پڑا لیکن وہ بدستور تنا کھڑا رہا۔ اس کے کپڑے رنگین ہوتے رہے۔

پتھر مارنے والا لڑکا چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ دوسرے لڑکے بھی سکتے کی سی کیفیت
تھے پھر ان سبھوں نے اپنے ہاتھ کے پتھر پھینک دیئے اور مسلم کی طرف لپکے۔ پتھر مارنے
لڑکا سب سے آگے تھا۔ "مسلم بھائی .... یہ .... یہ ...." اس نے مسلم کی طرف
بڑھایا۔

"ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔" مسلم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا لیکن اس کا لہجہ نرم تھا۔ اس
پلٹ کر پھیری والے کو دیکھا، جو بت بنا کھڑا تھا۔

"مسلم بھائی، مجھے معاف کر دیں۔" لڑکے نے التجا کی۔

"معافی کس بات کی، تم تو برحق ہو، ہے نا؟"

"مسلم بھائی، آپ سمجھتے کیوں نہیں، آپ ...."

"میں سمجھ رہا ہوں اور تمہیں بتا رہا ہوں کہ صرف یہی نہیں۔" اس نے پھیری وا
کی طرف اشارہ کیا۔ "میں بھی اسی سلوک کا مستحق ہوں، اس لئے کہ میں بھی اس کا بھائی ہ
مارو پتھر .... اور مارو ...."

لڑکے چند لمحے ساکت کھڑے رہے ان کے چہروں سے ان کی کش مکش کا اظہار ہو ر
پھر ان کے چہروں پر شرمندگی ابھر آئی۔ "مسلم بھائی" انہوں نے بیک آواز کہا۔ "ہمیں مع
کر دیں۔"

"پہلے ایک وعدہ کرو، آئندہ اس انداز میں نہیں سوچو گے۔"

"وعدہ"

"اور کبھی کسی پھیری والے .... کسی غریب آدمی کے بارے میں اس انداز
نہیں سوچو گے۔"

"وعدہ .... وعدہ ...."

"اب آپ دوا تو لگائیں، یہ لیجئے پانی۔" پتھر مارنے والا لڑکا بالٹی میں پانی لے آیا تھا۔

"ایک منٹ۔" مسلم نے کہا اور پھیری والے کی طرف مڑا۔ پھیری والے کی آنکھ
میں آنسو تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ "بھائی .... یہاں آتے ہوئے کبھی نہ ڈرنا۔"

ے مخاطب کیا۔ "انشاءاللہ یہاں تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"صاحب، ڈرنا کیا، یہ تو ہمارا روزی ہے، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔ گھر میں بچہ
ب بھوکا ہو تو ہم گھر میں کیسے بیٹھ سکتا ہے اور خدا کی قسم، یہ لوگ تو ہمارے لئے ہمارے بچوں
مالک ہے۔" اس نے لڑکوں کی طرف اشارہ کیا پھر بولا۔ "صاحب، اللہ تم کو خوش رکھے۔"

پھیری والے کے جانے کے بعد مسلم بالٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ خون اب بھی جاری
ا۔ بہرحال، پانی کی بدد سے خون رک گیا۔ "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔" مسلم نے لڑکوں سے کہا۔

"میں کپڑے بدل آؤں پھر تمہیں چائے پلاؤں گا۔"

"نہیں مسلم بھائی، آج تو ہم آپ کو چائے پلائیں گے۔"

"چلو یہی سہی۔"

"مسلم کپڑے بدل کر باہر نکلا اور لڑکوں کے ساتھ ہوٹل کی طرف چل دیا۔ وہ نئی نسل
ی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ انہیں اس معاملے کی ہر اونچ نیچ بہت اچھی طرح سمجھا دینا چاہتا
ا۔ وہ انہیں ایک کھلی بات جتا دینا چاہتا تھا۔ اسلحہ رکھنا غریب لوگوں کے بس کی بات نہیں۔
ولیاں چلانے والے کرائے کے لوگ تھے، اسلحہ فراہم کرنے والے بڑے لوگ تھے یہی وجہ
ھی کہ گولیوں کی زد میں آنے والے صرف غریب غربا تھے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی صوبے سے
و اور وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں۔

کیا یہ بات معنی خیز نہیں کہ تشدد کے نتیجے میں آنے والی موت صرف غریبوں اور
جوانوں کا انتخاب کر رہی ہے۔

O============☆============O
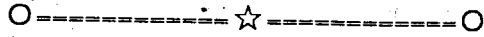
وقتی طور پر حالات معمول پر آ چکے تھے۔ کرفیو اٹھ چکا تھا لیکن اندر ہی اندر لاوا کھول رہا
تھا۔ عوامی سطح پر سہراب گوٹھ کی بیخ کنی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا لیکن جہاں خرابی بلند ترین سطح تک
پہنچی ہوئی ہو، وہاں اصلاح کے لئے اقدام کون کرے اور کس دل سے کرے۔

اس عوامی ردعمل پر صرف ہیروئن فروش ہی برہم نہیں تھے، وہ لوگ بھی جزبز تھے،
جنہیں ہر ہفتے بڑی بڑی رقمیں چشم پوشی کے عوض ملتی تھی لیکن عوامی مطالبہ اتنا شدید تھا کہ
اب انہیں چشم پوشی کا جواز تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

مسلم کا دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ غم جاناں پر غم دوراں حاوی آ گیا تھا۔ اس روز وہ پرانی
کتابوں کی ایک لاٹ کا سودا کرنے کھوڑی گارڈن گیا۔ واپسی میں وہ صدر آیا۔ یہ وہ علاقہ تھا
جہاں زندگی کا دھارا کبھی نہیں رکتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں گہما گہمی تھی۔ ایمپریس مارکیٹ کے
سامنے والے فٹ پاتھ پر سیکنڈ ہینڈ گرم کپڑے فروخت کرنے والے موجود تھے۔ ان میں اکثریت
صوبہ سرحد کے غریب لوگوں کی تھی۔ وہ کندھوں پر پرانے کوٹ اور پتلونیں لٹکائے کھڑے تھے
مگر ہمیشہ کے برعکس اس روز وہ سہمے ہوئے تھے۔ ان کی مضطرب نگاہوں کو قرار نہیں تھا۔

خوف اور آزردگی ان تک ہی محدود نہیں تھی۔ صدر کے علاقے کی رونق اپنی جگہ لیکن ف
پاتھوں پر چلنے والے عام لوگ بھی سہمے سہمے سے تھے مسلم کے دل میں درد کی ایک کاٹ دار
دوڑ گئی۔ لوگ کتنی جلدی ایک دوسرے پر اعتبار کھو بیٹھتے ہیں اور جب بھی ایسا ہوتا ہے، خو
کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ایسے میں تو آدمی خود سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔

مسلم کو ایک دوست سے ملنے نیو کراچی جانا تھا۔ بسوں میں حسب معمول بہت رش
اسے نیو کراچی جا کر واپس بھی آنا تھا چنانچہ اس نے رکشہ یا ٹیکسی کے حصول کے لئے کوش
شروع کر دی، لیکن کوئی نیو کراچی چلنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ زیادہ تر ٹیکسی ڈرائیورز نے منہ پ
انکار کر دیا۔ مسلم مایوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا، گھر واپس چلا جائے، نیو کراچی کی بعد
دیکھی جائے گی۔

ایک خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ اس نے یونہی بلا ارادہ رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی
کے قریب آکر رک گئی۔ "کہاں جانا ہے بابو صیب؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"نیو کراچی۔" اس نے جواب دیا۔

ڈرائیور چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "ضرور چلے گا بابو، پر لالوکھیت سے نئیں جائے گا۔"

"مسلم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"گلشن اقبال سے جائے گا۔" ڈرائیور نے فیصلہ سنایا۔

مسلم کی سمجھ میں اس کی منطق نہیں آئی۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے عقبی نشست
دروازہ کھولا۔ "کہیں سے بھی چلے چلو، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

ٹیکسی چل دی۔ ڈرائیور عقب نما آئینے میں بار بار اسے دیکھ رہا تھا پھر وہ محجوب لہجے
بولا۔ "بابو صیب، ادر سے چلنے میں میٹر پیسہ زیادہ بنائے گا۔"

"مسلم کو یہ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی مگر ڈرائیور کی شرمندگی اس کی سمجھ سے با
تھی۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے پشتو میں کہا۔

ڈرائیور کا چہرہ کھل سا گیا۔ مسلم بارہا آزما چکا تھا کہ ساری زبانیں بولنے کا سب سے
فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص بڑی اپنائیت سے اپنے دل کی بات سنا دیتا ہے اور وہ اتنی ہی اپنائیت
سن لیتا ہے۔

"میرا میٹر بھی تیز چلتا ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔ اب وہ بھی پشتو بول رہا تھا۔

"ایسا کیوں کرتے ہو؟ یہ تو بددیانتی ہے۔ خوامخواہ محنت کی روزی خراب کرنا۔"

ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا اور ونڈ شیلڈ پر نظریں
دیں۔ "کرنا پڑتا ہے صیب، جب حکومت اندھی ہو جائے تو غریب لوگ کیا کریں۔ اسلام ا
کا شور مچا رکھا ہے لیکن آدمی کو رزق حلال کمانے کا موقع کوئی نہیں دیتا۔ پٹرول کی قیمت ک
سے کہاں پہنچ گئی لیکن رکشا، ٹیکسی کا کرایہ بڑھانے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ اب پورا

پڑے گا تو آدمی بے ایمانی تو کرے گا اور حرام ایک بار منہ کو لگ جائے تو چھوٹنا بڑا مشکل ہوتا
ہے۔"

ڈرائیور نے بڑی سادگی سے حقیقت بیان کر دی تھی۔ مسلم کو رکشا کا تجربہ تو پہلے ہی
سے تھا۔ عام طور پر رکشے کا میٹر ٹیکسی سے بھی تیز........ چلتا ہے بلکہ کسی کسی رکشے میں تو
بیں پیسے بڑھنے کی رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کمزور دل کے آدمی کا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے
یعنی کھلی بے ایمانی ہو رہی ہے۔ قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور پوچھنے والا کوئی نہیں۔

"اگر میں چوکی کے پاس رکوا کر پولیس میں رپورٹ کروں کہ تمہارا میٹر تیز چل رہا ہے
تو؟"

"کچھ نہیں ہوگا صیب، اس میں حصہ تو ان کا بھی ہوتا ہے۔" ڈرائیور نے نہایت
اطمینان سے کہا۔

مسلم جانتا تھا کہ ڈرائیور ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ٹرانسپورٹرز اور عوام کے درمیان کشیدگی کی
ذمے داری پولیس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ میں بہت بڑی تعداد ایسی گاڑیوں کی
ہے، جو پولیس افسران کی ملکیت ہیں۔ ان گاڑیوں کو چالان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ان کے مالک
اپنے ڈرائیور اور کنڈیکٹر پر زور ڈالتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، انہیں زیادہ سے زیادہ کیش چاہیے۔
چنانچہ ڈرائیور اندھا دھند ڈرائیونگ کے ذریعے ٹرپس کی تعداد بڑھاتا ہے، وہ سگنل کی بھی پروا
نہیں کرتا، اسی لئے اتنے زیادہ حادثات ہوتے ہیں .... پھر حادثات کے مجرموں کا کچھ بگڑتا
بھی نہیں۔ اس وجہ سے لوگ حادثے کے بعد قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے عادی ہو گئے ہیں
اور اب یہ عادت پختہ بھی ہوتی جا رہی ہے اور اس کا دائرہ بھی وسیع ہو رہا ہے۔

"تم نے لالوکھیت سے چلنے کو کیوں منع کیا؟" مسلم نے پوچھا۔

اب بھی گفتگو پشتو ہی میں ہو رہی تھی۔

"میں نے قسم کھائی ہے، اب اس طرف نہیں جاؤں گا۔"

"کوئی وجہ بھی ہوگی۔"

ڈرائیور نے طویل سرد آہ بھری اور بولا۔ "میں نے ابھی حال ہی میں ٹیکسی خریدی تھی
قسطوں پر، ایک ہی قسط ادا کی تھی اس کی پھر ایک روز میں سواریوں سمیت لالوکھیت کے
ہنگاموں میں پھنس گیا۔ لڑکوں نے ٹیکسی رکوائی، مجھے اور سواریوں کو اتارا اور میری آنکھوں کے
سامنے میری ٹیکسی جلا ڈالی، وہ تو انہوں نے مہربانی کی کہ مجھے چھوڑ دیا، وہ مجھے بھی ٹیکسی کے
ساتھ جلا سکتے تھے۔"

"مسلم کا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک ڈرائیور کی بپتا نہیں، یہ تو ایسے ہی
سینکڑوں زخم خوردہ لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے، یہ اندھا تشدد کب تک چلے گا؟ اس غصے اور

دیوانگی کی سمت کب درست ہوگی؟ بے قصور اور ناتواں لوگ کب تک ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتیں گے؟ وہ لوگ اس غصے، دیوانگی اور تشدد کی زد پر کب آئیں گے جو اس کے مستحق ہیں، اصل سزاوار ہیں؟ لیکن اس کے پاس ان میں سے کسی سوال کا بھی جواب نہیں تھا۔

"یہ ٹیکسی کسی اور کی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں میب، مجھے شام کو اس کا سو روپیہ بھی دینا ہوتا ہے۔ پٹرول کا خرچ الگ پورا کرنا پڑتا ہے پھر جلی ہوئی ٹیکسی کی قسط الگ، خدا کی قسم میب! گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا ہے۔" ڈرائیور کا لہجہ رقت آمیز ہوگیا۔

مسلم اس صورت حال کا تصور کرکے لرز گیا۔

O============☆============O
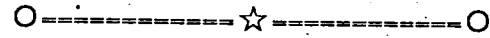
بالآخر عوامی مطالبے کے سامنے انتظامیہ کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ سہراب گوٹھ پر نام نہاد آپریشن کلین اپ کا آغاز ہوا۔ تاہم کسی مہربان نے موت کے سوداگروں کو اس سلسلے میں قبل از وقت خبردار کر دیا۔ آپریشن سے محض چند گھنٹے پہلے وہاں سے ٹرک کے ٹرک بھر کر مال نکال لیا گیا۔ چنانچہ آپریشن کے نتیجے میں بدنام زمانہ سہراب گوٹھ کے غیرقانونی تہ خانوں سے جو کچھ نکلا، وہ اتنا کم بھی نہیں تھا مگر سہراب گوٹھ کی شہرت کے پیش نظر اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس اعتبار سے آپریشن کلین اپ نیم دلانہ اور ناکام رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ انتظامیہ نے لوگوں کو آپریشن کلین اپ کے سلسلے میں سزا دینے کا تہیہ کرلیا ہے۔ ایک عام شہری کو بھی اندازہ تھا کہ آپریشن کلین اپ کا ردعمل کہاں ظاہر ہوگا اور کتنا شدید ہوگا لیکن انتظامیہ یا تو بے شعور تھی یا اس بہیمانہ منصوبے میں شامل تھی۔ چنانچہ شہر کے حساس ترین علاقوں کو کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا۔

ردعمل توقع سے کہیں شدید نکلا۔ پوری علی گڑھ کالونی کو جس طرح پھونکا گیا، ملک کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ منشیات فروشوں نے نہ صرف ایک بستی کو مٹا ڈالا بلکہ عوام کے دو گروہوں میں نفرت کی ایسی آگ بھڑکا دی، جس کا بجھنا ناممکن نہ سہی، بہت زیادہ مشکل تھا۔ اس ردعمل پر پورے شہر میں ردعمل ہونا فطری تھا۔ چنانچہ ہر جگہ محبت کے دیے بجھائے جانے لگے۔ نفرت کے الاؤ دہکنے لگے۔ وفاقی حکومت خاموش تھی اور صوبائی حکومت نیرو کا کردار ادا کر رہی تھی۔ روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔

مسلم کو اندازہ ہوگیا کہ نفرت کی یہ آگ اس بار آسانی سے نہیں بجھے گی۔ بیسویں صدی میں .... اس جدید دور میں ایک انسانی بستی کو مکمل طور سے پھونک دینا بے حد خوفناک تھا۔ اس کے نتیجے میں جو اشتعال پیدا ہوا، اسے روکنا آسان نہیں تھا۔ تاہم اس نے اپنے علاقے کے لڑکوں کو بڑی دانش مندی سے قابو میں رکھا لیکن لڑکوں کے لہجے تند ہوتے رہے تھے۔ مسلم جانتا تھا کہ اب اس کا محبت کا پرچار پہلے کی طرح موثر نہیں رہا۔

وہ بہت بڑے عذاب میں گرفتار تھا۔ وطن کے سادہ لوح اور غریب محنت کشوں کو ایک دوسرے سے ڈرتے سہمتے دیکھتا تو اس کا دل خون ہو جاتا۔ جو کچھ ہو چکا تھا وہ تو تھا ہی .... لیکن منظم طریقے سے افواہیں پھیلا کر نفرت اور خوف کو ہوا دی جا رہی تھی۔ پولیس کا رویہ بھی عجیب اور اشتعال انگیز تھا، یہ جواز تو مانا جاسکتا تھا کہ پولیس کے مقابلے میں شرپسندوں کے پاس جدید اور بہتر اسلحہ تھا مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ پولیس ان لوگوں کی خانہ تلاشی لیتی، انہیں تنگ کرتی، جو ظلم کا نشانہ بنے ہوتے۔ مسلم کے لئے وہ دن بہت کڑے تھے، وہ آنکھیں بند کرکے کسی پر الزام دھرنے کا قائل نہیں تھا۔ غیر جانب داری سے تجزیہ کرتا تو پتا چلتا کہ خطا سبھی کی ہے۔ کسی کی کم اور کسی کی زیادہ۔ حکومت اور انتظامیہ سے لے کر افراد تک کوئی بھی سوجھ بوجھ سے کام نہیں لے رہا تھا۔ ملک کسی کو بھی عزیز نہیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی۔ وطن سے محبت ہر شخص کرتا تھا مگر سوچنے سمجھنے کی عادت کسی کو نہیں رہی تھی۔ اندھی جذباتیت نے ہر مہذب جذبے کو دبا کر رکھ دیا تھا۔

اس کا گل دستے والا معمول اب بھی جاری تھا۔ ایک رات وہ فاطمہ کے گھر پہنچا تو خلاف توقع شہناز کو موجود پایا۔ فاطمہ کچھ متوحش سی لگ رہی تھی جب کہ شہناز اسے دلاسے دے رہی تھی۔ اس نے سلام کرکے فاطمہ کی طرف گل دستہ بڑھایا۔ فاطمہ نے اسے گل دان میں لگا دیا۔

"اور شہناز، تم کیسی ہو؟" مسلم نے پوچھا۔ اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔

"خدا کا شکر ہے، ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔"

دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی لیکن دونوں ہی نظریں اٹھانے سے گریز کر رہے تھے۔ فاطمہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ خاموشی بہت عجیب........ بوجھل بوجھل سی لگنے لگی۔ دونوں ہی گھٹن سی محسوس کر رہے تھے مگر زبان کھولنے کا بھی یارا نہیں تھا۔

بالآخر مسلم نے نظریں اٹھائیں۔ عین اسی لمحے شہناز نے بھی نظریں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ان نگاہوں میں نہ جانے کیا کیا تھا۔ چند لمحوں میں ان نگاہوں نے جیسے صدیوں کی گفتگو کر ڈالی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جان لیا کہ دونوں ہی ناخوش ہیں لیکن وہ جی بھر کر ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے، دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو صدیوں کی پیاس تھی، جس کے بجھنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

دونوں نے نظریں بھی ایک ساتھ ہی چرائیں۔ اب پھر خاموشی تھی........ بوجھل اور کشیدہ خاموشی۔

"آج تم ڈیوٹی پر نہیں گئیں؟" بالآخر مسلم نے پوچھا۔

"تین دن مسلسل ڈیوٹی دے کر آئی ہوں۔" شہناز نے جواب دیا۔

مسلم نے اسے بہ غور دیکھا' وہ بہت کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بتا رہے تھے کہ وہ کئی راتوں سے نیند سے مرحوم ہے۔

شہناز نے نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا' جن میں ایک سوال مچل رہا تھا۔ اس نے وضاحت کی۔ "ہر اسپتال کا یہی حال ہے۔ زخمیوں کی تعداد بیڈز کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ وارڈ کے باہر بھی زخمی پڑے ہیں۔ ایسے میں چھٹی کون کر سکتا ہے۔ صبح پھر چلی جاؤں گی میں۔"

مسلم کے دل میں ٹیس سی اٹھی' "اے خدا' اس نے دل میں پکارا۔ "کیا تو نے بھی ہم نافرمانوں سے منہ پھیر لیا ہے۔ کیا تو ہمیں راستہ نہیں دکھائے گا۔" لیکن فوراً ہی وہ اپنی اس سوچ پر شرمندہ ہو گیا۔ اللہ کی رحمت تو اب بھی تھی۔ اس کی نظر کرم ہی نے تو سنبھال رکھا تھا' ورنہ شیرازہ کب کا بکھر چکا ہوتا' یہ تو ہم ہی ہیں جن کی توجہ اس کی طرف نہیں' اگر وہ جواب میں منہ پھیر لے ہم سے تو پھر ہمیں بچانے والا کون ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شہناز اسے بہ غور دیکھ رہی تھی۔ "اللہ سے دعا کیا کریں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں بھی ہمیشہ دعا کرتی ہوں۔"

"ہاں' دعا تو میں بھی کرتا ہوں اور کیا بھی کیا جائے۔"

فاطمہ ٹرے میں کھانا لے آئی اور اس نے میز پر رکھ دیا۔ اسے اعتماد تھا کہ مسلم آج انکار نہیں کرے گا اور مسلم نے انکار کیا بھی نہیں' لیکن اس سے ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اور یہ حال صرف اسی کا نہیں تھا' فاطمہ اور شہناز نے بھی کھانا بس زہر مار کیا۔

"اور بیٹا' آج کل بستی کی فضا کیسی ہے؟" کھانے کے بعد اچانک فاطمہ نے پوچھا۔

"بستی کی فضا؟" مسلم چکرا گیا پھر اچانک اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے خالہ۔"

"نہیں' کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے' محلے پر حملہ ہونے والا ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو خالہ' یہ ہندوستان نہیں' پاکستان ہے۔ یہاں ہندو' مسلم اور سکھ کا کوئی جھگڑا نہیں' یہاں کون ہم پر حملہ کرے گا۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"تم مانو یا نہ مانو' یہ ہو کر رہے گا۔ اس طرف والوں کی تیور اچھے نہیں اور اب تو سب کے پاس گنیں ہیں۔" فاطمہ نے اصرار کیا۔

مسلم کے ہوش اڑ گئے۔ فاطمہ کوئی بہت زیادہ باخبر عورت نہیں تھی لیکن وہ اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہی تھی۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ بستی واضح طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی' آبادی کے لحاظ سے لیکن اس کی باسیوں کے درمیان کبھی کشیدگی نہیں رہی تھی' وہ تو ہمیشہ محبت

سے ساتھ رہتے آئے تھے۔ ہر شخص کے ہر شخص سے مراسم تھے لیکن اب......... لیکن اب.........

مسلم سے بیٹھا نہیں گیا۔ "میں چلتا ہوں خالہ۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹا' ہمارا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔" فاطمہ روہانسی ہو گئی۔

"خوامخواہ پریشان نہ ہوں خالہ' ایسی کوئی بات نہیں۔ کچھ لوگ افواہیں پھیلا کر لوگوں کو لڑانے کے چکر میں ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ امی؟" شہناز بگڑ گئی۔ "اللہ پر یقین نہیں رہا کیا؟"

"اور کیا' آپ بلا وجہ پریشان نہ ہوں' آپ نے کسی کا کیا بگاڑا ہے' ساری بستی آپ کی عزت کرتی ہے۔" مسلم نے کہا۔

وہاں سے نکلتے ہی مسلم نے گلی کے لڑکوں سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔

"ہاں مسلم بھائی' سنا تو یہی ہے۔" ایک لڑکا بولا۔ "بڑی زوروں کی تیاریاں کی ہیں ان لوگوں نے۔"

"لیکن فکر کی کوئی بات نہیں' ہم بھی تیار ہیں۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔" مسلم غرایا۔ "اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ یہ سب افواہیں ہیں۔"

"یہ افواہیں پہلے بھی کئی جگہ حقیقت بن چکی ہیں۔" ایک لڑکا طنزیہ لہجے میں بولا۔

"میری ایک بات مانو گے؟" مسلم نے التجا کی۔

"ضرور۔" لڑکوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بتائے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا' کسی قیمت پر۔"

"کوشش تو یہی ہوگی۔"

"کوشش نہیں' تمہیں میری یہ بات ماننا ہو گی۔"

"ٹھیک ہے مسلم بھائی۔"

O============☆============O

"مسلم دوسرے محلے کے لوگوں سے ملا۔ وہاں بھی صورت حال یہی تھی' وہ بھی حملے کے خطرے سے ڈر رہے تھے اور ان کا بھی کہنا یہی تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں' ہم بھی تیار ہیں۔

مسلم کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جارحیت کے موڈ میں کوئی نہیں ہے اور نہ کسی سے کسی کو خطرہ ہے' یہ سب افواہوں کا کمال ہے۔ افواہوں کے نتیجے میں بے اعتمادی اور شک کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ شہر کے دوسرے حصوں میں ہونے والے واقعات نے افواہوں میں حقیقت کا سا زور پیدا کر دیا تھا۔ ہر شخص اپنے دفاع کے لئے تیار تھا۔ حکومت' انتظامیہ اور پولیس پر کسی کو اعتماد نہیں رہا تھا۔ ان کی نااہلی یا بدنیتی پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی۔

لیکن اس کے باوجود صورت حال تشویشناک تھی۔ صرف مدافعت کے لئے تیار ہونے والے کسی غلط فہمی میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوسکتے تھے۔ جب گیس لیک کر رہی ہو تو صرف ایک دیا سلائی سب کچھ پھونک سکتی ہے جب کہ افواہ کی حیثیت شعلے کی سی ہوتی ہے۔

اس کے بعد مسلم کئی بار دونوں طرف کے لڑکوں سے ملا۔ اس نے انہیں ہر بات کی وضاحت کرکے سمجھایا لیکن بے یقینی اور بے اعتمادی دور نہیں ہوئی۔ تاہم بات کھل جانے کی وجہ سے صورت حال اتنی گھمبیر نہیں رہی۔

اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہی تھی کہ بستی کے تمام لوگوں کو ایک میٹنگ میں بلایا جائے۔ مسلم یہ کام کرسکتا تھا۔ بے اعتباری کے اس کڑے وقت میں ایک وہی تو تھا' جس پر سب اعتبار کرسکتے تھے' ورنہ دنیا کی کوئی طاقت ان سہمے ہوئے لوگوں کو یکجا نہیں کرسکتی تھی۔

اس میٹنگ میں بستی کے تمام اہم لوگ شریک تھے۔ ان میں نوجوان لڑکے بھی تھے اور جہاں دیدہ مرد بھی۔ میٹنگ مسلم کے گھر میں ہوئی۔ ابتدا میں ہر شخص کا انداز جارحانہ تھا اور پتہ کھڑکا بندہ بھڑکا والی کیفیت تھی مگر جلد ہی ان کا کھویا ہوا اعتماد واپس آگیا لیکن تلخی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مسلم کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس میٹنگ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اندر ہی اندر زہر بن جانے والی تلخیاں لفظوں کی مدد سے باہر آجائیں۔ دھواں باہر نہ نکلے تو دم گھٹتا ہی ہے۔ اسے سینوں کے اندر گھٹا ہوا دھواں باہر نکالنا تھا۔

مسلم نے تمام حالات بیان کرکے میٹنگ کا آغاز کیا۔ اس نے پرسوز لہجے میں اپنا تجزیہ بیان کیا۔ اس کے مدلل انداز بیان نے کشیدگی کو خاصا کم کر دیا۔ اس نے خدا کی قسم کھاکر کہا کہ اس کی غیر جانبداری پر شک نہ کیا جائے۔ اس نے یہ التجا بھی کی کہ بھڑکنے کے بجائے ہر شخص کی گفتگو معقولیت سے سنی جائے تاکہ افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہو۔

"سوال یہ ہے کہ اتنے عرصے کے بعد ایک ایسی تنظیم کیوں بنی؟" ایک بزرگ نے اعتراض کیا۔

"صرف اسی تنظیم پر اعتراض کیوں؟" دوسرے بزرگ نے جوابی اعتراض کیا۔ "طلبا برسوں سے صوبائی بنیاد پر تنظیمیں بنا رہے ہیں۔ ان پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ نہ حکومت نے اور نہ آپ نے' کیا یہ معاندانہ رویے کا ثبوت نہیں۔"

"ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔"

"اس طرح آپ اس تحریک کی اہمیت کو تسلیم کر رہے ہیں۔" دوسرے بزرگ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

مسلم نے جلدی سے مداخلت کی۔ "دیکھیے' خرابی ابتدا میں ہمیشہ غیر اہم اور معمولی لگتی ہے لیکن اسے غیر اہم قرار دے کر نظر انداز کر دینا غلطی ہے۔ اس کی اصلاح کا وہی مناسب

ترین وقت ہوتا ہے' جب وہ کمزور ہو۔ اسے نظر انداز کرکے ہم نہ صرف اسے پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں بلکہ دوسروں کو برائی کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ میں اسے حکومت کی مجرمانہ غفلت قرار دوں گا۔"

"لیکن ایسی کوئی تنظیم بنانا' اس میں شامل ہونا غداری ہے۔"

"یہ ایک اور مسئلہ ہے۔" مسلم نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "برسوں سے ہمارا یہی وطیرہ رہا ہے۔ حکومتی سطح پر بھی اور انفرادی سطح پر بھی۔ کسی سے کوئی اختلاف ہو تو ہم اس اختلاف کا تجزیہ کرنے کے بجائے' اختلافی عمل کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس پر غداری کا حتمی الزام عائد کر دیتے ہیں۔ ایسے میں افہام و تفہیم کی فضا کیسے بن سکتی ہے دوسرا شخص اپنے نظریے پر اور اپنے عمل پر راسخ ہو جاتا ہے۔ آپ اتنی آسانی سے لاکھوں افراد کو کیسے غدار قرار دے سکتے ہیں؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" پہلے بزرگ نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ "بہرحال' میں شرمندہ ہوں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"مجھ سے پوچھیے۔" ایک نوجوان نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں پاکستان میں پیدا ہوا........ پاکستانی ہوں۔ میرے بزرگوں نے ہجرت کرکے قربانی دی تھی' کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن ان کا حوالہ مجھے گالی کی طرح دیا جاتا ہے۔ مجھے قدم قدم پر احساس دلایا جاتا ہے کہ میں پاکستانی نہیں' ہندوستانی ہوں' یہ کیسے قبول کروں میں۔"

"ایسا افراد کرتے ہیں' ناسمجھ افراد........ اور ان میں اکثریت بدنیتی سے ایسا نہیں کرتی۔" ایک بزرگ نے اسے سمجھایا۔

"تو اس ناسمجھی کو اب ختم ہوجانا چاہئے' چاہے نیک نیتی سے کی جائے' برائی تو پھر بھی برائی ہی رہتی ہے۔"

"آپ افراد کی بات کرتے ہیں۔ یہ کہیں' حکومت کیا کر رہی ہے۔ ڈومیسائل کے فارم میں باپ کے باپ کی وطنیت کے بارے میں کیوں پوچھا جاتا ہے؟"

"اور بے روزگاری کی لعنت الگ۔"

"خیر' بے روزگاری تو سب کے لئے ہے۔"

"لیکن اصول بنا کر اصول شکنی تو زیب نہیں دیتی۔ دنیا بھر میں یہ اصول چلتا ہے کہ لوکل اسامیوں پر مقامی لوگوں کی تقرری ہوتی ہے۔"

"یہ آئی نا اصل بات۔" ایک صاحب تلخ لہجے میں بولے۔

"ہمیں بے روزگار کرکے روزگار حاصل کرنا چاہتے ہو تم؟"

"مسلم نے پھر مداخلت کی۔ "آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اللہ رزق دینے والا ہے' کوئی کسی سے رزق نہیں چھین سکتا۔ میرے بزرگو' میرے نوجوان بھائیو! کیا آپ ایمان سے

محروم ہوگئے ہیں، اللہ کی رزاقی پر..........''

''بس آگے کچھ نہ کہنا۔'' ایک بزرگ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہم لوگوں کے ایمان کمزور ہو گئے ہیں، اللہ ہمیں نیک ہدایت دے۔''

دو گھنٹے تک لوگوں کے دلوں کی بھڑاس نکلتی رہی۔ منشیات فروشوں کا کردار بھی زیر بحث آیا۔ انتظامیہ اور حکومت کا کرپشن بھی۔ خوب تند و تلخ گفتگو بھی ہوئی لیکن مسلم نے بڑی حاضر دماغی سے ایسے موقعوں پر مداخلت کر کے صورت حال کو خراب ہونے سے بچالیا۔ اب تمام لوگ بڑے سکون اور معقولیت سے ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے۔ دلوں کی کدورتیں مٹنے لگیں اور فاصلے گھٹنے لگے۔

''ہمیں اپنے بھائیوں سے کوئی اختلاف نہیں۔''

''ہمارے بھائیوں کو ہم سے کبھی خطرہ بھی لاحق نہیں ہوگا۔''

''یہ خیال کبھی دل میں نہ آنے دیجئے کہ ہم سے آپ کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

یہ وہ لمحہ تھا، جب مسلم نے اچانک کہا۔ ''حضرات! میری طرف متوجہ ہو جایئے۔ آپ لوگوں کو بلانے سے میرا ایک مقصد تو پورا ہوگیا ہے۔ محبت اور احترام کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ خدشے اور وسوسے دور ہوگئے ہیں لیکن میرا ایک مقصد اور ہے، جس کے لئے میں نے آپ سب کو زحمت دی ہے۔''

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''میں .... میں بھی ایک تنظیم بنانا چاہتا ہوں۔'' اس نے دھماکا کیا۔ فضا پھر کشیدہ سی ہوگئی۔ وہ سب اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں شاید وہ کوئی سیاسی شعبدہ گر تھا جس کے اپنے کچھ مفادات بھی تھے۔

''اس تنظیم کا نام ہے، انجمن محبان پاکستان۔'' اس نے کہا۔'' ہر وہ شخص جو پاکستانی ہے، اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ اس انجمن کا مقصد ہے حب الوطنی کا پرچار، ایک دوسرے سے محبت، نفرت کی نفی اور ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی، اس انجمن کا نعرہ ہے۔ پاکستان زندہ باد، اس کے ممبروں کی تعداد ملک کی آبادی کے مساوی ہونا چاہئے۔ آپ سب حضرات اس انجمن کے بنیادی ارکان ہیں۔ اس کی ممبر شپ کو پھیلانا ہم سب کا بنیادی فرض ہے، یہ ہر پاکستانی کی انجمن ہے۔ بولیے کیا کہتے ہیں آپ لوگ؟''

جواب میں صرف ایک ہی نعرہ سنائی دیا۔ اسلام زندہ باد .... پاکستان زندہ باد۔

مسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نفرتوں کی تند ہوا میں محبتوں کا دیا جل اٹھا تھا۔

انجمن کے لئے عہدیداروں کا انتخاب بھائی چارے اور یک جہتی کی فضا میں ہوا۔ تمام لوگ کے اصرار کے باوجود مسلم نے کوئی بھی عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بستی پر سے خوف کے بادل چھٹ چکے تھے۔

O----------☆----------O

وسائل کی کمی کے باوجود انجمن محبان پاکستان کی رکنیت میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ متعدد بستیوں میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ دوسری طرف شہر میں زندگی میں اپنے معمول پر واپس آتی لگ رہی تھی۔

شہناز رات کی ڈیوٹی کر کے واپس آئی۔ فاطمہ اس کے لئے ناشتا بنانے گئی۔ وہ خاموشی سے گل دان کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے رات کے باسی پھولوں کی بڑی نزاکت سے اپنی انگلیوں سے سہلایا۔ پچھلی بار مسلم سے جو ملاقات ہوئی تھی، اس نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ اس سے بچنا نہیں چاہتی تھی، اس سے دوری کی خواہاں نہیں تھی، وہ کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ ماں کو وہ کہانی سنا دے جو مسلم نے اسے سنائی تھی، مسلم کی جیون کہانی۔

اس وقت ان پھولوں کو سہلاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ آج ہر خوف سے بے نیاز ہو کر زبان کھولے گی۔

باورچی خانے میں توے پر پراٹھا ڈالتے ہوئے فاطمہ بھی مسلم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مسلم اسے اچھا تو شروع ہی سے لگتا تھا لیکن جب سے اس نے محلے کی نفرتیں دور کی تھیں، اس کی محبت دو چند ہوگئی تھی۔ اب وہ اس کی خاطر اپنے ہر مطالبے سے دستبردار ہونے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی۔

ناشتے کے دوران شہناز ماں سے بات کرنے کا سوچی رہی لیکن بات اس کے لبوں پر آکر رک جاتی تھی۔ اسے اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ماں خود اس سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔

فاطمہ نے فیصلہ کیا کہ شام کو شہناز کے ڈیوٹی پر جانے سے پہلے اس سے بات کرے گی۔ شہناز کو ناشتا کرتا چھوڑ کر، وہ سودا لینے چلی گئی۔ شہناز نے ٹھیک طرح سے ناشتا بھی نہیں کیا۔ سے وہ رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ آنگن میں نکل آئی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پردے کے پیچھے کھڑے ہوئے اسے چند ہی لمحے ہوئے ہوں گے کہ مسلم کی جانی پہچانی چاپ سنائی دی۔ شہناز نے پردے میں جھری بنائی۔ وہ ہمیشہ کی طرح نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ شہناز نے بھی ہمیشہ کی طرح جسم و جان کے تمام ارتکاز کے ساتھ خاموش التجا کی.......... نظریں اٹھاؤ، ادھر دیکھو، مگر ہمیشہ کی طرح مسلم کی نظریں جھکی رہیں۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کوئی پردے کے پیچھے سے اسے کتنی محبت سے دیکھ رہا ہے۔

نہ جانے کیوں اس روز شہناز کا جی چاہا کہ پردہ اٹھائے اور اسے سلام کرے لیکن سامنے ہی شرفو کی دکان تھی اور وہ سدا کی بزدل تھی۔ لہٰذا دل مسوس کر رہ گئی۔ البتہ اس کی جھنجلاہٹ اور سوا ہوگئی۔ آخر اس میں جرات کا فقدان کیوں ہے؟ کیا یہ حیا کے منافی ہے، وہ

سوچتی اور کڑھتی رہی۔

وہ کمرے میں واپس چلی آئی اور بستر پر دراز ہوگئی۔ عام طور پر رات کی تھکی ہاری، و
بستر پر گرتے ہی سو جاتی تھی لیکن اس روز اسے کوشش کے باوجود نیند نہ آئی۔ تاہم وہ لیٹ
رہی۔ کم از کم تھکن تو دور ہو جائے۔ شام کو وہ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ فاطم
نے چور لہجے میں اس سے کہا۔ "مسلم کے متعلق کیا خیال ہے بیٹی؟"

اس نے چونک کر ماں کو دیکھا۔" وہ بہت اچھے ہیں لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں امی؟"

"مجھے احساس ہوگیا ہے کہ میں نے بہت بے بنیاد بات کی وجہ سے تمہارے اور اس ک
.... دونوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔" فاطمہ نے شرم ساری سے کہا۔

شہناز کے لبوں پر پڑے قفل بھی ٹوٹ گئے۔ اس نے ماں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو مسا
نے اسے اپنے بارے میں بتایا تھا۔

فاطمہ خاموشی سے سنتی رہی پھر اس کے چپ ہونے کے بعد بولی۔ "فکر نہ کرو۔ آج
گل دستہ لائے گا تو میں اس سے بات کروں گی، میں اس سے معذرت کروں گی اور تم بھی مج
معاف کر دینا بیٹی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں امی۔" شہناز ماں سے لپٹ گئی۔ مہینوں بعد وہ خود کو ہلکا پھ
محسوس کر رہی تھی، دل سے ہر بوجھ اٹھ گیا تھا۔

O============☆============O
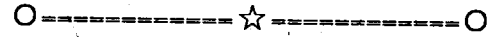
اسی شام گھر واپس آنے سے پہلے مسلم پھول والے کی دکان پر کھڑا تھا۔ پھول والے
مسکرا کر اس کی خیریت پوچھی اور اس کے لئے مخصوص قسم کا گل دستہ بنانے میں مصرو
ہوگیا۔ مسلم خاموش کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد پھول والے نے گل دستہ اس کی طر
بڑھایا۔ اس نے جیب سے پیسے نکال کر دیے اور وہاں سے چل دیا۔ گل دستہ اس کے ہاتھ
تھا۔

وہ چند ہی قدم چلا ہوگا کہ زبردست دھماکا ہوا۔ زمین ہل کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے سا
سے گرد و غبار کا طوفان اٹھتا دکھائی دیا اور پھر انسانی چیخیں۔ وہ محض چیخیں نہیں تھیں، درحقیق
کہرام مچ گیا تھا۔ وہ صدر بازار کے لئے ایسا وقت تھا جب وہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔
میں عورتوں اور بچوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوتی تھی۔

اس نے جلدی سے گل دستہ پینٹ کی جیب میں ٹھونسا اور اس طرف لپکا۔

اس وقت دوسرا دھماکا ہوا اور یہ دوسرا دھماکا پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ اس بار تباہی
قریب نظر آئی۔ کئی عمارتوں میں آگ لگ گئی تھی۔ قریب ہی پارک کی گئی کاروں میں بھی
لگ گئی تھی دیکھتے ہی دیکھتے جلتی ہوئی کاروں کی ٹنکیاں پھٹنے لگیں، یہ اور زیادہ تباہ کن تھا۔
سامنے ہی بوہری بازار والی گلی تھی، یہ پورا علاقہ شاپنگ ایریا تھا، وہ پوری جان سے

جلتی ہوئی کاروں سے شعلے اڑتے لپکتے محسوس ہو رہے تھے، وہ کسی بات کی پروا کئے بغیر بھاگتا
رہا۔ کئی بار شعلے اسے چھو کر گزرے لیکن اسے دکانوں میں پھنسے ہوئے لوگوں، عورتوں اور
بچوں کے سوا کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔

وہ ایک دکان کے سامنے ٹھٹکا۔ دکان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اندر سے روح فرسا چیخیں
سنائی دے رہی تھیں۔ ان چیخوں میں مردانہ اور زنانہ کی کوئی تخصیص نہیں تھی، وہ چیخیں صرف
موت کی قربت کی گواہی دے رہی تھی۔

وہ دیوانہ وار دکان میں گھس گیا، وہ بہت کربناک لمحے تھے۔ اس نے موت کو یوں سرعام
رقص کرتے، لوگوں کو سمیٹتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دکان کے منظر نے اسے دہلنے کا موقع بھی
نہیں رہا۔ وہ تو وقت عمل تھا۔

اس نے دکان کا جائزہ لیا۔ دکان میں موجود بیشتر افراد مر چکے تھے۔ جگہ جگہ بکھرے
ہوئے اعضا کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ دکان میں کم از کم سو افراد موت سے ہمکنار ہوئے ہیں
حالانکہ دکان میں اتنے افراد کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایک عورت، دو بچے اور دو مرد فرش پر
پڑے سسک رہے تھے ان کی حالت اتنی خراب تھی کہ کراہنا بھی ان کے بس میں نہیں تھا۔
کسی کا ہاتھ، کسی کا پاؤں اڑ چکا تھا۔ ان کے چہرے اور جسم لہولہان تھے۔

مسلم نے پہلے بچوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا پھر وہ عورت کو دکان سے نکال لایا۔
مردوں کو اٹھانا، البتہ دشوار مرحلہ تھا پھر بھی اس نے کوشش کی۔ اس وقت اس کے جسم میں نہ
جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اس نے ایک مرد کو بہ آسانی کندھوں پر اٹھایا لیکن اسے باہر
لاتے لاتے وہ بری طرح ہانپ گیا پھر وہ دوبارہ اندر گیا........ دوسرا مرد بے حد جان دار تھا۔ نیم
جان ہونے سے اس کے وزن میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، وہ کوشش کے باوجود اسے نہ اٹھا
سکا۔ گھسیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ زخمی شخص کی چیخیں نکل گئیں۔

اسے باہر لانے کے بعد مسلم دوبارہ دکان میں گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے جائزہ لیا لیکن
دکان میں موجود تمام لوگ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکے تھے وہ باہر چلا آیا۔ اس کے کپڑے
خون میں لت پت ہو چکے تھے۔

دل گرفتگی کے ان لمحوں نے ہی اسے زندگی کی سب سے بڑی مسرت دی، بے پناہ دکھ
میں ڈوبی ہوئی مسرت، امدادی کارروائیاں شروع ہوگئی تھیں۔ لوگ آفت زدگان کی مدد کے لئے
بھاگے بھاگے پھر رہے تھے لیکن ان میں بیشتر عام شہری تھے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ پولیس کے
لوگ امدادی کاموں میں مصروف نظر نہیں آ رہے تھے پھر فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آئیں، اس کے
بعد ایمبولینس گاڑیوں کا تانتا بندھ گیا۔ سامنے والی غیر متاثرہ سڑک پر ہنگامی کیمپ لگا دیا گیا۔
لوگوں سے خون کا عطیہ دینے کی اپیلیں کی جانے لگیں۔ نوجوان لڑکے متاثرہ علاقے سے زخمیوں
کو نکال نکال کر ایمبولینس گاڑیوں تک پہنچانے لگے۔ اسی دوران وہ کیمپ جا کر خون کا عطیہ بھی

دے رہے تھے۔

مسلم نے جن زخمیوں کو دکان سے نکالا تھا' انہیں ایمبولینس تک پہنچا دیا گیا۔ مسلم نے جلدی سے خون دیا اور واپس آیا۔ اب وہ دوسری دکانوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

اسی دوران اس نے جیولری کی ایک دکان سے ایک پولیس مین کو نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں پر کسی زخمی شخص کا وجود نہیں تھا بلکہ ان ہاتھوں میں زیورات کے ڈبے تھے۔ مسلم کا خون کھول کر رہ گیا' وہ تیزی سے پولیس مین کی طرف بڑھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟" مسلم نے گرج کر پوچھا۔

"سامان نکال رہا ہوں۔"

"لعنت ہو تم پر' تمہیں سامان کی پڑی ہے' زخمیوں کی مدد کا خیال نہیں آیا تمہیں۔" وہ دہاڑا۔

"اوئے تم ہو کون' خدائی فوج دار ہو' مجھے حکم دینے کا کیا حق ہے تمہیں۔" پولیس مین نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"ہاں' میں ایک عام شہری ہونے کے باوجود تمہیں حکم دے سکتا ہوں۔ تم خادم ہو ہمارے' عوام کے خادم۔"

"میں تمہیں ابھی پکڑ کر اندر کرتا ہوں۔ مجھے تو تم مشکوک آدمی لگتے ہو۔ ہوسکتا ہے دھماکے میں تمہارا ہی ہاتھ ہو۔"

"ہاں اور تم کیا کرو گے۔" مسلم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ساری عمر یہی تو کیا ہے تم نے۔ اپنے فرض سے ہمیشہ منہ موڑا ہے اور معصوم لوگوں پر دھونس جمائی ہے۔ بے قصور لوگوں کو شک میں گرفتار کرکے خانہ پری کرتے رہے ہو۔"

"ٹھہرو' میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔" پولیس والا جارحانہ تیور لئے اس کی طرف بڑھا۔

اسی وقت ایک اور دھماکا ہوا۔ مسلم کو بس اتنا احساس ہوا کہ کوئی چیز پوری قوت سے اس سے ٹکرائی ہے اور وہ فضا میں اڑ رہا ہے۔ اس کے لبوں پر بے اختیار کلمہ آگیا پھر اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا گیا' اگر وہ چند لمحے مزید ہوش میں رہتا تو اسے یہ جان کر خوشی ہوتی کہ اس کے ہم وطنوں نے حق ادا کر دیا ہے۔ کیمپ سے اپیل کی جا رہی تھی کہ عطیات کی صورت میں ضرورت سے بہت زیادہ خون اکٹھا ہوگیا ہے۔ اب خون کے عطیے کی نہیں۔ لیکن بپھرے ہوئے جوان اس کارِ خیر سے محرومی قبول کرنے پر تیار نہیں تھے وہ خون کا عطیہ دینے پر مُصر تھے۔

اسی شام شہر کی کوئی بستی ایسی نہیں تھی جس کے نوجوانوں کا گروپ صدر میں امدادی کاموں میں مصروف نہ ہو۔

O=========== ☆ ===========O

ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ بھی چل بسا۔" اس نے آزردگی سے کہا۔

شہناز نے مرنے والے کو دیکھا۔ اس کے کپڑے خون میں یوں لت پت تھے کہ کپڑوں کے رنگ کا پتا چلنا ناممکن تھا۔ اس کا چہرہ بھی ناقابل شناخت تھا۔ پھر اسے مرنے والے کی پینٹ سے کوئی چیز جھانکتی دکھائی دی' وہ جھکی اور اس نے پینٹ کی' جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ گل دستہ نکال لیا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا' وہ گل دستہ ہاتھ میں پکڑے سیدھی ہوئی تو اس کا جسم لرز رہا تھا۔

ڈاکٹر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ بے چارہ نہ جانے کس کے لئے گل دستہ لے جا رہا تھا۔

شہناز کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی گل دستے کو دیکھتی اور کبھی مرنے والے کو۔ ڈاکٹر دوسرے زخمیوں کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"سسٹر! ہمیں بہت کام کرنے ہیں۔" اس نے شہناز کو یاد دلایا۔

"مجھے احساس ہے ڈاکٹر۔" شہناز نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میں ابھی آئی' ٹائلٹ جانا ہے مجھے۔"

ڈاکٹر نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور زخمیوں کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔

شہناز گل دستہ ہاتھ میں لئے تقریباً بھاگتی ہوئی استقبالیہ تک پہنچی۔ اس نے گل دستہ کاؤنٹر کے پیچھے رکھا اور وارڈ کی طرف واپس چل دی' جہاں نہ جانے کتنے زخمیوں کو اس کی ضرورت تھی۔ مسلم کی لاش مردہ خانے لے جائی جا چکی تھی۔

وہ اس کے لئے بہت کڑا وقت تھا۔ اسے اپنا فرض پورا کرنا تھا لیکن دل و دماغ طوفان کی زد میں تھے' وہ اپنا فرض پورا کرتی رہی لیکن ان سوچوں سے نہ بچ سکی' جنہوں نے اس کے ذہن پر یلغار کر دی تھی۔ سوچوں کا سیلاب تھا جو اسے بہائے لئے جا رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ زخمیوں کو طبی امداد فراہم کرنے میں مصروف تھے۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مسلم تھا۔ لیکن وہ گل دستہ! نہیں' وہ مسلم ہی تھا۔ اسے کچھ دیر پہلے کی ماں کی گفتگو یاد آگئی۔ ماں نے کہا تھا......... اس نے آنکھیں بھینچ کر بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو روکا۔ اب ماں مسلم کی......... اس کے گل دستے کی منتظر ہوگی تاکہ اس سے معذرت کرسکے' اپنے غلط اندازِ فکر کی تلافی کرسکے۔ لیکن اب وہ منتظر ہی رہے گی۔ اب اسے معذرت کا......... تلافی کا کوئی موقع نہیں ملے گا' وہ تو......... وہ تو چلا گیا۔

پھر وہ مسئلہ اس کے شعور کی سطح پر ابھر آیا جو لاشعور میں دیر سے چبھ رہا تھا۔

مسلم کی لاش ناقابل شناخت تھی' اگر اس کی جیب میں وہ مخصوص گل دستہ نہ ہوتا تو وہ خود بھی اسے شناخت نہ کرپاتی۔ گویا اب اس کے سوا مسلم کی لاش کو کوئی شناخت نہیں کرسکتا

تھا۔ خدا کا شکر ہے .... دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی شناخت کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی ہے۔

وہ لرز کر رہ گئی۔ سدا کی بزدل تھی وہ .... اور اس کی بزدلی اس کڑے وقت میں بھی پوری قوت سے ابھری تھی۔

اگر وہ اس گل دستے کی بنیاد پر اسے شناخت کرتی ہے تو .... تو لوگ کیا کہیں گے۔ اسے کیسی نظروں سے دیکھیں گے۔ پوچھیں گے کہ وہ کون تھا اس کا؟ اور اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ پھر لوگ کیا کیا سوچیں گے' وہ گل دستہ بھی ایک طعنہ بن کر رہ جائے گا لیکن اگر اس نے اسے شناخت نہ کیا تو .... تو وہ گمنامی میں 'لاوارثوں کی طرح دفنا دیا جائے گا وہ .... جو مسلم پاکستانی تھا' اسے کوئی شناخت نہیں کرے گا' نہیں.......... یہ تو بہت بڑا ظلم ہوگا .... ناانصافی ہوگی۔ وہ عمر بھر اپنی شناخت کے معاملے میں ڈٹا رہا تھا۔ اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونی چاہئے' وہ بے شناخت کیوں رہے مرنے کے بعد .... وہ صرف ایک انسان .... اچھا انسان ہی تو نہیں تھا' وہ تو ایک بہت بڑی' بہت محترم علامت تھا۔

وہ کام کرتی اور سوچتی رہی' وہ کش مکش بہت سنگین تھی۔ اسی الجھن میں کئی گھنٹے گزر گئے۔

"سسٹر شہناز' اب تم کچھ دیر آرام کر لو۔" ڈاکٹر نے اسے چونکا دیا۔ "بہت برا حال ہو رہا ہے تمہارا۔"

"تھینک یو ڈاکٹر.......... لیکن میری ضرورت ابھی موجود ہے۔"

"میں تمہیں جانے کو تو نہیں کہہ رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے بے حد شفقت سے کہا۔ "جاؤ' آدھا گھنٹا آرام کر لو پھر آجانا .... جاؤ' اٹ از مائی آرڈر۔"

وہ استقبالیہ کی طرف چل دی۔ پھر اچانک ہی اسے اپنی الجھن سے نجات مل گئی۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ عمر بھر وہ بزدلی کا ثبوت دیتی آئی ہے لیکن اب نہیں چلے گا یہ سب کچھ' لوگ کچھ نہیں کہیں گے' کہیں بھی تو کہنے دو۔ مسلم کی لاش کی شناخت زیادہ ضروری ہے۔

وہ تیزی سے پلٹی اور مردہ خانے کی طرف بھاگی۔

مردہ خانے میں بہت ہجوم تھا وہ راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ اسے محلے کا لڑکا رشید نظر آیا۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ شہناز نے بڑی نرمی سے اس کے کندھے پر تھپکی دی "کیا بات ہے رشید؟"

رشید نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "مسلم .... مس .... لم .... بھا.......... ئی ...." وہ پھر بلک بلک کر رو دیا۔

شہناز حیران رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ تو یہاں اپنی آمد کا سبب بھی

بھول گئی۔ کیا ہوا مسلم کو؟" اس نے پوچھا۔

روتے بلکتے رشید نے نیچے مسلم کی لاش کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ شہناز نے لاش پر نظر ڈالی پھر ادھر ادھر دیکھا۔ محلے کے کچھ اور لڑکے بھی وہاں موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "کیا ہوا؟" اس نے ان میں سے ایک سے دریافت کیا۔

"یہ .... یہ مسلم بھائی ہیں.......... اپنے مسلم بھائی۔" لڑکے نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نے کیسے پہچانا؟" شہناز کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"وہ ہمیشہ کہتے تھے نا کہ مسلم پاکستانی ہونا میری شناخت ہے۔" لڑکے نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔ "ان کے گلے میں ہمیشہ حمائل شریف ہوتی تھی اور جیب میں پاکستانی پرچم۔ چھوٹے سے پاکستانی پرچم والا لاکٹ بھی انہوں نے خاص طور پر بنوایا تھا۔"

"باجی ....لا .... لاش ہمیں .... دلوا دیں گی نا آپ؟" ایک لڑکے نے اٹکتے اٹکتے کہا۔

"ہاں .... کیوں نہیں۔" شہناز نے کہا اور پلٹ کر باہر نکل آئی۔ میں خواہ مخواہ پریشان ہوتی رہی۔ وہ دیوانہ وار سوچ رہی تھی۔ حالانکہ اس نے زندگی میں کبھی مجھے پریشان نہیں کیا۔ شرمندگی کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں سمجھی تھی اسے شناخت کرنا میری ذمے داری ہے' میری محبت کی ذمے داری ہے لیکن میں ڈرپوک تھی۔ اس کی محبت پر شرمندہ .... حالانکہ اس کی شناخت کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے لئے حوالے ہی ایسے جاوداں منتخب کئے تھے' اسی لئے تو ان بے چہرہ لاشوں کے انبار میں بھی اسے شناخت میسر آگئی۔ میری محبت اسے پہچان نہ دے سکی لیکن مذہب کی .... وطن کی محبت نے اسے پہچان دے دی۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے وہ استقبالیہ کاؤنٹر تک پہنچ گئی۔ کاؤنٹر کے پیچھے جا کر اس نے لہو میں تر' مسلے ہوئے پھولوں کا گلدستہ اٹھایا اور سینے سے لگا لیا پھر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب تک اس نے نہ جانے کس طرح اپنے غم کے آگے ضبط کا بند باندھے رکھے تھا مگر اب وہ اپنی محبت کا سوگ منا سکتی تھی' اپنے ارمانوں کا ماتم کر سکتی تھی' اب وہ رو سکتی تھی لیکن کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ آنسو کس کے لئے ہیں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

O============☆============O

اگلے روز مسلم پاکستانی کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ وہ خود بھی دیکھتا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ چھوٹی سی بستی کا باسی تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس کے جنازے میں پورا شہر شرکت کے لئے آگیا ہے۔ بستی کے لوگ تو بلک بلک کر رو رہے تھے۔

فاطمہ اور شہناز نے پردہ اٹھا کر اس کے جنازے کو گزرتے دیکھا۔ فاطمہ کا حال بالخصوص

بہت برا تھا۔ پچھتاوا ہی اتنا بڑا تھا۔ شہناز نے نم آنکھوں سے اسے آخری بار گلی سے گزرتے دیکھا۔ "خدا حافظ .... فی امان اللہ۔" وہ بڑبڑائی پھر وہ پلٹ کر کمرے کی طرف بھاگی اور بستر پر جاگری۔

دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنسوؤں کے ساتھ آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ اس کی نظریں خود بہ خود خالی گل دان کی طرف اٹھ گئیں۔ اب یہ گل دان خالی خالی' اجڑا اجڑا ہی رہے گا.......... میرے دل کی طرح' اب ان میں کبھی پھول نہیں سجیں گے۔ اب کون پھول لائے گا..........؟ کوئی نہیں .... کوئی نہیں۔

O============☆============O

اس بڑے قبرستان میں ایک قبر ایسی ہے' جس کے اطراف میں پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے آپ کو ٹھنڈک کا احساس ہوگا.......... ٹھنڈک اور طمانیت کا۔ آپ کا جی چاہے گا کہ وہاں ٹھہر کر فاتحہ پڑھیں۔ آپ کتبے پر نظر ڈالیں گے۔

"یہاں مسلم پاکستانی ابدی نیند سو رہا ہے' اسے چاروں صوبوں نے پالا اور ایثار پیشہ مہاجروں نے اسے تعلیم و تربیت دی۔ اس نے ساری زندگی کسی سے نفرت نہیں کی' کسی کو دکھ نہیں پہنچایا' یہ سراپا محبت تھا۔ اس کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھتے وقت' اس کی مغفرت کی دعا کرتے وقت جان لیجئے کہ سب سے اچھی پہچان مسلم پاکستانی ہونا ہے' اس سے ہٹ کر ہم سوچیں تو قدم بہ قدم خود کو چھوٹا اور محدود کرتے چلے جاتے ہیں' یہ شخص انجمن محبان پاکستان کا بانی تھا' جس کے رکن ہم سب ہیں' تسلیم کریں یا نہ کریں۔

قبرستان سے نکل کر آپ اس مہربان اور مہمان نواز شہر میں گھومیں گے تو آپ کو طمانیت کا احساس ہوگا' یہ کشادہ دامن' کشادہ دل شہر آپ کے لئے اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں کا مظہر ہے .... اللہ جو رزاق و رزاق ہے۔

اسی مہربان اور مہمان نواز شہر کے کسی ہسپتال میں .... اس کی کسی بستی کے ایک کچے گھر میں آپ کو کوئی اجڑی لڑکی نظر آ جائے تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے گا۔ وہ لڑکی بھی ایک قبر ہے' اس کے دل کا کتبہ پڑھئے گا' جس پر خوشبو میں رچی ہوئی یادیں لکھی ہیں .... آنسوؤں کی روشنائی سے۔

اور اس شہر سے جاتے وقت دعا کیجئے گا کہ اللہ اسے اپنی رحمتوں اور امان کے سائے میں رکھے اور ہمیں .... ہم سب کو اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بننے کی توفیق عطا فرمائے..........

وہ عیدالفطر کا مبارک دن تھا!

لیکن سیکولر بھارت کے مسلمانوں کے لئے عمومی اور مراد آباد کے مسلمانوں کے لئے خصوصی طور پر وہ روز قیامت ثابت ہوا۔ کشیدگی تو پہلے سے چل رہی تھی مگر عید کی صبح کینہ پرور مکار اور بزدل ہندوؤں نے حکومت کی سرپرستی پر بربریت کی انتہا کر دی۔ عید کی نماز پڑھنے والے مسلمانوں پر سؤر دھکیل دیے گئے۔ بھگدڑ مچی تو نماز کے شوق میں آئے ہوئے بے شمار ننھے اور معصوم بچے کچلے گئے۔ اس افراتفری میں اچانک پولیس نے فائر کھول دیا۔ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اس روز شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا۔ اس کے فوراً بعد پورے بھارت میں مسلم کش فسادات شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ پورے بھارت کا چہرہ شہیدوں کے خون سے سیاہ ہو گیا تھا۔

اخبارات کی دو روزہ چھٹی کی وجہ سے پاکستان میں صورت حال واضح نہیں تھی۔ مگر ریڈیو اور ٹی وی کی غیر واضح خبروں نے بھی ملک میں کہرام مچا دیا تھا۔ دو دن کے وقفے کے بعد اخبارات آئے تو صورت حال بہت سنگین ہو گئی۔ ہر آنکھ خون کے آنسو رو رہی تھی' ہر شخص مشتعل تھا۔

فطری طور پر پاکستان میں اس کا شدید رد عمل ہوا۔ ملک بھر میں بھارت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ بھارتی وزیراعظم کے پتلے چلائے گئے۔ پاکستانی حکومت نے حسب معمول سرکاری سطح پر حکومت ہند سے احتجاج کیا اور مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے' ان کی نسل کشی کو فوری طور پر روکنے کی اپیل کی۔ حکومت ہند نے بھی معمول کے مطابق فسادات کو بھارت کا اندرونی معاملہ قرار دے کر اس احتجاج کو مسترد کر دیا۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا۔

O ============ ☆ ============ O

اس شام منصور نیٹ پریکٹس کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس روز بھی بستی کے چھوٹے بڑے' راستے میں اسے

روکتے' سلام کرتے اور حال پوچھتے.......... کیا حال ہے منصور بھائی؟ منصور میاں' کیسے ہو؟ وہ اس بستی کا بہت محترم نوجوان تھا۔ علاقے کے بچے اور لڑکے اس پر جان چھڑکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ بستی کے معمر اور بڑے لوگوں میں ایسے لوگ بھی تھے' جو اسے منصور بھائی کہہ کر مخاطب کرتے تھے حالانکہ اس کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ محلے کی عورتیں بھی اسے اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔ لیکن عزت عام طور پر بے سبب نہیں ملتی۔ منصور اس بستی میں ایک روشن پس منظر رکھتا تھا۔ اس کے مرحوم والد منظور صاحب نے اس بستی کی بڑی خدمت کی تھی۔ پوری بستی ان کی احسان مند تھی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ہندوستان سے آکر اسی بستی میں آباد ہوئے تھے۔ اس وقت بمشکل دس جھونپڑیاں تھیں۔ بجلی اور دیگر سہولتوں کا دور دور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ منظور صاحب علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ تدریس ان کا شعبہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان میں سب سے اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم ہے۔ یہ مستقبل کی تعمیر کا مسئلہ تھا لیکن ان کے پاس وسائل نہیں تھے۔ گھر' زمین' جائیداد.......... سب کچھ وہ ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے اور یہاں ایک جھونپڑی میں رہ رہے تھے۔ قابلیت کی وجہ سے روزگار ان کے لیے مسئلہ نہیں بنا۔ انہیں ایس ایم کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ مگر ان کے مقاصد اور عزائم کچھ اور تھے۔ انہوں نے کبھی انہیں فراموش نہیں کیا۔

بستی پھیلتی چلی گئی اور ایک گنجان آبادی کا روپ دھار گئی۔ حالات ذرا بہتر ہوئے تو جھونپڑیاں' کچے مکانوں میں اور کچے مکان پختہ مکانوں میں تبدیل ہو گئے۔ بستی میں سرکاری اسکول بھی نہیں تھے۔ بچے اور لڑکے دن بھر گلیوں میں کینچے اور گلی ڈنڈا کھیلتے نظر آتے' مردوں کو فکر روزگار سے فرصت نہیں تھی کہ انہیں یہ تباہی نظر آتی۔ وہ تو سرزمین پاک پر اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ایسے میں منظور صاحب نے علاقے کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں تعلیم کی اہمیت اور اس بہت بڑی محرومی کا احساس دلایا' جو خدانخواستہ پاکستان کے مستقبل کو تباہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں کوچنگ سینٹر کھولنے اور بچوں کو تعلیم دینے کا پروگرام بنایا۔ اس کوچنگ سینٹر کو انہوں نے اللہ کی تائید سے دس سال میں تعمیر پاکستان اکیڈمی میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے انتھک اور بے لوث محنت کی۔ اپنا سب کچھ اس میں لگا دیا۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنا تمام وقت اسکول کو دیا اور اسے کچھ کا کچھ بنا دیا۔ اب تعمیر پاکستان ہائی اسکول کا شمار کراچی کے ممتاز ترین اسکولوں میں ہوتا تھا۔ اس کے اولڈ بوائز نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور اپنی اپنی اہلیت کے مطابق ملک و قوم کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہے تھے۔ وہ برملا اعتراف کر رہے تھے کہ منظور صاحب نہ ہوتے تو وہ اس وقت مزدوری کر رہے ہوتے۔ ان میں جو صاحب حیثیت تھے' وہ اسکول کی ترقی کے لئے

امداد دیتے رہتے تھے۔ ضرورت مندوں کے بچوں کو اسکول میں نہ صرف مفت تعلیم دی ج
تھی بلکہ انہیں کتابیں اور دیگر ضروری چیزیں بھی فراہم کی جاتی تھیں۔ وظائف اس کے عا
تھے۔ اب اسکول ایک ٹرسٹ کے زیر اہتمام چل رہا تھا۔ ٹرسٹ کی منتظم اعلیٰ منظور صاحب
بڑی بیٹی صفیہ تھی۔

دو سال پہلے منظور صاحب کا انتقال ہوا تھا تو لگتا تھا کہ بستی یتیم ہو گئی ہے۔ ہر گھر
سوگ تھا۔ منصور کو پہلی بار اپنی خوش بختی کا احساس ہوا تھا۔ باپ کی کمی کی تلافی تو ممکن
نہیں تھی لیکن وہ تنہا نہیں تھا۔ بستی کے ہر بڑے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ بستی کے
گھرنے اسے ماں کی آغوش فراہم کی تھی، جس کی گرمی اسے یاد ہی نہیں تھی......... ملی
نہیں تھی۔ اس کی چار بہنیں تھیں اور چاروں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ باپ کی مو
کے بعد بہنوں نے بہت چاہا کہ منصور ان کے ساتھ رہ جائے لیکن منصور نے گوارا نہ کیا۔

منظور صاحب تمام انتظام کر کے گئے تھے۔ ان کی موت کے وقت منصور نے این
ڈی میں انجینئرنگ کے پہلے سال میں داخلہ لیا تھا۔ منظور صاحب کی وصیت کے مطابق ا
اسکول کے ٹرسٹ سے اپنے تعلیمی اور دیگر اخراجات کے لئے اس وقت تک رقم ملنا تھی، ج
تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا۔

یہ تھا منصور کا پس منظر اور بستی والوں کا وہ احترام، جو اس کے والد نے ورثے
چھوڑا تھا۔ مگر وہ خود ایسا لڑکا تھا کہ اس نے اس احترام کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ
خوش اخلاق، خوش گفتار، خوش اطوار اور صاحب کردار لڑکا تھا۔ اس نے بھی بستی والو
ایک احسان کیا تھا......... باپ سے بالکل مختلف......... لیکن اتنا ہی اہم۔ اسے بچپن ہی
کرکٹ کا شوق تھا، اِدھر اُدھر بیٹھنے والے لڑکوں نے اسے کرکٹ کی طرف لگا دیا۔ وہ جانتا تھ
لڑکوں کے پاس فرصت ہوتی ہے۔ ادھر ادھر بیٹھتے بیٹھتے وہ مختلف قسم کی برائیوں کی طرف ما
ہو جاتے ہیں۔ لفنگے پن کی ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے۔ اس نے ایک کرکٹ ٹیم بنائی۔ پریکٹس
اہتمام کیا۔ ٹیم میں ڈسپلن کی اہمیت پر زور دیا۔ ہار جیت کا غیر اہم ہونا ثابت کیا۔ علاقے میں
بھی کرکٹ ٹیمیں تھیں لیکن اس کی ٹیم واحد ٹیم تھی جس کا کوئی لڑکا کبھی بدتمیز نہیں دیکھا
وہ پریکٹس پر بچوں کو بھی لے جاتا تھا تاکہ ٹیم کو ٹیلنٹ ہمیشہ ملتا رہے۔ ٹیم کے کھلاڑیوں
والدین اپنے لڑکوں میں مثبت تبدیلی کی وجہ سے اس کے احسان مند تھے۔ یہی نہیں، اس
اپنے گھر میں چند ان ڈور گیمز کا اہتمام بھی کیا۔ وہ کھلا گھر تھا لیکن پاس پڑوس کے لوگوں کو
لڑکوں کے جمع ہونے سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ لڑکوں نے کبھی شور شرابا نہیں کیا۔ کبھی
کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کبھی کسی گھر میں بیٹے کی ضرورت ہوتی تو وہ اِدھر اُدھر تلاش ک
کے بجائے منصور کے گھر چلے آتے۔ یہ ایک اور خوبی تھی۔ غرضیکہ منصور بستی والو
آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔

اس شام وہ لوگ حسب معمول ناگوری ملک ہاؤس پر لسی پینے کے لیے رکے۔ کٹ

لے کر منصور کے گھر جاتے ہوئے انہیں چوک پر لڑکوں کی بھیڑ نظر آئی لیکن وہ کوئی غیر معمولی
ے نہیں تھی۔ چوک سے کچھ لڑکے اِدھر اُدھر چلے گئے۔ باقی منصور کے گھر چلے آئے۔ وہاں
ہ ہر روز منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوتے تھے پھر کچھ لوگ کیرم کھیلنے لگتے، کوئی منصور کے ساتھ
طرنج کی بساط جما لیتا۔

ساڑھے سات بجے کے قریب باہر سے زبردست شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ
ڑکے دروازے کی طرف لپکے مگر اسی وقت باہر سے حمید آگیا۔ اس کے پیچھے فاروق اور نعیم بھی
تھے۔ ان کے چہرے اندرونی ہیجان سے تمتما رہے تھے۔ "کیا بات ہے حمید؟" شطرنج کھیلتے ہوئے
منصور نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"وہ منصور بھائی۔ لڑکوں نے سات نمبر گلی والے ہندوؤں کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا
ہے۔" حمید نے بتایا۔

"تو ہندو یہاں کہاں سے آگئے؟"

"وہ ابراہیم صاحب کا مکان تھا نا......... اس میں آئے ہیں وہ لوگ۔" نعیم بولا۔

"ابھی انہیں یہاں آئے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔" ایک اور لڑکے نے بتایا۔

"یہ تو ثواب کا کام ہے۔" صفدر نے کہا۔ "چلو، ہم بھی ہاتھ بٹائیں۔"

منصور بساط چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ صفدر کی بات سن کر اس نے اسے گھورا۔ "کیا بکواس
کرتے ہو۔ انسانوں کو مارنا ثواب کا کام کب سے ہو گیا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ تو
گھناؤنا فعل ہو گا۔ ہمیں ان کو روکنا چاہئے۔"

"لیکن منصور بھائی، وہاں ہندوستان میں مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے، وہاں تو یہ بات
کوئی نہیں سوچتا"۔ صفدر کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"وہ کافر ہیں......... جاہل ہیں......... روشنی سے محروم۔ کیا ہم خود کو ان کی سطح پر لے
آئیں۔ ہمیں تو ہمارے مذہب نے اعلیٰ اخلاقی اقدار سکھائی ہیں۔ ہمیں تو درگزر اور اقلیتوں
کے ساتھ رواداری کا سبق دیا گیا ہے۔"

"منصور بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سجاد نے کہا۔ کئی لڑکوں نے اس کی تائید میں سر ہلا
دیے لیکن چند لڑکے متذبذب تھے۔

"لیکن ہم ان لوگوں کو کیسے روک سکتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔ وہ باہر کی صورت حال
دیکھ کر آیا تھا۔ "ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

"اور وہ بہت مشتعل ہیں۔" حمید نے بتایا۔

"جلدی کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔" منصور باہر کی طرف لپکا۔

منصور کا گھر تین نمبر گلی میں تھا۔ اسی کے ساتھ سات نمبر گلی تھی۔ درمیان میں بس
ایک سائیڈ اسٹریٹ تھی۔ گھر سے نکلتے ہی انہیں ہجوم نظر آگیا۔ سائیڈ اسٹریٹ پر بھی لوگ جمع
تھے۔ وہ بھیڑ میں گھستے گھساتے ساتویں گلی کے نکڑ پر پہنچے۔ وہ ساتویں گلی کا تیسرا مکان تھا۔ اس

گلی میں کئی عیسائی گھرانے بھی رہتے تھے۔ تیسرے مکان کے سامنے علاقے کے نوجوانوں کا ہج تھا۔ علاقے کا سب سے بڑا بدمعاش رحمت ان میں پیش پیش تھا۔ بات بات پر چاقو نکال لینا ا کا شیوہ تھا لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے محلے میں کسی سے الجھے۔ رحمت اس گھر ک دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ "دروازہ کھول۔ ورنہ ہم دروازہ توڑ دے گا' اور پھر کسی کو نہیں بچ گا۔" رحمت چیخ رہا تھا۔

گلی کافی کشادہ تھی۔ لیکن لوگوں کا ہجوم اتنا تھا کہ چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

"منصور بھائی' یہاں تو رحمت بھی موجود ہے۔" حمید نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ " اسے کیسے روک سکتے ہیں۔ یہاں تو خون خرابا ہو کر رہے گا۔"

"تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو یہیں رک جاؤ۔" منصور نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ا وہ گلی کے دہانے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "ہٹیں ایک طرف مجھے راستہ دیں پلیز۔" وہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ گلی میں ہر گھر کے دروازے عورتیں اکٹھا ہو گئی تھیں۔ عیسائی عورتیں تینوں گھروں کی ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ ان ہمدردیاں ہندوؤں کے ساتھ ہوں گی لیکن آواز اٹھانے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ دبی سرگوشیوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

منصور جگہ بناتا تیسرے گھر کے دروازے کے قریب پہنچا۔ کرکٹ ٹیم کے تمام لڑکے ا کے پیچھے تھے۔ وہ رحمت کی موجودگی اور لڑکوں کے اشتعال کی وجہ سے خوف زدہ تھے لیکن منصور کو تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے کچھ کے نزدیک جو کچھ ہو رہا درست تھا......... اور ان کے خیال میں منصور کا موقف غلط تھا لیکن وہ منصور کا اتنا لحاظ کر تھے کہ یہ بات اس سے نہیں کہہ سکتے تھے۔

یہ لوگ دروازے کے قریب پہنچے تو بات بڑھ چکی تھی۔ بند دروازے کے پیچھے ایک نسوانی آواز نے کہا۔ "تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" لہجے میں خوف تھا۔ "ہمارا قصور کیا ہے؟

"اپنے مردوں کو باہر نکالو۔" رحمت نے للکار کر کہا۔ "ورنہ ہم دروازہ توڑ د گا......... اور پھر کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے پر پوری قو سے لات رسید کی۔

عورت گڑگڑانے لگی۔ اسی لمحے اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ "ماں۔ کوئی فا نہیں۔ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔" اس کے جواب میں عورت گڑگڑا گئی' ساتھ ہی نسوانی آوازیں ابھریں' جو مرد کو رکنے کو کہہ رہی تھیں۔ پھر وہ باقاعدہ بین کر لگیں۔

دروازہ کھلا اور ایک بیس بائیس سالہ نوجوان باہر آیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور پاؤں لرز رہے تھے۔ اسے دیکھ کر منصور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے ذہن میں ہندوؤں تصور تھا' لڑکا اس پر کسی اعتبار سے پورا نہیں اترتا تھا۔ نہ اس کے سر پر چوٹی تھی' نہ پیشا

لک تھا اور نہ ہی اس نے دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ وہ ٹی شرٹ اور پتلون پہنے تھا اور دوسرے کوں جیسا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کم از کم منصور یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔

"تم لوگ ہندو ہو؟" رحمت نے اسے ڈپٹ کر پوچھا۔

"ہہ......... ہہ......... ہا......... ہاں........." نوجوان کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

"نام کیا ہے بے تیرا؟"

"شش......... شش......... شن......... شنکر۔" نوجوان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ لگتا تھا' وہ اپنے پیروں پر اب چند لمحے بھی نہیں کھڑا رہ سکے گا۔

"نام کیا پوچھتے ہو استاد۔ مارو سالے کو۔" آگے کھڑے ایک لڑکے نے کہا اور ساتھ ہی ہندو لڑکے کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا۔ ہندو لڑکا گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی دو لڑکوں نے لاتوں سے اس کی تواضع شروع کر دی۔

اس دوران منصور وہاں پہنچ چکا تھا۔ "ارے......... کیا کرتے ہو۔ دور ہٹو۔ خبردار......... اسے نہ مارو۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس طرف بڑھا۔

لیکن رحمت نے ہاتھ پھیلا کر اسے روک دیا۔ "ان کے حمایتی بن کر آئے ہو بابو؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"رحمت دادا......... انہیں روکو۔ یہ زیادتی ہے۔" منصور نے التجا کی۔

"کافروں کی حمایت کر رہے ہو۔ کیا دین چھوڑ بیٹھے ہو اپنا؟" رحمت نے طنز کیا۔

منصور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "نہیں رحمت دادا۔ جو ہمارے دین نے سکھایا ہے وہی بتانے کے لیے آیا ہوں۔"

"چلے جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں بھی ختم کر دوں گا۔ ہم ان کافروں کی حمایت نہیں برداشت کرے گا' جو مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں........."

اچانک دروازہ کھلا اور تین نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں۔ ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کے پیچھے دو ڈھائی سال کی ایک بے حد خوبصورت بچی روتی ہوئی دروازے پر آئی۔ "بھگوان کے لیے......... بھیا کو نہ مارو۔" بڑی لڑکی گڑگڑائی۔ ادھیڑ عمر عورت دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ بچی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس سہم کر روئے جا رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں زمین پر پڑے بھائی پر ڈھال بن کر چھا گئیں۔

"میں تم سے بنتی کرتی ہوں' اسے چھوڑ دو۔" ادھیڑ عمر عورت نے روتے ہوئے کہا۔

ہندو کو مارنے والے نوجوان لڑکیوں کو ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن لڑکیاں بھائی سے بری طرح چمٹی ہوئی تھیں۔

"رحمت دادا' یہ سب کچھ کروا رہے ہو تم۔ تم تو بدمعاش ہو کر بھی بستی کی ماؤں بہنوں کے محافظ تھے۔" منصور کے لہجے میں عجیب سی گھن گرج تھی۔

"یہ کافر عورتیں بستی کی ماں بہن نہیں ہیں۔" رحمت نے بڑے سکون سے کہا۔

دوسری طرف لڑکیوں اور جارح نوجوانوں میں کشمکش جاری تھی۔

"انہیں روکتے ہو دادا یا یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔" منصور نے بپھر کر کہا۔

لڑکیوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے والے نوجوانوں نے سر اٹھا کر خونخوار نظروں سے منصور کو دیکھا۔ رحمت کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا۔ بستی میں آج تک کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ "او منصور بابو!" وہ غرایا۔ "اپنی کھال میں رہ۔ ماسٹر مرحوم کا خیال نہ ہوتا تو زبان کھینچ لیتا گدی سے ابھی.......... جا.......... چلا جا یہاں سے۔"

"میں نہین جاؤں گا۔" منصور نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "پہلے میری بات سن لو۔ سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ.........."

لڑکیوں سے زور آزمائی کرنے والوں میں سے ایک کو غصہ آگیا تھا۔ "یہ یوں نہیں مانیں گی۔" اس نے سب سے بڑی لڑکی کے بال مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ پھر اس لڑکی کے رخسار پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ہندو عورت چیخ چیخ کر رونے لگی۔ "ہے بھگوان.......... ہے بھگوان.......... دیا کر۔"

"یہ بھی خاموشی سے دیکھ لو گے رحمت دادا!" منصور چلایا۔ "کیسے مسلمان ہو تم؟ اور یہ تمہارے چیلے عورتوں پر ہاتھ اٹھائیں گے۔"

رحمت نے جھک کر اس لڑکے کے تھپڑ رسید کیا اور گرج کر بولا۔ "ہٹ جاؤ یہاں سے۔ انہیں چھوڑ دو۔ ہاتھ روکو۔"

لڑکوں نے سر اٹھا کر رحمت کو حیرت سے دیکھا اور ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمت، منصور کی طرف متوجہ ہوا۔ "اے بابو.......... اب تو اپنی کتھا سنا دے ذرا جلدی سے۔" اس نے کڑے لہجے میں کہا۔ "بول.......... تجھے کیا تکلیف ہے۔"

منصور نے زمین پر پڑے ہندو لڑکے کو دیکھا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ یوں بے بس پڑا تھا، جیسے خود سے کبھی نہ اٹھ سکے گا۔ تینوں لڑکیاں اب بھی اس کی ڈھال بنی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑی اور سب سے چھوٹی کے چہرے فق تھے۔ ان پر لرزہ چڑھا ہوا تھا البتہ منجھلی لڑکی خود پر قابو پائے ہوئے تھی۔ یہی نہیں، اس کی آنکھوں میں آگ سی دہکتی نظر آرہی تھی۔ اس کے انداز میں ہٹ دھرمی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ بہت ضدی لڑکی ہے۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں رحمت دادا، کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، غلط ہے۔" منصور نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

"اور ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ٹھیک ہے؟" رحمت نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔"

اب ہر طرف سناٹا تھا۔ لوگ سانسیں روکے کھڑے تھے۔ عورتوں کی سرگوشیاں بھی

تھم گئی تھیں۔ سب سوچ رہے تھے کہ اب رحمت کا ہاتھ حرکت میں آئے گا۔ اس میں چاقو لہرائے گا اور..........

بھائی پر گری ہوئی منجھلی بہن نے سر اٹھا کر منصور کو دیکھا، اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خوف اور حیرت گھل مل گئی تھی۔

"کیوں۔ وہ جو وہاں نہتے مسلمانوں کو بلا وجہ قتل کر رہے ہیں۔ پولیس اور فوج کی مدد سے.......... وہ ان کے بھائی بند نہیں؟" رحمت نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"وہ ان کے ہم مذہب ہیں۔ لیکن یہ وہ تو نہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا پڑھے لکھے بابو!"

"اچھا رحمت دادا، تم یہ بتاؤ کہ تم یہ سب مسلمان ہونے کے ناتے کر رہے ہو نا؟" منصور نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں غنڈہ سہی۔ لیکن مسلمان ہوں۔" رحمت نے سینہ پھلا کر کہا۔

"ایک بات بتاؤ دادا، ظلم کے خلاف لڑنا جہاد ہوتا ہے نا؟"

"ہاں!"

"ہمارے مذہب نے ہمیں ظلم کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظلم کے بدلے ظلم کرنے کا نہیں۔ مجاہد اور ظالم میں بڑا فرق ہوتا ہے دادا!"

رحمت کے انداز میں پہلی بار بے یقینی جھلکی۔ "لیکن.........."

"میری بات سن لو دادا!" منصور نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نہتے کو قتل کرو گے، عورتوں پر ہاتھ اٹھاؤ گے، کمزوروں کا گھر جلاؤ گے تو کیا یہ جہاد ہوگا؟ نہیں دادا.......... یہ ظلم ہو گا۔ اس سے زیادہ گھناؤنا ظلم، جو بھارت میں ہندو کر رہے ہیں۔ زیادہ اس لیے کہ ہمیں اللہ نے ہدایت کی روشنی دی ہے اور وہ اندھیرے میں ہیں، جاہل ہیں۔"

رحمت کے چہرے پر زلزلے کا تاثر ابھرا۔ منصور کی دلیل نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"میں تمہیں چند باتیں یاد دلانا چاہتا ہوں دادا!" منصور اپنی کہے جا رہا تھا۔ "تم اس دین کامل کے ماننے والے ہو، جو حکم دیتا ہے کہ باپ کے جرم کی سزا اولاد کو نہیں ملے گی۔ تم اس پیغمبر ﷺ کی امت میں سے ہو جنہیں کفار نے ہمیشہ بدترین اذیتیں دیں لیکن آپ ﷺ نے انہیں کبھی بددعا نہیں دی۔ جن پر بے ہدایت لوگوں نے غلاظتیں پھینکیں، پتھر مارے اور راستے میں کانٹے بچھانے کا معمول بنایا اور کسی دن اس معمول میں فرق پڑا تو آپ ﷺ اذیت دینے والوں کے لیے پریشان ہو گئے۔ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ تم ان ﷺ کے امتی ہو رحمت دادا، جو رحمتہ للعالمین ﷺ تھے۔ رحمتہ للعالمین ﷺ کا مطلب سمجھتے ہو۔ تمام عالم کے لیے.......... سب انسانوں کے لیے.......... بلا تفریق مذہب سب انسانوں کے لیے رحمت.........."

رحمت کا چہرہ پسینے میں نہا گیا تھا۔ "بس کرو بابو، تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے لرزتی آواز

میں کہا۔ "تم نے ہمیں بہت بڑے گناہ سے بچالیا۔" پھر وہ ہندو عورت کی طرف مڑا۔ "مائی، ہم کو معاف کرنا۔ ابھی تم یہاں بے کھٹکے رہو۔ رحمت کے ہوتے یہاں کوئی تم کو کبھی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھے گا۔"

"لیکن استاد!" جارح لڑکوں نے احتجاج کیا۔

"بس۔ ابھی چل دو یہاں سے اور اپنا گارنٹی سن لیا نا تم نے۔" رحمت نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "ابھی ان لوگوں کو کبھی تنگ نہ کرنا۔ چلو.......... آؤ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے وہ لڑکے تھے جو اس گھر کو آگ لگانے کے ارادے سے آئے تھے۔ ان کے چہروں پر مایوسی تھی اور وہ منصور کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

دو کرسچن عورتیں اپنے گھر سے نکلیں اور اس طرف آئیں۔ "بیٹا.......... تم نے بڑی نیکی کا کام کیا۔" ان میں سے ایک نے منصور سے کہا۔ پھر وہ دونوں ہندو فیملی کی طرف بڑھ گئیں۔ تینوں بہنیں بھائی کو سہارا دے کر نہلا رہی تھیں۔ لڑکے کا حال بہت برا تھا۔ اس کے لیے اب بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ ہندو عورت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی مگر اب اس کے رونے میں سکون اور طمانیت کا عنصر نمایاں تھا۔ لڑکیوں میں منجھلی لڑکی ہی تھی، جو سنبھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ سب گھر میں گھسے۔ منجھلی لڑکی سب سے پیچھے تھی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے وہ منصور کو جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عقیدت بھری چمک۔

منصور اور اس کے ساتھی واپس جانے لگے۔ دروازوں پر کھڑی عورتوں میں سے ایک نے کہا .... منصور بیٹے.......... تمہیں خدا خوش رکھے۔ تم نے بڑا کام کیا ہے۔ ہم پاکستان کی راہ میں اپنا گھر جلا کر، سب کچھ لٹا کر، اپنے پیاروں کی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے آنے والے ایک ہندو گھر سے کس کس چیز کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ہمیں تو اللہ نے اس کا صلہ ایک پیارے وطن کی شکل میں دے دیا ہے۔ وہ بڑا صلہ دینے والا ہے بیٹے!"

"ہاں بہن۔ ذرا دیر پہلے میں سوچ رہی تھی کہ لڑکے ٹھیک کر رہے ہیں۔ وہاں مسلمان مر رہے ہیں تو یہاں ہندوؤں کو کیوں چھوڑا جائے۔" دوسری عورت نے شرمندگی سے کہا۔ "لیکن منصور نے بالکل ٹھیک کیا۔"

لیکن کچھ عورتیں ناخوش بھی تھیں!

O==========☆==========O

اس رات منصور سونے کے لیے لیٹا تو وہ زندگی میں دوسرا موقع تھا کہ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ پہلا موقع ابا جان کی موت والی رات آیا تھا۔ ابا جان کی تدفین ہو چکی تھی۔ چاروں بہنیں اور بہنوئی گھر میں موجود تھے۔ وہ دیر تک اس کی دل جوئی کرتے رہے۔ بالآخر وہ یہ سوچ کر سوتا بن گیا کہ یوں وہ ان کے لیے بھی بے آرامی کا سبب بنے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہنیں اس سے باتیں کرتی رہیں۔ پہلے وہ نیند میں ڈوبی آواز بنا کر انہیں

، ہاں میں جواب دیتا رہا۔ پھر اس نے چپ سادھ لی۔ بہنیں مطمئن ہو کر چلی گئیں۔ تمام
یں بجھا دی گئی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کو گھورتا رہا۔ چند لمحوں بعد
ت اسکرین کی طرح روشن ہو گئی اور اس پر بیتے لمحوں کا باتصویر سفر شروع ہو گیا۔ بچپن کی
داشت کے پہلے لمحے سے لے کر ابا جان کی زندگی کے آخری لمحے تک کا سفر مکمل ہو گیا۔ اسے
جیسے اس کا سینہ.......... اس کا وجود خالی ہو گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ اسے کھوکھلے پن کا
اس ہونے لگا۔ اس نے ریڈیم ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اتنی ذرا سی
صرف چالیس منٹ میں وہ زندگی کے پندرہ سال دوبارہ جی لیا تھا۔ پندرہ سال.......... اور
لیس منٹ!

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ سینے پر بہت بوجھ تھا۔ چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روئے لیکن سینے پر جیسے کوئی چٹان رکھی تھی، جو ہل ی نہیں سکتی تھی جس کے پگھلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ رونے کو ترستا رہا۔ اس نے ابا جان کی ہر بات یاد کی۔ خود پر رقت طاری کرنے کی کوشش کی لیکن خشک آنکھیں صحراؤں کی طرح جھلستی ہی رہیں۔ اس کی پلکیں تک نم نہ ہوئیں۔

وہ اٹھ کر کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ قرار نہ آیا تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ س کا رخ ابا جان کے کمرے کی طرف تھا۔

وہ ابا جان کے کمرے میں داخل ہوا اور چوکھٹ سے ایک قدم آگے ہی رک گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن اس کمرے کو دیکھنے کے لیے اسے روشنی کی ضرورت بھی تھی۔ اس کمرے میں وہ آنکھیں بند کر کے بھی چل سکتا تھا۔ سامنے کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ابا جان کی میز تھی، جس کے ساتھ ریوالونگ چیئر تھی۔ داہنے ہاتھ والی دیوار پر شیلف لگا تھا۔ اس میں ایک طرف تدریس کے موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں تھیں، دوسری طرف اردو ادب تھا۔ میز پر اباجان کی عینک ہمیشہ کی طرح الٹی رکھی تھی۔ سامنے ٹیبل لیمپ تھا۔ ایک جانب اردو کی لغات تھی اور دوسری طرف ڈکشنریاں رکھی تھیں۔ بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ ان کا بیڈ رکھا تھا۔ وہیں ایک صوفہ سیٹ اور دو چھوٹی میزیں تھیں۔

وہ چند لمحے کھڑا کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ یہاں اسے ابا جان کی موجودگی کا.......... اور اس کے نتیجے میں سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر بڑی آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا۔ وہ میز کی طرف بڑھ گیا۔ میز کے گرد گھوم کر وہ کرسی کے پاس پہنچا اور کرسی کے ہتھے کو یوں سہلاتا رہا، جیسے مرحوم باپ کے لمس کا ریشم سمیٹ رہا ہو۔ چند لمحے ہچکچانے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی جیسے پورا منظر بدل گیا..........

پورا منظر بدل گیا لوگو
لمحہ بھر کو جھپک گئیں آنکھیں

کمرے میں دھوپ اتری ہوئی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ ابا جان اپنی کرسی پر بیٹھے

تھے۔ وہ ان کے سامنے میز کے دوسری طرف بیٹھا تھا۔ ابا جان نے کتاب سے نظریں اٹھائیں اور مطالعے کی عینک کے شیشوں کے اوپر سے اسے بغور دیکھا۔ "کوئی خاص بات ہے بیٹے!" انہوں نے پوچھا۔

"جی ابا جان۔ خاص ہی ہے۔"

ابا جان نے عینک اتاری اور میز پر الٹ کر رکھ دی۔ "کہو.......... کیا مسئلہ ہے۔"

"ہر باپ اپنے بیٹے سے پوچھتا ہے کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ آپ نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا۔" اس نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

ابا جان مسکرائے۔ مسکراہٹ کی چمک کی وجہ سے ان کی آنکھیں اور خوبصورت اور روشن لگنے لگیں۔ "ضرورت ہی نہیں پڑی پوچھنے کی۔" انہوں نے کہا۔

"میں بہت پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اب تو میں انجینئرنگ کے مضامین میں داخلہ لے چکا۔ لیکن باپ تو بچوں سے اس وقت یہ سوال کرتے ہیں' جب بچوں نے اپنی سمتوں کا تعین بھی نہیں کیا ہوتا ہے۔ آپ نے تو اس وقت بھی مجھ سے یہ بات نہیں پوچھی۔"

ابا جان سنجیدہ ہو گئے۔ "ہاں' میں نے کبھی نہیں پوچھا۔ اس لیے کہ جو کچھ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں' اس کے لیے میں نے ہر سانس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے اور اللہ نے مجھے یقین اور طمانیت عطا فرمائی ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ میں مطمئن ہوں تمہاری طرف سے۔"

"میں سمجھا نہیں ابا جان!"

"میں تمہیں بہت اچھا مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں۔ حشر کے روز تمہارا حوالہ' تمہاری پہچان تمہارا بہت اچھا انجینئر ہونا نہیں ہو گا؟ اچھا مسلمان بہت اچھا انسان ہوتا ہے اور بہت اچھا مسلمان تو عظیم انسان ہوتا ہے۔"

"تو آپ نے مجھے اچھا انسان بنانے کے لیے کیا کیا؟"

"میں نے ہر تعلیم سے پہلے تمہیں کلام پاک کی تعلیم دی۔ دین کے ارکان سے متعارف کرایا۔ نماز سکھائی' تمہیں اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرایا' کردار کی اہمیت بتائی۔ اسلامی معاشرے میں حقوق و فرائض کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ سے ہر لمحہ تمہارے لئے توفیق و ہدایت طلب کی.........."

"لیکن آپ نے مجھ پر کبھی نماز پڑھنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا.........؟"

"ہاں' یہ میری کوتاہی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ لیکن بیٹے' صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے سے آدمی اچھا مسلمان نہیں بن سکتا۔ آدمی نماز پڑھے' عبادات کرے لیکن انسانوں کو تکلیف پہنچائے' پڑوسیوں کو نقصان پہنچائے' والدین کی نافرمانی کرے تو وہ اچھا مسلمان تو کیا' اچھا انسان بھی نہیں بن سکتا۔ میں نے ہمیشہ تمہیں حقوق العباد اور حقوق اللہ کے بارے میں بتایا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ بندے پر اپنے حقوق وہ معاف کر دیں گے.......... اور وہ بڑے رحم والے ہیں۔ لیکن بندوں کے حقوق اللہ اس وقت تک معاف نہیں کریں گے

جب تک وہ بندہ معاف نہ کرے' جس کی حق تلفی ہوئی ہے" انہوں نے ایک گہری سانس لی "دیکھو بیٹے' اللہ سے محبت کرنا کتنا آسان ہے لیکن بہت مشکل ہے۔ سو اس سے بالواسطہ محبت کی جاتی ہے کہ یہ آسان ہے۔ اس کے بندوں سے محبت کرو۔ اس تک پہنچ جاؤ گے۔ براہ راست پہنچنا چاہو گے تو بھٹکنے کا احتمال رہے گا۔ اسی طرح بہت اچھا مسلمان بننے کے لیے پہلے اچھا انسان بنو۔ بہت اچھا انسان بن جاؤ گے تو صرف نماز روزے کی کمی ہو گی اور اللہ پاک انسانوں سے تمہارے سلوک اور محبت سے خوش ہو کر تمہیں اپنے راستے پر بلالیں گے۔ اللہ کی طرف سے توفیق وہدایت ملے گی تو یہ منزل آسان ہو جائے گی۔ نماز ایسی عادت ہے' جو آسانی سے ترک بھی نہیں کی جا سکتی۔ کی جائے تو آدمی بے سکون ہو جاتا ہے۔ مسلسل چالیس نمازیں پڑھ لی جائیں تو کہتے ہیں کہ پھر آدمی سے نماز قضا نہیں کی جاتی۔"

"شکریہ ابا جان۔ آپ کی دعائیں انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں انشاء اللہ اچھا مسلمان اور اچھا انسان بنوں گا۔"

منصور نے پلکیں جھپکائیں اور منظر پھر بدل گیا' وہی تاریک کمرا تھا۔ وہ ابا جان کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے والی کرسی خالی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ اس نے لغات اپنی طرف کھینچی' اسے کھولا اور ابا جان کی عینک لگا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن حروف بہت بڑے نظر آرہے تھے.......... اور دھندلا بھی رہے تھے۔ اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی.......... ابھی تم ابا جان سے بہت پیچھے ہو منصور۔ تم ان کی آنکھوں سے دنیا نہیں دیکھ سکتے۔ اچھے انسان بنو..........

اچانک اس کے سینے پر رکھی چٹان مرتعش ہوئی۔ حلق دکھنے لگا۔ آنکھوں میں جلن سی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سینے پر رکھی چٹان موم کے ڈھیر کی طرح پگھل رہی تھی۔ اس نے ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

خاصی دیر کے بعد وہ کرسی سے اٹھا۔ بیڈ کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھی ابا جان کی جانماز پر پڑی۔ اس کے اندر ایک بے ساختہ خواہش مچلی۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وضو کر کے وہ باہر آیا' ابا جان کی جانماز بچھائی اور خدا کے حضور سربسجود ہو گیا۔ نماز پڑھ کر وہ اٹھا تو پرسکون تھا۔ وہ ابا جان کے بیڈ پر جا لیٹا۔ ان کا تکیہ' ان کی چادر' بستر ہر چیز میں جیسے ان کی خوشبو اب بھی موجود تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹا اور چادر اوڑھی تو اسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ اسے لگا کہ وہ چھوٹا سا بچہ ہے' جسے ابا جان نے اپنے سینے پر لٹا لیا ہے۔ بچپن میں جب اسے نیند آتی تھی تو وہ اسے اپنے سینے پر لٹا لیتے تھے۔ اس کی پیٹھ تھپکتے' اس کا سر سہلاتے' اسے کہانیاں سناتے.......... اور اسے پتا بھی نہ چلتا کہ وہ کب سو گیا۔

اس رات وہ تکیہ اس کا سر سہلا رہا تھا۔ چادر اس کی پیٹھ تھپک رہی تھی۔ بیڈ نے ان کے سینے کی طرح اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔ ان کی آواز اسے زندگی کے قرینے تعلیم کر رہی تھی' اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ کب سو گیا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ صفیہ اس کے کمرے میں گئی اور

کمرا خالی پا کر پریشان ہو گئی تھی۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آیا تھا کہ منصور یقیناً ابا جان کے کمرے میں ہو گا۔ وہ وہاں آئی تھی۔ اسے سوتا دیکھ کر اسے اس پر پیار آیا تھا۔ وہ اس کی پیشانی چوم اور اسے ٹھیک طرح سے چادر اوڑھا کر دبے پاؤں واپس چلی گئی تھی۔

اور آج رات......... یہ زندگی میں دوسرا موقع تھا کہ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

وہ سونے کے لیے لیٹا۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ اس کے تصور میں ایک دلکش ابھر آیا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ تصور چہرے کے نقوش ا جسم کے تمام پیچ و خم سمیت کوئی وجود تخلیق کرے......... اور وہ بھی بالکل حقیقی انداز میں۔ زورِ تخیل تو شاید صرف مصوروں کو نصیب ہوتا ہے......... اور وہ بھی ان مصوروں کو جنہ قدرت نے پیدائشی طور پر اس نعمت سے نوازا ہو......... ورنہ بیشتر مصور تو بس نقال ہو ہیں۔

کئی لمحے گزر گئے۔ وہ سراپا اب بھی اس کے تصور میں جلوہ گر تھا......... جیسے چپک رہ گیا ہو۔ اچانک اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ تو حقیقی سراپا تھا۔ اس احساس نے اسے چونکا دیا۔ یہ دوسرا سراپا تھا' جو اس نے چند گھنٹے پہلے سچ مچ دیکھا تھا۔ مگر یہ بھی صرف اس کا احسا تھا......... یقین سے عاری۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ اس لڑکی کو تو اس نے ٹھیک سے د بھی نہیں تھا۔ وہ ہندو لڑکی......... پٹنے والے ہندو لڑکے کی منجھلی بہن' جو اپنی دوسری بہنو اور ماں کے برعکس اتنی خوف ناک صورت حال میں بھی پرسکون اور پُراعتماد تھی۔

اس تصور یا تخیل میں ایک غیر معمولی پہلو اور بھی تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس نے کبھی ک لڑکی کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ محلے میں کتنی لڑکیاں تھیں' جو اس کے ساتھ کھیل کر' بڑ کر جوان ہوئی تھیں۔ اس نے ان کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ لیکن وہ تصور میں انہیں صر ہیولے کے روپ میں دیکھ سکتا تھا اور ان کے خدوخال اس کے تصور میں نہیں ابھرتے تھے اس وقت اس نے آزمائش کے لیے ان لڑکیوں کا تصور......... کرنے کی کوشش کی رشیدہ......... فرزانہ......... بشریٰ......... سیما......... طلعت......... غزالہ......... لیکن نہیں ان کا تصور کرنا تو درکنار' وہ تصور میں بسے ہوئے اس سراپا کو بھی نہیں جھٹک سکا۔

اس نے خود کو اس خیال سے بہلانے کی کوشش کی کہ اتنی سنگین صورت حال میں لڑ کا غیر معمولی رویہ اس کے لیے کشش کا باعث ہوا ہو گا لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ ا ہی کہہ رہی تھیں۔ دل اتنے خوشگوار انداز میں کبھی دھڑکا ہی نہیں تھا۔ جن محسوسات سے ا وہ آشنا ہو رہا تھا' وہ اس کے لیے بالکل نئے تھے۔ اسے اپنے رگ و پے میں عجیب سی' میٹھی سنسنی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ضدی سراپا ایسا منتشر ہوا' جیسے پانی پر عکس ایک چھو سے کنکر سے چکنا چور ہو جائے۔ ساتھ ہی اس احساس نے اسے افسردہ کر دیا کہ کوئی بہت خو صورت اور نازک چیز جیسے مٹ گئی ہے۔

مجھے کیا ہو رہا ہے؟ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ کیا میرا دماغ چل گیا ہے۔ اسی لمحے ایک مرع اس کے ذہن میں در آیا۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ لاحول ولا قوۃ' وہ بہ واز بلند بڑبڑایا۔ یہ عشق کہاں سے آکودا بیچ میں......... اچھا......... موقع ملے تو دیکھ لینا۔ اس نے خود کلامی کی۔ وہ لڑکی حقیقت میں میرے اس تخیل سے یکسر مختلف ہو گی۔ اس خیال کے ں میں دلیلیں بھی تھیں......... اور دلیلیں بھی مبنی بر حقیقت۔ اس نے لڑکی کو واقعی نہیں دیکھا ا۔ کم از کم اس طرح نہیں دیکھا تھا کہ اس کا اتنا مکمل تصور کر پاتا۔

وہ کروٹیں بدلتا اور الجھتا رہا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ ضدی سراپا بند پلکوں کے پیچھے تھرکنے لگتا۔ نہ جانے کب......... لیکن بڑی مشکل سے اسے نیند آئی۔ اور وہ خواب سے محروم نیند تھی۔ ورنہ نیند کی آغوش میں اترتے وقت اس نے سوچا تھا کہ اب شاید وہ خواب میں بھی اسے پریشان کرے گی۔

لیکن اس نے تو اگلے روز بھی اسے پریشان نہیں کیا۔ یونیورسٹی میں اس کا وقت معمول کے مطابق گزرا۔ اس کی توجہ ذرا نہیں ہٹی۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال نہیں آیا۔ بلکہ اس کے ذہن سے تو جیسے وہ واقعہ ہی محو ہو گیا تھا۔

اس روز کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اس لیے وہ دو بجے گھر پہنچ گیا۔ رات ٹھیک......... سے سو نہیں سکا تھا۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھ بھی فوراً ہی لگ گئی مگر پھر دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک نے اسے گہری نیند سے جگا دیا۔ وہ جھومتا جھامتا بڑھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا تھا۔ اسے منصور نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اس کا سوتا ہوا ذہن اس تضاد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اسے کرنٹ سا لگا۔ یہ تو وہی چہرہ تھا جو گزشتہ رات بند پلکوں کے پیچھے تھرکتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نیند جیسے اُڑ گئیں۔

لڑکا ویسے ہی جھجک رہا تھا۔ منصور میں تبدیلی رونما ہوتے دیکھ کر وہ اور نروس ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ کوئی آواز نہیں نکلی۔

"کیا بات ہے؟" منصور نے اسے نروس دیکھ کر بے حد نرم لہجے میں کہا۔ حالانکہ اس کا پہلا بے ساختہ سوال یہ ہونا چاہیئے تھا......... کون ہو تم؟ مگر پھر یہ بھی ہے کہ وہ یہ بات اپنے تصور کے حوالے سے جان گیا تھا۔ لہٰذا یہ سوال غیر ضروری تھا۔

"ماں......... ماں آپ کو بلاتی ہے؟" لڑکے نے کہا۔

منصور کو اس کی زبان اور لہجہ دونوں نامانوس لگے۔ "کون......... کہاں.........؟" نہ جانے کیوں وہ گڑبڑا گیا۔

لڑکے کی سمجھ میں پہلے تو کوئی جواب ہی نہ آیا۔ پھر اس نے گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سڑک کے پار والی گلی میں......... ماں گھر میں ہے۔ وہ آپ کو بلاتی ہے۔"

منصور کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اسے اپنا دل دھڑکتا محسوس ہوا۔ "آؤ.........

اندر آجاؤ۔" اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل سو رہا تھا۔ ذرا منہ دھولوں
پھر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا لیکن لڑکا اندر نہیں آیا۔ منصور نے باتھ روم میں
جا کر منہ ہاتھ دھویا اور تولیے سے خشک کرنے کے بعد باہر آیا۔ لڑکا بدستور دروازے پر کھڑا تھا
منصور نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور بولا۔ "چلو۔"

"صرف کڑی مارو گے آپ؟ تالا نہیں لگاؤ گے!" لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

منصور کی سمجھ میں اس کی بات آگئی۔ یہ کڑی مارنا دراصل کنڈی لگانا تھا۔ وہ مسکرایا
"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ لڑکے کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے لڑکے سے پوچھا
"تمہارا نام کیا ہے؟"

"منہر۔" لڑکے نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "منہرلال۔"

منہر نامی اس لڑکے نے اپنے مکان کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ "آپ آجاؤ۔"
اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

"تم ماں کو بلا لاؤ۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔" منصور نے کہا۔ اب جھجکنے کی اس کی باری
تھی۔

لڑکا دروازہ بند کیے بغیر اندر چلا گیا۔ ایک لمحے بعد منصور نے اس کی آواز سنی
"ماں.......... منصور بھائی آوی گیوچھے۔" (ماں' منصور بھائی آگیا ہے۔)

"تو اندر بلائی ناکھ ڈھینگرا۔" ایک نسوانی آواز نے کہا (تو اندر بلا لے نا بے وقوف)

"تمے آپی جاؤ........" لڑکے کی آواز دور جاتی ہوئی تھی۔ (تم خود چلی جاؤ)

منصور پوری طرح تو نہیں سمجھ سکا لیکن اس گفتگو کا مفہوم اس کی سمجھ میں آرہا تھا
کرکٹ میچوں کے سلسلے میں میمن لڑکوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا۔ گجراتی زبان کچھ کچھ اس کی سمجھ
میں آنے لگی تھی۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ یہ ہندو گجراتی کیسے بول رہے ہیں۔ وہ تو
سمجھتا تھا کہ ہندو صرف ہندی بولتے ہیں۔

اتنے میں وہ ادھیڑ عمر ہندو عورت دروازے پر چلی آئی تھی' جسے اس نے گزشتہ رات
دیکھا تھا۔ "آ......... نانڈلا' اندر آجا۔" اس نے دروازے کے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔
"آجا میرا لال۔"

منصور ہچکچایا۔ لیکن عورت کے لہجے میں اتنی محبت تھی کہ وہ اندر چلا گیا۔ سامنے ہی
خاصا کشادہ آنگن تھا۔ دروازے کے عین سامنے نیچی چھت کا ایک کمرا تھا۔ بائیں جانب برابر
برابر دو کمرے تھے۔ اس کا اندازہ دروازوں سے ہوا تھا۔ دور والے کمرے کے ساتھ نیچی چھت
والے کمرے کے برابر کچن تھا۔

عورت اسے دروازے کے قریب والے کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کو وہ ڈرائنگ
روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ چھوٹا کمرا تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ تھا۔ درمیان

میں ایک میز تھی۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازے پر پردہ لٹکا تھا۔ منصور سائیڈ میں آڑے
رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔ عورت تھری سیٹ صوفے پر بیٹھ گئی۔ "نانڈلا........... کل تو نے
ہم لوگوں پر بڑی دیا کی۔" عورت بولی۔ "تجھے بھگوان نے ہمارے لیے دیوتا بنا کر بھیجا
نانڈلا........ میں........ ہم......... " وہ بالکل اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منصور
بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے........... کیا کرے۔

اسی لمحے درمیانی دروازے کا پردہ اٹھا........ اور جو لڑکی اندر آئی' منصور اسے دیکھتے کا
دیکھتا رہ گیا۔ اس لمحے اس کا ہر دفاعی حصار ٹوٹ گیا۔ وہ وہی لڑکی تھی' جس کا سراپا رات بھر
اسے تنگ کرتا رہا تھا۔ وہ ہو بہو وہی تھی۔ لڑکی بھی متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
دونوں کی نظریں ملیں........... اور اٹک کر رہ گئیں۔ کائنات کی ہر چیز ساکت ہو گئی۔ وقت ٹھہر
گیا۔ ان دونوں کے لیے اب کائنات میں کہیں کچھ بھی نہیں تھا.......... دو آنکھوں کے سوا!
ایک دوسرے کی آنکھوں کے سوا!

عورت روئے جا رہی تھی........... اور وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے
ہوئے تھے۔

منصور کے لیے وہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس کے جسم کی تمام توانائی سمٹ کر آنکھوں میں
آگئی تھی۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا.......... بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک
نظریں نہیں ہٹائے گا' وہ اس کیفیت سے نہیں نکل سکے گا لیکن نظریں ہٹانا اس کے اختیار میں
نہیں تھا۔ دوسری طرف بغیر کسی وجہ کے اسے یہ یقین تھا کہ لڑکی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی
نظریں نہیں ہٹا سکتی۔

بڑی لڑکی کمرے میں آئی تو کسی کو احساس بھی نہیں ہوا۔ اس نے حیرت سے روتی ہوئی
ماں کو دیکھا اور بولی۔ "کیا ہوا ماں؟"

اس کی آواز طلسم کشا ثابت ہوئی۔ منجھلی لڑکی نے پلکیں جھپکائیں اور منصور طلسم سے
آزاد ہو گیا۔ منجھلی لڑکی نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "یہ ماں تو ہمیشہ جذباتی ہو جاتی ہے۔"
اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ "اور جذباتی ہوتی ہے تو رونے لگتی ہے۔"

منصور اس دوران اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ لڑکیاں لباس سے
کرسچن لگ رہی تھیں۔ بڑی لڑکی اسکرٹ اور بلاؤز میں تھی اور منجھلی لڑکی گھٹنوں سے کچھ نیچے
تک کی پھول دار فراک پہنے تھی۔ دونوں کی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ البتہ ان کی ماں خالص ہندو
عورت لگ رہی تھی۔ اس نے سوتی ساڑی باندھی تھی۔ پیشانی پر بندیا تھی اور مانگ میں
سیندور..........

"خیر.......... جذباتی ہونے کی بات تو ہے۔" بڑی لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر وہ منصور
کی طرف مڑی۔ "کل آپ نہ آتے تو نہ جانے ہمارا کیا ہوتا۔"

"اس میں بھی کوئی کمال نہیں۔" منجھلی لڑکی بولی۔ "جو کچھ انہوں نے کیا' وہ ان کا فرض

تھا۔" اس نے منصور کی طرف اشارہ کیا۔
منصور اس کے لہجے کی شوخی سے بوکھلا گیا۔ "جی .... جی ہاں' وہ تو میرا فرض تھ
عورت چپ ہو گئی تھی۔ اس نے منجھلی لڑکی کو ڈانٹا۔ "میرا......... چپ کر جا۔
بکواس کیے جاتی ہے۔"
تو اس پیاری لڑکی کا نام میرا ہے۔ منصور نے سوچا۔ کتنا موزوں نام ہے۔ جتنی
صورت لڑکی' اتنا ہی پیارا نام۔
"جا......... اس کے لیے کچھ لے کر آ۔ چائے بنا۔" عورت بولی۔
"میں تو نہیں جاتی۔ یہیں بیٹھوں گی۔" میرا نے اکڑ کر کہا اور ماں کے برابر ب
گئی۔"
"جا اوشا' تو لے آ۔" ماں نے بڑی بیٹی سے کہا۔ وہ میرا کو گھورتی ہوئی کمرے سے
گئی۔
"سنیں آنٹی۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔" منصور نے کہا۔
"آپ کی بات ماں کو سمجھ نہیں آئے گی۔ ماں کی اردو اچھی نہیں ہے۔" میرا نے
ہوئے کہا۔
"تمہاری اردو تو بہت اچھی ہے۔" منصور بولا۔
"بہت اچھی تو نہیں۔ ماں کے مقابلے میں لگ رہی ہوگی۔ پر میں چاہتی ہوں کہ
اردو بہت اچھی ہو جائے۔"
ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "نانڈلا......... تو بیٹھ۔ میں جرا دیر میں آتی ہوں۔" اس
منصور سے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔
منصور کو اپنے چہرے پر میرا کی نظروں کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے
اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ منصور نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔
آنکھوں کا جادو دیکھ چکا تھا۔ "یہ نانڈلا کیا ہوتا ہے میرا؟" اس نے پوچھا۔
"اس کا مطلب ہوتا ہے' چھوٹا۔" میرا نے بتایا۔ "ماں لاڈ میں شنکر بھائی کو بھی نانڈ
ہے۔"
"لیکن میں نانڈلا تو نہیں ہوں۔"
"ماں کو آپ پر لاڈ آتا ہوگا۔"
منصور جھینپ گیا۔ میرا اب بھی اسے اسی طرح دیکھے جا رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اوش
ٹرے لے آئی۔ اس نے ٹرے میں سے چیزیں نکال کر میز پر رکھیں' ایک پلیٹ میں چند
تھیں اور دوسری میں آلو کی ترکاری۔ پھر وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔ ماں بھی کمرے میں آ
تھی۔ اس نے اصرار کر کے منصور کو پوریاں کھلائیں' پھر اوشا چائے لے آئی۔ اس دورا
منصور سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ اس سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔ منـ

بھی ان لوگوں کے متعلق خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔ عورت کا نام کلاوتی تھا۔ دو لڑکیوں
کے نام اسے معلوم ہو چکے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام بھی اسے معلوم تھا۔ تیسری بہن کا نام تارا
تھا۔ سب سے چھوٹی بچی شاردا تھی۔ جو لڑکا اسے بلانے آیا تھا' منہر تھا۔ اس سے چھوٹا ایک لڑکا
شیام تھا۔ گھر کے سربراہ کا نام گردھاری تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ ان کا بڑا
بیٹا شنکر ایک اور کمپنی میں اسٹینو تھا۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ آپس میں بے تکلف ہو گئے لیکن منصور کے انداز میں اب بھی
جھجک تھی۔ تاہم وہاں بیٹھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ وہ میرا کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا
اور وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"تو انجینئرنگ پڑھ رہا ہے رے......... میری میرا کو گرنتھ سکھا دے نا۔" اچانک کلاوتی
نے کہا۔
"گرنتھ!" منصور نے حیرت سے دہرایا۔
"ماں کا مطلب ہے میتھ میٹکس۔" میرا نے وضاحت کی۔
"پڑھا تو دوں لیکن وقت کا مسئلہ ہے۔" منصور نے کہا۔ "یونیورسٹی سے آتا ہوں تو کچھ
دیر آرام کرتا ہوں۔ پھر کرکٹ کھیلنے چلا جاتا ہوں........."
"تو رات کو سہی۔" میرا بولی۔ منصور نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا
تھی۔
"ٹھیک ہے آنٹی۔ میں آٹھ بجے آجایا کروں گا۔ اچھا......... اب میں چلتا ہوں۔"
وہ سب اسے رخصت کرنے دروازے تک لے آئے۔

O============☆============O
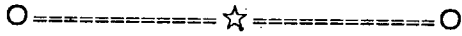
دو مہینے گزر گئے۔ منصور اب ان کے گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ بہت
محبت کرنے والے لوگ ثابت ہوئے تھے۔ شنکر سے تو اس کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔
گردھاری لال بہت خاموش طبع آدمی تھا۔ وہ گھر کے معاملات میں کم ہی دخل دیتا تھا۔ شنکر
والے واقعے کا اسے گھر والوں کی زبانی علم ہوا تھا اور وہ بہرحال منصور کا شکر گزار تھا۔ منصور
کبھی سوچتا کہ اس گھر کے لوگوں کی محبت میں ان کی غرض یقیناً شامل ہے۔ وہ بستی سے ان کا
واحد رابطہ تھا۔ اس واقعے کے بعد ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ گلی کے لوگوں میں بھی گھلیں
ملیں۔ ایسے میں منصور ایک ایسے پل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا' جو اس گھر کو باقی بستی سے ملاتا
تھا۔ یہ وہ غرض تھی' جس کے تحت وہ اس سے محبت بھرا برتاؤ کرنے پر مجبور تھے' محبت میں
غرض کتنی تھی' اس کا تعین منصور نہیں کر سکتا تھا۔ بہرکیف وہ لوگ اسے اچھے لگتے تھے۔
دوسری طرف میرا اب اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ رات کو وہ سونے کے لیے
بستر پر لیٹتا تو وہ اس کے تصور میں چلی آتی۔ اس تصور میں عجیب سی لذت تھی۔ وہ اس کے
تصور سے کھیلتے کھیلتے سو جاتا۔ غرض مدعا کا اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس لیے کہ اسے

مدعا ہی معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ آخر اس کا حاصل کیا ہے۔ ان کے درمیان ایک
ناقابل عبور خلیج حائل تھی۔ وہ مل ہی نہیں سکتے تھے۔ کیسی ستم ظریفی تھی کہ اسے زندگی م
پہلی بار محبت ہوئی تو وہ بھی ہندو لڑکی سے۔ اب عقل اسے بتاتی تھی کہ یہ ایک لاحاصل روگ
ہے۔ اسے یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیے لیکن دل ضدی بچے کی طرح اسی کھلونے پر اٹک
کر رہ گیا تھا۔ اس کی کیفیت اس شعر کے مصداق ہو کر رہ گئی تھی۔

دل وہ بچہ ہے کہ جو چاند کی کرتا ہے طلب
میں وہ ذی ہوش کہ بچے کو بھی بہلا نہ سکوں

کبھی اسے یہ خیال بھی آتا کہ یہ کھیل یک طرفہ ہے اور میرا کو تو یہ بھی معلوم نہ
ہوگا کہ میں اسے چاہتا ہوں اور ضروری نہیں کہ اس کے دل میں میرے لیے اس انداز کی گو
گنجائش ہو لیکن یہ خیال پل بھر کا ہوتا۔ اس معاملے میں اس کے اندر ایک واثق یقین موج
تھا۔ یہ یقین کہ میرا اس کے جذبات سے بے خبر بھی نہیں اور یہ میرا کے جذبات اس ۔
مختلف بھی نہیں۔ وہ یقین اس خیال کو ایک ثانئے میں مٹا دیتا۔

جس روز وہ یونیورسٹی سے جلدی آجاتا' اس روز وہ پریکٹس سے پہلے ہی میرا کو پڑھا
چلا جاتا۔ اس کے باوجود ٹھیک آٹھ بجے منہرا اسے بلانے آجاتا۔

"بھیا۔ ماں آپ کو بلاتی ہے۔" وہ کہتا اور کبھی کہتا۔ "میرا دیدی بولتی ہے' ایک سوا
سمجھ میں نہیں آرہا۔"

شروع میں تو وہ جب بھی میرا کو پڑھانے بیٹھتا تو کمرے میں کوئی نہ کوئی موجود ہو
زیادہ تر تارا بیٹھی ہوم ورک کرتی رہتی۔ کبھی کلاوتی آبیٹھتی۔ وہ سویٹر بُنتی رہتی۔ سلایا
متحرک رہتیں۔ وقتاً فوقتاً وہ نظر اٹھا کر اسے اور میرا کو دیکھتی اور پھر سلائیوں کی طرف متوجہ
جاتی۔ مگر دو ماہ گزرتے گزرتے یہ احتیاط ختم ہو گئی۔ منصور پہلی بار میرا کے ساتھ اکیلا بیٹھ
اسے عجیب سی خوشی ہوئی۔ اسے لگا کہ اب اسے قابل اعتماد سمجھ لیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ا
وہاں بیٹھ کر پڑھتی ہوئی تارا یا بُنائی کرتی ہوئی کلاوتی اس پہرے دار کی طرح معلوم ہوتی تھیں
جن پر کسی بہت بڑے خزانے کی حفاظت کی ذمے داری ڈال دی گئی ہو۔

میرا میٹرک میں تھی اور الجبرا میں بہت ہی کمزور تھی۔ منصور کی محنت کے نتیجے میں ا
اس کا حساب خاصا بہتر ہو گیا تھا۔ اکیلا بیٹھنے کے باوجود ان کی درمیان کبھی پڑھائی سے ہٹ
بات نہیں ہوئی۔ منصور تو نظریں بھی کم ہی اٹھاتا تھا۔ اسے میرا کے لباس سے بہت زیادہ الجھ
ہوتی تھی۔ وہ کوئی سوال سمجھاتا تو اس کی نظریں کاپی یا کتاب پر جمی رہتیں۔ میرا خود کوئی سو
حل کرتی تو وہ بیٹھ کر اپنی کتاب پڑھنے لگتا۔ ایک کتاب وہ ہمیشہ ساتھ لے کر جاتا تھا لیکن اکثر
ہوتا تھا کہ اسے احساس ہوتا کہ میرا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پلکیں لرز
لگتیں' جیسے اٹھنے کو بے تاب ہوں لیکن وہ خود پر جبر کیے' کتاب پر نظریں جمائے بیٹھا رہ
حالانکہ اسے ایک لفظ بھی نظر نہ آرہا ہوتا۔ کبھی میرا کسی سوال میں الجھی ہوتی تو وہ مو

مناسب جان کر چپکے چپکے اسے دیکھتا رہتا۔ میرا ذرا پہلو بدلتی تو وہ جلدی سے کتاب پر جھک جاتا۔

ایک روز وہ ایسے ہی میرا کو دیکھ رہا تھا۔ میرا کوئی سوال حل کر رہی تھی۔ اچانک اس
نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "آپ مجھے چپکے چپکے کیوں دیکھتے ہو؟"

"نہیں تو۔ میں تو کتاب پڑھ رہا ہوں۔" منصور نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔ میں نے پوچھا ہے' آپ مجھے چپکے چپکے کیوں دیکھتے ہو؟"

منصور کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ میرا اسے دیکھے بغیر.......... نظریں اٹھائے بغیر یہ بات کہہ
رہی تھی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے پوچھا۔

"بس.......... پتا چل گیا۔ مجھے ہمیشہ پتا چل جاتا ہے۔"

منصور یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ اسے بھی تو ہمیشہ نظریں اٹھا کر دیکھے بغیر احساس ہو جاتا تھا
کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ بولی۔

منصور اس بات کا جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جوابی حملہ کرنے کی ٹھانی۔
"اور تم مجھے چپکے چپکے کیوں دیکھتی ہو؟"

میرا نے نظریں اٹھائیں۔ ان بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں حیرت تھی۔ "مجھے معلوم
تھا کہ آپ کو بھی پتا چل جاتا ہے۔" اس کے لہجے میں عجیب سی خوابناکی تھی۔ "لیکن میں آپ کو
چپکے چپکے تو کبھی نہیں دیکھتی۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں تو آپ کو ماں کے
سامنے بھی چھپ کر نہیں دیکھتی۔"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں۔" منصور نے اس کا جملہ اسی کو لوٹا دیا۔

"میں جواب دینے سے بھی کب گھبراتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "میرا من کرتا ہے آپ
کو دیکھنے کو۔ اس لیے دیکھتی ہوں۔"

منصور حیران رہ گیا۔ اسے اس لڑکی پر رشک آنے لگا۔ جس بات کا جواب دینے سے وہ
گھبرا رہا تھا.......... بچ رہا تھا' اس لڑکی نے وہ جواب کتنی آسانی سے.......... کتنے سادہ لفظوں میں'
کتنی سادگی سے دے دیا تھا۔ سچ تو ہے۔ دل چاہے تو کوئی کیا کرے۔ دل کا کہنا تو ماننا پڑتا ہے۔
بچے تو اپنی بات منوا کر رہتے ہیں۔ بچوں کی ضد تو پوری کرنی پڑتی ہے۔

میرا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ "اتنی آسان سی.......... اتنی سچی بات آپ نہیں
کہہ سکتے؟"

منصور خاموش رہا۔

"آپ کا من بھی کرتا ہے نا مجھے دیکھنے کو؟"

"ہاں۔" منصور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب تم جلدی سے یہ سوال حل
کرو۔"

وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ "آپ اتنے بہادر ہو کہ سینکڑوں

کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہمارے لیے۔ مگر اتنے ڈرپوک بھی ہو۔" وہ بولی۔

منصور کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "وہ اور بات تھی۔ نہ میں اتنا بہادر تھا' نہ اتنا ڈرپوک ہوں۔ بات ہے موقع محل کی۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب تم جلدی سے یہ سوال کر کے دکھاؤ۔ مجھے جانا بھی ہے۔"

میرا سر جھکا کر کام میں لگ گئی۔ منصور اسے دیکھتا رہا۔ اب وہ نڈر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا کا ڈرپوک کہنا اسے بہت برا لگا تھا۔

اس روز پہلی بار اس نے میرا کو باقاعدہ ایک لڑکی کی نظر سے دیکھا تھا۔ میرا کا ناک نقشہ بہت اچھا نہیں تھا لیکن رنگ بہت گورا تھا اور آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بے حد شاداب لڑکی تھی......... پھولوں سے لدی شاخ جیسی اور اس روز پہلی بار منصور کی سمجھ میں شادابی کا مفہوم آیا۔ اس کے جسم میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی۔ اس لمحے اس کے وجود میں اجنبی سے جذبے جاگے۔ اسے احساس تھا کہ وہ جذبے اس کے ذہن تک......... شعور تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ لیکن وہ انہیں کسی حد تک سمجھ رہا ہے۔ یہ ایسا تھا جیسے کوئی شیر خوار بچہ پہچان نہ ہونے کے باوجود ماں کی طرف لپکتا ہوں۔ شاید اسی کو جبلت کہا جاتا ہے۔

کئی دن تک پڑھائی کا سلسلہ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ وہ میرا سے ڈرنے لگا تھا۔ اسے زبردست لڑکی لگی تھی۔ پچھلی گفتگو میں وہ اس سے ایک ایسی بات کہلوانے میں کامیاب ہو گئی تھی جس کا اعتراف وہ نہیں کرنا چاہتا تھا......... یعنی یہ کہ اس کا دل میرا کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔ لیکن وہ اسے بے دھڑک دیکھنے سے ڈرتا ہے۔ وہ ایسی لڑکی تھی' جو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ منصور کے اپنے اندر گڑبڑ تھی۔

چند روز بعد میرا نے اس کے جذبوں کے سوئے ہوئے پانی میں پھر کنکر اچھال دیے۔

"آپ تو سچے آدمی ہو۔ ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" منصور نے جواب دیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس بے ضرر سوال کے پیچھے بہت کچھ ہے۔ "ویسے میں کوشش کرتا رہتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ میرا خاموش رہی تو اس نے پوچھا۔ "تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"سوچتی ہوں' آپ سیکڑوں کے سامنے ایک خطرناک سچ تو بول سکے ہو۔ لیکن ایک ضرر لڑکی کے سامنے ایک بے ضرر سچ نہیں بول سکتے۔"

منصور کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "پتا نہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"آپ جانتے ہو' میں کیا کہہ رہی ہوں۔" میرا بولی۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھ کر وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ اچانک اس نے کہا۔ "کیا یہ جھوٹ ہے کہ آپ کے من میں کوئی بات ہے' جو آپ سے کہنا چاہتے ہو۔ مگر نہیں کہتے۔" اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

منصور نے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ آج بھی ناممکن تھا۔ اس نے پچھلی بار کی طرح اب کے بھی دفاع میں جوابی حملہ کیا۔ "یہ بات تو میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔ تمہارے دل میں مجھ سے بھی پہلے سے کوئی بات ہے' جو تمہیں مجھ سے کہنی ہے۔ لیکن تم نے نہیں کہی۔"

اس بار میرا بری طرح چونکی۔ "یہ آپ کو کیسے پتا کہ میرے دل میں آپ سے پہلے سے کوئی بات ہے؟"

"نہ جانے کیسے......... مگر بس مجھے معلوم ہے۔" منصور نے جواب دیا۔

میرا پھر سوچ میں پڑ گئی۔ "تو آپ بھی مجھے ویسے ہی سمجھ لیتے ہو' جیسے میں آپ کو سمجھ لیتی ہوں۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "مگر میں اپنے من کی بات کہنے سے نہیں ڈرتی' ایک وجہ ہے جو مجھے روک دیتی ہے۔"

"وجہ میرے پاس بھی ہو سکتی ہے۔" منصور نے کہا۔ وہ اس کھری اور بے باک لڑکی سے اپنی ذہانت کے بل پر لڑ رہا تھا۔ "اور تم بھی بہرحال ڈرتی ہو؟"

"ہاں۔ میں ڈرتی ہوں۔" میرا نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دھرم سے نہیں ڈرتی......... سماج سے نہیں ڈرتی۔ گھر والوں سے نہیں ڈرتی آپ سے نہیں ڈرتی۔ صرف اس بات سے ڈرتی ہوں کہ میرا سچ آپ تک پہنچتے پہنچتے جھوٹ نہ بن جائے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"دیکھو۔ ہم سب کا آپ سے ایک غرض کا رشتہ ہے۔ لیکن میں سب میں شامل نہیں۔ میرا آپ سے غرض کا رشتہ نہیں۔ میں آپ سے ایک بہت بڑی بات کہوں گی تو وہ چھوٹی ہو جائے گی اور میں اس بات کو چھوٹا دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں کچھ کہوں گی تو آپ سمجھو گے کہ میں آپ سے تحفظ خرید رہی ہوں۔"

منصور کو حیرت ہوئی۔ میرا کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن وہ بہت بڑی......... بڑی گہری باتیں آسانی سے......... بڑوں کے انداز میں کہہ دیتی تھی۔

"میں سیدھی بات کرتی ہوں۔" میرا اپنی کہے جا رہی تھی۔ "مجھ سے بات گھما پھرا کر کرنا نہیں آتا۔ مجھے آپ سے تحفظ خریدنا ہوگا تو میں آپ کو بول دوں گی کہ مجھے اور میرے گھر والوں کو پروٹیکشن دو' میں اس کے بدلے........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ "مگر وہ بیوپار ہوگا۔"

"ضروری نہیں کہ میں تمہاری بات کو غلط سمجھوں۔" منصور نے کہا۔

"لیکن چانس تو ہے نا غلط سمجھنے کا۔"

"اور اگر میں تمہیں یقین دلا دوں کہ غلط نہیں سمجھوں گا۔"

"تو میں آپ سے من کی بات کہہ کر شانت ہو جاؤں گی۔" میرا نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔"

"بس تو پھر اپنے دل کی بات کہہ دو۔"

"میرا کی نظریں جھک گئیں اور چہرہ اتنی تیزی سے گلابی ہوا کہ منصور حیران رہ گیا۔ یہ لڑکی ہے کہ حیرت کدہ۔ اتنے تضادات! اتنی بولڈ اور اتنی شرمیلی! وہ کاپی پر سر جھکا کر لکھنے میں مصروف ہو گئی لیکن چہرے پر شمعیں جل رہی تھیں۔

"بولو نا۔" منصور نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ "کیا کہنا ہے تمہیں؟"

"زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ پہلی بار تو نہیں کہہ سکتی۔" میرا نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ پھر اس نے کاپی بند کی اور منصور کی طرف بڑھا دی۔ "من کی بات اس پر لکھ دی ہے۔ آپ پڑھ لو۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی نظر نہیں اٹھائی تھی۔

منصور نے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کاپی کھولی اور اوراق الٹنے لگا۔ وہ حساب کی کاپی تھی۔ درمیان میں ایک صفحے پر تحریر دیکھ کر اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے بے تابی سے عبارت پڑھی۔ لکھا تھا........ "من کے دیوتا' میں آپ سے اس پل سے پریم کرتی ہوں' جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا' مگر آپ تو جان کر بھی نہیں جان سکتے کہ پریم کیا ہوتا ہے........"

"سنوں چھے نانڈلا۔ ٹھیک تو چھے۔"

منصور نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے کلاوتی کھڑی تھی۔ عام طور پر وہ بے ساختہ گجراتی بول جاتی تھی۔ منصور نے گھبرا کر کاپی بند کر دی۔ "کچھ نہیں آنٹی۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"لگتا تو نہیں۔ میرا بولتی تھی تیرے سر میں درد ہے۔ میرا چائے بنا رہی ہے تیرے لیے۔"

"جج........ جی ہاں۔ سر میں درد تھا کچھ۔" منصور نے گڑبڑا کر کہا۔ میرا نے تو اسے موقع ہی دیا تھا۔ اسے بتائے بغیر سر کا درد تشخیص کر دیا تھا۔

"میں شیام کو بھیج کر ڈسپرین منگاتی ہوں۔" کلاوتی بولی۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی منصور حیران رہ گیا۔ غرض اپنی جگہ۔ لیکن غرض میں کوئی کسی کے لیے اتنا بے سا پریشان نہیں ہوتا۔ کلاوتی کے انداز میں ممتا بھری محبت تھی اور ممتا وہ نعمت تھی' جس سے منصور محروم رہا تھا۔ "ارے آنٹی........ اس کی ضرورت نہیں۔ معمولی سا درد ہے۔ بس چائے سے ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"تو چپ کر۔ پہلے دو ڈسپرین کھانا۔" کلاوتی نے پیار سے اسے ڈانٹا۔

میرا چائے لے کر آئی تو پہلے جیسی میرا تھی۔ اس نے چائے کی پیالی منصور کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "لو........ اسے پیتے ہی سر کا درد بھاگ جائے گا۔"

اتنے میں شیام ڈسپرین لے آیا۔ کلاوتی نے پانی کے گلاس میں دو ڈسپرین ڈال کر "لے نانڈلا........ پہلے یہ پی جا۔"

منصور نے پانی پیا۔ کلاوتی گلاس لے کر چلی گئی تو اس نے میرا پر آنکھیں نکالیں۔ "یہ کیا شرارت تھی۔ مجھے مفت میں ڈسپرین لینی پڑ گئی۔ اب ہو گا سر میں درد۔"

"مفت میں کیوں۔ قیمت ادا کی ہے آپ نے۔" میرا نے شوخی سے کہا۔ "مفت تو کوئی چیز نہیں ملتی۔ پریم سی دولت دو ڈسپرین میں ملی ہے آپ کو۔ سستے چھوٹ گئے۔"

منصور سر جھکائے چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔

"اب آپ بھی اپنے من کی بات کہہ دو۔" میرا نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے میرا کہ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں جسے تم سے کہنا ضروری ہو۔" منصور نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"میرے اندر وشواس ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔" میرا کے لہجے میں بے پناہ اداسی تھی۔ "آپ ایک بات بتاؤ۔ ہم لوگ آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

"اچھے لگتے ہو۔ محبت کرنے والے لوگ کسے اچھے نہیں لگتے۔" منصور نے پوری سچائی سے کہا۔

"اور میں؟" میرا نے پوچھا۔ مگر فوراً ہی اس نے رخ بدلا۔ اس کے لہجے میں اب بھی اداسی تھی۔ "آپ ایک اور بات بتاؤ۔ مروت لحاظ سے نہ کرنا۔ آپ کو مجھ میں کوئی بات اچھی بھی لگی؟ میں کسی بھی اعتبار سے آپ کو پسند آئی؟"

"میرا جواب تمہیں اچھا نہیں لگے گا اور میں دل دکھانے کا قائل نہیں۔" منصور نے کہا۔

"آپ اس کی پروا نہ کرو۔ مجھے بتاؤ۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری بس ایک بات اچھی نہیں لگتی۔" منصور نے یہ کہا اور پہلی بار نظریں اٹھائیں۔ اب وہ میرا کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میرا کے چہرے پر اداسی تھی مگر اب اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک بھی تھی۔ منصور نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"بلکہ مجھے تمہاری یہ بات بہت بری لگتی ہے۔"

"وہ بات کیا ہے؟" میرا نے پوچھا۔

"وہ ہے تمہارا یہ لباس۔"

"لیکن........ لیکن........ دیکھو نا' میں مسلمان تو نہیں ہوں۔" میرا گڑبڑا گئی۔ منصور کا جواب اس کے لیے بے حد غیر متوقع تھا۔

"میں جانتا ہوں لیکن تم کرسچن بھی نہیں ہو۔ تم ساڑی کیوں نہیں پہنتیں؟"

"ہائے رام۔ ابھی میں ساڑی کیسے پہن سکتی ہوں۔" میرا نے حیرت سے کہا۔ "ساڑی تو عورتیں پہنتی ہیں........ شادی کے بعد۔"

"خیر یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں اسکرٹ اور بلاؤز کو ہندوؤں کا پہناوا بھی نہیں سمجھتا۔"

"ہندو لڑکیاں تو یہی پہنتی ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے؟"
"یہ.......... یہ.......... اس میں عریانی ہے۔ دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔"
منصور گڑبڑا گیا۔ وہ حجاب محسوس کر رہا تھا۔
میرا چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے مایوسی لہجے میں کہا۔ "یہ تو وہ بات ہے' جو آپ
بری لگتی ہے مگر آپ کو مجھ میں اچھا کچھ بھی نہیں لگتا۔ ہے نا؟"
"منصور کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ وہ بچوں کی طرح مایوس نظر آ رہی تھی۔ یہ ا
اور روپ تھا اس کا۔ اس کی بے باکی' تیزی و طراری دھری رہ گئی تھی۔ "میں نے یہ تو نہ
کہا۔" منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آپ نے ایک برائی بتا دی۔ اس کا مطلب
یہی ہوا۔"
"میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا۔ میں نے کہا تھا' مجھے تمہاری بس ایک ب
اچھی نہیں لگتی۔"
"مطلب؟" میرا نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔
"مطلب یہ کہ باقی سب کچھ اچھا لگتا ہے۔"
اچانک میرا کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے اور وہ بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔
کرتی ہو۔ آنٹی آ جائیں گی.......... سب آ جائیں گے۔ مجھے تماشا بنواؤ گی۔" منصور نے ا
ڈانٹا۔
"آنے دو' اس وقت میں بہت خوش ہوں۔ سچ بتاؤ' میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟"
"تالیاں روکو گی تو بتاؤں گا۔"
اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ "لو.......... اب بتاؤ۔"
"میں جھوٹ نہیں بولتا۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"
"پر آپ نے مجھے اتنا کیوں ستایا۔ سچ.......... مجھے رونا آ رہا تھا۔"
"تمہاری بے وقوفی ہے۔" منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بس ایک بات اچھی نہ
مطلب صاف ہے کہ باقی سب کچھ اچھا لگتا ہے۔"
"اب میں آپ جیسی عقل مند تو نہیں۔ لفظ تو نہیں پکڑ سکتی۔"
"لفظوں کو غور سے سنا کرو۔ کبھی کبھی لفظوں کے درمیان بہت کچھ چھپا ہوتا۔
منصور نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔
"اب غور سے سنا کروں گی۔" میرا بولی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے ا
آنکھیں پھر چمکنے لگیں۔ "اب میں نے آپ کا ایک جھوٹ پکڑ لیا۔"
"کون سا جھوٹ؟"
"آپ نے کہا تھا کہ آپ کے من میں ایسی کوئی بات نہیں' جو مجھ سے کہنا

"یہ جھوٹ تو نہیں۔"
"اگر میں آپ کو اچھی لگتی ہوں تو آپ کے من میں ایسی ایک بات ضرور ہوگی جیسی
یرے من میں تھی۔"
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میرے دل میں کوئی بات نہیں۔"
منصور نے کہا۔ "بات تو ہے لیکن وہ تم سے کہنا ضروری نہیں۔"
"کیوں ضروری نہیں؟"
"بس' وجہ ہے جیسے تمہارے پاس تھی۔"
"میں نے تو وجہ آپ کو بتا دی تھی۔ پھر بات بھی بتا دی تھی۔"
"وجہ میں بھی تمہیں بتا دیتا ہوں۔ جس بات کا کوئی فائدہ نہیں۔ حاصل نہیں' اسے کہنے
ے کیا فائدہ؟"
"فائدہ اور نقصان تو بیوپار میں دیکھا جاتا ہے۔ آپ بیوپاری تو نہیں لگتے۔" میرا نے تند
لہجے میں کہا۔ پھر اچانک گڑگڑانے لگی۔ "پلیز.......... ایک بار بول دو۔ میرے کو بس ایک بار بتا
د۔ پھر کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ پلیز.......... پلیز.......... پلیز.........."
"میرا۔ جو بات جانتی ہو' وہ سننا کیوں چاہتی ہو؟" منصور جھنجھلا گیا۔
"نے بغیر وشواس نہیں ہوتا۔ آپ دیکھو' میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ آپ بس ایک
ر بول دو۔" میرا نے آنکھیں بند کر لیں۔
"میرا.......... میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔" منصور نے کہا اور خود بھی حیران رہ گیا۔
ں نے اتنی روانی سے وہ جملہ ادا کر دیا تھا' جسے ادا کرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔
ے تو وہ جملہ فلموں میں افسانوں میں بھی برا لگتا تھا لیکن شاید میرا کی طلب بہت شدید..........
ت رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ شاید زندگی میں کوئی شخص اس جملے سے بچ
ں نہیں سکتا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے میں میرا کی محبت امنڈ پڑی ہے۔ سمندر
یسی محبت اس کے وجود میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔ اب جیسے اس
کے اندر محبت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ فلمی کہانی نویسوں اور افسانہ
کاروں نے اس جملے کو پامال کر کے.......... سستا بنا کر محبت کرنے والوں پر احسان کیا ہے۔ اب
وئی باوقار شخص.......... کوئی سچا آدمی اس جملے کو اس وقت تک کسی سے نہیں کہہ سکتا' جب
تک اس کے سینے میں محبت کا سمندر موجزن نہ ہو جائے۔ بلکہ وہ یہ جملہ کہتا نہیں۔ وہ تو اس
کے اندر سے ابھرتا ہے' ہونٹوں پر مچلتا ہے' اور خود بخود ادا ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس کا اپنا تجربہ
یہی تھا۔
میرا نے آنکھیں کھول دی تھیں اور ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں
ں منصور کو اپنے لیے کوئی عجیب.......... بے بہا چیز نظر آئی۔ اس مفہوم سے قریب ترین اسے

ایک ہی لفظ سُوجھا......... پرستش!

بالآخر میرا نے ہی خاموشی توڑی۔ "آپ یہ بات کہنے سے ڈرتے تھے۔ اس لیے کہ ا
میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ ہم مل نہیں سکتے؟"

"ہاں میرا اور میرا ڈر غلط نہیں۔"

"غلط ہے۔" میرا نے زور دے کر کہا۔ "اس لیے کہ ہم مل سکتے ہیں۔ ہم ملنا چاہیں
ہمیں ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ بھی ملیں تو کیا ہے۔ جب تک چل سکیں، ہم ای
دوسرے کے ساتھ تو چل سکتے ہیں۔ جب بھاگوں میں بچھڑنا ہوگا، ہنسی خوشی بچھڑ جائیں گے
ہمارے پاس ایک دوسرے کے ساتھ گزارا ہوا خوب صورت وقت ہوگا۔ ایسا خوب صور
وقت جو بھگوان صرف نصیب والوں کو دیتا ہے۔ ہم جب بچھڑیں گے تو ہمارے پاس خوبصور
یادیں ہوں گی۔ ان یادوں کے سہارے ہم سات جنم بھی ہنسی خوشی گزار سکتے ہیں۔ کم از کم
تو گزار سکتی ہوں۔ تمہاری محبت کا ایک پل میرے ایک جنم کے تمام دکھ دھو ڈالنے کے
بہت ہے۔"

"میرا......... میرا......... تم ہر بار مجھے حیران کر دیتی ہو؟" منصور نے پوری سچائی
کہا۔ "یہ سب......... فلسفہ کس نے پڑھایا تمہیں؟"

میرا کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی، اس کی گہری کالی آنکھیں، لگتا تھا ہر چیز کے پار جا
وقت کے سمندر کو کھنگال رہی ہیں۔ پھر وہ بولی تو اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔
نہیں کیسے۔ مگر یہ مجھے معلوم ہے۔ میں ذہین نہیں۔ تمہاری طرح عقل مند نہیں۔ پر تم
پوچھا تو میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں پتا کہ جو میری سمجھ میں آئی، غلط ہے یا صحیح
شاید ٹھیک ہی ہے۔ مجھے ابھی میرے من نے بتایا ہے کہ منش کو جب جیون ملتا ہے تو ساتھ
اس کے من کو پریم ساگر بھی ملتا ہے۔ وہ ساگر من کے اندر سویا ہوتا ہے۔ پھر جب کبھی
میں سویا پریم جاگتا ہے تو منش کی سمجھ میں سب کچھ خود بخود آجاتا ہے اور........." وہ خام
ہوئی اور چند لمحے سوچتی رہی۔ "میں تمہارا نام نہیں لے سکتی۔ میں تمہیں پریتم کہوں گی۔"
نے منصور کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔ "تمہیں یہ فلمی لگ رہا ہوگا لیکن یہ من کی
ہے پریتم۔ تو میں کہہ رہی تھی کہ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں.........
ایک لفظ ہے نا......... کیا ہے بھلا سا......... ہاں، دانائی۔ پریم کی اپنی دانائی ہوتی ہے.........
کی، من کی دانائی۔ دماغ کی، سنسار کی دانائی سے بالکل الگ۔ تو پریتم، میرے پاس من کی دا
ہے۔ وہ مجھے اندر اندر سب کچھ بتاتی......... سمجھاتی ہے۔ مجھ سے باتیں کہلواتی ہے۔" وہ
کہتے رکی اور اس نے منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "پریتم......... تمہارے
میں ایسا کوئی خیال تو نہیں کہ میں کوئی گھاگ لڑکی ہوں اور مجھے سب کچھ پہلے سے معلوم ہے

منصور کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کے دل میں ایک لمحہ پہلے یہی خیال آیا تھا۔
میرا، میں نے ایسا سوچا تھا۔"

"میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔ بس ایسا کچھ بھی نہ سوچنا میرے بارے
میں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، میرا سب کچھ تم سے شروع ہے اور تم ہی پر ختم۔ نہ اس سے آگے
کچھ، نہ اس سے پیچھے کچھ۔"

منصور تو جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ بن سوچے، بن مانگے محبت ملے اور اتنی ملے تو
آدمی کہاں جائے۔ وہ اس وقت محبت کے ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا
کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

اس رات کوئی میرا کی کاپی چیک کرتا تو حیران رہ جاتا۔ اس روز اس نے کوئی سوال حل
نہیں کیا تھا۔ ایک سادہ صفحے پر تاریخ لکھی تھی اور بس۔ نچلا آدھا صفحہ کاپی سے پھاڑ لیا گیا تھا۔

O============☆============O

منیر نے آنکھیں پھاڑ کر نیچے پڑے پتوں کو دیکھا اور منصور پر آنکھیں نکالیں۔ "یہ حکم کا
پتا کہاں سے نکل آیا؟"

"کیا مطلب؟" منصور نے کہا۔ "میرے پاس تو ابھی ایک حکم اور بھی ہے۔"

"دو ہاتھ پہلے تم حکم کاٹ کر گئے ہو۔" نصیر نے کہا۔ وہ منیر کا پارٹنر تھا۔

"ناممکن۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"ارے بھائی......... میرا حکم کا بادشاہ تھا، جسے تم نے ٹرمپ کیا تھا۔" منیر نے فریاد کرنے
والے انداز میں کہا۔

"منیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شہزاد نے تائید کی۔ وہ منصور کا پارٹنر تھا۔

"تو پتے چیک کر لیتے ہیں۔" نصیر بولا۔ "یہ اپنے بنے ہوئے ہاتھ ادھر لاؤ۔" اس نے
پتے اٹھائے اور چیک کرنے لگا۔ "یہ دیکھو۔" ایک لمحے کے بعد اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔
"یہ حکم کا بادشاہ ہے۔ اس پر میں نے اور شہزاد نے حکم دیا ہے اور تم نے ترپ کے چھکے سے
اسے کاٹا ہے۔"

"حیرت ہے یار۔ مجھ سے ایسی غلطی کیسے ہو گئی۔" منصور نے بے بسی سے کہا۔ اسے
اب بھی یاد نہیں آیا تھا کہ اس نے حکم پر ترپ لگائی ہے۔

"غلطیاں تو ہوں گی۔" شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم روگ ہی ایسا لگا بیٹھے ہو۔"

"کیسا روگ؟ کیا مطلب؟"

"یار، اب دوستوں سے تو نہ چھپاؤ۔ وہ اس ہندو لڑکی سے تمہار چکر نہیں چل رہا
ہے۔"

منصور گم صم سا ہو گیا۔ وہ جمعے کی شام تھی۔ وہ کرکٹ میچ کھیل کر آیا تھا اور نہا دھو کر،
لباس تبدیل کر کے دوستوں کے ساتھ ترپ چال کھیلنے بیٹھا تھا۔ یہ تینوں اس کے بچپن کے
دوست تھے۔ قدرتی طور پر ان کے درمیان بے تکلفی بہت تھی۔ اتفاق کی بات کہ ان تینوں کو
ہی کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"لو بھائی' اسے تو سانپ ہی سونگھ گیا۔" شہزاد نے کہا۔
"ابے اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔" نصیر نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ "ش
ہے' پتھر میں جونک تو لگی۔ اے بھائی' اس منیر کو دیکھ' ہر ہفتے نیا عشق چل رہا ہوتا ہے۔ تو
تو ابھی کیریئر کا آغاز کیا ہے بس۔"
منصور ●ب بھی گم صم بیٹھا تھا۔ چاروں دوست تاش کھیلنا بھول گئے تھے۔
"او بھائی......... ہندو لڑکی سے عشق میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔" شہزاد بولا۔ "نقصان
کوئی ڈر ہی نہیں۔"
"مطلب کیا ہے تمہارا؟" منصور پہلی بار بولا۔
"مطلب صاف ہے۔ ہاتھ صاف کر دے اس پر۔ ان ہندوؤں کی طرف ہمارا بڑا حساب
نکلتا ہے۔"
"یار......... تم سنجیدہ ہو؟" منصور نے شہزاد سے پوچھا۔
"ایک سو دس فی صد سنجیدہ ہوں میں۔ یہ مذاق کی بات ہی نہیں۔" شہزاد نے سنجید
سے کہا۔
"یار شہزاد' مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔" منصور نے دل گرفتگی سے کہا۔ "ات
سنجیدگی سے اتنی گھٹیا بات کی ہے تم نے۔"
"تو میں ایک بڑھیا بات بتاؤں۔" نصیر بولا۔ "اسے مسلمان کر کے اس سے شادی ک
لے' ثواب کا ثواب' مزے کے مزے۔"
"یعنی چپڑی اور وہ بھی دو دو۔" منیر نے ٹکڑا لگایا۔
"بڑے افسوس کی بات ہے........."
منیر نے منصور کی بات کاٹ دی۔ "یار منصور' سچی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی ٹھیک
کہہ رہے ہیں۔"
"مشوروں کا شکریہ۔" منصور نے خشک لہجے میں کہا۔ "اب میں تم سے التجا کروں گا
آئندہ مجھ سے اس موضوع پر کبھی بات نہ کرنا۔"
وہ تینوں سنجیدہ ہو گئے۔ شہزاد نے کہا۔ "ہمارے درمیان ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہاں
دلیل سے قائل کرنے کا رواج ہے۔ قائل کر دو' پھر ہم کچھ نہیں کہیں گے۔"
"ہاں۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے۔" نصیر بولا۔
منصور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے شہزاد کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "تو ٹھیک
ہے۔ سب سے پہلے میں تمہاری بے ہودہ تجویز پر بات کرتا ہوں۔"
"مجھے اس پر اعتراض ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "پہلے میری تجویز کو بے ہودہ ثابت کرو۔"
"بھائی......... خدا کے لیے اسے قومی اسمبلی کا اجلاس مت بناؤ۔" منیر' شہزاد کے سا
ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ تو خود بخود ثابت ہو جائے گی۔" منصور نے سنجیدگی سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ
...دوؤں کی طرف جو ہمارا حساب نکلتا ہے' وہ انفرادی نہیں' قومی معاملہ ہے اور قومی معاملات
...سطح پر قوموں کے درمیان طے پاتے ہیں۔ شہزاد صاحب' تمہارا خیال ہے کہ ایک ہندو لڑکی
...بے آبرو کرنے سے اس حساب کتاب میں کمی آجائے گی......... یا ایک لاکھ تیس ہزار دو سو
...ارہ لڑکیوں کو بے آبرو کرنے سے اور تین لاکھ چھپن ہزار آٹھ سو نوے ہندوؤں کو قتل کرنے
...وہ حساب بے باق ہو جائے گا۔" اس نے سر اٹھا کر شہزاد کو دیکھا۔ شہزاد کا چہرہ تمتما رہا تھا۔
...کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ٹھہر جاؤ۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔" اس نے ہاتھ اٹھا
...کہا۔ "تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ حساب برابر کرنا جاپانیوں سے سیکھو۔ اس اعتبار سے وہ بڑی
...م ہیں۔ اب اس بات سے شاید تمہاری قومی حمیت کو ٹھیس پہنچے گی لیکن یہ حقیقت ہے۔
...ھو' امریکا نے نہ جھکنے والے جاپانیوں کو ایٹم بم کے زور پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ جاپانیوں کو
...سے ہیروشیما اور ناگاساکی کا انتقام لینا تھا۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا اور اس پر
...ں پیرا ہو گئے۔ قدرتی وسائل سے محرومی کے باوجود انہوں نے صنعتی میدان میں اتنی ترقی کی
...۔ امریکا اور یورپ کو صنعت کے معاملے میں ان کی اپنی مارکیٹ میں مفلوج کر دیا۔ ان کی
...یشت تباہ کر دی۔ یہ ایک قوم کا دوسری قوم......... بلکہ قوموں سے انتقام ہے اور یہ ہے بڑی
...چ کا نتیجہ۔ چھوٹی سوچ رکھنے والے کبھی حساب برابر نہیں کر سکتے۔ وہ خسارے ہی میں ہوتے
...ں کہ ان کے اندر کھاتا بند ہو جاتا ہے۔" اس کا لہجہ کاٹ دار ہو گیا۔ وہ شہزاد کو طنزیہ نگاہوں
...ے دیکھ رہا تھا۔ "یہ تو تھی دلیل کی بات۔ اب مذہب کی رو سے دیکھو۔ تمہاری تجویز پر جو کوئی
...ں عمل کرے گا' وہ ہندوؤں کا حساب تو کیا چکائے گا' اپنے نامہ اعمال ہی کو سیاہ کرے گا۔ اب
...خود سوچو۔ تم مجھے ایک بہت بڑے گناہ کی ترغیب دے رہے تھے' بولو' تم اب بھی اپنی تجویز
...اصرار کرو گے؟"
"نہیں یار منصور' میں غلطی پر تھا۔" شہزاد نے شرمندگی سے کہا۔ "آئی ایم
...ری......... رئیلی سوری ڈیئر' میں اپنی تجویز سے شرمندگی سے دستبردار ہوتا ہوں۔"
"لیکن میری تجویز میں ایسی کوئی خرابی نہیں۔" نصیر بولا۔ "اس کے متعلق کیا کہتے ہو؟"
"ٹھیک ہے۔ اب میں اس طرف آتا ہوں۔" منصور نے کہا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری
...چ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ "اس
...ا بھی قباحت ہے۔ شادی کو میں دراصل صرف انسان کا ذاتی معاملہ نہیں سمجھتا۔ اس سے
...ا کے آباؤ اجداد کا......... اور ان سے بڑھ کر آنے والی نسلوں کا تعلق ہوتا ہے۔ میں مسلمان۔
...ل اور چاہتا ہوں کہ میرے بچے بہت اچھے مسلمان ہوں اور اس کے لیے ہمارے مذہب نے
...رت کو بجا طور پر اہم قرار دیا ہے۔ مسلمان ماں کی اہمیت بہت زیادہ ہے' اس کی کارکردگی
...ھی ہو یا بری' آنے والی نسلوں کو بہرحال متاثر کرتی ہے........."
"لیکن تم میرا کو مسلمان کر سکتے ہو۔" نصیر نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ضروری نہیں، میرا مسلمان ہو جائے اور اگر میری محبت میں وہ کر بھی لے تو اس میں خلوص کی کمی ہوگی۔ یہ تو غرض سے ایمان لانا ہوگا۔ ایسے میں وہ میرے بچوں کو اچھی تربیت دے کر بہت اچھا مسلمان نہیں بنا سکتی اور نسلوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ایک خرابی پیدا ہو جائے تو آگے جاتے جاتے وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس معاملے میں ایسا ہوا تو ذمے دار میں ہوں گا۔"

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ دل سے اسلام قبول کر لے۔" نصیر نے دلیل دی۔

"بالکل ممکن ہے لیکن یقین سے تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ میرا بھی کبھی پورے وثوق سے یہ دعویٰ نہیں کر سکے گی۔ اس لئے کہ یہاں درمیان میں محبت ہی ہے، جو ایک بہت طاقتور جذبہ اور محرک ہے۔ محبت تو آدمی سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ میرا تمہاری محبت میں اسلام قبول کر لے لیکن بعد میں اس کا دل سچ مچ روشن ہو جائے۔"

"ممکن ہے لیکن یقینی نہیں اور میں اتنے بڑے معاملے میں رسک نہیں لے سکتا۔ دیکھو، میرا مسلمان ہو جائے اور مجھ سے شادی کر لے تو مجھ پر ذمہ داری ہوگی کہ میں اسے اسلامی شعائر سے روشناس کراؤں۔ اسے دینی تعلیم دوں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے مکمل تربیت کی ضرورت ہوگی اور بچے کی تربیت آسان ہوتی ہے کہ اس کا ذہن سادہ ٹیپ کی طرح ہوتا ہے جس پر کبھی کچھ ریکارڈ نہ ہوا ہو۔ حالانکہ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ ہر بچہ اپنے ساتھ اپنا پس منظر لے کر آتا ہے۔ اس کے ساتھ غیر شعوری ریکارڈنگ کی شکل میں نسلوں کا ورثہ ہے۔ ماں باپ، ننھیال اور ددھیال کے امتزاج سے اس کی فطرت بنتی ہے۔ میرا کو جو پیدائشی طور پر ہندو ہے اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتی آتی ہے، بدل دینا کوئی آسان کام نہیں ہوگا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں، یہ انسان کے بس کا کام ہی نہیں۔ صرف اللہ کی ہدایت ہی کسی کو بدل سکتی۔ یار سوچو تو ہندو دھرم دنیا کا سب سے زیادہ غیر منطقی مذہب ہے۔ دلیلوں سے اسے ہزار بار لغو اور غیر منطقی ثابت کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس بیسویں صدی میں بھی لوگ معقولیت سے صرفِ نظر کرکے اس دھرم سے چمٹے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کے اندر پشت ہا پشت کی تاریخ موجود ہے۔ ان کا ذہن اپنے دھرم کی ہر نامعقولیت کو سمجھتا ہے لیکن دل پر پچھلی نسلوں کی تربیت کی مہر لگی ہوئی ہے اور اس مہر کو صرف اللہ توڑ سکتا ہے۔"

"یار...... خدا کے لیے بس کرو۔" نصیر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "اتنی ثقیل تقریر کر ڈالی تو نے۔ بھائی، میں بھی اپنی تجویز سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

"یہ غلط ہے۔" منصور نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بات دلیل سے قائل کرنے کی ہو رہی ہے۔ مقابلہ ڈرا نہیں ہو سکتا۔ جوابی دلیل لاؤ۔ ورنہ ہار مان لو۔"

"بھائی، میں نے ہار مان لی۔ تم باتیں ہی اتنی بڑی کر جاتے ہو کہ دلیل دینے کی ہمت نہیں رہتی۔"

منیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "بھائیو...... میں اعلان کرتا ہوں کہ اس مناظرے میں منصور صدیقی کامیاب ہوئے ہیں۔" اس نے اناؤنسر کے سے انداز میں کہا۔

چاروں دوست ہنسنے لگے۔

"اور اس خوشی میں منصور صدیقی ہم سب کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائیں گے۔" منیر نے مزید کہا۔

"وہ تو پلانی پڑے گی۔ ہمارا دماغ پچی کر کے رکھ دیا ہے اس نے۔" نصیر بولا۔

منصور مسکراتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔

O=========== ☆ ===========O
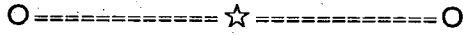
ہفتے کے دن منصور، میرا کو پڑھانے کے لیے گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میرا پہلے سے وہاں موجود نہیں تھی۔ پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ درمیانی دروازے کا پردہ ہٹا اور کوئی اندر آیا۔ منصور نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا...... اور اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ وہ میرا تھی...... لیکن ایسی میرا کہ منصور کو آنکھوں دیکھی پر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ حیرت سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

"ہیلو۔ کہاں کھو گئے ہو آپ؟ کچھ بولو گے نہیں؟" میرا نے شوخ لہجے میں کہا۔

منصور کچھ کہنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کلاوتی کمرے میں آ گئی۔ "آگیا نانڈلا۔ کیسا ہے رے؟" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "تو بھی حیران ہے نا؟ یہ میرا پاگل بھی ہے اور ضدی بھی۔ بولنے لگی، اب میں فراکیں اسکرٹ نہیں پہنوں گی۔ میں نے بولا، کیوں نہیں پہنے گی۔ بولی، میرا من نہیں کرتا اب قمیض شلوار پہنوں گی۔ میں نے منع کر دیا۔ ہم لوگ کے ہاں شادی سے پہلے کا پہناوا یہی ہے۔ پر پتا ہے، اس نے کیا کیا؟" اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ اس میں کچھ برہمی بھی تھی، پیار بھی تھا۔ "اس نے سارے کپڑے کاٹ کر پھینک دیے...... تن کے کپڑوں کے سوا۔ میں ہار گئی اس کی ضد سے۔ کپڑا دلا کر لائی۔ اس نے خود سیئے ہیں کپڑے۔"

منصور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ خود کو چور سا محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کچھ کہنا بھی ضروری تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے سر اٹھایا۔ "مگر آنٹی، ایک بات تو ہے۔ میرا بہت اچھی لگ رہی ہے ان کپڑوں میں۔ ہے نا؟" اپنی آواز اسے خود اجنبی سی لگی۔

"اچھی تو لگے گی۔ میری میرا گھنتری سندر چھے۔" کلاوتی بولی۔ پھر اس نے غور سے منصور کو دیکھا۔ منصور کا چہرہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ "سوں چھے رہے نانڈلا۔" اس نے تشویش سے پوچھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے تیری؟"

"ٹھیک ہے آنٹی۔ بس سر میں کچھ درد ہے۔"

"میں ڈسپرن منگاتی ہوں اور ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

کلاوتی چلی گئی تو میرا نے کہا۔ "اب تو آپ میرے کو دیکھ سکتے ہو نا؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" منصور کی بوکھلاہٹ ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔

"پر آپ کے سر میں درد کیوں ہو گیا۔ آپ کو اچھا نہیں لگا میرا یہ کپڑے پہننا؟" میرا
بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

منصور نے چونک کر اسے دیکھا۔ "ارے نہیں پگلی۔ میں تو حیران ہوں' تم نے یہ
کچھ کیسے کیا۔ سر درد کا بہانہ ہے۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔"

میرا کھل اٹھی۔ "تو آپ کو اب میں اچھی لگی ہوں نا؟"

"دنیا میں کوئی کبھی اتنا اچھا نہیں لگا ہو گا' جتنی اچھی تم لگ رہی ہو لیکن یہ سب
نے.........."

"کبھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جو آپ مجھ سے کہو اور میں نہ کروں۔ آپ نے
بولا۔ میں نے کر لیا۔"

"لیکن آنٹی نے کیا سوچا ہو گا؟"

"آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ماں کو بتایا ہے کہ آپ نے مجھے ان کپڑوں سے منع
تھا۔" میرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں پریتم' آپ پر تو میں کبھی آنچ نہیں آنے دوں گی
میں نے ماں کو بولا کہ میں اب یہ کرپچنوں والے کپڑے نہیں پہنوں گی۔"

اسی وقت کلاوتی پانی' ڈسپرین اور چائے لے آئی۔

اس روز منصور کا دل میرا کو پڑھانے میں نہیں لگا۔ وہ بار بار میرا کو دیکھتا..........
سوچتا رہا۔ شہزاد' نصیر اور منیر سے اپنی گزشتہ روز کی گفتگو اسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ پھر اس
کی سماعت میں میرا کی آواز گونجتی.......... کبھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی' جو آپ مجھ سے
اور میں نہ کروں۔ وہ سوچ رہا تھا' یہ لڑکی واقعی میری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہ تو دل
اسلام بھی قبول کر سکتی ہے لیکن اس خیال سے بھی اسے طمانیت نہ ملتی۔ اس نے دوستوں
جو کچھ کہا تھا' دل کی گہرائی سے کہا تھا اور سمجھ کر کہا تھا۔ اس کے لیے وہ بچے بہت اہم تھے
کے بارے میں اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے نصیب میں ہیں بھی کہ نہیں......
اور ہیں تو کتنے ہیں؟ کتنے بیٹے ہیں اور کتنی بیٹیاں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہ سب کچھ قبل
وقت سوچ رہا ہے لیکن اس کے نزدیک یہ بات تھی بھی ایسی کہ اس کے متعلق قبل از وقت
سوچنا ضروری تھا۔

دوسری طرف وہ میرا کو دیکھتا تو اس پر بے ساختہ پیار آنے لگتا۔ سینے میں موج در موج
اس کی محبت اٹھتی.......... بپھرتی۔ سر پر دوپٹہ ڈالے' کرتے شلوار میں وہ اسے بے حد اپنی لگ
رہی تھی۔ اس کے اندر ملکیت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔

وہ میرا کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرا کی نظریں اٹھیں۔ ایک لمحے کو دونوں کی آنکھیں
ملیں۔ پھر میرا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اس کے رخسار گلابی ہو گئے تھے۔

"ارے.......... یہ تمہیں شرمانا کب سے آ گیا؟ پہلے تو تم کبھی نہیں شرمائیں۔" منصور
نے حیرت سے کہا۔ "تم تو مجھ سے دیکھنے کی فرمائشیں کرتی تھیں۔"

"آپ پہلے کبھی ایسے دیکھتے بھی تو نہیں تھے۔" میرا نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"یہ میرے دیکھنے کا نہیں' ان کپڑوں کا کمال ہے میرا۔ دوپٹہ سر پر آ جائے تو لڑکی کو لڑکی
ہونے کا احساس ہو جاتا ہے۔"

"سچ مچ مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔" میرا بولی۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ منصور کی نگاہوں میں وارفتگی تھی
اور میرا کی نگاہوں میں حجاب۔ بہتا وقت چپکے چپکے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

O============ ☆ ============O
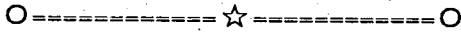
اس روز منصور کے پریکٹیکل نہیں تھے۔ وہ گھر آیا اور کھانا کھا کر میرا کے گھر کی طرف
چلا گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے میرا نے
پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں.........." منصور نے جواب دیا۔ وہ حیران تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

میرا نے دروازہ کھول دیا۔ "آ جاؤ پریتم۔"

منصور اندر داخل ہوا۔ میرا نے چٹخنی لگا دی۔ منصور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ گھر میں
اسے سناٹا محسوس ہوا۔ ذرا دیر بعد میرا آئی تو اس نے اس سلسلے میں اس سے استفسار کیا۔

"سب لوگ گئے ہوئے ہیں۔" میرا نے جواب دیا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے؟"

"بس شیام ہے۔"

"تو میں چلتا ہوں۔"

"نہیں نا۔ مجھے اسکول سے بہت کام ملا ہے میتھ میٹکس کا۔ انگریزی کا کام بھی ہے۔
میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ کروا دو نا۔"

"میں پھر آ جاؤں گا۔ کرا دوں گا۔"

"کب آ جاؤ گے۔"

"جب آنٹی آ جائیں گی۔"

"وہ تو رات تک ہی آئیں گی۔"

منصور پریشان ہو گیا "یہ تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی۔" وہ بڑبڑایا۔

"گڑبڑ کیا ہو گئی۔ بس آپ مجھے پڑھا دو۔" میرا نے اطمینان سے کہا۔ "ماں لوگ کے نہ
ہونے سے کیا ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ اکیلے گھر میں اچھا نہیں لگتا۔ مناسب نہیں ہے۔"

میرا نے اسے صوفے پر دھکیل دیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "بس.......... آپ بیٹھ جاؤ
چپ چاپ۔ آج مجھے ضرورت ہے تو آنکھیں پھیر رہے ہو۔"

"لیکن میرا........"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ گھر میں شیام تو ہے۔"

منصور نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔ وہ عجیب سی بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ دوسری طرف جب میرا نے اسے صوفے پر دھکیلا تھا تو اس کے ہاتھوں کے دباؤ سے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ وہ ایک نئی کیفیت سے دو چار تھا' جسے وہ پوری طرح نہیں' البتہ کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ آج اس کی آزمائش کا وقت آگیا ہے۔

"اچھا' ٹھیک ہے۔ اسکول کا کام لے کر آؤ۔" اس نے کہا

"ابھی لائی۔" میرا نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ اپنا بیگ لے کر واپس آئی اور بیگ میں سے الجبرا کی کتاب نکال کر منصور کی طرف بڑھا دی۔ "ایکسر سائز 4.3 ہے........ فیکٹرز کی۔" اس نے کہا اور بیگ سے اپنی کاپی اور قلم بھی نکال لیا۔

منصور نے کتاب کھول کر مشق نمبر 4.3 نکالی۔

"آپ میری ایک بات مانو گے؟" میرا نے اچانک پوچھا۔

منصور نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"آج پریکٹس پر نہیں جانا۔ یہاں میرے ساتھ ہی رہنا۔" میرا کے لہجے میں التجا تھی۔

"یہ........ یہ تو ناممکن ہے۔"

"کیوں؟"

"لڑکے کیا سوچیں گے؟"

"سوچنے دو۔ میں آپ کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ آپ میرے لیے ایک دن کرکٹ نہیں چھوڑ سکتے۔" میرا نے تیز لہجے میں کہا۔

"میرا........ میں انہیں وجہ کیا بتاؤں گا۔ یہ کہوں گا کہ میں میرا کے ساتھ بیٹھا ہوں اس لیے پریکٹس پر نہیں چل سکتا۔" منصور نے بے بسی سے کہا۔ ویسے میرا نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ اس کے کہنے پر اپنا پہناوا چھوڑ بیٹھی تھی اور اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ماں باپ اور گھر والے کیا سوچیں گے۔

"آپ انہیں زبانی کوئی وجہ نہیں بتاؤ گے۔" میرا بولی۔ "آپ کا گھر ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ آپ ابھی ایک پرچے پر لکھ دو کہ ایک ضروری کام سے جا رہے ہو۔ شیام وہ پرچا گھر رکھ آئے گا۔"

"لیکن میرا........"

"بس' آپ کو میری یہ بات ماننا ہوگی۔" میرا نے تنک کر کہا۔ "اب جلدی سے پرچا لکھ دو۔"

منصور کے لیے وہ دن ہی بے بسی کا تھا۔ "پرچا لکھنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں نہیں ملوں گا تو لڑکے خود ہی یہ بات سمجھ جائیں گے۔"........

"تو پھر اتنی حجت کیوں کر رہے تھے؟" میرا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ منصور خاموش رہا۔ میرا کا لہجہ بجھ سا گیا۔ "میں سمجھ گئی۔ میرے پاس بیٹھنے کو آپ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہے نا؟"

"نہیں میرا' یہ بات نہیں' تم جانتی ہو کہ مجھے یہاں آنا' تمہارے پاس بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"بات یہ ہے........ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ میرا۔ دیکھونا۔ ہم اکیلے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے........"

"مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ میں آپ کو کھا جاؤں گی کیا؟"

"نہیں۔ میرا........ مجھے خود سے ڈر لگتا ہے۔"

"ہاں۔ آپ کو اپنے آپ سے ڈرنا بھی چاہیے۔ میرے حصے کا ڈر بھی آپ کا ہے۔"

"کیا مطلب؟" منصور نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب بعد میں بتاؤں گی اور ایک بات بتاؤں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ خود سے ڈرتے ہو۔ خود سے ڈرنے والا آدمی غلط راستے پر نہیں جاتا۔ اسے صرف اس وقت خود پر اعتبار ہوتا ہے' جب وہ سیدھے راستے پر چل رہا ہوتا ہے۔"

"اے میرا........ یہ سب باتیں کون بتاتا ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں۔ میرے من میں خود بخود آتی ہیں۔ غلط تو نہیں ہوتیں؟"

"غلط ہوتیں تو مجھے حیرت کیوں ہوتی۔" منصور نے کہا۔ "اچھا........ بہت ہوگئی۔ اب کام کی بات کرو۔ اس ایکسر سائز میں کون سا سوال نہیں آتا تمہیں؟"

"ایک بھی نہیں آتا۔"

"حیرت ہے۔ سارے فارمولے تو میں تمہیں سکھا چکا ہوں۔ اس مشق میں ملے جلے سوال ضرور ہیں لیکن ہر سوال پر ان میں سے کوئی نہ کوئی فارمولا ضرور اپلائی ہوتا ہے' جو میں تمہیں کرا چکا ہوں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ بس مجھ سے کوئی سوال نہیں ہوتا۔"

منصور اسے سوال سمجھانے بیٹھ گیا۔ مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہے۔ اس نے ایک دو بار ٹوکا مگر میرا نے اسے یقین دلا دیا کہ سوال اس کی سمجھ میں آ رہے ہیں۔ سوال سمجھنے کے لیے میرا کاپی پر جھک آئی تھی۔ دونوں کے سر تقریباً ملے ہوئے تھے۔ ایک بار دونوں نے بیک وقت نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ سانسیں گویا سانسوں کو چھو رہی تھیں۔ دونوں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں مگر منصور ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اب اس کے لیے میرا کو سوال سمجھانا تو درکنار خود سمجھنا بھی دشوار ہوگیا تھا۔ دل و دماغ کی' جسم کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کاپی پر جھکی میرا

اسے ایک درخت کی پھلوں سے لدی......... پھلوں کے بوجھ سے جھکی شاخ کی یاد دلا رہی تھی۔

اسے ایک واقعہ یاد آگیا۔ یاد کیا آگیا' ماضی کا وہ پورا منظر اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔

اس کی عمر چھ سات سال رہی ہوگی۔ وہ گلی سے گزر رہا تھا۔ گلی میں ایک مکان کے اندر دیوار کے بالکل ساتھ امرود کا ایک درخت تھا' جس میں امرود ہمیشہ بھر کر آتے تھے۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے ایک شاخ نظر آئی' جو امرودوں کے بوجھ سے گلی میں جھک آئی تھی۔ اتنی کہ کوئی پورا آدمی صرف ہاتھ بڑھا کر امرود توڑ سکتا تھا۔ منصور نے اندازہ لگایا کہ ذرا سا اچھل کر وہ بہ آسانی امرود توڑ سکتا ہے۔ اس نے ہلکی سی جست لگائی لیکن اس کا ہاتھ سب سے نیچے والے امرودوں سے ذرا پیچھے رہ گیا۔ دوسری بار وہ زیادہ اچھلا' اس کا ہاتھ شاخ تک پہنچا۔ اس نے شاخ کو ہاتھ کی گرفت میں لیا۔ نیچے آتے ہوئے اس کا ہاتھ امرودوں سے ٹکرایا' امرود پک چکے تھے۔ تین امرود ٹوٹ کر نیچے گرے۔ وہ امرود اٹھانے کے لئے جھکا اور امرود ہاتھ میں لیے سیدھا کھڑا ہوا تو اسے اپنے قریب ہی ابا جان کھڑے نظر آئے۔ اس نے جلدی سے سلام کیا۔ ابا جان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کر رہے ہو بیٹا۔"

"یہ امرود توڑے ہیں میں نے؟ اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"لیکن منصور' یہ تو بری بات ہے۔"

منصور کو یاد تھا کہ اسی گھر کے دروازے پر اس گھر کی خاتون ایک دن ایک لڑکے کو سمجھا رہی تھیں کہ بیٹا' ویسے جتنے چاہے امرود توڑ لو' لیکن پتھر مار کر نہ توڑا کرو۔ گھر میں بچے ہیں کسی کے پتھر لگ گیا تو کیا ہوگا۔ چنانچہ منصور نے اسی حوالے سے جواب دیا۔ "لیکن ابا جان میں نے یہ امرود پتھر مار کر نہیں گرائے ہیں۔ اچھل کر اس شاخ سے توڑے ہیں۔" اس نے شاخ کی طرف اشارہ کیا "اور پتھر مار کر پھل توڑنا بری بات ہوتی ہے۔"

"جو تم نے کیا' وہ بھی غلط ہے بیٹے!" ابا جان نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو' یہ درخت جس کے گھر میں ہے اسی کا ہے۔ پھل بھی اسی کے ہیں۔ تم ان کی اجازت کے بغیر پھل توڑو گے تو یہ چوری ہوگی اور چوری بری بات ہے۔ ہاں......... اپنا درخت ہو تو اس پر تمہیں پورا حق ہوگا۔ جس طرح چاہو' پھل توڑو۔"

منصور کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ اس نے شرمندگی سے اپنے ہاتھ میں موجود امرود کو دیکھا۔ "تو ابا جان' میں ان کا کیا کروں؟ یہیں چھوڑ دوں؟" اس نے پوچھا۔

"اس صورت میں تمہارا جرم اپنی جگہ رہے گا۔ کوئی اور اٹھا کر لے گیا تو یہ تمہاری ذمے داری ہوگی۔ یہ امرود توڑے تو تمہی نے ہیں نا؟"

منصور کا ننھا سا ذہن الجھ گیا تھا۔ "ابا جان۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" اس نے بے بسی سے پوچھا۔

"بیٹے۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس درخت کے مالک سے معافی مانگتا اپنی غلطی کی اور امرود انہیں ہی دے دیتا۔" یہ کہہ کر ابا جان چلے گئے۔

منصور انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے امرود کے درخت والے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ منصور نے اسے سلام کر کے کہا۔ "خالہ......... مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے یہ امرود توڑے ہیں آپ کے درخت سے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے امرود اس کی طرف بڑھا دیے۔

"تو بیٹا......... کوئی بات نہیں۔ یہ تم میری طرف سے رکھ لو۔" عورت نے کہا۔

"نہیں خالہ' ابا جان کہتے ہیں کہ کسی سے کچھ مانگنا یا لینا بری بات ہے۔"

عورت نے ہاتھ بڑھا کر امرود لے لیے۔ "تم ماسٹر صاحب کے بیٹے ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرا نام منصور ہے۔"

"ماشاء اللہ' کیسی اچھی تربیت کر رہے ہیں' ماسٹر صاحب بیٹے کی۔"

منصور گھر پہنچا تو ابا جان گھر پر نہیں تھے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں امرود کا ایک پودا تھا' جس کی مٹی میں لپٹی ہوئی جڑیں خاکی کاغذ کے ایک لفافے میں چھپی ہوئی تھیں۔ انہوں نے منصور سے کہا۔ "یہ میں تمہارے لیے امرود کا پودا لے آیا ہوں۔ زمین کھودو' اسے لگاؤ۔ ہر روز صبح' شام اسے پانی دو' اس کا خیال رکھو۔ محنت کرو' صبر سے کام لو اور انتظار کرو۔ انشاء اللہ یہ درخت تمہیں بہت میٹھے پھل دے گا اور ہاں......... ایک وعدہ کرو۔ اس درخت میں امرود آنے تک تم امرود نہیں کھاؤ گے۔ بازار سے خرید کر بھی نہیں۔"

منصور کو اب بھی یاد تھا کہ کتنا عرصہ وہ امرود کھانے کو ترستا رہا تھا اور جب درخت میں پہلی بار امرود لگے تھے تو ابا جان نے کہا تھا "لو بھئی......... تمہارا درخت پھل دینے لگا ہے۔ اب جیسے چاہو امرود توڑو اور کھاؤ......... یہ تمہاری اپنی چیز ہے۔"

اور اندر سے سرخ ان امرودوں کا ذائقہ اور مہک منصور کو اب بھی یاد تھی۔ وہ درخت اب بھی پھل دے رہا تھا۔ کہتے ہیں لال امرودوں میں کیڑا بہت آسانی سے لگ جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔

"کہاں کھو گئے پریتم؟" میرا نے منصور کو چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔ ابا جان یاد آگئے تھے۔" منصور نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

مشق مکمل کرا کے اس نے کتاب میرا کی طرف بڑھائی۔ کتاب کے تبادلے کے دوران ان کے ہاتھ آپس میں ملے۔ منصور کے پورے جسم میں وہ لمس کرنٹ کی طرح دوڑ گیا۔ وہ لمحہ جیسے ٹھہر گیا۔ کتاب بیک وقت دونوں کے ہاتھوں میں تھی اور دونوں کے ہاتھ آپس میں ملے ہوئے تھے' پھر دونوں ہی کے ہاتھ لرزے......... اور کتاب گر گئی۔ دونوں اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو ان کے سر ٹکرا گئے۔ میرا نے لرزتے ہاتھوں سے کتاب اٹھائی اور میز پر رکھ دی۔

"میرا......... مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔" منصور نے کہا لیکن اسے خود اپنی آواز اجنبی

لگی۔

میرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بدن میں خفیف سی لرزش تھی، جو منصور کی نظروں
چھپی نہ رہ سکی۔ اس کا اپنا حال بھی عجیب تھا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ وہ اپنے ہا
کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا کے جانے کے بعد اس نے گھڑی میں
دیکھا۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔

میرا اس کے لیے پانی لائی۔ گلاس منصور کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اس کے
میز پر رکھ دیا۔ منصور کو اس کی وجہ معلوم تھی۔ خود اس کے ہاتھ ابھی تک یوں لرز رہے
جیسے ان میں میرا کے ہاتھ کا لمس اب بھی تھرک رہا ہو۔

میرا گلاس رکھ کر جانے لگی تو منصور نے پوچھا۔ "اب کہاں چل دیں؟"

"آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

منصور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ ذرا دیر بعد برابر و
کمرے سے میرا کی آواز سنائی دی۔ "سانجھ ھی گئی رے شیامو۔ اب اٹھ جا۔ گوشت تر
لے آ بازار سے۔"

"اٹھتا ہوں دیدی!" شیام نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

کچھ دیر بعد میرا چائے لے آئی اور اس کے سامنے بیٹھ کر خود بھی چائے کے چھ
چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ اب وہ خود پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔ شیام منہ ہاتھ دھو کر
سے خشک کرتا ہوا آیا۔ "دیدی، لاؤ پیسے دو۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ بولو........ کیا کیا لاؤں۔

میرا نے مٹھی میں دبا سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "آدھا کلو گوشت۔ دو رو
ٹماٹر ہرا دھنیا اور ایک کلو لوکی لے آنا۔"

شیام چلا گیا۔ میرا نے جا کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ پھر وہ دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھ
چائے کی پیالی اٹھالی۔

منصور سے رہا نہیں گیا۔ "ارے........ تم لوگ گوشت کھاتے ہو؟" اس نے
سے پوچھا۔

"ہاں، ہم لوگ بکری کا گوشت کھاتے ہیں۔ مرغی مچھلی بھی کھاتے ہیں۔ پر کٹر ہند
بالکل نہیں کھاتے۔"

"مجھے حیرت ہوئی یہ سن کر۔"

"بکری کا گوشت تو انڈیا میں بھی کھاتے ہیں ہندو لوگ۔" میرا نے چائے کی پیالی خ
کے میز پر رکھ دی۔ "آپ میرے ساتھ برابر والے کمرے میں چلو۔"

"کیوں؟" منصور گھبرا گیا۔

"چلو نا۔ کھا نہیں جاؤں گی آپ کو۔ کچھ دکھانا ہے۔"

وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کمرے میں گیا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس

دیوار کے ساتھ ایک پرانے طرز کی مسہری رکھی تھی۔ مسہری کے ایک طرف اسٹیل کی الماری
تھی۔ مسہری کے اس طرف دیوار سے لگی ایک ڈائننگ ٹیبل تھی، جس کے تین طرف پانچ
کرسیاں تھیں۔ میز کی چوتھی سائیڈ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ "آپ یہاں مسہری پر بیٹھو۔ میں
ابھی آئی۔" میرا نے دوسرے دروازے سے جاتے ہوئے کہا۔ اس دروازے سے نکلتے ہی
بائیں جانب کچن کا دروازہ تھا۔ میرا کچن میں چلی گئی۔

مسہری پر بیٹھنے کے بعد منصور کو حیران کن چیز نظر آئی۔ ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ والی
دیوار اور ڈرائنگ روم اور اس کمرے کی مشترکہ دیوار پر دو کیلیں گاڑ کر ایک ڈوری باندھی گئی
تھی اور پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ چھوٹی سی تکونی جگہ تھی، جو پردے کی اوٹ میں تھی۔ منصور کو
تجسس ہونے لگا۔

میرا کچن سے پیتل کی ایک تھالی لے کر آئی۔ تھالی پر ایک کٹوری رکھی تھی اور ایک
پلیٹ تھی، جس پر پچ رنگی مٹھائی رکھی نظر آ رہی تھی۔ تھالی پر ایک ماچس بھی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" منصور نے پوچھا۔

"دیوا بتی کر رہی ہوں۔"

"یہ دیوا بتی کیا ہوتی ہے؟"

"ابھی دیکھ لینا۔"

میرا نے بڑھ کر تکونے گوشے کا پردہ سرکایا۔ وہاں دیوار پر کافی نیچا ایک کارنس بنا تھا۔
کارنس پر کچھ عجیب الخلقت دیوی دیوتاؤں کی فریم شدہ تصویریں رکھی تھیں۔ کارنس کے نیچے
کچھ کٹوریاں رکھی تھیں۔ ایک طرف مٹی کے کچھ چراغ تھے۔ میرا نے تھالی پر رکھی کٹوری سے
چراغوں میں تیل ڈالا۔ پھر ماچس اٹھائی اور چراغ جلا دیے۔ تیل کی کٹوری اور ماچس وہیں چھوڑ
کر اس نے وہ جلتے ہوئے چراغ تھالی پر پلیٹ کے دونوں طرف رکھے۔ کارنس کے نیچے رکھی
کٹوریوں میں سے ایک کٹوری تھالی پر رکھنے کے بعد وہ تھالی اٹھا کر منصور کی طرف بڑھی۔
منصور حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منصور کے قریب آ کر میرا نے تھالی کو اس کے سینے کی سطح پر
رکھتے ہوئے ایک دائرے میں اوپر کی طرف گھمایا۔ اوپر وہ تھالی کو اس کے سر سے ذرا اوپر تک
لے جا کر اس کے داہنے کندھے سے نیچے لے آتی تھی۔ ایسا اس نے سات بار کیا۔ منصور اس
قدر حیران تھا کہ احتجاج بھی نہ کر سکا۔

پھر میرا نے تھالی اس کے پیروں کی طرف رکھی اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ لیے۔ اس کے ہونٹ ہل
رہے تھے لیکن آواز نہیں تھی۔ منصور گنگ بیٹھا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

چند لمحے بعد میرا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے تھالی میں رکھی کٹوری میں اپنے
داہنے ہاتھ کا انگوٹھا ڈالا۔ اس کٹوری میں کوئی سرخ سی چیز تھی۔ پھر میرا نے اسی انگوٹھے سے
منصور کی پیشانی سے بالوں کی جڑوں تک ایک لکیر سی کھینچ دی۔ پھر اس نے اس کے پیر پکڑ

لیے۔

منصور جیسے کسی ٹرانس سے باہر آگیا۔ "کیا کرتی ہو میرا' یہ سب کیا ہے؟" اس کے لہ
میں جھنجلاہٹ تھی۔

"آرتی اتاری ہے تمہاری۔ پہلے ہر روز بھگوان کی آرتی اتارتی تھی۔ آج تمہاری آرتی
اتاری ہے۔ تمہیں بھگوان تو پہلے ہی مان چکی ہوں اپنا۔"

منصور حیران رہ گیا۔ یہ کیسی محبت ہے؟ یہ محبت کا کون سا درجہ ہے؟ اس نے سوچا۔

"اچھا......... اب ہٹو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "اور یہ میری پیشانی پر کیا لگایا ہے تم نے؟"

"یہ تلک ہے۔ پلیز......... اسے ذرا دیر رہنے دو۔ پھر بے شک پونچھ لینا' پھر تمہارے
ماتھے پر میرے پیار کا یہ سورج ہمیشہ چمکتا رہے گا۔"

"تو یہ ہے دیوا بتی اور بھگوان کی آرتی کیسے اتارتی ہو تم؟"

"جیسے تمہاری آرتی اتاری ہے۔" میرا نے کہا۔ "بھگوان کی پیشانی دیکھونا۔"

منصور نے کارنس پر رکھی تصویر کو دیکھا۔ تصویر کے ماتھے پر سرخ نشان چمک رہا تھا۔

"اس کے بعد تم کیا کرتی ہو؟"

"ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ میرا من میت مجھے دے دے۔" میرا
نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ بھگوان
میری نہیں سن سکتا اس لیے آج تمہاری آرتی اتاری ہے۔ تم سے پرارتھنا کی ہے۔ جانتی ہوں'
تم مجھے وہ سب کچھ دے سکتے ہو' جو میں چاہتی ہوں۔ تمہارے اختیار میں ہے سب کچھ........."

"یہ کفر ہے۔ میں نہیں سن سکتا۔" منصور نے اسے ٹوک دیا۔ "سب کچھ اللہ کے
اختیار میں ہے۔ بندے کا اختیار تو بس ایک خود فریبی ہے۔ سب کچھ اللہ کی مرضی سے
ہوتا ہے۔ وہ اللہ جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ جو ہر جگہ موجود ہے۔ آدمی کے اندر' رگ جاں سے
بہت قریب......... جو سب کچھ سنتا' سب کچھ دیکھتا......... اور سب کچھ جانتا ہے۔ جس سے
کچھ بھی چھپا نہیں۔ جو دلوں کا حال بھی جانتا ہے۔ میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں اور پھر یہ تو
بتاؤ' تم چاہتی کیا ہو؟"

"مجھے ایک چھوٹا سا گھر چاہیے......... تمہارے ساتھ......... صرف تمہارے ساتھ۔"

"یہ ناممکن ہے میرا!" منصور نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "میں اعتراف کرتا ہوں کہ
مجھے تم سے محبت ہے لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ اس لیے کہ میں بہرحال سچ بولوں گا اور میرا جواب تمہاری دل
آزاری کا باعث ہوگا۔"

"پھر بھی۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

منصور نے وہ سب کچھ اسے کہہ سنایا' جو دوستوں سے کہا تھا۔ ہر دلیل اس کے گوش

زار کر دی۔

میرا نے افسردگی سے اسے دیکھا۔ "تم نے اپنے طور پر ٹھیک سوچا۔" اس کے لہجے میں
افسردگی تھی۔ "اس لیے کہ تم بہت کچھ نہیں جانتے۔ تم ہندو عورت کو نہیں سمجھتے۔ میں
نے کہیں پڑھا تھا کہ مختلف قوموں کی عورتوں کی کیا خصوصیات ہیں۔ لکھا تھا کہ ہندو عورت کا
خمیر محبت سے اٹھا ہے۔ وہ صرف محبت کے لیے بنائی گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو کچھ لکھا
گیا' وہ کم تھا۔ میں اپنے من کے حوالے سے سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے' محبت ہمارا دھرم
ہے۔ پریمی ہمارا بھگوان ہوتا ہے۔ ہم من ہارتے ہیں تو تن' دھن اور دھرم سب اسی کے نام کر
دیتے ہیں۔ اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہی تھی کہ تمہیں اپنے آپ سے بہت زیادہ ڈرنا
چاہیے۔ اس لیے کہ میرے حصے کا ڈر بھی تمہارا ہے۔ پریتم' میں سچ کہہ رہی ہوں' آپ کا ہر
اشارہ میرے لیے بھگوان کا حکم ہے۔ یہ تو میرے بھاگوں کا کرم ہے کہ میرے من میں آپ
جیسے دیوتا پریمی نے پریم جوت جگائی۔ ورنہ جتنا سمے ہم نے اکیلے گزارا ہے' اس میں کچھ بھی ہو
جاتا۔ جانتے ہو' ہمارا شرم و حیا کا تصور مختلف ہے۔ دیوتا بے حیائی کو حیا کہے تو میرے لیے وہ حیا
ہی سب سے بڑی بلندی ہوگی۔ سمجھ رہے ہو نا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ تم کو اپنے آپ سے بھی
ڈرنا ہوگا اور مجھ سے بھی۔ میں آپ کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی۔ مجھ سے کوئی ایسی بات کبھی
نہیں کہنا' جس پر آپ کو بعد میں پچھتاوا ہو۔ ہاں......... مجھے کبھی کسی بات پر پچھتاوا نہیں
ہوگا۔"

منصور کو اپنے قدموں میں بیٹھی اس لڑکی سے خوف آنے لگا۔ اتنی محبت تو آدمی کو تکبر
میں مبتلا کر سکتی ہے......... جہنم رسید کر سکتی ہے۔ "اچھا......... اب تم اٹھ تو جاؤ یہاں سے۔"
اس نے کہا۔

"ایسے تو نہیں اٹھوں گی میرے بھگوان' پوجا کی ہے آپ کی۔" وہ اس کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے بولی۔ "اپنے ہاتھوں سے مجھے پرشاد دو۔ مجھے آشیرواد دو کہ میری منو کامنا پوری
ہو۔"

"پرشاد؟"

"ہاں۔ یہ پوجا کا پرشاد ہے۔" میرا نے تھالی میں رکھی مٹھائی کی طرف اشارہ کیا۔

منصور نے پیچ رنگی برفی کی ایک ڈلی اس کی طرف بڑھائی۔

"ایسے نہیں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤ۔" میرا نے کہا اور منہ کھول دیا۔ منصور نے
برفی کا ٹکڑا اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ میرا نے آدھا ٹکڑا کاٹ لیا۔ پھر وہ بولی۔ یہ تم کھالو۔"

"یہ میں نہیں کھا سکتا۔" منصور نے کہا۔ "بس اللہ سے دعا ہے کہ تمہاری آرزو ہم
دونوں کی بہتری اور عافیت کے ساتھ پوری کرے۔"

"ٹھیک ہے' میں ضد نہیں کروں گی۔"

اسی وقت منصور نے الماری کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کی پیشانی پر تلک بہت

عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار پیشانی کی طرف گیا۔ "ٹھہرو' میں صاف کر دیتی ہوں۔" میرا نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنے دوپٹے سے اس کے ماتھے پر لگے تلک کو صاف کرنے لگی۔ پھر اس نے اچانک ہی منصور کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ پھر وہ دوپٹے کے اس کونے کو بے تابانہ چومنے لگی' جہاں تلک کا رنگ لگ گیا تھا۔ "اب تمہارے ماتھے پر میرے پیار کا سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا...... میرا...... تمہارے پاگل پن سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔" منصور نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔

"پاگل تو تم ہو۔ پیار سے ڈرتے ہو۔ ارے۔ یہ دولت تو بھاگ والوں کو ملتی ہے۔" میرا نے کہا۔ وہ تھالی اٹھا کر پوجا پاٹ والے کونے میں لے گئی۔ وہاں سے اس نے تیل کی کٹوری اٹھا کر تھالی میں رکھی اور چراغ اور رنگ والی کٹوری کارنس کے نیچے رکھ دی۔ تھالی واپس اٹھا کر اس نے پردہ برابر کر دیا۔ تھالی لا کر اس نے میز پر رکھ دی۔

"آؤ۔ اب کمرے میں چلیں۔" اس نے منصور کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

دونوں ڈرائنگ روم میں اپنے اپنے صوفے پر آبیٹھے۔ "اور بتاؤ' کیا پڑھنا ہے؟" منصور نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس باتیں کرنی ہیں۔" میرا مسکرائی۔

"ابھی کچھ باقی ہے؟"

"بہت کچھ باقی ہے ابھی تو۔ مجھے آپ کو بتانا ہے کہ میں آپ کے لیے اپنا دھرم بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ آدھا تو آج ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ تو میں جان گیا ہوں۔" منصور نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسا تم میری محبت کی وجہ سے کرو گی۔ آدمی اللہ کی محبت میں' اللہ کے خوف کے تحت اسلام قبول کرے تو بات بنتی ہے۔ نام کا مسلمان بننے سے کیا فائدہ؟"

"تو آپ بھی تو نماز نہیں پڑھتے' مگر مسلمان ہو۔" میرا نے بے ساختہ کہا۔

منصور کی زندگی میں شرمندگی کا ایسا بھرپور لمحہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کا سر جھک گیا۔ یہ بات...... اور وہ بھی ایک ہندو لڑکی کے منہ سے۔ میرا نے صاف صاف تو کہہ دیا تھا کہ اسلام قبول کرنے کی صورت میں وہ بھی کم از کم اتنی مسلمان تو ہوگی' جتنا وہ ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

میرا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ "آپ کی قسم' میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا" وہ بولی۔ "میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ نماز پڑھا کریں۔ آپ جانتے ہو' ہم...... سارے ہندو لوگ آپ لوگ کو نماز کے وقت نماز نہ پڑھتے دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ میرے گھر کے لوگ بھی۔ اور آپ کے معاملے میں مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔"

منصور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ میرا۔ اب میں انشاء اللہ نماز

ادا کروں گا۔"

"مجھے بہت خوشی ہوگی...... سچ" وہ بولی پھر افسردہ ہو گئی۔ "مگر آپ مجھ سے شادی تو نہیں کرو گے!"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں میرا' یہ ممکن نہیں لیکن میں تم سے محبت پر مجبور ہوں۔"

"میرے لیے یہی بہت ہے۔" میرا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میرے من میں اب کوئی آپ کے سوا نہیں آسکتا۔ میں آخری سانس تک آپ سے محبت کروں گی اور محبت کرنے والے کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ آج کے بعد وہ ہر کام سیکھنے کی کوشش کروں گی' جسے آپ ضروری سمجھتے ہو۔ میں وہ سب کچھ کروں گی' جو آپ کو اچھا لگتا ہے۔ میں ویسی بننے کی کوشش کروں گی' جیسا آپ اپنی بیوی کو دیکھنا چاہتے ہو۔ میں سب کچھ سیکھوں گی......"

"کچھ میں بھی سیکھنا چاہتا ہوں تم سے۔"

"میں؟ میں آپ کو کیا سکھا سکتی ہوں پریتم!"

"میں تم سے گجراتی سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"سچ؟" میرا کھل اٹھی۔ "میں ضرور سکھاؤں گی۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ شیام آگیا تھا۔

وہ دن منصور کی زندگی کا یادگار دن ثابت ہوا۔ اس نے اسی روز سے نماز شروع کر دی۔ پنج وقت نماز تو وہ قائم نہ کر سکا لیکن ہر روز دو تین نمازوں کی سعادت اسے بہرحال مل جاتی تھی۔ اب وہ میرا کو پڑھانے کے دوران اٹھ کر عشاء کی نماز کے لیے جاتا تھا۔ میرا اس کی اس تبدیلی سے واقعی بہت خوش تھی۔

O=========== ☆ ===========O

اکتوبر 1985ء

وہ جمعے کی شام تھی...... اور منصور جمعے کو شاردا کو نہیں پڑھاتا تھا۔ اس لیے شیام اسے بلانے آیا تو اسے حیرت ہوئی۔ "آپ کو ماں بلاتی ہے۔" شیام نے کہا۔

"تم جاؤ۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔" منصور نے جواب دیا۔

وہ اس وقت گھر میں اکیلا تھا اور پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ پودوں کو پانی دینے کے بعد اس نے ہمیشہ کی طرح دروازے کی باہر سے صرف کنڈی لگائی اور میرا کے گھر کی طرف چل دیا۔

ان پانچ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا...... بہت کچھ آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ خود تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب معروف تعمیراتی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ صرف دو برس میں کمپنی میں اس نے اپنی ساکھ بنا لی تھی۔ وہ ذہین بھی تھا اور محنتی بھی۔ اس میں آگے بڑھنے کی لگن بھی تھی۔ دیانت داری ایک اضافی وصف تھا جو عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے کمپنی کے مالکان اسے بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

میرا نے گزشتہ سال بی اے کر لیا تھا اور اب ایک امپورٹ ایکسپورٹ فرم میں اسٹینو

گرافر کی حیثیت سے جاب کر رہی تھی۔ تارا نے اس سال بی اے کا امتحان دیا تھا۔ شاردا نو
میں پڑھ رہی تھی اور منصور اسے پڑھاتا تھا۔

پانچ برسوں میں سب کچھ بدل گیا تھا لیکن منصور اور میرا کے معاملات محبت جوں کے
توں تھے۔ دونوں کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس عرصے میں میرا کے گھر منصور کا
جانا اور بڑھ گیا تھا۔ انہیں تنہائی میں ملنے کے مواقع ملتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی ایک دوسرے
ہاتھ تھامنے کی بے تکلفی سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ میرا نے کئی بار شادی کے متعلق بات کی
تھی مگر منصور اپنے موقف پر قائم تھا۔ ایسی ہی ایک گفتگو کے دوران اس نے میرا سے کہا تھا
"میں نے سنا ہے......... اور میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ آدمی کو اپنا مذہب بہت عزیز ہو
ہے۔ چاہے مذہب سے اس کا تعلق برائے نام ہو۔ چاہے وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو لیکن وہ اسے
ترک بہرحال نہیں کرتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے' جب تم اپنا دھرم چھوڑنے کی بات کرتی ہو۔"

"آپ کبھی مجھ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے پریتم۔ سمجھو گے بھی نہیں۔ اس لیے
کہ آپ بہت عقل مند سہی مگر آپ کے پاس من کی دانش نہیں ہے۔" میرا نے کہا تھا۔ "پہلا
بات اتنی سی تھی کہ مجھے آپ سے پریم ہو گیا تھا......... پہلی نظر میں اور پھر آپ نے......... تم
چھوڑو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس دن جب وہ لوگ شنکر بھائی کو مارنے آئے تھے اور مار رہے
تھے۔ اس دن آپ نہ آتے تو کیا ہوتا؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" منصور نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"

"زیادہ امکان تو یہی تھا کہ وہ شنکر بھائی کو مار ڈالتے۔"

"ہاں۔ رحمت دادا کے ہوتے یہ امکان زیادہ تھا۔ رحمت دادا نہ ہوتا تو میرے خیال میں
وہ لڑکے شنکر کو مار پیٹ کر چھوڑ دیتے۔"

"اور ایک بات بتاؤں۔ شنکر بھائی کو میرے ہوتے کوئی نہیں مار سکتا تھا۔" میرا عجیب
سے لہجے میں بولی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ کہ میں اپنے گھر میں سب سے مختلف ہوں۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

"اس روز میرے جیتے جی وہ شنکر بھائی کو نہیں مار سکتے تھے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں
بڑی ہمت والی ہوں اور کسی سے بھی لڑ سکتی ہوں۔ جان دے سکتی ہوں اور لے بھی سکتی ہوں۔
میں یقین سے کہتی ہوں کہ پہلے میں ماری جاتی پھر شنکر بھائی کو کچھ ہوتا اور یہ بھی طے ہے کہ
یہی ہوتا' وہ لوگ شنکر بھائی کو زندہ نہیں چھوڑتے یعنی میں بھی زندہ نہیں بچتی۔"

"تو پھر؟"

"اپنے حساب سے اُس پل میرا جیون ختم ہو گیا تھا۔ تب سے میں آپ کا دیا ہوا جیون
گزار رہی ہوں۔ تو اس جیون کے مالک آپ ہی تو ہوئے۔ پھر دھرم کیسا؟ میرا تو دھرم بھی آپ

ہو۔ بھگوان بھی آپ ہو۔"

"مگر وہ تو میرا فرض تھا۔ خود تم نے کہی تھی یہ بات۔ میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں
کیا تھا۔"

"فرض تو تھا۔ فرض تو وہ سب مسلمانوں کا تھا۔ ان کا بھی تھا' جو ہمیں مارنے آئے
تھے۔ ان کا بھی تھا' جو تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کا بھی جو اسے ٹھیک سمجھتے تھے اور ان کا بھی جو
اسے غلط سمجھتے تھے۔ مگر اس فرض کا خیال کسے آیا؟ صرف آپ کو اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ
ہمارے ساتھ ہو رہا ہے' ٹھیک ہو رہا ہے۔ وہاں مسلمانوں کے گھر جلائے جا رہے تھے۔ خاندان
کے خاندان قتل کیے جا رہے تھے۔ وہاں والوں کو ہمارے بارے میں بھی سوچنا چاہئے تھا۔ ہم ان
کی ذمے داری تھے۔"

"لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"اس کو چھوڑو۔ آپ خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔ خیر......... مجھے پہلی نظر میں آپ
سے پریم ہوا۔ پھر آپ نے میری جان بچائی۔ مجھے نیا جیون دیا۔ میں نے آپ کو اپنا بھگوان مان
لیا۔ بعد میں' میں مسلسل سوچتی رہی۔ ہمیشہ سوچتی رہی۔ بار بار سوچتی رہی۔ میں نے سوچا' آپ
نے جو کچھ کیا' خود سے نہیں کیا۔ اپنے مذہب کے حکم کے مطابق کیا اور سچ یہ ہے کہ آپ بہت
اچھے مسلمان بھی نہیں ہو۔ پھر میں نے سوچا اچھے مسلمان کیسے ہوتے ہوں گے اور اسلام کتنا
اچھا مذہب ہوگا۔ میں ہندو دھرم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی رہی۔ یوں میں آہستہ آہستہ بدلتی
گئی۔ خود مجھے بھی بعد میں پتا چلا کہ میں کتنی بدل گئی ہوں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
"ایک اور بات' آپ جانتے تھے کہ میں نے خود پر آپ کو پورا ادھیکار دے رکھا ہے۔ آپ نے
کتنی بار میرے ساتھ تنہائی میں گھنٹوں گزارے مگر کبھی مجھے نظر سے بھی میلا نہیں کیا۔ اسکول
کی لڑکیوں کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ محبت کرنے والے ذرا سا موقع ملتے ہی محبت کے نام پر
لٹیرے بن جاتے ہیں مگر آپ تو ہمیشہ میرے محافظ رہے جب کہ میں آپ کو بہت پہلے ہر اجازت
دے چکی تھی۔ آپ کی محبت آپ کے اور آپ کے مذہب کی طرح پوتر تھی۔ میں آپ کو یہ بتا
رہی ہوں پریتم' کہ اب میری آپ کے دھرم میں دلچسپی صرف آپ کی محبت کی وجہ سے نہیں۔
اور بھی باتیں ہیں اور بھی سچائیاں ہیں۔" اچانک اس کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔ "مگر آپ میرے
شریر کی یہ بھینٹ کبھی سوئیکار نہیں کرو گے۔ آپ سمجھتے ہو کہ میں آپ کی نسلوں میں ملاوٹ
کروں گی' خراب کر دوں گی........."

"ایسی باتیں مت کرو میرا!" منصور نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تمہارے
جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن میرا دل نہیں مانتا۔"

"آپ دل سے سوچتے ہی کب ہو۔ آپ تو عقل سے سوچنے والے ہو۔" میرا نے دل
گرفتگی سے کہا۔ "مگر پریتم' میں ہار نہیں مانوں گی۔ ٹریننگ اسکول میں تو مسلمان لڑکیاں تھی
نہیں۔ کالج میں سب مسلمان لڑکیاں ہیں۔ دیکھ لینا۔ میں ان سے سب کچھ سیکھ لوں گی۔"

منصور نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ وہ میرا کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا
اس کے اپنے موقف میں لچک بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

یہ سب کچھ سوچتا' یاد کرتا وہ میرا کے گھر پہنچا۔ گھر میں کلاوتی اور شیام کے سوا
نہیں تھا۔ کلاوتی کچن میں تھی۔ وہیں سے بولی۔ "نانڈلا...... تو کمرے میں بیٹھ جا۔ میں
آتی ہوں۔"

منصور کمرے میں جا بیٹھا۔ وہ حیران تھا کہ کلاوتی نے اس طرح اسے کیوں بلوایا۔
ذرا دیر بعد کلاوتی چائے لے کر آئی۔ "لے نانڈلا' چائے پی۔"

"شکریہ آنٹی' سب لوگ کہاں ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"آج برادری میں ایک بیاہ ہے۔ وہاں گئے ہیں۔"

"آنٹی...... کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں نانڈلا!" کلاوتی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تو پہلے چائے پی لے۔ پھر
گی۔"

منصور کو وہ سب کچھ غیر معمولی لگ رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ جیسے
اس نے جلدی جلدی چائے پی۔ جلدی میں اس کے ہونٹ بھی جل گئے۔ "ہاں آنٹی' اب
کیا بات ہے؟"

"بات کچھ بھی نہیں نانڈلا' پر میرے لیے بڑی ہے۔" کلاوتی بولی۔ منصور نے محسو
کہ وہ ہچکچا رہی ہے۔

"آنٹی...... آپ بے فکر ہو کر صاف صاف کہیں۔"

کلاوتی کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی۔ چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ حوصلہ مجتمع کر
کوشش کر رہی ہے۔ یہ دیکھ کر منصور کی تشویش اور بڑھ گئی۔ اس کا دل اور زور سے دھ
لگا۔ بالآخر کلاوتی نے نظریں اٹھائی۔ "دیکھ نانڈلا' میرا بھگوان جانتا ہے میں نے تجھے بھی
شنکر سے کم نہیں سمجھا۔ تو میرا بیٹا ہے۔"

"میں جانتا ہوں آنٹی!"

"نانڈلا...... یہاں ہندو لوگ جیادہ نہیں ہیں۔ لڑکیاں جیادہ ہیں' لڑکے کم ہیں۔ ج
ان میں ڈھنگ کے لڑکے بہت ہی کم ہیں' ہمارے ہاں ہیرے جیسی بیٹیاں پتھر جیسے لڑکوں کو
دی جاتی ہیں...... وہ بھی ہجار نخرے سہہ کر۔ یہ بھاگ ہوتے ہیں ہم لوگ کی بیٹیوں کے۔
کبھی تو لڑکیاں بیٹھی رہ جاتی ہیں...... عمر بتا دیتی ہیں اور بر نہیں ملتا۔ ابھی دیکھ' میری
بیٹھی ہے۔ بھگوان جانے' بر کب ملے گا۔ پر میری سب سے سندر بیٹی میرا ہے رے۔ اس
لیے میرا من کڑھتا ہے۔ مجھے سب سے جیادہ اسی کی چنتا ہے۔"

"کوئی رشتہ آیا ہے میرا کا؟" منصور نے پوچھا۔ "نہ جانے کیوں' اس خیال سے ا
دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

"نہیں رے۔ اور بات ہے۔ بٹی کی ماں کی ہجار آنکھیں ہوتی ہیں۔ سمجھ بھی جیادہ ہوتی
ہے۔ میں نے پہلے دن جان لیا تھا کہ میرا تجھ سے پریم کرتی ہے۔"

منصور کو لگا کہ زمین اس کے پیروں تلے سرک گئی ہے۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

"پھر میں نے دیکھا' تو بھی میرا سے پریم کرتا ہے۔ پر یہ بھی جان لیا کہ تو عجت دار گھر کا
لڑکا ہے۔ تو نے ہماری جان بچائی۔ ہماری سہائتا کی۔ میں میرا کو جانتی ہوں۔ میری میرا آج بھی
پوتر ہے تو صرف تیری وجہ سے۔ مجھے تجھ پر بڑا مان ہے۔ رے نانڈلا۔ میرا وشواس کرنا۔
بھگوان کی کسم نانڈلا......" کلاوتی کی آواز بھرا گئی۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے
تھے۔ "میں دھرم کی چنتا کے بنا خود میرا کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیتی۔ بھگوان جانتا ہے' میں
جھوٹ نہیں بولتی' میں ایسا ہی کرتی اور جیون بھر میرا کی طرف سے سکھی رہتی۔ سمجھتی کہ
بھگوان نے میرا کے بھاگ جگا دیے۔ پر نانڈلا' میں مجبور ہوں۔ تیرا اور میرا کا سمبندھ نہیں ہو
سکتا۔ ہوا تو میرا گھر لٹ جائے گا۔ ہم کو جاتی سے نکال دیں گے جاتی والے۔ میری کسی بیٹی کو بر
نہیں ملے گا اور میرا سوامی...... تیرا انکل مجھے جان سے مار دے گا......"

"مگر آنٹی...... میں نے تو یہ سب کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔" منصور نے لرزتی
آواز میں احتجاج کیا۔

"جانتی ہوں۔ پر میرا کو بھی جانتی ہوں۔ وہ جو من میں ٹھان لے' کر کے رہتی ہے۔
آج کل دھرم چھوڑ رکھا ہے اس نے۔ دیوا بتی بھی نہیں کرتی۔ بولتی ہے' میرا من نہیں کرتا
ماں۔ وہ سب کا جیون اجاڑے گی۔ مورکھ کہیں کی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

منصور کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے آنٹی۔ میں کل سے آپ کے گھر نہیں
آؤں گا۔"

"میں ایسا نہیں بولتی رے نانڈلا۔ یوں تو وہ جد پکڑ لے گی۔"

"تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے آنٹی؟"

"ہم لوگ...... تیرا انکل صدر میں فلیٹ تلاش کر رہا ہے۔ ہم کچھ دن میں یہاں سے
چلے جائیں گے۔ دور رہ کر شاید میرا تیرے سپنے دیکھنا چھوڑ دے۔ نہیں چھوڑے تو بھگوان کی
مرجی۔ پر تو مجھے وچن دے...... ایک کرپا کرے گا مجھ پر۔"

"ہاں آنٹی' میں وہاں کبھی نہیں آؤں گا۔"

"نہیں رے۔ تجھے دیکھے بنا تو میں بھی نہیں رہ سکتی نانڈلا۔ تو آنا...... پر کم آنا۔ جیادہ
دیر نہیں رکنا۔ پر وچن دے کہ میرا کو کبھی نہیں بتائے گا کہ میں نے تجھ سے بات کی
ہے......"

"میں وعدہ کرتا ہوں آنٹی کہ میرا کو کبھی پتا نہیں چلے گا۔" منصور نے کہا۔

"یہاں روج کی طرح آتے رہنا۔"

"آپ بے فکر رہیں آنٹی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"ایک بات بتا نانڈلا۔ تو اپنے من سے میرا کا پریم ختم نہیں کر سکتا؟"
منصور سوچتا رہا۔ خود کو ٹٹولتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا۔ "میں جھوٹ نہیں بولا
آنٹی۔ اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو میں اب تک ختم کر چکا ہوتا۔ میں اب بھی میرا سے
کرتا ہوں آنٹی۔ مگر آپ بے فکر رہیں۔ وہ کچھ نہیں ہوگا' جس سے آپ ڈر رہی ہیں۔"
"بھگوان تیری کرپا کرے نانڈلا۔ بھگوان تجھے سکھی رکھے۔"
منصور بوجھل دل لیے وہاں سے اٹھ آیا۔

O============☆============O

اور یہ اس گفتگو کے دو ماہ بعد کی بات ہے۔ نیا سال آگیا تھا اور وہ کوئی عام نیا سال
تھا۔ وہ تبدیلیاں ساتھ لایا تھا۔ گردھاری لال نے صدر کے علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر
لیا تھا۔ اس کی فیملی شفٹ ہو رہی تھی۔

وہ جمعرات کی شام تھی۔ تمام بھاری سامان فلیٹ میں پہنچا جا چکا تھا۔ صرف کچن کا سا
چند بستر اور چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی تھیں۔ اگلی صبح انہیں ساتھ لے کر جانے کا پروگرام
گردھاری لال اوشا' تارا' شنکر اور منہر کو لے کر فلیٹ چلے گئے تھے تاکہ وہاں سیٹنگ ک
سکے۔ کلاوتی' میرا' شاردا اور شیام گھر پر تھے۔ انہوں نے رت جگے کا پروگرام بنایا تھا۔ کلا
نے منصور سے کہہ دیا تھا کہ وہ رات ان لوگوں کے ساتھ رہے "گھر پر کوئی مرد جروری ہے
اس نے کہا تھا۔ "تیرا انکل تو بے فکر ہو کر چلا گیا ہے۔"

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد منصور نے کھانا کھایا اور گرم چادر کندھے پر ڈال کر میرا
گھر کی طرف چل دیا۔ وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ کلاوتی نے چلغوزے اور م
پھلی منگالی تھیں۔ منصور بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

وہ بہت اداس رات تھی۔ میرا چپ چپ تھی۔ منصور زبردستی ہنسنے بولنے کی کوشش
رہا تھا مگر یہ احساس دل کا بوجھ بن گیا تھا کہ یہ قربتوں کے الوداعی لمحے ہیں۔ اس کے بعد
لمبی رات! شیام اور شاردا کی فرمائش پر وہ انہیں کہانیاں سناتا رہا۔

ساڑھے دس بجے کے قریب کلاوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تو سونے جاتی ہوں نانڈلا
بستر چھوٹے کمرے میں بچھا دیا ہے۔ آرام سے سو جانا۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں
تھی۔ منصور کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ وہ اسے اور میرا کو ایک دوسرے سے جی بھ
باتیں کرنے کا موقع دے رہی تھی۔

گیارہ بجے کے قریب شیام اور شاردا کو جماہیاں آنے لگیں لیکن وہ کہانیوں سے د
بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ "جاؤ...... تم دونوں سو جاؤ جا کر۔" میرا نے ہلکی سی خفگی
کہا۔ "ماں بہت سویرے جگا دے گی۔"
"دیدی تم بھی چلو۔ ماں تمہیں بھی تو جگائے گی۔" شاردا بولی۔
"ماں مجھے نہیں جگا سکتی۔ اس لیے کہ میں سوؤں گی ہی نہیں۔"

"لیکن دیدی......" شیام نے احتجاج کرنا چاہا۔
"بس چپ چاپ سو جاؤ جا کر۔ نیند نہیں آرہی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ جماہیاں لیے
جا رہے ہو۔"
وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ میرا خاموش بیٹھی فرش کو دیکھتی رہی۔ منصور چند لمحے اسے
بغور دیکھتا رہا۔ میرا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بہت اداس اور غم زدہ دکھائی دے رہی تھی۔
"میرا...... کچھ بولو گی نہیں؟" منصور نے چپ توڑی۔
"کیا بولوں پریتم۔ بولنے کو کیا رہ گیا ہے؟"
"ابن انشاء کا وہ شعر سنا ہے تم نے۔" منصور نے کہا۔
"پھر ہجر کی لمبی رات میاں' سنجوگ کی تو بس ایک گھڑی
جو دل میں ہے لب پر آنے دو' شرمانا کیا گھبرانا کیا"
"دل کی ساری باتیں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں پریتم' آج تو دل خالی خالی لگ رہا ہے۔
جیسے اجڑ گیا ہو" وہ بڑے دکھ سے بولی۔
"کیوں؟ میری محبت نہیں رہی کیا۔ ختم ہو گئی؟"
"ایسی باتیں مت کرو آپ جانتے ہو' یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔"
"نہیں' میں نہیں جانتا۔" منصور نے کہا۔ "ہاں...... اب جان جاؤں گا۔ محبت جدائی
کی آزمائش سے گزرنے کے بعد ہی ثابت ہوتی ہے۔"
"آپ بڑے بے رحم ہو۔" میرا نے اسے ملامتی نظروں سے دیکھا۔ "مجھے آزمائش سے
ڈر لگتا ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنی محبت پر بھروسا نہیں۔"
"خود پر تو بھروسا ہے لیکن ڈر لگتا ہے کہ آپ دور رہ کر مجھے بھول جاؤ گے۔" میرا نے
آہ بھر کر کہا۔
منصور چند لمحے سوچتا رہا۔ "ہاں۔ ناممکن بھی نہیں" بالآخر اس نے کہا۔ "لیکن یہ بھی
ممکن ہے کہ محبت اور بڑھ جائے۔"
"سچ' بڑے بے درد ہو۔" میرا نے دکھی لہجے میں کہا۔
"بے درد نہیں' حقیقت پسند ہوں۔ جس تجربے سے کبھی گزرا نہیں' اس پر اپنے
ردعمل کا اندازہ کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو خود پر تمہارے اعتماد پر حیران ہوں۔"
"اور مجھے اس پر حیرت ہے کہ آپ اپنی محبت پر بھروسا نہیں کر سکتے۔"
منصور پھر سوچنے لگا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور میرا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
بولا۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں دل سے نہیں' دماغ سے سوچتا ہوں۔ محبت بھی صرف دل سے
نہیں کرتا۔ اس لیے تو شک رہتا ہے خود پر۔"
"آدمی کو اتنا سچا بھی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ جانتے ہو کہ آپ سے دور رہ کر میں کتنی

دکھی ہوں گی۔ آپ جھوٹ موٹ مجھے آسرا دے دیتے تو میرا دکھ اور بڑھتا تو نہیں۔ اب میرے لیے دو عذاب ہوں گے' ایک آپ سے دور رہنے کا اور دوسرا یہ کہ بھگوان جانے' آپ مجھے بھول تو نہیں گئے۔ یہ آپ نے کیسا ظلم کیا ہے میرے ساتھ۔" وہ شکایتی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "کاش.......... میری خاطر ذرا سا جھوٹ بول لیتے آپ۔"

منصور کو واقعی افسوس ہونے لگا۔ اسے میرا پر ترس آنے لگا لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بات منہ سے نکل چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب میرا اس کی محبت کے معاملے میں ہمیشہ خود کو غیر محفوظ سمجھے گی۔ لیکن سچ یہ تھا کہ میرا اپنے بارے میں کتنی ہی پریقین سہی' اس کا یقین سمندر کی ریت پر لکھے لفظ کی طرح تھا' جو کسی بھی وقت مٹ سکتا تھا۔ تیز ہوا کے ہاتھوں بھی۔ اور سمندر کی لہروں کے ہاتھوں بھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خود بھی یہ اذیت اٹھائے گا۔

"آئی ایم سوری میرا!" اس نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن سچ تو سچ ہے۔ کچھ عرصے بعد پتا چل جائے گا کہ ہماری محبت میں، کتنی سچائی' کتنی گہرائی ہے۔"

"کتنے عرصے کی بات کرتے ہو آپ!" میرا نے تند لہجے میں کہا۔ "میرا یقین تو جیون بھر کا تھا اور اب یقین کہاں۔ اب تو ملنے پر ہی یقین آئے گا اور آپ کہہ چکے ہو کہ ہم کبھی ملیں گے نہیں۔ اور آپ.......... ایک سال گزر جائے گا تو آپ سوچو گے کہ محبت کا ایک سال زندہ رہنا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ اگلے سال میں مٹ نہیں جائے گی۔ دیکھو.......... یقین آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا تو پھر کبھی آتا بھی نہیں۔ محبت میں یقین نہ ہو تو آدمی ذرا دیر کی دوری میں موقع ملتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔"

منصور نے سر جھکا لیا۔ میرا سچ کہہ رہی تھی' اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی لیکن وہ کیا کرتا۔ اس کا اپنا سچ اس سے مختلف تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ میں اب کبھی کسی اور کی نہیں ہو سکتی میں نے.........." اچانک وہ کہتے کہتے رکی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان میں بے یقینی لہرا رہی تھی۔ "ہے بھگوان.......... ہائے رام۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "آپ کو اپنی محبت پر یقین نہیں تو میری محبت پر بھی نہیں ہوگا۔ ہے نا؟ دیکھو سچ بولنا۔"

"نہیں میرا' یہ بات نہیں۔"

"ادھر۔ سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھو.......... اور پھر بولو۔" میرا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

منصور نے سر اٹھایا' اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اب اس کے لیے جھوٹ بولنا ناممکن تھا۔ "سوری میرا' میں تمہیں دکھ پر دکھ دے رہا ہوں۔" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "لیکن سچ یہ ہے۔"

"بس' اب کچھ نہ بولو۔ میں سمجھ گئی۔ آپ خود بھی تو دکھی ہو۔ آپ کو مجھ پر بھی یقین نہیں۔" میرا بولی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔ "پر اب آپ چنتا نہ کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ آپ کو مجھ پر بھی وشواس آجائے گا اور خود پر بھی۔ مجھے بھی آپ پر وشواس آجائے گا۔ آپ بالکل چنتا نہ کرو۔"

"کیا مطلب؟" منصور دنگ رہ گیا۔ وہ بالکل بدل گئی تھی۔ اداسی غائب ہو گئی۔ اب وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں پرانی چہکار بھی لوٹ آئی تھی۔

"بس آپ چھوڑو اس بات کو۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔" میرا نے چہک کر کہا۔ "ایک بات بتاؤ۔ آپ نے مجھ سے جو گجراتی سیکھی ہے' دور رہ کر بھول تو نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"چلو.......... کچھ تو یقین سے کہہ سکتے ہو آپ۔ ہاں' ایک بات اور بتاؤ۔ ماں نے میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی تھی آپ سے؟"

"نہیں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"مجھے لگتا ہے' ماں کو میرے اور آپ کے بارے میں پتا ہے۔ اسی لیے یہ گھر چھوڑ رہے ہیں ہم۔ ماں نے سوچا ہوگا کہ آپ سے دور ہو کر میں سدھر جاؤں گی۔"

"لیکن فلیٹ تو انکل نے ڈھونڈا ہے اپنی مرضی سے۔"

"نہیں۔ ماں نے بولا ہوگا' پپا کو۔"

"ممکن ہے' یہی بات ہو لیکن آنٹی نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"خیر.......... ہوگا کچھ۔ مجھے پروا نہیں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ آج کچھ اچھی اچھی باتیں بھی کر لو۔ دور کا سفر ہے میرا۔ اس میں کام آئیں گی۔"

وہ ایک دوسرے سے وہی باتیں کرنے لگے' جو ساری دنیا کے محبت کرنے والے آپس میں کرتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میرا کو جماہیاں آنے لگیں۔ اس نے کلاک میں وقت دیکھا۔ "اوہ.......... سوا بارہ بج گئے۔ نیند آ رہی ہے۔ آپ یہاں رکو۔ میں آپ کا بستر ٹھیک کر کے آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چھوٹے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آئی۔ "جاؤ.......... آپ بھی جا کر سو جاؤ۔ میں نے آپ کا بستر لگا دیا ہے۔"

"مگر مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"جا کر لیٹو گے تو آجائے گی.......... گڈ نائٹ جان!"

"شب بخیر۔"

میرا ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی رہی۔ منصور چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ فرش پر گدا بچھا کر اس پر بے داغ سفید چادر بچھا دی گئی تھی۔ پائنتی کی طرف لحاف رکھا تھا۔ منصور نے پلٹ کر میرا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "آپ کے سرہانے تکیہ میرا رکھا ہے۔ جاؤ' اب لیٹ جاؤ۔ میں بتی بجھا رہی ہوں۔" میرا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"منصور بستر پر جا لیٹا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ اس نے لحاف کھول کر اوڑھ لیا۔ میرا

نے تمام بتیاں بجھا دی تھیں۔
منصور کو خاصی دیر نیند نہیں آئی۔ کمرے اور بستر کی نامانوسی اس کے لیے الجھن کا باع
تھی۔ پھر وہ میرا کے رویے اور انداز میں اچانک تبدیلی سے بھی الجھ رہا تھا۔ میرا کا یہ کہنا
سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی.......... اب آپ چنتا مت کرو.......... اس
کیا مطلب تھا آخر۔ وہ غور کرتا اور الجھتا رہا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ سو
سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔
لیکن نیند گہری نہیں تھی۔ اس لیے جیسے ہی کوئی اس کے لحاف میں گھسا' اس کی
کھل گئی۔ "کک.......... کو.......... کون ہے؟" اس نے بوکھلا کو پوچھا۔
"چیخنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں میرا۔ اور کون ہو سکتا ہے۔" میرا نے ا
ڈانٹا۔"
"کیا.......... کیا بات ہے؟" منصور اب بھی بوکھلایا ہوا تھا۔
"کوئی بات نہیں۔ بس آپ کو یقین دلانے اور خود یقین حاصل کرنے آئی ہوں۔"
نے کہا اور اس سے لپٹ گئی۔
"کیا کرتی ہو۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" منصور کی آواز لرزنے لگی۔
"اب تو آگئی ہوں۔ آپ مجھے بھگا تو نہیں سکتے۔" میرا نے اس کے سینے پر اپنا سر
دیا۔
منصور سانس لینا بھی بھول گیا۔ افتاد اس قدر اچانک تھی کہ اس سے سوچا بھی نہیں
رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے اندر.......... اس کے وجود میں بھی ایک طوفان مچلنے لگا تھا۔
طوفان باہر تھا اور ایک اندر۔ اس کا وجود' ایک حقیر کشتی کی طرح دونوں طوفانوں کی زد میں
ہوا تھا۔ "میرا.......... میرا.......... خدا کے لیے.......... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں مت ڈا
وہ گڑگڑایا۔ "میرا.......... میرا.........."
"آپ نے تو بولا تھا کہ آزمائش کے بعد ہی سچ سچا ثابت ہوتا ہے۔" میرا نے ا
دلایا۔ "مگر آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا او میرا بھی۔
سے محبت کرتی ہوں تو آپ سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ جہاں آپ کمزور پڑ گئے' میں م
بن جاؤں گی۔"
اندر کا طوفان زور پکڑ گیا تھا۔ کشمکش بہت کمزور اور موہوم تھی۔ "لیکن میرا' میں
کمزور آدمی ہوں۔ میرا میں.........."
"آپ ڈرو نہیں.......... سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔" میرا نے بچوں کی طرح اسے
"یہ اپنے ہاتھ لاؤ۔ ان کی آنکھوں سے مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ پوری طرح یاد کرلو مجھے۔
نے منصور کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا!

میرا نے جو کہا تھا' کر دکھایا۔ وہ صرف ایک ثانیئے کو کمزور پڑا تھا اور اس ثانیئے میں میرا
نے خود کو مضبوط ثابت کر دیا تھا۔
پھر میرا کا چہرہ اس کے چہرے پر جھکتا چلا آیا۔ زمین کی گردش جیسے تھم گئی۔ کائنات کی ہر
چیز ساکت ہو گئی۔
طوفان راستہ بدل کر بستیوں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا تھا۔ بس ایک موج اٹھی
تھی.......... اور وہ بھی ایسی کہ سمندر میں پھنسے ہوؤں کو بھنور میں دھکیلنے کے بجائے ساحل پر
پہنچ گئی تھی۔
"میرا.......... یہ سب.........."
"خاموش رہو پریتم!" میرا نے پیار بھری خفگی سے کہا۔ "خوبصورتی کو برباد مت کرو۔
آپ نے.......... میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ بہت خوبصورت سفر کیا ہے ساتھ ساتھ۔ یہ سب
کچھ اپنے دل.......... دماغ پر نقش کرلو۔ بولو گے تو سب مٹ جائے گا۔"
منصور نے اپنے اندر جھانکا۔ جو کچھ ہو چکا تھا' اسے اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ سب
کچھ واقعی بہت خوبصورت تھا۔ ایک کمزور ثانیئے کے سوا اس میں کہیں آلودگی کا شائبہ بھی
محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود کو بہت آسودہ محسوس کر رہا تھا لیکن وہ کمزور ثانیہ! اس لمحے ایسا
محسوس ہوا تھا' جیسے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مگر.......... مگر میرا نے اسے بچالیا تھا۔ اس ایک
پل کو یاد کر کے اس کے دل میں میرا کے لیے شکر گزاری ابھری۔ اس نے بے حد محبت سے
میرا کے سر کو تھپتھپایا' جو اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔
"میرا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "پیار آرہا ہے مجھ پر؟"
"ہاں میرا' آج تم نے مجھے بچالیا۔" منصور نے کہا۔
"لیکن آزمائش میں ڈالا بھی تو میں نے تھا۔ اور پھر آپ تو ہمیشہ مجھے بچاتے آئے ہو۔"
"پھر بھی.........."
"میں نے کہا تھا نا کہ جہاں آپ کمزور پڑو گے' وہاں میں مضبوط ہو جاؤں گی۔"
"میں تمہارا شکر گزار.........." منصور کہتے کہتے رک گیا۔ اچانک ہی ایک خیال نے
اسے اندر سے لرزا دیا تھا۔ اس نے سوچا' یہ میں کس انداز سے سوچ رہا ہوں۔ میں تو اس
مذہب کا ماننے والا ہوں' جس میں کسی نامحرم کو ایسی کیفیت میں چھو لینا بھی گناہ ہے اور میں بھی
میرا کی طرح سوچ رہا ہوں کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ درست ہے کہ ہم ایک گناہ کبیرہ سے بچ
نکلے لیکن گناہ تو ہم نے پھر بھی کیا۔ آہ.......... میں ترغیب سے بچ نہ سکا۔
میرا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا تاثر اسے بہت کچھ بتا گیا۔ "کیا
بات ہے منصور؟" اس نے پوچھا۔
"میرا' ہم دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ بہت برا ہوا میرا!"
"لیکن پریتم' ہم نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔" میرا کی سرگوشی میں دبا دبا احتجاج تھا۔

"جو کچھ ہم نے کیا' ہمارے دین میں وہ بھی گناہ ہے۔" اب وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ "
ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں۔ اس کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کو چھوا۔ یہ گناہ ہ
اب یہ الگ بات ہے کہ اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ نیتیں اس پر روشن ہیں۔ شاید یوں ہما
بچت ہو جائے۔ ورنہ گناہ گار تو ہم بہرحال ہو گئے۔"

"میرے خیال میں تو ہمیں گناہ سے بچ نکلنے کا انعام ملنا چاہیے۔"

"ایسی باتیں مت کرو میرا!" منصور نے برہمی سے کہا۔ "میں تمہیں جو سمجھا رہا ہو
اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اللہ نے انسانوں کے لیے ایک دائرہ ب
ہے۔ دائرے کے باہر جانا گناہ ہے لیکن جانتی ہو' اللہ نے انسانوں کو تلقین کی ہے..........
سے منع فرمایا ہے کہ دائرے کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس لیے کہ انسان کمزور لمحے۔ قریب جا
گا تو کسی کمزور لمحے میں دائرے سے باہر کی دلدل میں اس کا پاؤں پڑ سکتا ہے۔ حکم ہے کہ خ
آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔"

میرا بہت غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
اب ہم پرائشچت نہیں کر سکتے اس پاپ کا؟"

"ہم توبہ کر سکتے ہیں اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کی پشیمانی سچی ہوگی اور دل و دما
آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ ارادہ ہوگا تو وہ آدمی کی توبہ ضرور قبول فرمائیں گے او
آدمی کو دھو کر پاک کر دیتی ہے.......... معصوم بچوں کی طرح.........."

میرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "منصور.......... تمہارا مذہب تو بہت اچھی باتیں سکھاتا
دیکھو.......... میں سچ مچ شرمندہ بھی ہوں اور میں آئندہ کبھی ایسا کروں گی بھی نہیں۔ تو ک
مجھے معاف کر دے گا؟"

"مگر تم تو اللہ کو مانتی ہی نہیں؟"

"واہ' مانتی کیوں نہیں ہوں۔ آدھی مسلمان تو ہوں میں۔ پوری بھی ہو جاؤں گ
دن۔ میں توبہ ضرور کروں گی۔"

"آدھی مسلمان کیسے ہو گئیں تم؟"

"بس ہو گئی۔ بعد میں کبھی بتاؤں گی۔ اب مجھے توبہ کرنے دو۔"

"وہ اکیلے میں کرنا۔ بس مجھے ایک بات بتا دو اور پھر چلی جاؤ۔ یہ سب کچھ تم ن
کیا؟"

"اب تو شرمندہ ہوں اس پر۔ اب کیا بتاؤں۔ میرا جواب میری شرمندگی کے
ہوگا۔"

"مجھے یہ بتاؤ۔ اس وقت تمہارے ذہن میں کیا تھا؟"

"اس وقت میرے خیال میں یہ ضروری تھا۔ اس لیے کہ اتنے برسوں میں' میں
سمجھ گئی ہوں۔ آپ اب مجھے کبھی نہیں بھولو گے۔ اس لیے کہ آپ نے مجھے اپنی امان

ہے اور اب آپ بھی میری امانت ہو۔ اب مجھے وشواس ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سوا کسی
کے نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے کبھی خیال نہیں آئے گا کہ آپ مجھے بھول گئے ہو اور آپ بھی کبھی
ایسا خیال نہ کرنا۔ اب میرا بھی آپ کے سوا کسی کی نہیں ہوگی۔ سمجھ گئے۔ بس یہ بات تھی۔
مگر اب میں شرمندہ ہوں۔"

منصور کو اس کی سوجھ بوجھ نے حیران کر دیا۔ اس کا تجزیہ واقعی درست تھا۔ اس کی اپنی
سوچ یہی تھی۔ "بس اب تم چل دو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"جاتی ہوں۔ پر مجھے بھی کچھ پوچھنا ہے۔ ہمارے گھر آیا کرو گے؟"

"دیکھو میرا۔ اب مصروفیت بہت ہے۔ یہ بہت مشکل ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کبھی گلہ نہیں کروں گی۔ پر ایک وچن دو مجھے۔ جب بھی میں
بلاؤں گی' ضرور آؤ گے۔ ہاں.......... میں کسی بڑی ضرورت کے بنا کبھی نہیں بلاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جب بلاؤ گی' ضرور آؤں گا۔"

"اچھا پریتم' اپنا خیال رکھنا۔" میرا نے رندھے گلے سے کہا۔ "اب میں جاتی ہوں۔"
اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"جاؤ میرا' مگر آج کے بعد ایسے نہ رونا۔" منصور نے اداس لہجے میں کہا۔ "سمجھ لینا کہ
تم روؤ گی تو مجھے تکلیف ہوگی۔"

"میرا چلی گئی۔ منصور کا عجیب حال تھا۔ دل پر بہت بوجھ تھا۔ وہ اٹھا' اس نے باتھ روم
میں جا کر ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ تھرتھری چڑھ گئی۔ کمرے میں واپس آکر وہ بستر پر قبلہ رو
سجدے میں گر گیا۔ "اے اللہ.......... مجھے معاف فرما دے۔ اے غفور الرحیم' معاف فرما دے'
میں شرمندہ ہوں آقا' توبہ کرتا ہوں معبود' مجھے معاف فرما دے۔ وہ گڑگڑایا' اگلے ہی لمحے جیسے
کوئی بند ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ خدا کے حضور گڑگڑاتا رہا۔ روتے
روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ لفظ ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر اس کا دل جیسے دھڑکنوں کی زبان
میں وہی لفظ دہراتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔

اچانک اسے قرار سا آ گیا۔ دل سے بوجھ ہٹا اور وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ شاید اس کی توبہ قبول
فرما لی گئی تھی۔ نہ جانے کب وہ سجدے ہی میں سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا۔ وضو کر کے آیا تو
کلاوتی جاگ چکی تھی۔ "اچھا آنٹی.......... اب میں چلتا ہوں۔"

"نماز پڑھ کر آئے گا نا؟"

"نہیں آنٹی' آج میچ بھی ہے میرا۔ اب تو میں بس آپ کے نئے گھر آؤں گا کبھی۔"

"اچھا نانڈلا۔ بھگوان تیری رکھشا کرے۔"

منصور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔

O==========☆==========O

وقت کے بوڑھے مؤرخ کا قلم بہت تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔

میرا ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ محبت کے حصار سے باہر آکر منصور اپنے گردوپیش کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ محبت کے سحر نے اتنے عرصے اسے ایک بے خبری زنداں میں اسیر کر رکھا تھا۔ وہ آزاد ہوا تو ہر طرف ایک جہان حیرت نظر آیا۔ یہاں تو دنی بدل گئی تھی۔ پرانی اقدار دم توڑ رہی تھیں۔ تہذیب اور تمیز رخصت ہو رہی تھی۔ چھو اپنے بڑوں پر آنکھیں نکالنے اور انہیں بدتمیزی سے جواب دینے کے مراحل سے گزر کر ان سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کے مرحلے میں داخل ہو گئے تھے۔ ہر دل میں احساس مح پل رہا تھا۔ اور ہر احساس محرومی کا علاج ایجی ٹیشن تصور کر لیا گیا تھا۔ ہر شخص کو ہر دو شخص سے شکایت تھی۔ ہر شخص اپنے حقوق کی بات کرتا تھا.......... اور دوسرں کے حقوق تغافل برتتا تھا۔ اپنے فرائض کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔

کوتاہیاں ارباب اقتدار سے بھی ہوئیں۔ استحصالی معاشرے میں یہی کچھ ہوتا۔ لوگ صرف اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ باقی سب کچھ ثانوی ہو کر رہ ہے۔اور لوگ جب یہ تماشا دیکھتے ہیں تو انہیں بے وقوف بننے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ بیماری پھیلتی جاتی ہے۔ اور جو لوگ وسائل سے محروم ہوتے ہیں' انہیں ان کی صلاحیتو اہلیتوں سمیت نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یوں سینے احساس محرومی سے سلگتے رہتے ہیں۔ دھواں بھر جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی شعبدہ گر ایکسپلائیٹیشن کی پھکنی سے دو چار پھونکیں مار د سلگتا ہوا احساس محرومی نفرت کی نہ بجھنے والی آگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے ت آغاز ہوتا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں انسانوں کو کتا سمجھنے کا رجحان بہت توانا ہے۔ کتے کی دم پر پاؤں پڑ جائے تو کتا لازمی طور پر غراتا ہے......... بلکہ کاٹ بھی لیتا ہے۔ ہم بھی......... ہمارے حکمراں بھی یہی کلیہ مہذب انسانوں پر آزماتے ہیں۔ صبر کو کوئی اہمیت نہیں دی کوئی صبر کرے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہیں اور تکلیف ہے بھی تو بہرحال برداشت ہے' دوا دینا ضروری نہیں۔ ہم تو وہ ہیں کہ اگر خدا کتے سے اس کا ردعمل' ا خصلت اور اس کی جبلت چھین لے اور ہم کتے کی دم پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جائیں او ہمیں ٹوکے کہ یہ کیا کرتے ہو۔ کتا مر جائے گا تو ہم اس پر غرائیں گے کہ تم کون ہوتے ہ ست گواہ چست والا معاملہ کرنے والے۔ کتے کو تکلیف ہوتی تو وہ بلبلاتا' بھونکتا' ہمیں ہمیں اندازہ نہیں کہ ہمارے اس مزاج' اس رجحان نے گرم خون والی نئی نسل کو تشدد کی دھکیل دیا ہے۔ انہیں کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے انہیں ایکسپلائٹ کرے۔

اور عروس البلاد کراچی میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اندر ہی اندر کب سے پکنے والے کو پھٹ پڑنے کے لیے صرف معمولی سے کسی عمل انگیز کی ضرورت تھی۔ منصور کو س پہلے کرکٹ ٹیموں کے رویے میں تبدیلی کا احساس ہوا۔ کرکٹ ڈسپلن کا کھیل ہے۔ چھوٹی

کے میچوں میں غیر جانب دار ایمپائر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹنگ کرنے والی ٹیم کے لڑکے ہی امپائرنگ کرتے ہیں۔ ایسے میں متنازعہ فیصلے ہونا بھی لازم ہے۔ پہلے فیلڈنگ سائیڈ اسے کھیل کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیتی تھی۔ اب ان فیصلوں پر ہنگامہ ہوتا تھا۔ لڑائیاں ہوتی تھیں۔ میچ بغیر مکمل ہوئے ختم ہو جاتے تھے۔ ٹیمیں اپنا اپنا راستہ لیتی تھیں۔

منصور کی ٹیم میں ابھی بگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ٹیم کے لڑکے اس کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ مگر بگاڑ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کچھ لڑکے منصور کی پوزیشن کو چیلنج کرنے لگے تھے۔ وہ اعتراض کرتے تھے کہ مخالف ٹیم کی خراب امپائرنگ کے جواب میں وہ اپنے لڑکوں کو خراب امپائرنگ نہیں کرنے دیتا۔ جس کے نتیجے میں ٹیم میچ ہار جاتی ہے۔ منصور انہیں کھیل کی اسپرٹ اور ہار جیت کے غیر اہم ہونے کے بارے میں ہمیشہ سے سمجھاتا آیا تھا لیکن اب اس کی باتیں غیر مؤثر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی میدان میں پیدا ہونے والا بگاڑ درحقیقت اجتماعی سطح پر بگاڑ ظاہر کرتا ہے۔

اسلام کے نام پر علیحدہ وطن حاصل کرنے والے مسلمان اب اس وطن کے لیے دی جانے والی تمام قربانیاں بھلا کر قومیتوں کی بات کر رہے تھے۔ حالانکہ اس بنیاد پر وہ ایک ایسے سے دو چار ہو چکے تھے۔ سقوط مشرقی پاکستان ایسا سانحہ نہیں تھا' جسے بھلا دیا جاتا۔ مگر اس وقت بھی یہی کہا گیا تھا کہ اچھا ہوا۔ جان چھوٹ گئی۔ آئے دن سیلاب بھگتنا پڑتے تھے۔ اس ایسے پر سوچنے اور اس سے سبق سیکھنے کے بجائے بے حسی اوڑھ لی گئی تھی۔ اور اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ بچے کھچے پاکستان کے لیے کڑی آزمائش کے مترادف تھا۔ قومیتوں کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بن رہی تھیں۔ نئی نسل کے لوگ.......... خصوصاً طلبا اس میں پیش پیش تھے۔ شاید ہی کوئی قومیت ایسی بچی ہو' جس کی کوئی طلباء تنظیم نہ ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے کراچی جیسا غریب پرور شہر باہمی نفرت اور حسد کی آگ میں سلگنے لگا۔ جاگتی راتوں کے روشن شہر کی راتیں ویرانی اور خوف سے عبارت ہو گئیں۔ روزگار سے محروم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایکسپلائٹ کرنے والے میدان میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام نوجوان ایک ایسے سحر میں گرفتار ہو گئے جسے صرف صدائے تکبیر ہی توڑ سکتی تھی لیکن اسلام کے نام پر سیاست کرنے والوں کے دلوں میں بھی سوزِ خلوص نہیں تھا۔

پھر ۳۱ اکتوبر آئی۔ کراچی کی تاریخ کا پہلا خونی.......... سیاہ باب لکھا گیا۔ اس کے بعد علی گڑھ کالونی کا سانحہ ہوا۔ بربریت کی انتہا ہو گئی۔ خوف و ہراس' کرفیو' جانوں کا اتلاف اور معاشی تباہی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اہل ہوش انگشت بدنداں تھے۔ وہ سوچتے تھے.......... یہ پاکستان ہے یا بھارت' جو کچھ پاکستان میں ہو رہا تھا' اس کے سامنے بھارت کے مسلم کش فسادات بے حیثیت تھے۔ وہ سب کچھ شرم سے سر جھکا دینے کے لیے بہت کافی تھا۔ مگر کہتے ہیں کہ خون بہانے والوں کے سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ وہ جنونی ہو جاتے ہیں اور جنون اور شرم میں تو ازلی بیر ہے۔

وقت ان لوگوں کے لیے بہت کڑا ہو گیا' جو مسلم پاکستانی تھے۔ وہ اس بے معنی جنگ میں
دونوں طرف غدار تھے۔ وہ لاشوں پر سیاست کرنے والوں کے ساتھ بھی نہیں چل سکتے تھے
اور وہ باقی ملک کو.......... اور ارباب اقتدار کو یہ بتانے پر بھی مجبور تھے کہ استحصال تو ہوا ہے
محرومیاں تو حقیقی ہیں۔ انہیں دور کر دو۔ احساس محرومی مٹا دو۔ ورنہ ہماری نسلیں تباہ ہو جائیں
گی۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے تھے' جہاں مزاجوں میں جمہوریت نہیں تھی۔ طاقت
ور سے اختلاف رائے موت کو دعوت دینا تھا۔ کوئی کسی کی بات معقولیت سے سننے' دلیل سے رد
کرنے کا روادار نہیں تھا۔ جہاں سیاسی جماعتوں کے ڈھانچے ہی آمریت اور ملوکیت کی بنیاد پر
کھڑے تھے۔ ہر اہم سیاسی جماعت کی قوت کا سرچشمہ کوئی فرد واحد تھا اور ہر ایسے فرد واحد کے
ماننے والوں کے نزدیک اس کے ہر حکم' ہر فرمان کی تعمیل ضروری تھی۔ اس سے اختلاف جیسے
گناہ تھا۔ لوگ اللہ کے احکامات بھول گئے تھے۔ سب کو بس اپنا اپنا قائد یاد تھا اور اس کے
احکامات ازبر تھے۔ ایسے میں وہ مسلم پاکستانی سوائے اس کے کیا کر سکتے تھے کہ اپنے اندر سمٹ کر
بیٹھ جائیں۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ یا ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ یا خاموش بیٹھے رہو۔ تیسری
صورت میں غداروں کے لیے صرف بدترین موت ہے۔

اور منصور بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس نے کرکٹ ٹیم سے ناتا توڑ لیا تھا۔ بس
بچپن کے تینوں دوستوں یعنی شہزاد منصور اور منیر سے اس کا تعلق باقی رہ گیا تھا۔ گھر سے دفتر اور
دفتر سے گھر.......... یہی اس کا معمول تھا۔ اس نے خود کو ایک خول میں بند کر لیا تھا۔ چاروں
دوست کبھی مل بیٹھتے تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ تاش اب وہ کم ہی کھیلتے تھے۔ زیادہ تر باتیں ہی
ہوتی رہتیں۔

اس عرصے میں ہندوستان سے آئے ہوئے ایک مسلمان نے کراچی کی صورت حال پر جو
تبصرہ کیا تھا' وہ منصور کبھی نہ بھول سکا۔ تبصرہ کیا' وہ ایک تازیانہ تھا۔ اس مہمان نے کہا تھا۔
"بھائی.......... یہاں سے تو ہم ہندوستان میں بھلے۔ وہاں کسی ہندو کے ہاتھوں مارے جائیں تو
شہادت کا درجہ پائیں گے۔ یہاں تو مجھے ہر طرف حرام موت نظر آتی ہے اور بھئی "لفظ شہید"
کو تو تم نے رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں تو سزا یافتہ مجرم بھی شہید کہلاتے ہیں۔ اللہ اور اس
کے رسول ﷺ نے جس چیز کو منع فرمایا ہے' وہی کچھ کرتے ہوئے مرنے والے بھی شہید۔
معاذ اللہ۔ یہاں تو ہر ظالم سیاسی جماعت کے پاس شہدا کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ معاذ
اللہ۔

O========☆========O
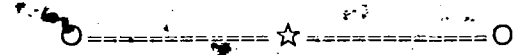
دسمبر 92ء

وہ چاروں ٹی وی پر خبرنامہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ وہ دسمبر کی
سات تاریخ تھی۔ ساری دنیا کو علم ہو چکا تھا کہ متعصب ہندوؤں نے برصغیر کی تاریخ کے بدترین
جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ بھارت کے سیکولر ہونے کے دعوے کی قلعی تو بارہا کھل چکی تھی۔ اس

ان کی جمہوریت اور عدلیہ کے احترام کا دعویٰ بھی جھوٹا ثابت ہو گیا تھا۔
بابری مسجد شہید کر دی گئی تھی!
وزیراعظم نواز شریف نے اگلے روز قومی سطح پر احتجاج کی اپیل کی تھی۔
خبرنامہ ختم ہونے کے ذرا ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ منصور نے جا کر دروازہ
کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ وہ اس کی پرانی کرکٹ ٹیم کے
ساتھی تھے۔ "السلام علیکم"۔ منصور نے کہا۔ وہ ان کی آمد پر حیران تھا۔ گزشتہ پانچ سال میں یہ
پہلا موقعہ تھا کہ وہ اس کے دروازے پر آئے تھے۔ وہ خود بھی ان سے بے تعلق ہو گیا تھا۔ وجہ
صرف اتنی تھی کہ وہ اس کی بات سننے کو تیار نہیں تھے اور وہ انہیں غلط راستے پر جاتے دیکھ
نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اسے خوشی تھی کہ وہ اس راستے پر زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ ورنہ
آپریشن کلین اپ کی زد میں آ گئے ہوتے۔
"منصور بھائی' ہمیں اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟" واجد نے کہا۔
"کیوں نہیں۔ آؤ.......... آجاؤ"۔ منصور نے ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیا۔
وہ سب کو ڈرائنگ روم میں لے گیا "تم لوگ بیٹھو' میں چائے بناتا ہوں"۔
"ارے نہیں منصور بھائی۔ ہم تو بس آپ سے باتیں کرنے آئے ہیں"۔ حمید بولا۔
"باتیں بھی کر لینا"۔ منصور نے کہا۔ "لیکن چائے تو ضروری ہے"۔
منصور چائے لے کر واپس آیا تو وہاں بابری مسجد کے سانحے پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔
سب جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ منصور نے سب کے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ دیں۔ وہ
سب خاموش ہو گئے۔
"منصور بھائی' آپ ہم لوگوں سے ناراض تو نہیں؟" نعیم نے پوچھا۔
"تم جانتے ہو' ناراض تو میں ہوں۔ لیکن ایسے جیسے بڑے بھائی چھوٹے بھائیوں سے خفا
ہوتے ہیں۔ میرے دل میں تم لوگوں کے لیے کوئی کدورت نہیں۔ دیکھو نا' آدمی خفا انہی سے
ہوتا ہے جنہیں اپنا سمجھتا ہے"۔
"منصور بھائی' ہم نے بھی آپ کو ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح سمجھا۔ اختلاف کے باوجود
آپ ہمارے لیے محترم رہے"۔ فاروق بولا۔
"میں اس کے لیے تم سب کا شکر گزار ہوں"۔ منصور کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔
"منصور بھائی' کل کا کیا پروگرام ہے؟" ممتاز نے پوچھا۔ "بستی سے ایک جلوس نکلنے
والا ہے"۔
"بھئی میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ اس پر ردعمل تو
شدید ہونا چاہیے لیکن میرا خیال ہے کہ اہم ترین مسئلوں پر جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا
چاہیے"۔
"آپ کا مطلب ہے' ایجی ٹیشن غلط ہے؟" حمید نے پوچھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں اس سانحے پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے جذبات کا اظ
بھی نہیں کرنا چاہتا"۔

"لیکن کیوں؟"

"دیکھو۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم سے کوئی بہت بڑی شکایت ہو تو ایجی ٹیشن ہی ب
ترین اظہار سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک اجتماعی رائے ظاہر کرتا ہے"۔ منصور نے دھیمے لہجے میں ک
"لیکن تم سب جانتے ہو کہ ہمارے ہاں ایجی ٹیشن کیسا ہوتا ہے۔ غیر متعلق املاک کو نقص
پہنچایا جاتا ہے۔ بسیں، ٹیکسیاں، پرائیویٹ کاریں جلا دی جاتی ہیں۔ پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ یعنی نقص
خود کو ہی پہنچاتے ہیں ہم۔ جانی نقصان بھی ہوتا ہے اور یہ سب لاحاصل ہوتا ہے، دشمن کا تو
بھی نہیں بگڑتا۔ وہ تو الٹا خوش ہوتا ہوگا۔ معاملہ جوں کا توں رہ جاتا ہے۔ جذبات سرد ہو جا
ہیں، بھڑاس نکل جاتی ہے تو ہم چپ ہو بیٹھتے ہیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی"۔

"منصور ٹھیک کہہ رہا ہے"۔ شہزاد بولا۔ "اس معاملے میں بھی یہی کچھ ہوگا"۔

"ہوگا یہ کہ خوب ہنگامہ ہوگا۔ لوگ کچھ مندر جلا دیں گے۔ کچھ ہندوؤں کو ختم کر
گے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس حماقت کے نتیجے میں حساب برابر ہو جانے کا تاثر ابھرے گا۔ بھار
اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ پوری دنیا میں واویلا کرے گا۔ یار ذرا سوچو تو، جو کچھ ہوا، وہ
معمولی بات تو نہیں کہ ہم اسے اتنے گھٹیا طریقے سے ختم کر دیں"۔

"تو اب کیا ہوگا منصور بھائی؟" فاروق نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"یہی کچھ ہوگا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا۔ اس مسئلے کو سیاسی چمکانے کے
استعمال کیا جائے گا اور مختلف سیاسی جماعتیں اپنی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے عوام سے ہڑتا
کی اپیل کریں گی۔ توڑ پھوڑ، جلاؤ گھیراؤ کا سلسلہ چلے گا اور پھر چھٹی"۔

"میں تو کہتا ہوں، ہمیں بھارت پر حملہ کر دینا چاہیے"۔ اکبر نے بپھر کر کہا۔

"یہ ناممکن ہے" نصیر بولا "یہ ایٹمی دور ہے۔ جنگیں تباہ کن ہوتی ہیں۔ تباہی ص
فوجوں کی نہیں ہوتی۔ شہر کے شہر اجڑ جاتے ہیں۔ پھر بین الاقوامی دباؤ الگ۔ اب وہ زمانہ
کہ لشکر کشی کی گئی۔ فوجوں میں لڑائی ہوئی۔ ہماری فوج فتح یاب ہوئی اور ہم نے لال قل
جھنڈا لہرا دیا"۔

"اور اگر جنگ ہو بھی جائے تو اس سے کیا حاصل ہوگا"۔ منصور نے کہا۔ "نہیں بھا
یہ وہ دور ہے، جس میں حکومتیں مجبور ہیں۔ کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دینا آسان کام نہیں
ڈپلومیسی کا دور ہے اور میرے خیال میں بابری مسجد کا سانحہ صرف اجتماعی نہیں، ہم سب
انفرادی مسئلہ بھی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ ہر مسلمان کی دینی و ملی حمیت کے لیے ایک
ہے۔ ایسی صورت حال میں سینوں میں چنگاریاں تو پھوٹتی ہیں......... آگ تو بھڑکتی ہے
مسئلہ یہ ہے کہ ہم بچوں کی طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ ہم اندر کی آگ کے نکاس کے گھٹیا ط
ڈھونڈتے ہیں۔ ہمیں خود کو تپانا، جھلسانا، جلانا نہیں آتا۔ اس وقت میرے سینے میں جو

ی رہی ہے، میں دشمنوں کی عورتوں کو گالیاں اور کوسنے دے کر ایجی ٹیشن کے نام پر املاک
آگ لگا کر دشمنوں کے پتلے جلا کر، نفرت کا اظہار کر کے اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا......... اور
وں گا بھی نہیں۔ میں تو اس آگ کو خدا کی امانت کے طور پر سنبھال کر رکھوں گا۔ میں اپنے
نے میں الاؤ دہکاؤں گا اور وقت کا انتظار کروں گا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میں اس سلسلے میں
ت کرنا ہی نہیں چاہتا"۔

"لیکن منصور بھائی! فرد کر ہی کیا سکتا ہے؟"

"افراد کچھ نہیں کرتے اور تعداد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن سینے میں الاؤ دہکایا
ے اور جذبہ صادق ہو تو ایک فرد کائنات کو بھسم کر سکتا ہے"۔ منصور کے لہجے میں یقین تھا۔
دیکھ لینا اس معاملے میں کوئی فرد ہی کچھ کرے گا"۔

"بہت بہت شکریہ منصور بھائی!" حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم بھی انشاء اللہ اپنی آگ
ائع کرنے کے بجائے سینے میں الاؤ دہکائیں گے"۔

"لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کچھ کر بھی سکتے ہیں یا نہیں"۔ فاروق بولا۔

"ایسے معاملات میں قدرت رہنمائی کرتی ہے"۔ منصور نے جواب دیا۔ "اور میری ایک
ت یاد رکھنا۔ انشاء اللہ! بھارت اپنی موجودہ جغرافیائی صورت میں اکیسویں صدی کا منہ نہیں
یکھ سکے گا"۔ وہ انہیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔

O============☆============O

آٹھ دسمبر کو مکمل ہڑتال ہوئی۔ منصور پورا دن گھر میں ہی رہا۔ شام سات بجے میرا کا
فون آیا۔ "تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟" میرا نے پوچھا۔

"میں سمجھ گیا، تم مجھے بلانا چاہتی ہو۔ ہے نا؟"

"ہاں، یہی بات ہے"۔

"تفصیل سے بات کرو"۔

"کل صبح دس بجے مجھ سے کہیں ملو"۔

"کہاں؟"

"کوئی ایسی جگہ ہو، جہاں سکون سے بات ہو سکتی ہو"۔

منصور سوچ میں پڑ گیا۔ "تم کہاں سے چلو گی؟" ایک لمحے بعد اس نے پوچھا۔

"صدر سے"۔

"تم ایسا کرنا۔ ایمپریس مارکیٹ سے A-4 میں بیٹھنا اور طارق روڈ، کیفے لبرٹی کے اسٹاپ
پر اتر جانا۔ میں دس بجے سے تمہیں وہاں کھڑا ملوں گا"۔

"سنو......... میں برقعے میں ہوں گی"۔

منصور کو یہ سن کر حیرت ہوئی۔ "کیا مطلب؟"

"بس میں برقع پہنے ہوں گی۔ باقی باتیں ملنے پر"۔

"تم نے فون کہاں سے کیا ہے؟"

"ایک سہیلی کے گھر سے۔ اچھا منصور' انشاء اللہ کل ملیں گے"۔ یہ کہہ کر میر
ریسیور رکھ دیا۔

منصور کو میرا کے منہ سے انشاء اللہ سن کر شاک لگا تھا۔ شاید ان دنوں وہ مسلما
صحبت میں زیادہ ہی رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

پچھلے سات برسوں میں ان کے درمیان چار پانچ بار فون پر گفتگو ہوئی تھی لیکن و
کبھی نہیں تھے۔ منصور ان کے گھر کبھی نہیں گیا تھا۔ بچھڑتے وقت میرا نے........ وعدہ
کہ وہ صرف شدید ضرورت ہی میں اسے بلائے گی' اور پچھلے سات برس میں اس نے ایک
بھی نہیں بلایا تھا۔ یعنی اس نے اپنا وعدہ پوری سچائی سے نبھایا تھا۔

یہ خیال آتے ہی منصور پریشان ہو گیا۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ بابری مسج
سانحے کا ردعمل شدید ہوا تھا۔ کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا۔ منصور کا جی چاہا کہ خود جا کر دیکھے۔
پھر اسے خیال آیا کہ میرا نے فون پر نارمل گفتگو کی تھی۔ اس کے لہجے میں پریشانی یا بد
ہرگز نہیں تھی۔

اب وہ ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہا تھا۔ سات برس........ اف........ پورے
برس! اب اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے اتنے طویل عرصے خود کو میرا سے ملنے
کیسے رکھا۔ کیسے ضبط کر لیا۔ پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اس میں اس کا کوئی کمال
تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ غم جاناں کے بارے میں سوچنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اور
دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ مگر اب وہ میرا سے ملنے کو بے تاب تھا۔

رات وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا۔ اس نے فجر کی نماز پڑھی پھر ناشتا کیا۔ نو بجے
نے اپنے آفس فون کر کے بتا دیا کہ وہ دفتر نہیں آسکے گا۔ پھر وہ تیار ہو کے نکلا۔ اس نے ما
روڈ کے لیے رکشا کر لیا۔

دس بجنے میں پانچ منٹ پر وہ کیفے لبرٹی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا دل زور زور
دھڑک رہا تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ہر شخص اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ ہر
جانتا تھا کہ وہ یہاں کسی لڑکی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ مگر دو تین منٹ بعد ہی میرا سے ملے
خوشی ہر احساس پر حاوی آگئی۔ دس بج کر دس منٹ پر ایک L-4 آ کر رکی۔ اس میں سے
دراز قد برقعہ پوش لڑکی اتری۔ منصور نے لڑکی کو دیکھا........ لیکن نہیں دیکھا۔ میرا کے
کے باوجود اس نے میرا کا برقعے میں تصور نہیں کیا تھا۔ وہ تو لڑکی کی آنکھوں میں مخصوص
پہچانی چمک ابھرتے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ میرا تھی۔

یہ نہیں کہ میرا بہت بدل گئی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی۔ بس اس کے چہرے پر ایک
سی تھی۔ جیسے وہ بہت طویل سفر کر کے تھک گئی ہو۔ البتہ برقعے نے اس کی پوری شخصیت
تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دونوں ایک ایک قدم آگے بڑھے۔ ایک قدم کا فاصلہ اور
تھا۔ مگر درمیان میں سات برس کی مسافت کی گرد تھی۔ دونوں ہی کی آنکھیں جلنے لگیں۔
دونوں اپنی جگہ ٹھہر گئے۔ جیسے درمیان میں سات برس کا فاصلہ ہو۔ وقت کا بہتا دھارا جیسے رک
گیا۔

چند لمحے وہ یونہی کھڑے رہے۔ پھر میرا مسکرائی۔ منصور بھی مسکرایا۔ وہ چند لمحے سات
برسوں پر حاوی تھے۔ وہ چند لمحے سات برس کی جدائی اور اس کی اذیتوں کی تلافی کر گئے۔ وہ
بیک وقت ایک دوسری کی طرف بڑھے۔ "السلام علیکم" میرا نے کہا۔

منصور نے بے ساختہ اس کے سلام کا جواب دیا........ اور پھر اچانک حیران رہ گیا۔

میرا نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ "کیسے ہو پریتم؟"

"اب کیا پوچھتی ہو۔ اب تو جیسا بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔ دیکھ لو"۔ منصور
نے کہا پھر شریر لہجے میں بولا۔ "مگر یہاں نہ دیکھنا۔ مجمع لگ جائے گا۔ آؤ میرے ساتھ"۔

انہوں نے سڑک پار کی........ پھر دوسری سڑک پار کی۔ منصور اسے ایرانیان کافی
ہاؤس کے فیملی روم میں لے گیا۔ ان کے کیبن میں بیٹھتے ہی بیرا نازل ہو گیا۔ "کیا لاؤں
صاحب؟"

منصور کا جی چاہا کہ کہے........ چودہ برس کی تنہائی۔ اپنی اس سوچ پر اسے خود ہنسی
آگئی۔ "چائے لے آؤ"۔ اس نے کہا۔

بیرے کے جانے کے بعد منصور نے کہا۔ "کیسی ہو؟"

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ اب تو تمہارے سامنے ہوں۔ جیسی بھی ہوں' خود دیکھ لو"۔
میرا نے کہا۔ "اس لیے کہ صرف مجھے دیکھ کر تم نہیں سمجھ سکو گے۔ بہرحال میں بہت اچھی
ہوں........ اور بہت خوش۔ تمہاری جدائی کی آگ نے مجھے کندن بنا دیا ہے"۔

"کچھ کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی ہو"۔ منصور کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آرہی
تھی۔

"ہاں پریتم' سفر بہت کٹھن تھا۔ تم سمجھ نہیں سکتے۔ بہت کٹھن سفر تھا میرا۔ اور تم سناؤ۔
ٹھیک تو ہو"۔

"بالکل فرسٹ کلاس۔ میں بھی بہت تھک گیا تھا۔ البتہ اب خود کو تازہ دم محسوس کر رہا
ہوں"۔

"تھکن کیسی تھی؟"

"تمہاری جدائی نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ لیکن وقت میں نے بھی بہت سخت گزارا
ہے"۔

"میں جانتی ہوں یہ بات اور مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی"۔ میرا نے مسکراتے ہوئے
کہا۔ "خود مجھے تمہاری جدائی نے کچھ کا کچھ بنا دیا"۔

منصور کی سمجھ میں اچانک ہی ایک بات آگئی۔ "اور یہ کیا چکر ہے۔ کل تم نے انشاءاللہ
کہا تھا اور آج تم نے مجھے سلام کیا ہے"۔

"اتنی آسان سی بات کا مطلب نہیں سمجھتے۔ میں مسلمان ہو چکی ہوں"۔

منصور سناٹے میں آگیا۔ یہ اطلاع اس کے لئے دھماکے سے کم نہیں تھی
"لیکن........... لیکن مجھے تو کسی نے بھی نہیں بتایا"۔

"میری ایک سہیلی کے سوا کسی کو یہ بات معلوم نہیں"۔ میرا نے جواب دیا۔ "وہ
سہیلی، جس کے گھر سے تمہیں فون کیا تھا۔ اس نے میری بڑی مدد کی۔ اسی نے مجھے نماز پڑھ
سکھایا۔ صرف وہی میری راز دار ہے"۔

"یہ........... یہ کب کی بات ہے؟" منصور نے پوچھا۔ وہ اب ـ شاک سے سنبھلنے
کوشش کر رہا تھا۔

"صدر شفٹ ہونے کے فوراً بعد میں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ دل سے تو م
بہت پہلے ہی ایمان لا چکی تھی۔ گھر والوں کو میں نے نہیں بتایا"۔

"مگر مجھ سے تو تمہاری کئی بار فون پر بات ہوئی۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم کو بتاتی تو تم یہی کہتے کہ میں تمہاری محبت کی وجہ سے مسلمان ہوئی ہوں۔ یہ با
میں سننا نہیں چاہتی تھی"۔

"لیکن تمہیں یہ کام علی الاعلان کرنا چاہئے تھا"۔ منصور نے خشک لہجے میں کہا۔

"تم سے شادی کا امکان ہوتا تو میں یہی کرتی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لا
والے، خدا کے حکم سے یہ بات پوشیدہ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی جانوں کو خطرہ لاحق تھا
یہی مسئلہ میرے ساتھ بھی تھا۔ میں مسلمان ہونے کا اعلان کرتی تو میرے سامنے دو صورتی
تھیں یا میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی یا بے ٹھکانا ہو جاتی۔ پہلی صورت میں یہ طے تھا
میرے پپا مجھے زہر دے دیتے اور دوسری صورت میں مجھ اکیلی لڑکی کا جینا دوبھر ہو جاتا۔ اسلا
کی رُو سے میرے لیے کسی سے شادی کرنا ضروری ہو جاتا، جو میں نہیں کر سکتی تھی۔ پھر ایک
مصلحت بھی تھی۔ میں اعلان کرتی تو تمام ہندو میری فیملی کا بائیکاٹ کر دیتے۔ میری بہنوں
زندگی تباہ ہو جاتی۔ جانتے ہو، اوشا اور تارا کا بیاہ ہو چکا ہے۔ اب صرف شاردا بچی ہے۔ وہ
انشاء اللہ جلد اپنے گھر کی ہو جائے گی" وہ کہتے کہتے رکی۔ بیرا چائے لے آیا تھا۔ وہ چائے بنا
میں مصروف ہو گئی۔ چائے کی پیالی منصور کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے سلسلۂ کلام جوڑا
"اور تم نے جو میری جواب طلبی کی ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ میرے او
اللہ کے درمیان ہے اور اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ یہ بھی سن لو کہ میں تمہاری محب
میں........... تم سے شادی کرنے کے لیے مسلمان نہیں ہوئی۔ اللہ کی ہدایت میرے کام آ
ہے۔ پہلے میرا دل ایمان سے روشن ہوا ہے"۔

منصور دم بخود بیٹھا تھا۔ میرا تو واقعی کہیں کی کہیں پہنچ چکی تھی۔ اس نے نہایت مدلل

جواب دے کر اسے لاجواب اور شرمندہ کر دیا تھا۔ "میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کرو
میرا"۔ اس نے شرمندگی سے کہا۔

"جن مولوی صاحب کے سامنے میں نے اسلام قبول کیا تھا، انہوں نے میرا نام حمیرا رکھا
تھا۔ تم بتاؤ، تم مجھے کس نام سے پکارو گے؟"

"میں تو تمہیں رابعہ کہوں گا"۔ منصور نے بلا جھجک کہا۔

"بس تو اب میں رابعہ ہوں"۔

"ایک بات بتاؤ۔ تم نے گھر والوں سے چھپایا تھا کہ تم مسلمان ہو گئی ہو، تب تو تم نے
دکھاوے کو پوجا پاٹ بھی کی ہوگی؟"

"بڑے بدگمان ہو"۔ اس نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تمہیں نہیں معلوم، پوجا کرنا تو میں
نے صدر شفٹ ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر میں نے سروس کر لی تو ویسے ہی بری الذمہ
ہو گئی۔ ماں کہتی تھی، میرا تھکی ہاری آتی ہے۔ یہ کام اب شاردا کرے گی"۔

"رابعہ........... اب میں خود تمہیں قرآن پاک پڑھاؤں گا"۔

"سات سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے منصور۔ میں قرآن پاک ختم کر چکی ہوں اور ہر روز
تلاوت کرتی ہوں"۔

منصور کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ ان سات برسوں میں اس نازک سی لڑکی نے کیا کچھ
کیا تھا........... اور کس قدر تنہا رہی تھی وہ۔ کتنی اکیلی...........

"مجھ سے یہ نہیں پوچھو گے کہ میں نے آج کس ضروری کام کے تحت تمہیں ملنے کے
لیے بلایا ہے"۔

"تم نے اتنے دھماکے کیے کہ مجھے یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ حالانکہ تجسس بہت تھا
مجھے۔ اب بتا ہی دو"۔

"وہ آخری ملاقات یاد ہے تمہیں؟"

منصور سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "اوہ........... وہ رات..........."

"بس۔ اتنا حوالہ ہی کافی ہے"۔ رابعہ کی نظریں جھک گئیں اور چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔
"وہ سب کچھ مجھے شرمندگی کے ساتھ ہمیشہ یاد رہا۔ میں ہمیشہ اس خطا پر خدا سے توبہ کرتی رہی۔
بڑی کچی توبہ تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ نے قبول کر لی ہوگی لیکن مجھے ایک خلش سی رہی۔ میں
ہمیشہ سوچتی تھی کہ تم سے شادی کروں گی تو تلافی بھی ہو جائے گی۔ آج میں تم سے یہی کہنے آئی
ہوں کہ مجھ سے شادی کر لو۔ پہلے اس کا جواب دے دو پھر میں ایک اور بات کروں گی"۔

"تم سے شادی کرنا تو میرے لیے باعث افتخار ہوگا"۔ منصور نے کہا۔ "لیکن شاردا کا کیا
ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہماری شادی کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ لیکن پہلے تم ہاں تو کرو"۔

"ہاں تو میں کر چکا ہوں۔ لیکن تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔ منصور کے لہجے

میں الجھن تھی۔ "ہم شادی چھپ کر کیوں کریں گے؟"

"یہ ضروری ہے پریتم!" وہ بولی' پھر اس کی نظر چائے کی پیالیوں پر پڑی' جو جوں کی تو
رکھی تھیں۔ "بیرے کو بلا کر اور چائے منگواؤ"۔

بیرا برتن سمیٹ کر لے گیا اور دوسری چائے لے آیا۔ رابعہ نے چائے بنائی۔ چائے کا
پہلا گھونٹ لینے کے بعد اس نے وضاحت کی۔ "اب میں اپنے گھر واپس نہیں جاؤں گی"۔

"وہ تو ظاہر ہے لیکن اس صورت حال میں تمہاری گمشدگی مسئلہ بن جائے گی۔ تمہارے
پپا' تمہاری برادری اس سلسلے میں اوپر تک اپروچ کر سکتی ہے' جو کہ عام حالات میں ممکن نہ
ہوتا۔ ہاں ہماری شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم قانونی طور پر خود مختار ہو لیکن شادی کو خ
رکھنا.......... اس کی کیا ضرورت ہے آخر؟"

"ضرورت ہے۔ پتا ہے' فوج کی موجودگی میں کل راتوں رات بابری مسجد کی جگہ م
تعمیر کر دیا گیا ہے۔ کیا ہم یہ گوارا کر سکتے ہیں؟ جب کہ ہماری حکومت سفارتی سطح پر کوشش ک
سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی"۔

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ' کچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اس سلسلے میں جان بھی دے سکتا ہوں"۔

"بس تو میری طرف سے بے فکر رہو۔ جو سبب تم نے میری گمشدگی سے متعلق پریشا
کا بیان کیا ہے' اس کا ایک اور رخ بھی ہے۔ اس صورت حال میں میرے گھر والے می
گمشدگی کے بعد یہی سوچ سکتے ہیں کہ مجھے کسی مشتعل مسلمان نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ مجھے م
بھی فرض کر سکتے ہیں۔ اب میری بات غور سے سنو.........."

وہ کہتی رہی۔ منصور سنتا رہا۔ سینے کا الاؤ اور دہک اٹھا تھا۔

○==========☆==========○

وہ تینوں دیکھ رہے تھے کہ منصور بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ زیادہ تر وہ خاموش اور گم
رہتا۔ کبھی اچانک چہکنے لگتا' اس وقت وہ پرانا منصور نظر آتا لیکن وہ بس چند لمحوں کی با
ہوتی۔ ورنہ وہ کسی گہری سوچ میں گم رہتا۔ بات بھی کم ہی کرتا۔ کچھ پوچھا جاتا تو مختصر جوا
دیتا۔ وہ تینوں اس سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ بات کیا ہے۔ وہ ہر بار کہتا' کوئی بات نہیں۔
بولنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ بابری مسجد کے موضوع پر کوئی بات ہوتی تب بھی وہ گم صم
رہتا۔

ویسے اس کی کہی ہوئی بیشتر باتیں درست ثابت ہوئی تھیں۔ یوں یوم احتجاج پر کئی م
جلا کر لوگوں کی تسلی ہو گئی تھی' قائد حزب اختلاف نے مسجد کی شہادت کا ذمے دار مو
حکومت کی خارجہ پالیسی کو ٹھہرایا تھا۔ یعنی اس دعوے کی تجدید کی تھی کہ تمام مسائل کا
اور جمہوریت کی بقا اسی میں ہے کہ انہیں اقتدار مل جائے۔ پھر بھارتی حکومت نے وعدہ کیا

وہ بابری مسجد کو دوبارہ تعمیر کرائے گی۔ اس پر کچھ لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ
ہندوؤں نے یہ وعدہ کر کے اپنی فطری مکاری سے کام لیا ہے۔

منصور نے مونچھیں چھوڑ دی تھیں۔ بچپن کے دوستوں کے لیے یہ بات بھی حیرت انگیز
تھی۔ وہ جانتے تھے کہ منصور کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ اس پر مونچھیں اچھی نہیں لگیں
گی۔ کئی بار بستی کے کچھ لڑکوں نے اسے ٹوکا تھا۔ "یار منصور' مونچھیں رکھ ہی لو"۔

"کیوں رکھ لوں؟" منصور کا ہمیشہ یہی سوال ہوتا تھا۔ "کیا مونچھیں رکھنا فرض ہے؟"

"فرض تو نہیں۔ البتہ مونچھ مردانگی کی علامت ہوتی ہے"۔ مونچھوں کے بارے میں یہ
جملہ ہمیشہ کہا جاتا ہے"۔

"میرے خیال میں مردانگی کسی اظہار' کسی علامت' کسی اعلان کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ
تو بوقت ضرورت بے ساختہ سامنے آتی اور خود کو منوا لیتی ہے"۔ منصور کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا
تھا لیکن اب وہ مونچھیں پال رہا تھا۔

"یار منصور' یہ تمہیں مونچھوں کی کیا سوجھ گئی؟" ایک روز نصیر نے پوچھا۔

"بس جی چاہا تھا سو مونچھیں چھوڑ دیں"۔

"تمہارا تو خیال تھا کہ تمہارے چہرے پر مونچھیں اچھی نہیں لگیں گی"۔ منیر نے اسے
یاد دلایا۔

"خیال تو اب بھی یہی ہے لیکن اب ۳۳ سال کی عمر میں یہ بچوں جیسا چہرہ بھی اچھا نہیں
لگتا"۔

درحقیقت رابعہ سے ملاقات کے بعد منصور پریشان بھی تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ خوف
زدہ ہوا تھا۔ ڈرا سے اس لیے تھا کہ اس معاملے میں اس کا پولیس سے سابقہ پڑ سکتا تھا۔ اس کا
خیال تھا کہ میرا کی گمشدگی کے سلسلے میں جب رپورٹ درج کرائی جائے گی تو پولیس یہ سوال
ضرور کرے گی کہ گردھاری لال کو کسی پر شک ہے تو نہیں۔ ایسے میں یہ ناممکن نہیں تھا کہ
گردھاری لال اس کا نام لے دے۔ کلاوتی کو تو یقیناً اس کا خیال آئے گا۔ ایسا ہوا تو پولیس پوچھ
گچھ کے لیے آئے گی اور پولیس کا کسی کے دروازے پر آنا ہی صاحب خانہ کی بے عزتی کے
لیے بہت ہے۔ منصور کو ابا جان کی وجہ سے عزت کا خیال ہمیشہ رہتا تھا۔

ویسے رابعہ نے اسے ہر طرح سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس روز وہ گھر واپس نہ جانے کا
فیصلہ کر کے نکلی تھی۔ منصور چاہتا تھا کہ اسے اپنی نصرت آپا کے گھر لے جائے۔ نصرت اس کی
سب سے چھوٹی بہن تھی' وہ سب سے زیادہ نصرت سے ہی قریب تھا۔ بہنوئیوں میں بھی نصرت
کا شوہر ذیشان اسے سب سے اچھا لگتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ رابعہ کو نصرت کے گھر لے جائے
گا۔ وہیں تینوں بہنیں اپنے شوہروں اور بچوں سمیت آ جائیں گی۔ شادی کی مختصر سی' لیکن اچھی
خاصی تقریب ہو جائے گی لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ شادی چھپ کر نہ کی جائے۔ مگر
رابعہ نے اسے قائل کر دیا تھا۔

رابعہ نے ہر طرح سے اس کے تحفظ کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ منصور سے ہر بات کرنے کے بعد وہ اپنی سہیلی ناہید کے گھر چلی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے اسے ناہید کا فو نمبر بھی دے دیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ رابعہ کی گمشدگی کا مسئلہ سرد ہوتے ہی منصور اسے فو کرے گا۔ پھر نصرت آکر اسے اپنے ساتھ لے جائے گی اور شادی کی تقریب میں صرف گھر لوگ شریک ہوں گے۔ رابعہ نے بتایا تھا کہ ناہید کے متعلق اس کے گھر میں کسی کو بھی معل نہیں۔ یہ ناہید وہی سہیلی تھی، جس سے رابعہ اسلام کے متعلق سیکھتی، جانتی رہی تھی۔ اسی گھر پر رابعہ نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا تھا۔

میرا کی گمشدگی کی رپورٹ گردھاری لال نے تیسرے دن درج کرائی تھی۔ ایک دن اسے اپنے طور پر تلاش کرتا رہا۔ میرا کے دفتر سے اسے معلوم ہوا کہ میرا تو گزشتہ روز بھی د نہیں آئی تھی۔ یہ خبر چوتھے روز شائع ہوئی۔

ابتدائی چند روز منصور کے لیے پریشان کن تھے۔ ہر دستک پر وہ سوچتا کہ پولیس آئی حالانکہ ڈر کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سینٹرل ڈویژن کا ایس پی ذوالفقار اس کے بہنوئی زیش کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ منصور کی بھی اس سے خاصی یاد اللہ ہو گئی تھی۔

تین ہفتے گزر گئے۔ نیا سال آگیا۔ اب منصور مطمئن ہو گیا۔ اس کی مونچھیں بھی باقا ہو چکی تھیں۔ ایک روز اس نے شہزاد سے کہا۔ "یار........ میں یہ ہوٹل کا کھانا کھاتے کھا بیزار ہو گیا ہوں"۔

شہزاد کے کچھ کہنے سے پہلے منیر بول اٹھا۔ "بہت دیر کی بے زار ہوتے ہوتے"۔

"میں تو کہتا ہوں، اب شادی کر لو"۔ شہزاد بولا۔

"ہاں یار، اب تو میرے بچے بھی پوچھنے لگے ہیں کہ کیا سچ مچ منصور انکل آپ کے ہم پڑھے ہیں"۔ نصیر نے کہا۔

"شادی تو خیر میں ابھی نہیں کر سکتا۔ دو تین سال بعد کروں گا"۔ منصور نے "لیکن میں نے نصرت آپا کے ہاں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

"یعنی ہماری محفل اجڑنے والی ہے"۔ منیر اداس ہو گیا۔

"تو یار، کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ آتا رہوں گا اور پھر نصرت آپا کا گھر بھی شہر میں ہے۔ تم بھی جب چاہو ملنے آسکتے ہو"۔

"اس شہر کی مصروفیت کا حال تو تم جانتے ہو"۔ شہزاد بولا۔ "اتنے قریب رہنے کے با بعض اوقات ہم کئی کئی دن نہیں مل پاتے"۔

"یہی زندگی ہے دوستو، شادی ہو جائے، بچے ہو جائیں تو وقت کم ہی نکلتا ہے"۔ منی نے کہا۔ "اسی لیے تو میں ابھی دو تین سال آزاد رہنا چاہتا ہوں"۔

اس روز وہ تینوں یوں رخصت ہوئے، جیسے ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہے ہوں۔ اگلے منصور نے اپنے کپڑے اور ذاتی استعمال کی چیزیں ایک سوٹ کیس میں رکھیں اور نصرت کے

چلا گیا۔ نصرت اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی کیونکہ وہ کم ہی آتا تھا۔ اس نے نصرت کو ایک خاص بات کے سوا سب کچھ بتا دیا۔ نصرت کھل اٹھی۔ بہنوں کو ہمیشہ چھوٹے بھائیوں کی شادی کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن منصور ہمیشہ ٹالتا رہا تھا اور آج وہ خود............

"سچ کہ رہے ہو منصور۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے"۔ وہ بولی۔

"تمہیں اس بات کا ملال تو نہیں کہ میں ایک نو مسلم لڑکی کو تمہاری بھابی بنا رہا ہوں؟" منصور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔ نصرت نے بلا تاخیر جواب دیا۔ "تمہاری پسند کوئی ایسی ویسی نہیں ہو سکتی۔ ہم چاروں بہنوں کو اس معاملے میں تم پر کتنا مان ہے، اس کا تصور بھی تم نہیں کر سکتے اور پھر وہ لڑکی، جس کے لیے تم اتنے برسوں سے بیٹھے ہو"۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ............"

"تم ہر بار شادی سے انکار کرتے رہے اور ہم بہنوں نے کبھی اصرار نہیں کیا۔ صرف اسی لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ تم اس ہندو لڑکی کو چاہتے ہو۔ صفیہ باجی نے ہمیں بتا دیا تھا۔ یہ بات تو پوری بستی کو معلوم تھی لیکن تم چھوٹے ہو کر بھی اتنے بڑے ہو کہ یہ بات تم سے کہی نہیں جا سکتی تھی۔ ہم کیا، کوئی بھی نہیں کہہ سکا۔ ورنہ بستی میں زبان دراز عورتیں بھی تو ہیں"۔

منصور شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے تئیں یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی محبت کا راز اس کے دوستوں کی سوا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ "تو آپا، اب میں رابعہ کو فون کر دیتا ہوں۔ تم جا کر اسے لے آؤ"۔

"ٹھیک ہے۔ تم اسے فون کر دو لیکن میں اکیلی اسے لینے نہیں جاؤں گی۔ ہم چاروں بہنیں جائیں گی اور بڑی شان سے لے کر آئیں گی۔ تمہاری شادی کا ارمان صرف مجھے نہیں، سبھی کو ہے اور اب خدا خدا کر کے ہمیں یہ موقع ملا ہے............"

"آپا، جو جی چاہے کرو۔ میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن اس شادی کا علم گھر کے لوگوں کے سوا کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے............"

"تو وجہ بھی بتا دو"۔

"بس آپا، اس پر مجبور نہ کرنا۔ وجہ میں نہیں بتا سکتا"۔

"ڈر رہے ہو تو غلط بات ہے۔ میں ذیشان سے کہوں گی، وہ ذوالفقار بھائی سے بات کر لیں گے............"

"نہیں آپا، بات ڈر کی نہیں۔ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا ہوں کہ ڈروں۔ بات کچھ اور ہے"۔

"ٹھیک ہے منصور............ تم ہے تو ہم لڑ بھی نہیں سکتے"۔ نصرت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اب تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمام بہنوں کو بتانے جا رہی ہوں"۔

اس کے جانے کے بعد منصور نے رابعہ کو فون پر خوش خبری سنا دی۔

اگلے روز منصور اور رابعہ کا نکاح ہو گیا۔ سہاگ رات ان کے لیے شکر کی رات تھی۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ ان کی سات سال پرانی خطا دھل گئی ہے۔

اس کے بعد منصور پوری طمانیت کے ساتھ ان کاموں میں مصروف ہو گیا جو بہت ضروری تھے.......... جن پر اس کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وطن عزیز میں جو چیزیں جعلی بنتی ہیں.......... ہر چیز دو نمبر کی بھی موجود ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی افادیت ہے۔ اسے اپنا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانا تھا۔ اس میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر وہ ایس پی ذوالفقار سے ملا۔ ذوالفقار کو رازداری پر قائل کرنا خاص دشوار کام تھا۔ بہرحال وہ اس مرحلے سے بھی گزر گیا۔ ذوالفقار کے ذریعے وہ ایک اور افسر سے ملا۔ معاملات طے ہو گئے۔ اب اسے صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔

وہ نصرت کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔ ایک روز نصرت نے کہا۔ "منصور.......... دلہن کو لے کر کہیں گھوم پھر آؤ"۔

"جاؤں گا آپا' موسم بہار میں کشمیر دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔ اس موسم میں برف باری بھی ہوتی ہے اور سرسوں بھی کھلتی ہے۔ سنا ہے' بڑا خوبصورت سماں ہوتا ہے' اپریل میں شاید جاؤں۔ ابھی تو مصروفیت بھی بہت ہے"۔

O=========== ☆ ===========O

بابری مسجد کے معاملے میں حسب توقع اور حسب روایت بھارتی حکومت نے مکاری سے کام لیا۔ مسجد کی تعمیر کا وعدہ ٹلتا رہا اور رام مندر کی باقاعدہ تعمیر شروع ہو گئی۔ تعمیراتی کمپنی کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کا خوبصورت ترین مندر ثابت ہوگا۔ کام فوج کے تحفظ میں ہو رہا تھا۔ اس علاقے کو ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا گیا تھا۔

حکومت پاکستان نے سفارتی سطح پر بارہا احتجاج کیا۔ بھارتی حکومت کبھی اسے اندرونی معاملہ قرار دے کر مسترد کر دیتی اور جب عالمی اور خاص طور پر اسلامی دباؤ بڑھتا تو وعدہ کر لیتی کہ وہاں بابری مسجد بھی دوبارہ تعمیر ہوگی۔

بالآخر مارچ میں پاکستانی قوم کا ضبط جواب دے گیا۔ بپھرے ہوئے مسلمان سڑکوں پر نکل آئے۔ ہندوؤں کے گھروں پر حملے بھی کیے گئے۔ کشیدگی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سرحدوں پر بھی صورت حال بہت خراب تھی۔ عام لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس صورت حال کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان بہت سے معاملات بدستور حسب سابق چل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک معاملہ غذائی اجناس کی اسمگلنگ کا بھی تھا۔ پاکستان سے گندم' چاول اور چینی غیر قانونی طور پر سرحد پار جاتی تھی.......... اور جا رہی تھی۔ ان معاملات میں جو بااثر لوگ ملوث تھے' وہ مذہب کی تفریق سے بے نیاز تھے۔ ان کے درمیان صرف مفادات اور ضرورت کا رشتہ تھا اور ایسے رشتے بڑے مستحکم ہوتے ہیں۔ تعلقات کی اس زنجیر کی کڑیاں بہت دور تک پھیلی

ہوئی تھیں۔

مارچ کے اواخر میں کراچی انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر نے میرپور خاص انتظامیہ کے ایک اہم افسر کو فون کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے صرف کولیگ ہی نہیں' بلکہ پرانے دوست بھی تھے۔ ان کی رفاقت اسکول کے زمانے سے تھی۔ کراچی کے افسر کو میرپور خاص کے افسر سے ایک کام درپیش تھا۔ وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ شہروں کے بادشاہ ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔

علیک سلیک اور ایک دوسرے کی مزاج پرسی کے بعد کراچی کے افسر نے کہا۔ "یار ایک کام آپڑا ہے تجھ سے۔ یہاں میرا ایک خاص جاننے والا ہے۔ ہندو ہے رمیش نام کا۔ وہ خطرے میں ہے۔ یہاں رہے گا تو مارا جائے گا۔ تفصیل میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ اسے اور اس کی بیوی کو سرحد پار کرانی ہے"۔

میرپور خاص کے افسر نے چند لمحے سوچا اور بولا۔ "یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا یار' تیرا حکم ہے تو بس سمجھ لے کام ہو گیا"۔

"وہ بڑا خاص آدمی ہے میرا۔ اس کی حفاظت کا خیال رکھنا۔ اور ہاں.......... تیرا کوئی ایسا جاننے والا بھی ہوگا' جو اس طرف آباد ہونے میں اس کی ہر ممکن مدد کر سکے۔ رمیش یہاں خاصا ویل آف رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ باہر جا کر وہ رُلے"۔

"تو اس کی بھی فکر نہ کر یار۔ میرے پاس بڑے کام کے بندے ہیں۔ تیرے دوست کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ بس تو انہیں میرے پاس بھیج دے"۔

"تھینک یو سو مچ ڈیئر۔ کل وہ تیرے پاس پہنچ جائیں گے"۔

میرپور خاص کے افسر نے ریسیور رکھنے کے بعد چند لمحے سوچا۔ پھر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ چپراسی آیا تو اس نے کہا "ڈرائیور سے کہو' جیپ نکالے"۔

چند منٹ بعد وہ جیپ میں بیٹھا رانا میت سنگھ کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔

رانا اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے پوچھا "سائیں مہاراج' بے وقت کیسے زحمت کی۔ مجھے بلوا لیا ہوتا"۔

"نہیں راناجی۔ کام تو میرا تھا"۔

"بولو سائیں مہاراج!"

"کام کیسا چل رہا ہے؟"

"فرسٹ کلاس"۔

"اگلی کھیپ کب جا رہی ہے مال کی؟"

"اگلے ہفتے سائیں!"

"اس بار دو بندے بھی ہوں گے مال کے ساتھ"۔ افسر نے رانا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

رانا کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ "سائیں مہاراج' آج کل کا حال تو آپ جانتے ہو... ہو رہی ہے بہت۔ حالات اچھے نہیں"۔

"میں سب جانتا ہوں"۔ افسر نے ترش لہجے میں کہا۔ "ضرورت کی چیز لینے میں تو... سختی نہیں کرتا۔ آٹا' چینی' چاول تو جاتا ہے نا۔ کون چیک کرتا ہے۔ سب سالے آنکھیں بند... کے بیٹھ جاتے ہیں اور راناجی' میں کوئی جاسوس نہیں بھجوا رہا ہوں اس پار"۔

"میں جانتا ہوں سائیں مہاراج پر........"

"ایک بات سن لو۔ تم جو مال ہمیشہ اُدھر بھجواتے ہو' وہ یہاں کا مال ہوتا ہے اور میں... مال تمہیں لے جانے کو کہہ رہا ہوں' وہ اُدھر ہی کا ہے"۔

"میں سمجھا نہیں مہاراج!" رانا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"وہ ایک ہندو ہے........ میرا دوست۔ اب ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ وہ یہاں رہ... گا تو مار دیا جائے گا۔ اسے سرحد پار کرانی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی ہو گی"۔

"اوہ........ یہ بات ہے۔ یہ تو پن کا کام ہے سائیں!" رانا نے اطمینان کی سانس لے... کہا۔ "کیا نام ہے آپ کے دوست کا؟"

"رمیش"۔ افسر نے بتایا۔ "اور ہاں راناجی' وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ یہاں بہ... اچھا کماتا کھاتا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے' یہاں سے جانے والوں کا حشر اچھا نہیں ہوتا۔ ورنہ سارے ہندو اب تک سرحد پار کر چکے ہوتے۔ میں نہیں چاہتا کہ رمیش وہاں جا کر خوار ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس پار بھی تمہارے بڑے تعلقات ہیں۔ تم کوشش کرو گے تو وہاں رمیش... روزگار کا' رہنے سہنے کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ رمیش کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے۔ بچہ کوئی نہ... ہے ان کا"۔

"آپ فکر نہ کرو سائیں مہاراج' اسے وہاں بڑے لاڈ سے رکھا جائے گا۔ بس وہ آ... تو آپ انہیں میرے پاس بھجوا دو۔ جانے تک وہ میرے مہمان رہیں گے"۔

افسر کے جانے کے بعد رانا سیدھا گھر میں گیا۔ "دیپا........ اپنے ہاں دو مہمان آ... والے ہیں"۔ اس نے بیوی سے کہا۔ "پتی پتنی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہندو ہیں۔ تو عورت... اچھی طرح سے ٹٹولنا۔ میں اس معاملے میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ عورت کو پرکھ کر پتا... سکتا ہے کہ وہ ہندو ہیں یا نہیں"۔

دیپا نے کہا۔ "تو تمہیں ان کے دھرم کی چنتا کیوں ہے۔ ہوتے رہیں کچھ بھی"۔

"تو نہیں سمجھتی۔ انہیں سرحد پار بھجوانا ہے۔ بڑے صاحب کا حکم ہے"۔

"اوہ کوئی بات نہیں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ دیپا تو اُڑتی چڑیوں کے پر گن لیتی ہے"۔

O============☆============O

منصور اور رابعہ عوام ایکسپریس میں سفر کر رہے تھے۔ چاروں بہنیں' بہنوئی اور بھا... بھانجیاں انہیں رخصت کرنے کینٹ اسٹیشن آئے۔ سب خوش تھے کہ نوبیاہتا جوڑا ہنی مون...

...ہے۔ "تم اتنے مصروف ہو گے کہ خط لکھنے کا تو وقت نہیں ملے گا"۔ فرحت نے منصور کو...

"نہیں آپا' میں کوشش کروں گا خط لکھنے کی" منصور نے سنجیدگی سے کہا۔ اس پر سب... پڑے۔

وہ دونوں حیدر آباد اترے اور میرپور خاص جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ ان کے پاس ...ان زیادہ نہیں تھا۔ "ایک بات بتاؤں"۔ سفر کے دوران رابعہ نے کہا۔ "شروع میں تو ...مجھے تم پر بہت بری لگی تھیں مگر اب اچھے لگ رہے ہو"۔

"تمہیں تو میں ہر حال میں اچھا لگوں گا"۔ منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات کا ...بار نہیں"۔

کوئی انہیں غور سے دیکھتا تو سمجھ لیتا کہ وہ بہت نروس ہیں۔ ان کے دل بری طرح ...ک رہے تھے۔ وہ ایک بے یقینی کی کیفیت سے دو چار تھے۔ خدا ہی جانتا تھا کہ جو کچھ انہوں ...سوچا اور چاہا ہے' ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ اور یہ بات ان کے لیے بہت زیادہ اہم تھی۔

"ہم دنیا کا سب سے انوکھا ہنی مون منانے جا رہے ہیں"۔ منصور نے سرگوشی میں کہا۔

"اور سب سے مقدس بھی"۔ رابعہ بولی۔

انہیں اس افسر کے گھر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی' جس کا کارڈ منصور کو ذوالفقار ...افسر دوست نے دیا تھا۔ افسر نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ "نہا دھو کر کھانا کھاؤ۔ ...رام کرو"۔ افسر نے کہا۔ "رات یہیں گزارو۔ صبح میں تمہیں رانا میت سنگھ کے پاس پہنچا دوں... سرحد پار کرنے تک تمہیں وہیں رہنا ہوگا۔ اور ہاں........ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم ...ں پوری طرح محفوظ ہو"۔

کھانے کے بعد افسر دیر تک منصور سے اس کے اور رابعہ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ یہ ...روری تھا۔ رانا کو اس نے بتایا تھا کہ رمیش اس کا بہت پرانا دوست ہے۔ اس لئے وہ اس کے ...ے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔

سونے کے موقعے پر انہیں تنہائی ملی۔ رابعہ نے کہا۔ "جان........ اب کٹھنائیوں کا سفر ...وع ہو رہا ہے"۔ وہ گجراتی میں بات کر رہی تھی تاکہ منصور رواں ہو جائے اور اسے حجاب ...رہے۔ "اب ہمیں تمام اچھی باتیں چھوڑنا پڑیں گی۔ ہم زبان سے بسم اللہ بھی نہیں کہہ سکیں ...ے"۔

"کوئی بات نہیں۔ دل کی دھڑکن تو اللہ کا نام لیتی رہے گی"۔ منصور نے بھی گجراتی میں ...۔ "اور اللہ دل کا حال جانتا ہے"۔

دونوں بیٹھ کر اپنی کہانی پکی کرتے رہے۔ اب وہ جس مرحلے میں داخل ہو رہے تھے ...ہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جانے کس وقت انہیں نیند آ گئی۔ صبح افسر خود انہیں ...پ میں بٹھا کر رانا میت سنگھ کے ڈیرے پر چھوڑ آیا۔

O==========☆==========O

پورا دن رابعہ دیپا رانی کے ساتھ رہی اور منصور ڈیوڑھی میں رانا کے ساتھ بیٹھا
رانا اس کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ "میں سب کچھ اس لئے جاننا چاہتا ہوں
کہ میں سرحد پار اپنے کچھ دوستوں کے نام پتے لکھ کر تمہیں دے دوں گا۔ وہ تمہاری مدد
کریں گے"۔ اس نے وضاحت کی۔
منصور مطمئن تھا کہ اس کی کہانی پکی ہے۔
"تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو"۔ رانا نے کہا۔
"جی ہاں۔ میں نے بی ایس سی کیا ہے"۔
"کام کیا کرتے تھے"۔
"کنسٹرکشن کمپنی میں تھا۔ بس انجینئرنگ کی ڈگری نہیں ہے میرے پاس۔ ویسے
انجینئر سے کم نہیں ہوں۔ سپروائزر تھا میں"۔
رانا متاثر نظر آنے لگا۔ "یہی تو میں سوچتا تھا۔ سائیں مہاراج کا دوست کوئی ایسا
نہیں ہو سکتا۔ اچھا.......... یہ تو بتاؤ۔ تم دونوں کے گھر والے"۔
"ہم دونوں ہی ایک جیسے ہیں"۔ منصور نے آہ بھر کر کہا۔ "ہمارے ماتا پتا کا بچپن میں
دیہانت ہو گیا تھا۔ بھائی بہن بھی کوئی نہیں"۔
"بڑا کٹھن جیون بتایا ہے"۔
"ہاں مہاراج۔ شاید یہی چیز ہمیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ لائی۔ ہم نے سوچا
اپنا الگ سنسار بنائیں گے"۔
"تمہیں پگار کتنی ملتی تھی؟"
"آٹھ ہزار"۔
"ایک بات بتاؤ۔ تم جانتے ہو کہ یہاں سے وہاں جانے والے بڑا کشٹ اٹھاتے ہیں
تم اتنا اچھا روزگار چھوڑ کر وہاں رُلنے کیوں جا رہے ہو؟"
"اب ہم یہاں رہ نہیں سکتے"۔ منصور نے آہ بھر کے کہا۔
"کیوں.......... ایسا کیا ہو گیا؟"
"شہر میں ایک بڑا آدمی میری رابو کے پیچھے پڑھ گیا تھا.........."
"رابو؟ کون رابو؟"
"میں ریکھا کو پیار سے رابو کہتا ہوں"۔ منصور نے جھینپتے ہوئے کہا۔
"پھر کیا ہوا؟"
"وہ بڑا اثر رسوخ والا آدمی ہے' غنڈے بھی پال رکھے ہیں اس نے۔ پولیس پر
زور ہے اس کا۔ اس نے کئی بار رابو کو پٹانے کی کوشش کی۔ رابو نے جھڑک دیا۔ آخر
اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے مروا دے گا۔ پھر دیکھے گا' رابو اس کی ہوتی ہے یا نہیں"۔

"آدمی پرائے لوگوں میں ہو تو اسے دبنا ہی پڑتا ہے"۔ رانا نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔
"دبنے میں کوئی برائی نہیں۔ پر عزت تو نہیں دے سکتے ہم"۔ منصور نے بپھر کر کہا۔
"اچھا تمہارے پاس شناختی کارڈ اور پاسپورٹ تو ہوں گے"۔ رانا نے اچانک پوچھا۔
"ہاں۔ ہیں"۔
"تو وہ مجھے دے دو۔ انہیں لے کر سرحد پار نہ کرنا۔ یاد رکھو' تم وہاں غیر قانونی طور پر
ہے ہو"۔
منصور اٹھا۔ اس نے سوٹ کیس میں سے اپنا اور رابعہ کا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ نکال
رانا کو دے دیا۔ رانا نے چاروں چیزیں دیکھے بغیر جیب میں ڈال دیں۔ "اچھا رمیش کاکا' تم
ام کرو۔ میں ذرا دو ایک کام نمٹا لوں"۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو
کو آواز دے لینا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا"۔

O==========☆==========O

خوش قسمتی سے دیپا نے ان کے سونے کا بندوبست علیحدہ کمرے میں کر دیا تھا۔ ورنہ
ے دن تو وہ ایک دوسرے کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ دونوں سونے کے لیے
گے تو رابعہ نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں زور سے نہ بولنا"۔
"کیوں' کیا بات ہے؟" منصور نے پوچھا۔
"یا تو ان لوگوں کو ہم پر شک ہے یا پوری طرح تصدیق کرنا چاہتے ہیں"۔ رابعہ بدستور
وشی میں بات کر رہی تھی۔ "دیپا نے دن بھر مجھ پر نظر رکھی۔ میری بول چال' چال ڈھال'
از و اطوار سب دیکھتی رہی۔ میرے متعلق سب کچھ پوچھا اور ایسی باتیں بھی پوچھیں' جن کا
ب صرف ایک ہندو لڑکی ہی دے سکتی ہے"۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے"۔
"کیا مطلب؟"
"یہ لوگ پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے تو سرحد پار والوں کو بھی مطمئن کر دیں گے"
ور نے اسے سمجھایا۔ "تم دیپا کا دل مٹھی میں لینے کی کوشش کرو"۔
"تم مطمئن رہو۔ بس تم ذرا محتاط رہنا"۔
"اتنا محتاط تو میں زندگی میں کبھی نہیں رہا"۔
دوسری طرف رانا میت سنگھ اور دیپا انہی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ دیپا' ریکھا کے
ن گا رہی تھی۔ "میں تو سوچتی رہی ہوں کہ بھگوان نے مجھے ایسی بیٹی کیوں نہ دی۔ بڑی گنوں
ی ہے۔ سمجھ دار.......... سگھڑ.........."
"میں نے تم سے کچھ اور کہا تھا"۔ رانا نے ترشی سے کہا۔
"تم بے فکر ہو جاؤ۔ وہ ہندو ہے"۔
"اتنے وشواس سے کیسے کہہ رہی ہو"۔

"میں نے دن بھر اسے پرکھا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں' جو وہی لڑکی جان سکتی ہندو گھر میں پیدا ہوئی ہو۔ ایسی باتیں تو کوئی مرد بھی نہیں جان سکتا۔ تمہیں بھی پتا نہ گی"۔

"ایسی کون سی بات ہے' جو مجھ گیانی کو پتا نہیں؟" رانا نے مونچھوں کو تاؤ دیتے پوچھا۔

"بڑے آئے گیانی بن کر۔ تمہیں تو کچھ بھی پتا نہیں"۔ دیپا نے اٹھلا کر کہا۔

"جانتی ہو' اس لڑکے سے باتیں کر کے میں نے بھی وہی سوچا' جو تم نے سوچا تھا لڑکا ہے۔ کاش میرا بیٹا ہوتا"۔ رانا نے کہا۔ اب وہ بہت مطمئن نظر آرہا تھا۔ "مگر وشوا سے نہ بیٹھ جانا۔ پھر بھی اس پر نظر رکھنا"۔

"تم بے فکر رہو سوامی!"

O============☆============O

چار دن بعد رانا میت سنگھ نے قریبی بھارتی سرحدی چوکی کا رخ کیا۔ یہ اس کا تھا۔ مال بھیجنے سے پہلے وہ چوکی سے رابطہ ضرور کرتا تھا۔ اس چوکی کا چارج کیپٹن ہردیا پاس تھا۔ کیپٹن ہردیال رانا کو خاصے عرصے سے جانتا تھا۔

رانا نے کیپٹن سے رمیش اور ریکھا کے لیے بات کی۔ "نہ شریمان جی' میں یہ نہیں لے سکتا"۔ کیپٹن نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

رانا نے اسے رمیش کے حالات بتائے۔ اس نے جیب سے ان دونوں کے شنا اور پاسپورٹ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیے۔ "دیکھو کپتان جی' میں تمہیں بتا رہا میں ان دونوں کو مدت سے جانتا ہوں"۔ اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ اس طرف میر رسوخ ہے مگر میں بھی انہیں نہیں بچا سکتا۔ وہ جس خطرے میں گھرے ہوئے ہیں' اس کی یہی صورت ہے۔ تمہیں ان پر دیا کرنی ہوگی"۔

"تم سمجھ نہیں رہے ہو' شریمان جی۔ یہ سیکیورٹی کا معاملہ ہے"۔

"دیکھو......... تم یہ کام نہیں کرو گے تو میں کسی اور سے کروا لوں گا۔ بھگوان دا ہاتھ بہت لمبے ہیں"۔ رانا کے لہجے میں موہوم سی دھمکی تھی۔

بھگوان داس غلے کا بہت بڑا آڑھتی تھا۔ یہ کاروبار تھا بھی اسی کا۔ پاکستان سے ہونے والا غلہ بھگوان داس کے ہی گوداموں میں جاتا تھا اور بھگوان داس کے ہاتھ بہ تھے۔ یہ بات کیپٹن ہردیال جانتا تھا۔ کیپٹن کو اوپر کی یہ آمدنی بہت عزیز تھی۔ جو شخص منٹ آنکھیں بند رکھنے کا بھاری معاوضہ دیتا تھا' وہ چند ہی منٹ میں اس کا تبادلہ بھی تھا۔

"اچھا میں سوچوں گا"۔ کیپٹن ہردیال نے کہا۔

"سوچنے کا وقت کہاں کپتان جی۔ مال تو کل سرحد پار کرے گا"۔ رانا میت

"اگلی کھیپ کے ساتھ بھجوا دینا ان دونوں کو۔ اس بار رہنے دو"۔

"جائیں گے تو وہ اسی کھیپ کے ساتھ"۔ رانا بولا۔ "کہو تو اس کھیپ کو رکوا دوں۔ جب ہو گے' چلی جائے گی"۔

کیپٹن ہردیال گھبرا گیا۔ "تم بھیج دینا دونوں کو"۔ اس نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ مال لیٹ اور بھگوان داس کو اس کی وجہ معلوم ہوئی تو اس کی خیر نہیں ہوگی' پھر یہ مال دیش کے ہی آئے گا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ یہ سلسلہ بند ہو جائے تو دیش میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کہاں کہاں پہنچ جائے گی اور مہنگائی حد سے بڑھ گئی تو لوگ بھوکے مریں گے اور بھوکے مرنے لے اٹھ کھڑے ہوں تو دھرتی بھی ہل جاتی ہے۔ میں تو دیش سیوا کر رہا ہوں۔

"تم نے بڑی دیا کی ہے کپتان مہاراج!" رانا میت سنگھ نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دل ہی دل میں وہ ہنس رہا تھا۔

O============☆============O

اسی رات رانا میت سنگھ نے منصور سے تفصیلی بات کی۔ "کل رات یہاں سے مال پار جا رہا ہے۔ تم اپنی پتنی کے ساتھ کل سرحد پار کر جاؤ گے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو کچھ سمجھا دیا ہے۔ چوکی پر بھی بات کر لی ہے"۔

منصور کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا۔ "سچ رانا جی۔ واقعی اس پوتر دھرتی کو چوم سکوں گا؟"

رانا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "اب کوئی دھرتی پوتر نہیں رہی بیٹا۔ دھرتی پوتر تو منشوں سے ہوتی ہے اور یہ کل جگ کے منش......... خیر' چھوڑو اس بات کو۔ ری بات دھیان سے سنو۔ میں نے اپنے دوست بھگوان داس کے نام یہ پتر لکھ دیا ہے"۔ اس ایک خط منصور کی طرف بڑھایا۔ "یہ احتیاط سے رکھ لو۔ اسے دے دینا۔ وہ بڑا اثر والا آدمی ہر طرح سے تمہاری سہائتا کرے گا۔ تمہیں مکان بھی دلوا دے گا۔ روزگار سے بھی لگا گا۔ لوگوں سے بھی ملوا دے گا۔ بھگوان تمہیں شانت رکھے"۔ اس کے لہجے میں اداسی "تم سے کچھ من مل گیا تھا۔ میں تمہیں یہیں بچا کر رکھ سکتا تو کبھی وہاں نہ بھجواتا۔ وہاں خط پتر بھیجتے رہنا۔ بھگوان داس کو دے دینا مجھے مل جائیں گے"۔

"آپ نے بڑی کرپا کی ہے رانا مہاراج!" منصور نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے ا۔

رانا میت سنگھ اپنے آنسو چھپانے کے لیے اٹھ کر چلا گیا۔

اندر رابعہ اور دیپا کے درمیان بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

O============☆============O

نصرت کو اسلام آباد سے منصور کا خط موصول ہوا۔ منصور نے لکھا تھا کہ اس نے اچانک

ہی فرانس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ویزا مل چکا ہے اور خط پہنچنے تک وہ اور رابعہ پیرس کو
پرواز کرچکے ہوں گے۔ ایک دو ماہ میں واپسی ہوگی۔ نصرت نے تینوں بہنوں کو مطلع کردیا
منصور نے روانہ ہونے سے پہلے وہ خط اسلام آباد میں اپنے ایک دوست کو اس
کے ساتھ بھجوایا تھا کہ وہ دو ہفتے بعد اس خط کو پوسٹ کردے وہ نہیں چاہتا تھا کہ بہنیں
طور پر اس کے لیے پریشان ہوں۔ آئندہ کے لیے بھی اس نے بندوبست کرلیا تھا۔ وہ نہیں
تھا کہ اس کی تلاش شروع ہو۔

O============☆============O

رات ساڑھے گیارہ بجے وہ دونوں رانا میت سنگھ اور دیپا کو الوداع کہہ کر نکل آ
قافلہ تیار تھا۔ انہیں اونٹوں پر سفر کرنا تھا۔ مگر ان کے لیے تو اونٹ پر بیٹھنا ہی دوبھر
رابعہ ڈر رہی تھی۔ چنانچہ اسے منصور کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔

رانا اور دیپا نم آنکھوں سے انہیں جاتا دیکھتے رہے۔

وہ دونوں خوش بھی تھے اور ان کے دلوں میں اندیشے بھی سرسرا رہے تھے۔ اب
جتنا عرصہ بھی رہنا تھا، پردیس میں رہنا تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہ آسان کام نہیں۔ ذرا سی
بھی سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ وہ دونوں چپکے چپکے، دل کی گہرائیوں سے اللہ
اور نصرت طلب کر رہے تھے۔

اونٹ کی سواری نے ان کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے۔ پہلی بار ان کی سمجھ میں
اونٹ کو ریگستان کا جہاز کیوں کہا جاتا ہے۔ ٹھیک بارہ بجے وہ سرحد پار کر کے ہندوستان کی
میں داخل ہوئے۔ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ ایک آبادی کے قریب پہنچے لیکن قافلہ آگے بڑھ گیا
دیر بعد انہیں ایک ٹرک کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ پھر وہ روشنیاں تین بار جلیں بجھیں۔
ٹرک کی طرف بڑھتے رہے۔ بالآخر قافلہ رک گیا۔

اونٹ سے اترتے ہوئے منصور اور رابعہ کو ایسا لگا کہ وہ ڈھے جائیں گے۔ ا
ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ قافلے کا لیڈر ٹرک کے ساتھ کھڑے ڈرائیور کی طرف بڑھ گیا۔ ا
پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "بوریاں ٹرک پر چڑھا دو"۔

منصور اور رابعہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انہیں اپنے دل کی دھڑکن کے سوا کوئی
سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ "کتنی بوریاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ڈیڑھ سو ہیں بنسی دھر۔ گنتی پوری کرلو"۔

بنسی دھر نے اپنے کلینز کو پکارا۔ "او رامو.......... بوریاں گن لے"۔

"اور بنسی دھر، میرے ساتھ بھگوان داس جی کے دو مہمان بھی ہیں"۔ قافلے کے
نے منصور اور رابعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں عزت کے ساتھ بھگوان داس

پہنچانا ہے۔ کوئی تکلیف نہ ہو انہیں۔ یہ رانا جی کا حکم ہے"۔
بنسی دھر نے انہیں غور سے دیکھا اور ہنسنے لگا۔ "تکلیف میں تو یہ پہلے ہی معلوم ہوتے
"۔

"اونٹ پر بیٹھنے کی عادت جو نہیں ہے"۔ لیڈر نے کہا۔ پھر منصور کو پکارا۔ "شریمان
یہاں چلے آیئے"۔

منصور اور رابعہ ان کی طرف چلے آئے۔ "یہ بنسی دھر ہے۔ آپ کو بھگوان داس جی
کے پاس پہنچا دے گا۔ آپ کوئی چنتا نہ کرنا"۔ لیڈر نے کہا۔

منصور اور رابعہ نے بنسی دھر کو نمسکار کیا۔ "یہ بستی کون سی تھی، جسے ہم پیچھے چھوڑ کر
آئے ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"یہ جلور تھی"۔ بنسی دھر نے بتایا۔

"اور ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"اندور، بھگوان داس جی کے گودام وہیں ہیں۔ ویسے وہ رہتے جبل پور میں ہیں"۔

دس منٹ میں تمام بوریاں ٹرک پر لاد دی گئیں۔ کارواں واپس چل دیا۔ "او رامو
رے!" بنسی دھر نے اپنے کلینز سے کہا۔ "تو پیچھے بوریوں پر بیٹھ جا رے۔ آگے مہمان بیٹھیں
گے"۔ یہ کہہ کر اس نے ان دونوں کے لیے ٹرک کا دروازہ کھولا۔ پہلے منصور بیٹھا پھر رابعہ۔
بنسی دھر نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔

نئے دور کا سفر شروع ہو گیا تھا!

O============☆============O

۳۱ مارچ ۹۳ء کا سورج انہوں نے اندور میں ابھرتے دیکھا۔

ٹرک ایک بڑے گودام کے سامنے رکا۔ دروازے پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ بنسی دھر
دروازہ کھول کر اترا۔ "لو منشی جی۔ ڈیڑھ سو بوریاں ہیں۔ اپنے کارندے بلا کر اتروالو"۔ اس
نے کہا۔ "اور مجھے پیسے دے دو"۔

منشی نے دھوتی کی انٹی میں سے نوٹ نکالے اور کچھ نوٹ گن کر بنسی دھر کی طرف بڑھا
دیے۔ "اور یہ لوگ کون ہیں؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"غیر ضروری باتیں مت پوچھا کرو منشی جی!" بنسی دھر بولا۔ "یہ بھگوان داس جی کے
مہمان ہیں"۔

منشی گودام میں گیا اور خلاصیوں کو بلا لایا۔ ٹرک سے مال اتارا جانے لگا۔ بنسی دھر منصور
اور رابعہ کی طرف چلا آیا۔ "آیئے میں آپ لوگوں کو بھگوان داس جی کے پاس پہنچا دوں"۔ وہ
دونوں نیچے اتر آئے۔ انہوں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ وہ ایک سنسان علاقہ تھا۔ فضا میں کچھ
خنکی تھی لیکن خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ موسم بہار تھا۔

"تھوڑا پیدل چلنا پڑے گا"۔ بنسی دھر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "ادھر ٹرک

لے جانا مناسب نہیں"۔

"کوئی بات نہیں"۔ منصور نے کہا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ چل دیے۔ کوئی ڈیڑھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد
آبادی شروع ہو گئی۔ پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بنسی دھر انہیں لے کر ایک گلی میں
داخل ہو گیا۔ گلی خاصی کشادہ تھی۔ تیسرے مکان کے دروازے پر وہ رک گیا اور دستک دی۔
دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک معمر لیکن تومند شخص تھا۔ بنسی دھر
نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ منصور اور رابعہ اوٹ میں کھڑے تھے۔

"کیا ہے رے بنسی دھر؟ مال لے آیا؟"

"جی مہاراج!"

"حساب ہو گیا تیرا؟"

"جی مہاراج' ادھر سے رانا جی نے دو مہمان بھیجے ہیں آپ کے پاس۔ انہیں چھوڑنے
آیا تھا"۔ بنسی دھر نے کہا اور منصور سے بولا۔ "سامنے آؤ نا"۔

منصور اور رابعہ آگے بڑھے۔ دونوں نے بھگوان داس کو نمسکار کیا۔ بھگوان داس حیرت
سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ایک طرف ہٹ کر انہیں راستہ دیتے
ہوئے بے حد خوش خلقی سے کہا۔ "پدھاریے شریمتی جی.......... شریمان جی۔ دھنیہ واد ہو"۔
وہ بنسی دھر کی طرف مڑا۔ "تو جا رے"۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ بھگوان داس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور انہیں
کمرے میں لے گیا۔ وہ بے حد آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ مکان کی بیرونی حالت کو دیکھ کر کوئی
اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہاں ایسا کوئی کمرا بھی ہو گا۔

بھگوان داس نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ منصور نے جیب سے رانا میت سنگھ
کا رقعہ نکال کر احترام سے اس کی طرف بڑھایا۔ پھر وہ صوفے پر رابعہ کے برابر جا بیٹھا۔

بھگوان داس خاموشی سے رقعہ پڑھتا رہا۔ پھر اس نے رقعہ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔
اس بار اس نے انہیں دیکھا تو اس کے انداز میں اپنائیت تھی۔ "تمہارے آنے سے خوشی
ہوئی"۔ اس نے کہا۔ "رانا میرا بڑا اچھا متر ہے۔ تم لوگ بہت اچھے ہو گے۔ پتھر کے من میں
جوگ جگا کر آئے ہو۔ میت سنگھ پریم کرنے والا آدمی نہیں۔ اب تم چنتا نہ کرو۔ میں سب
سنبھال لوں گا۔ تم لوگ سکھی رہو گے۔ یہی تمہارا دیش ہے اب"۔

منصور نے بڑے انکسار سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

بھگوان داس تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرا بیوپار بہت پھیلا ہوا ہے۔ تم پڑھے لکھے
ہو۔ میرا بیوپار سنبھال لو۔ مکان موجود ہے۔ یہیں رہنا۔ میں تو یہاں کبھی کبھار ہی آتا ہوں۔ گھر
میرا جبل پور میں ہے"۔

"آپ کی بڑی کرپا مہاراج۔ مگر میں کنسٹرکشن کا آدمی ہوں۔ بیوپار میں چل نہیں سکوں

گا"۔ منصور نے معذرت کی۔

"تو پھر یوں کرو دو تین دن یہاں رکو۔ پھر میرے ساتھ جبل پور چلنا۔ میرے ایک
دوست کا بڑا کاروبار ہے کنسٹرکشن کا۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا"۔

O============☆============O

جبل پور کا سفر انہوں نے بھگوان داس کی کار میں کیا۔ منصور اگلی سیٹ پر بھگوان داس
کے ساتھ بیٹھا تھا۔ رابعہ پچھلی سیٹ پر تھی۔ بھگوان داس منصور سے اس کے بارے میں پوچھتا
رہا۔ "تم لوگ زبان کون سی بولتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"گجراتی"۔ منصور نے جواب دیا۔

"ہوں۔ دیکھو' وہاں خود کو احمد آباد کا بتانا۔ تم لوگ یہاں غیر قانونی طور پر آئے ہو۔ یہ
بات کسی کو نہیں بتانا"۔

"جی بہتر"۔

"اور ہاں.......... تمہارے تعلیمی سرٹیفکیٹ بھی نہیں چلیں گے۔ سمجھو' یہاں تم ان
پڑھ ہو"۔

"تو پھر مجھے کنسٹرکشن کمپنی میں کام کیسے ملے گا؟" منصور نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"اس کی تم چنتا نہ کرو۔ رام پرشاد میرا بڑا اچھا متر ہے۔ وہ تمہیں کام دے دے گا۔ پھر
تم اپنی قابلیت دکھا دینا"۔

جبل پور پہنچ کر بھگوان داس نے منصور کو دس ہزار روپے دیے۔ منصور نے لینے سے
انکار کیا تو وہ بولا۔ "یہ تمہارے ہی ہیں"۔

"وہ کیسے مہاراج؟"

"تم نے رانا کو دس ہزار پاکستانی روپے دیے تھے؟"

منصور کو یاد آگیا۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ لینے کے بعد اگلے روز رانا نے اس سے
پوچھا تھا' کچھ لے کر بھی آئے ہو یا خالی ہاتھ بھاگے ہو۔ اس پر منصور نے اسے بتایا تھا کہ اس
کے پاس عمر بھر کی بچت کے دس ہزار ہیں۔ رانا نے کہا تھا۔ "وہ مجھے دے دو۔ تمہیں اس کے
بدلے بھارت میں بھارتی کرنسی کی شکل میں مل جائیں گے"۔

"اس کے علاوہ بھی ضرورت پڑے تو مانگ لینا"۔ بھگوان داس نے کہا۔

بھگوان داس نے ان کا ہر مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے انہیں آریہ محلے میں دو کمروں کا
ایک مکان دلا دیا۔ پھر اس نے منصور کو لے جا کر رام پرشاد سے ملوایا۔ اس کے نتیجے میں منصور
کو رام داس کنسٹرکشن کمپنی میں سپروائزر کی حیثیت سے ملازمت بھی مل گئی۔ پڑوس میں دو گھر
گجراتیوں کے بھی تھے۔ وہ لوگ راج کوٹ کے رہنے والے تھے۔ جلد ہی ان سے مراسم ہو
گئے۔ یوں سوشل لائف بھی شروع ہو گئی جو آدمی میں خود اعتمادی ابھارتی ہے۔

زندگی مدھر سُروں میں بہتی رہی۔

منصور کنسٹرکشن کمپنی میں تیزی سے اپنا مقام بنا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بھگوان داس نے رام پرشاد کو اس کے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے لیکن یہ طے ہے کہ رام پرشاد اس پر خاص طور سے مہربان تھا۔ ایک بار باتوں باتوں میں وہ کہہ چکا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ رمیش تعلیم یافتہ بھی ہے اور قابل بھی۔

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ منصور کی رسائی کمپنی کے اسٹور روم تک ہو گئی۔ موقع ملتے ہی منصور نے اسٹور سپروائزر ارجن داس سے دوستی گانٹھ لی۔ یہ بات بہت اہم تھی کیونکہ اسٹور روم میں آتش گیر مادہ موجود رہتا ہے اور اس کی منصور کو ضرورت تھی۔

اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا کام بہت تیزی سے جاری تھا۔ اردگرد کے شہروں میں آئے دن مسلم کش فسادات ہوتے رہتے تھے۔ مسلمان رہ رہ کر بابری مسجد کے مقام کی طرف مارچ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن پولیس کی فائرنگ انہیں روک دیتی۔ مندر کی تعمیر کا کام فوج کے تحفظ میں ہو رہا تھا۔

اپنی جگہ سب کچھ ٹھیک تھا مگر منصور اور رابعہ ایک کٹھن کا شکار تھے اور وہ بہت بڑا کٹھن تھی۔ وہ شدید خواہش کے باوجود اولاد کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اس سے گریز پر مجبور تھے۔ اس ماحول میں، جہاں وہ ہندو بن کر رہنے پر مجبور تھے۔ وہ اپنے بچوں کو کیسے پالتے۔ ان کے بچے ہندو ہو جاتے لیکن آرزو تو اپنی جگہ تھی۔

"اللہ......... میں نے کیسا کیسا سوچا تھا کہ اپنے بچوں کی تربیت کروں گی"۔ رابعہ تڑپ کر کہتی۔ "انہیں مثالی مسلمان بناؤں گی۔ تم پر ثابت کروں گی کہ نو مسلم ماں کی گود میں تربیت پا کر بھی بچے مومن ہو سکتے ہیں"۔

"اب کیوں شرمندہ کرتی ہو"۔ منصور اسے بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ "یہ اعتماد نہ ہوتا میں تم سے شادی ہی نہ کرتا"۔

"کتنی بڑی مجبوری ہے ہماری۔ منصور، میں مرجاؤں گی۔ مجھے ایک بیٹا تو چاہیے......... تم جیسا"۔

"بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا مجھے اولاد کی آرزو نہیں۔ میں تو اپنے باپ کا اکلوتا ہوں۔ میرے ساتھ میرے آباؤ اجداد کی نسل ختم ہو جائے گی لیکن میری جان، ہم ایک......... بہت بڑے مقصد کے لیے نکلے ہیں۔ ہماری منزل تو شہادت ہے اور اگر ہمارے ہوئے تو یہ سوچو کہ ہمارے بعد ان کا کیا ہوگا۔ یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہے"۔

"ٹھیک کہتے ہو"۔ رابعہ آہ بھر کر کہتی۔ "شکر کا مقام ہے کہ اللہ کی تائید ہمارے ہے۔ یہاں کتنی مشکلیں تھیں، جو اس کی رحمت سے آسان ہو گئیں"۔

"واقعی......... اللہ کی تائید نہ ہوتی تو یہاں اس طرح قدم جمانا تو درکنار، یہاں تک بھی نہیں سکتے تھے"۔

پھر کمپنی میں ایک نیا آرکیٹیکٹ آیا۔ رام پرشاد نے بڑی تنخواہ کا لالچ دے کر اسے

توڑا تھا۔ اور یہ وہ شخص تھا، جس نے اجودھیا کے نئے رام مندر کا نقشہ بنایا تھا۔ منصور بہت تیزی سے اس کے قریب ہوا۔ نیا آرکیٹیکٹ رندھیر بھی اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ نقشوں کے متعلق منصور کی سوجھ بوجھ نے اسے حیران کر دیا تھا۔ "تم تو پیدائشی آرکیٹیکٹ معلوم ہوتے ہو"۔ وہ اکثر کہتا۔

ایک دن منصور نے اس سے کہا۔ "میں آرکیٹیکٹ نہ سہی، لیکن ایک نہ ایک دن ایسا مندر ڈیزائن کروں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔ ایسا مندر، بھارت میں تو کیا پورے سنسار میں......... دوسرا نہیں ہوگا"۔

"اب تم ایسا نہیں کر سکتے"۔ رندھیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس لیے کہ میں ایسا ڈیزائن بنا چکا ہوں۔ رام مندر جیسا دوسرا مندر نہ تھا، نہ آئندہ بن سکے گا"۔

"واقعی! رام مندر کا نقشہ تمہارا بنایا ہوا ہے؟" منصور نے حیرت سے کہا۔ حالانکہ اسے یہ بات معلوم تھی۔

"اسی لیے تو رام پرشاد جی میرے پیچھے پڑ گئے تھے اور انہوں نے مجھے میری کمپنی سے توڑ کے چھوڑا"۔ رندھیر نے اکڑ کر کہا۔ "اور اب میں بھارت کا سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا آرکیٹیکٹ ہوں"۔

"مجھے بڑا اشتیاق ہے رام مندر کا بلیو پرنٹ دیکھنے کا"۔

"وہ تو اس وقت سب سے بڑا سرکاری راز ہے"۔ رندھیر نے کہا۔

"میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس کی ایک کاپی اپنے لیے سنبھال کر رکھ لیتا"۔

رندھیر نے اسے بہت غور سے دیکھا "لیکن وہ تو بہت بڑا جرم ہوتا"۔

"مگر میں اس اعزاز کو اپنا حق سمجھتا"۔ منصور نے ضدی پن سے کہا۔ "اور پھر میں کسی کو بتاتا......... یا وہ بلیو پرنٹ دکھاتا تو نہیں"۔

"مجھے بھی نہیں دکھاتے"۔ رندھیر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"تم وہ واحد آدمی ہوتے، جسے میں وہ بلیو پرنٹ دکھاتا"۔

"کیوں؟"

"ایک تو تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ دوسرے تم ہی اس کی داد دے سکتے تھے"۔

بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے روز رندھیر نے منصور کو اپنے کمرے میں بلایا اور دروازہ بند کر لیا۔ "کل کی بات یاد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے"۔

"تو پھر دل تھام کر بیٹھو۔ یہ ہے رام مندر کے بلیو پرنٹ کی کاپی"۔ رندھیر نے اپنی دراز سے ایک فائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

منصور نے لرزتے ہاتھوں سے وہ فائل کھولی۔ اللہ کی تائید واقعی اس کے ساتھ تھی۔
وہ بلیو پرنٹ کا جائزہ لیتا رہا۔ وقتاً فوقتاً وہ کسی بات پر داد دیتا اور رندھیر مربیانہ انداز میں مسکرا
دیتا۔ وہ خوش تھا کیونکہ ہربار منصور کی داد بامحل تھی۔

منصور اس نقشے میں تہ خانوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پورے نقشے میں وہی اس
کے مطلب کی چیز تھی۔ وہ تمام کارآمد باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے فائل بند کر
کے رندھیر کی طرف بڑھا دی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ایسا مندر نہ کبھی بنا ہے' نہ بنے گا۔
میں تو سوچ بھی نہیں سکتا"۔

"نہیں یار۔ تم بہت ذہین آدمی ہو"۔ رندھیر نے اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"مجھے وشواس ہے' ایک دن تم کوئی بہت بڑا کام کرو گے........ کبھی نہ بھلایا جانے والا کام"۔

منصور نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ تو میں کروں گا انشاء اللہ۔ زبان سے وہ بولا۔ "وہ کام
تو تم کر چکے ہو"۔

اس شام گھر پہنچ کر اس نے وہ سب کچھ کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ وہ محض احتیاط تھی۔ کیونکہ
وہ تفصیلات اب اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتی تھیں۔

چند روز بعد وہ کمپنی کے اسٹور سے دو ڈائنامیٹ اسٹکس چرا کر لایا۔ اس روز وہ بہت
خوش تھا۔ اس نے منزل کی طرف جانے والے راستے پر پہلا قدم رکھ دیا تھا۔

O ============ ☆ ============ O

اکتوبر ۹۶ء

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ موسم آتے جاتے رہے تھے لیکن ان کے لیے ہر موسم گھٹن کا
موسم تھا اس لیے کہ وہاں ہر موسم کے ساتھ ایک تہوار بھی تھا۔ دسہرہ' دیوالی' ہولی۔ عید' بقر
عید' شب برات' عید میلاد النبیؐ اور ہر تہوار کے ساتھ ایک جبر اور ہر خوشی کے ساتھ ایک بے
بسی۔ ہندوانہ تہوار مناتے وقت وہ بے بسی کی آخری حد کو پہنچ جاتے تھے۔ منصور کا جی چاہتا تھا
کہ چیخ چیخ کر اعلان کر دے اپنے مسلمان ہونے کا۔ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ دے لیکن
ایسے ہر لمحے میں رابعہ اس کا ہاتھ تھام لیتی۔ اس کے ہاتھوں کا لمس منہ سے بولتا۔ اسے حوصلہ
دیتا۔ یاد دلاتا کہ وہ ایک بہت بڑے مقصد کے لیے نکلا ہے........ ایسا مقصد جس کے لیے بڑی
سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے۔ اس لمس کی تسلی سے اس کا دل پگھلنے لگتا۔ آنسو آنکھوں سے
ابل آتے۔ ایسے میں وہ سختی سے آنکھیں بھینچ لیتا کہ آنسو باہر نہ آجائیں۔

عید اور بقرعید پر اس کی حالت اور بری ہوتی۔ جماعت سے نماز عید پڑھنے کو اس کا دل
تڑپتا۔ اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ وہ گھر پر ہی عید کی نماز پڑھتا اور گڑگڑا کر خدا سے دعا کرتا
کہ اس کی مجبوری کے پیش نظر اس کی یہ نماز قبول فرمالے۔ وہ اور رابعہ گھر کی کسی صاف
چادر کی جانماز بنا کر نماز پڑھتے رہتے تھے۔ اس عرصہ اذیت میں منصور کو پتا چلا کہ عورت کتنی
مضبوط ہوتی ہے۔ رابعہ کا سہارا نہ ہوتا تو اب تک وہ ٹوٹ چکا ہوتا........ بکھر چکا ہوتا۔

اس دوران ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہندو بابری مسجد کے معاملے میں اپنے
موقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور مسلمان اس زمین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ بھارت
کا اندرونی خلفشار آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ تقریباً ہر صوبے میں علیحدگی کی تحریکیں سر اٹھا چکی
تھیں........ اتنا زور پکڑ چکی تھیں کہ اب انہیں روکنا دشوار تھا۔ معتدل مزاج ہندوؤں نے
بہت کوشش کی تھی کہ باعزت تصفیہ کر لیا جائے لیکن متعصب ہندوؤں پر جنون طاری تھا۔
بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ۶ دسمبر ۹۲ء کے بعد سے اب
تک فسادات میں اور پولیس اور فوج کے ہاتھوں شہید ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچنے
والی تھی۔ رام مندر کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔ اسے پوجا کے لیے کھول دیا گیا تھا........ لیکن
فوج کے تحفظ میں۔ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ مسلمانوں کو مندر کے قریب بھی نہیں
پھٹکنے دیا جا رہا تھا۔

منصور پر جب بھی گھٹن طاری ہوتی' وہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا کہ منزل بہت
قریب آگئی ہے۔ ڈائنامیٹ اسٹکس' پڈنگ' ڈیٹونیٹرز........ سب کچھ وہ خاصی تعداد اور
مقدار میں جمع کر چکا تھا۔ یہ سب کچھ گھر میں بڑی حفاظت سے رکھا تھا لیکن اہم بات یہ تھی کہ
ان پر کسی کو شک نہ ہو ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ محلے میں انہوں نے اپنی بہت اچھی ساکھ
بنا رکھی تھی۔ گجراتی گھرانوں سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ تعلقات اس کے علاوہ بھی
تھے۔ محلے کی تمام عورتیں اس بات کو بہت سراہتی تھیں کہ ریکھا ہر تہوار بڑی شان سے مناتی
ہے۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ مسلمان ہے اور باقاعدہ نماز پڑھتی ہے۔

عمل کی گھڑی قریب آگئی تھی۔ اب کسی بھی وقت منصوبے پر عمل ہو سکتا تھا۔

لیکن اکتوبر کی اس صبح رابعہ بہت بجھی بجھی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر تھا۔
وہ دونوں ناشتا کرنے بیٹھے تو منصور نے اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کی "کوئی خاص بات
نہیں"۔ رابعہ نے کہا۔

ناشتے کے بعد منصور نے اس سے دوبارہ پوچھا۔ اس بار رابعہ نے کہا۔ "ہاں........
ایک بات ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں"۔

منصور کے لیے وہ دھماکا تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکا
پھر اس نے کہا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارا اندازہ غلط ہو۔ دیکھو نا........ ایسی گڑبڑ........
میرا مطلب ہے' بے ترتیبی تو ہو جاتی........"

"پچھلے مہینے میں نے بھی یہی سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر اس بار........ نہیں جان' ہم
حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے"۔

منصور کو اچانک ہی اپنے اندر روشنی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ پچھلے برسوں کا
سارا فرسٹریشن دھل گیا ہے۔ گھٹن دور ہو گئی ہے۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔
"اری پگلی' تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہمیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے"۔

"لیکن جو مسائل کھڑے ہوں گے.......... ہم جن باتوں سے ڈر رہے تھے.........."

"ہم تو بہت سی باتوں سے ڈر رہے تھے لیکن اللہ کی تائید سے سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا گیا"۔ منصور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہم یہاں کبھی کسی مسئلے سے دو چار نہیں ہوئے۔ صرف اسی لیے کہ اللہ کی تائید ہمارے ساتھ تھی.......... تو ان مسائل کا حل بھی نکل آئے گا۔ ہم خوشی کی بات پر کیوں پریشان ہوں۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ ہماری ہر ممکن احتیاط کے باوجود.........."

"میں اسی پر تو حیران ہوں"۔ رابعہ بولی۔

"حیران ہونا چھوڑ دو۔ یہ امر تو خود تائید الٰہی کی دلیل ہے۔ اس میں بھی بہتری ہوگی۔ ایک بہتری تو نظر آرہی ہے۔ اب انشاء اللہ میری نسل چلے گی۔ مجھے یقین ہوگیا ہے اور بہتری کے اور بھی پہلو ہوں گی' جو ہمیں نظر نہیں آرہے ہیں"۔

"یہ تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مگر پھر بھی میں سوچتی ہوں کہ کسی ڈاکٹر سے مل کر اس سلسلے میں کچھ کروں۔ یہ لوگ تو ویسے بھی آبادی میں اضافے کے خلاف زبردست مہم چلا رہے ہیں"۔

"تمہارا مطلب ہے' اسقاط.........."

"ہاں منصور' میں نے دل پر پتھر رکھ کر یہ بات سوچی ہے"۔

"ایسی حماقت کرنا بھی نہیں۔ اول تو میرے نزدیک یہ بہت بڑا ناشکرا پن بھی ہے اور قتل بھی اور پھر تم یہاں یہ ظاہر کرتی رہی ہو کہ ہمیں اولاد کی بڑی آرزو ہے۔ یہ بات سامنے آئی تو خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے"۔

اور یہ حقیقت تھی۔ پڑوس کی بے تکلف عورتیں اس سلسلے میں رابعہ سے پوچھتی رہتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر رابعہ ہمیشہ آہ بھر کر کہتی۔ "آرزو تو بہت ہے بہن۔ پر بھگوان کے سامنے کس کی چلتی ہے۔ بھگوان کی اِچھا ہوگی تو میری گود ضرور بھرے گی۔ میں تو بس پرارتھنا کر سکتی ہوں"۔

"پر اپنا اور اپنے پتی کا چیک اپ تو کرالو"۔ کوئی پڑوسن کہتی۔

"کئی بار کرا چکے ہیں موسی!" رابعہ جواب دیتی"۔ "ہم دونوں میں کوئی خرابی نہیں"۔

"یہی تو بھگوان کی رلیلا ہے۔ ورنہ کون مانے بھگوان کو"۔

"میں تو کہتی ہوں' منت مان لو کوئی"۔

"مانی ہوئی ہے۔ اولاد ہوئی تو رام مندر جا کر پوجا کروں گی۔ چڑھاوا دوں گی"۔ رابعہ کہتی۔

رابعہ کو یہ تمام باتیں یاد آگئیں۔ منصور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ کرنا حماقت ہی ہوتی۔ "تو اب کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ منصور نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ تم نے مجھے زندگی

کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی ہے"۔

اس روز وہ کام پر گیا تو بہت مطمئن تھا۔ تاہم وہ سوچ بھی رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہے۔

دن گزرتے ہے۔ وہ بار بار رابعہ کو احتیاط برتنے کی تلقین کرتا' یہ کرو وہ نہ کرو' وزن نہ اٹھاؤ۔ بھاری کام نہ کیا کرو۔ میرے لیے چھوڑ دیا کرو۔ رابعہ ہنستی' کہتی' "ابھی ایسی کوئی بات نہیں۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو"۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے منصور کو اپنی خالہ کا خیال آگیا۔ وہ اس کی سگی خالہ تھیں اور اجمیر میں رہتی تھیں لیکن اس کے پاس ان کا پتا نہیں تھا۔ بہرحال یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ انہیں تلاش کر سکتا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

دفتر میں لوگوں کو علم ہوا کہ وہ صاحب اولاد ہونے والا ہے تو سب بہت خوش ہوئے۔ اس نے خوب مبارک بادیں وصول کیں۔

ایک رات اس نے رابعہ سے اپنے منصوبے پر گفتگو کی۔ اسے سب کچھ سمجھا دیا لیکن وہ رابعہ کو اس پر مائل نہ کر سکا کہ وہ منصوبے میں آخر تک شامل نہ ہو۔ رابعہ اپنی شمولیت پر اڑی رہی۔ "دیکھو نا.......... ہم بچ کر نکل بھی تو سکتے ہیں"۔ رابعہ نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے رابو۔ اول تو بچ نکلنے کی صورت میں بھی ہم پکڑے جائیں گے اور اس کے بعد وہ جو کچھ ہوگا' وہ میرے لیے تصور کی حد تک بھی ناقابل برداشت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں پکا کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ عین موقع پر کوئی گڑبڑ ہو جائے اور معاملہ ٹھپ ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو اور میری آرزو ہے کہ میں وہاں نماز بھی ادا کروں"۔

"بس تو پھر میں تمہارے شانہ بشانہ رہوں گی"۔ رابعہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ٹھیک ہے رابو۔ یہ بتاؤ' سب کچھ سمجھ گئی ہو؟"

"سب سمجھ گئی ہوں۔ بس اس آخری مرحلے میں بہت شرم آئے گی"۔

"یہ سمجھ کر گزر جانا اس سے کہ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے بس یہ فکر ہے کہ تم اتنا بوجھ اٹھا بھی سکو گی"۔

"بوجھ کی تم فکر نہ کرو۔ وہ تو الٹا نیچرل ٹچ بن جائے گا"۔

"ویسے میں کوشش کروں گا کہ بوجھ کم سے کم ہو"۔

○ ============ ☆ ============ ○

رابعہ کو آٹھواں مہینہ چل رہا تھا۔ ایک روز منصور رام پرشاد سے ملنے جا پہنچا۔ "کہو رمیش' کیسے ہو؟" رام پرشاد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کام تو بہت اچھا چل رہا ہے۔ تمہارے کام سے سب خوش ہیں"۔

"بھگوان کی کرپا ہے اور آپ کی دَیا ہے مہاراج۔ آپ نے میری بڑی سہائتا کی ہے"۔

منصور نے کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ بھگوان داس جیسا مِتر تمہیں میرے پاس لایا تھا اور تم آدمی بھی کام کے نکلے۔ اور' خوش تو ہو؟"

"جی مہاراج!"

"اس وقت کیسے آئے؟ کوئی کام ہے؟"

"مہاراج ایک ہفتے کی چھٹی مانگنے آیا ہوں"۔

"چھٹی.......... وہ کس لیے؟"

منصور کی نظریں جھک گئیں۔ "مہاراج میری پتنی امید سے ہے۔ یہاں ہم اکیلے ہیں۔ میں اپنی پتنی کو احمد آباد چھوڑ کے آنا چاہتا ہوں.......... اس کی موسی کے گھر"۔

"اوہ.......... تو یہ بات ہے۔ دھنیہ واد"۔ رام پرشاد مسکرا دیا۔ "بھئی ضرور جاؤ۔ آج تک تو تم نے ایک دن کی چھٹی بھی نہیں کی"۔

"شکریہ مہاراج۔ میں بس اسے چھوڑتے ہی آجاؤں گا۔ ایک ہفتہ بھی نہیں لگے گا"۔

"جلدی کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"ہے۔ ایک ڈیڑھ ماہ بعد مجھے پھر چھٹی کی ضرورت پڑے گی"۔

"کیوں؟"

"آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ میری پتنی نے منت مانی تھی کہ بھگوان نے اس کی گود بھری تو وہ اجودھیا کے رام مندر میں پوجا کر کے چڑھاوا دے گی"۔

"اور تمہارے من کی مراد پوری ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے رمیش۔ تم اس کی پروا مت کرو۔ اس موقع پر بھی تمہیں چھٹی مل جائے گی"۔

رمیش مطمئن باہر نکل آیا۔

ادھر رابعہ پڑوس کی تمام عورتوں کو بتا چکی تھی کہ اس کی زچگی احمد آباد ہوگی۔ کسی کے لئے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

اسی شام منصور نے ضروری' سامان ایک علیحدہ سوٹ کیس میں بڑی احتیاط کے ساتھ پیک کیا۔ وہ اس کے منصوبے کا سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ راستے میں اس سوٹ کیس کی تلاشی لے لی جاتی تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ ویسے درحقیقت اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن منصور بہرحال اس طرف سے پریشان تھا۔

رابعہ نے بھی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ وہ پڑوس کی تمام عورتوں کو بتا آئی تھی۔ صبح ان کی روانگی کے وقت محلے کے تمام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سب نے انہیں بڑی محبت سے آشیرباد دے کر رخصت کیا۔ وہ دونوں احمد آباد جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے لیکن بھوپال پر وہ اتر گئے۔ وہاں سے انہوں نے رخ بدلا اور اجمیر کی ٹرین پکڑ لی۔

اجمیر پہنچتے ہی انہوں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا۔ منصور کا خیال تھا کہ اب اسے نجمہ خالہ

کی تلاش میں مارے مارے پھرنا ہوگا۔ اتنے بڑے شہر میں کسی کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بس ایک چانس تھا۔ اس کے خالو محمود احمد ایک متمول اور بارسوخ آدمی تھے۔ ان کے گھر ٹیلی فون کا ہونا کوئی انہونی نہیں تھا۔

اسی خیال کے زیر اثر اس نے نیچے جا کر استقبالیہ پر ٹیلی فون ڈائریکٹری طلب کی۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ محمود نام کے کئی آدمیوں میں محمود احمد ایک سے زائد نہیں تھے۔ کئی محمود الحسن تھے اور کئی محمود کسی اور لاحقے کے ساتھ تھے۔ اس نے محمود احمد کا فون نمبر اور سامنے لکھا ہوا پتا نوٹ کر لیا۔

رات انہوں نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ صبح بہت سویرے وہ ادائیگی کر کے ہوٹل سے نکل آئے۔ سڑکوں پر چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ منصور نے ایک تانگہ روکا اور اسے پتا بتایا۔ پندرہ منٹ میں وہ منزل پر پہنچ گئے۔ منصور کو اب بھی دھڑکا تھا کہ یہ کوئی اور محمود احمد نہ ہوں۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ جن خاتون نے کھولا' وہ نجمہ خالہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ منصور نے امی جان کی بے شمار تصویریں دیکھی تھیں اور نجمہ خالہ ہو بہو امی جان جیسی تھیں۔ اس نے بہت آہستہ سے کہا "خالہ' آپ مجھے نہیں پہچانتیں لیکن میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ گرمجوشی کا مظاہرہ یہاں دروازے پر نہ کیجئے گا۔ میں ذرا سامان اتار کر تانگے والے کو رخصت کر دوں"۔

اس نے سامان اتار کر تانگے والے کو پیسے دیئے پھر سامان اٹھا کر رابعہ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ خاتون سکتے کی سی کیفیت میں دروازے پر کھڑی تھی۔

"خالہ.......... میری نجمہ خالہ.........." منصور نے بڑی محبت سے انہیں پکارا۔

خاتون کو جیسے اچانک ہی ہوش آیا پھر ان کی آنکھوں سے آنسو امنڈ پڑے۔

"خالہ پلیز' ہمیں راستہ دیں"۔ منصور کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

خالہ ایک طرف ہٹ گئیں۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ خالہ نے دروازہ بند کیا۔ وہ دونوں گومگو کے عالم میں کھڑے تھے۔ خالہ منصور کے سامنے جا کھڑی ہوئیں اور اسے بہت غور سے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "کبھی تیری تصویر نہیں دیکھی۔ لیکن پہچان گئی ہوں' تو سلمیٰ باجی کا بیٹا ہے نا"۔

"ہاں خالہ۔ میں منصور ہوں"۔

خالہ نے اسے بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ دیر تک وہ اس کا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر جھکائے اس کا چہرہ چومتی رہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رابعہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑی تھی۔ منصور پر بھی رقت طاری ہوگئی تھی۔ خالہ کے لمس سے اسے مامتا کی وہ گرمی مل رہی تھی' جس کے لیے وہ ہمیشہ ترستا رہا تھا۔

پھر اچانک خالہ کو رابعہ کا خیال آگیا۔ "ارے بہو بھی تو ہے ساتھ"۔ انہوں نے منصور

کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ہٹ......... وہ بھی کیا کہے گی کہ بیٹے کو تو کلیجے میں بھر لیا اور بہ
نظر انداز کر دیا"۔ یہ کہہ کر انہوں نے رابعہ کو لپٹا لیا۔ "ارے میرے لاڈلے کی دلہن۔ مر
سلمٰی باجی تو تجھے دیکھ بھی نہیں سکی ہوں گی"۔

پندرہ بیس منٹ وہیں گزر گئے تب کہیں یہ ابال تھما۔ خالہ انہیں اندر لے گئیں۔ یہ
دروازے کے ساتھ ہی بیٹھک تھی' جس کا ایک دروازہ اندر بھی کھلتا تھا۔ باہر والا دروازہ دا
دروازے کے ساتھ تھا۔

خالہ انہیں جس کمرے میں لے گئیں وہ بے حد کشادہ اور ہوا دار تھا......... ز
نشست تھی۔ دیواروں سے گاؤ تکیے لگے تھے۔ "تو یہاں سامان رکھ کر آرام سے بیٹھ۔
تیرے لیے دوسرا کمرا ٹھیک کرتی ہوں لیکن نہیں......... پہلے ناشتا تو نمٹا لوں"۔

"خالو جان کہاں ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"وہ نہا رہے ہیں۔ ابھی ناشتے پر ملاقات ہو جائے گی"۔

"اور........."

"بس' اب چپ رہ۔ تجھ سے باتیں کرنے کو تو عمر چاہیے۔ گھڑی دو گھڑی میں کام نہ
چلے گا۔ تم دونوں بھی ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ"۔

"ہم ہوٹل سے آرہے ہیں خالہ۔ تیار ہو کر نکلے ہیں"۔

"بس تو بیٹھو۔ میں ابھی آئی"۔

پندرہ منٹ بعد خالہ دسترخوان لائیں اور بچھا دیا۔ وہ ناشتا لے کر آئیں تو ان کے سا
خالو محمود بھی تھے۔ ان کی شخصیت بہت بارعب تھی۔ سرخ و سپید رنگت' خوبصورت نقش
کھڑا قد۔ خالہ نے ان سے کہا۔ "یہ دیکھو' کون آیا ہے ہمارے ہاں۔ یہ منصور ہے.........
باجی کا بیٹا۔ پاکستان سے آرہا ہے"۔

منصور ان کی پیشوائی کے لیے اٹھا۔ انہوں نے اسے سینے لگا لیا۔ "تم منظور میاں
بیٹے ہو نا؟" انہوں نے اسے پیچھے ہٹا کر بہت غور سے دیکھا۔

"جی ہاں"۔

"تم نہ بھی بتاؤ تو پتا چل جائے۔ ایسے گئے ہو اپنے باپ پر"۔ خالو جان بولے۔ "تمہ
باپ بہت عظیم انسان تھا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔ آؤ' پہلے ناشتا کر لو' پھر باتیں ہ
گی"۔

پھر باتیں ہوئیں......... اور خوب ہوئیں۔ برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں تو گھڑی
سوئیوں کی گردش غیر اہم ہو جاتی ہے۔ جبکہ وہ تو وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے سے کبھی
ملے تھے۔

O==========☆==========O

خالو محمود حکیم تھے۔ پھولوں والے چوک پر مطب کرتے تھے۔ اللہ نے ہاتھ میں شفا

تھی۔ مطب پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ہمیشہ کے خوشحال تھے۔ اللہ نے بڑی رحمت کی تھی
ان پر۔ مگر بہت دکھی تھے۔ تین بیٹوں' تین بیٹیوں کے ہوتے تنہا تھے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں
کی ہو چکی تھیں اور اس شہر میں نہیں تھیں۔ بیٹے تینوں شہید ہو گئے تھے۔ دو علی گڑھ میں
تعلیم پا رہے تھے اور وہاں کے مسلم کش فسادات میں شہید ہو گئے تھے۔ تیسرا میرٹھ کے
فسادات میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ تین جوان بیٹوں کی موت نے خالہ اور خالو کی زندگی اندھیر کر
دی تھی۔ اس پر بابری مسجد کا سانحہ! "اب تو ہمارے پاس اللہ کی نذر کرنے کے لیے کچھ بھی
نہیں بچا"۔ خالو جان نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

خالو جان مطب پر چلے گئے تو منصور نے اپنا مسئلہ خالہ کے سامنے رکھا۔ پہلے تو خالہ کی
سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ پھر وہ ایکسائٹ ہو گئیں۔ "کیسی باتیں کرتا ہے لڑکے۔ مندر کی
حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دے بیٹے!"

"خالہ......... میرا منصوبہ بڑا مکمل ہے۔ انشاء اللہ آپ اگلے ماہ یہ مبارک خبر سن لیں
گی۔ سارے حفاظتی انتظامات دھرے رہ جائیں گے"۔

"لیکن بیٹا........."

"خالہ......... بس آپ میرا مسئلہ حل کر دیں۔ مجھے اپنے ہونے والے بچے کی فکر ہے۔
یہ بتائیں' آپ کا پاسپورٹ بنا ہوا ہے"۔

"بیٹا' جب پاکستان جانا چاہتی تھی تو یہاں کی مصروفیت نے گھیرے رکھا۔ ذرا فرصت ملی تو
سلمٰی باجی ہی دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ مگر خدا بڑا کارساز ہے۔ پچھلے سال یہاں کی تنہائی سے
میرا دل گھبرا گیا تو میں نے تیرے خالو سے کہا' پاسپورٹ بنوا لو' میں کم از کم سلمٰی باجی کے بچوں
سے ہی مل آؤں جا کر۔ سو پاسپورٹ بن گیا"۔

"تب تو کام بن جائے گا خالہ۔ آپ خالو جان سے بات کریں۔ کریں گی نا؟"

"ضرور کروں گی لیکن اس معصوم کو کیوں دھکیلتا ہے؟" خالہ نے رابعہ کی طرف اشارہ
کیا۔

"خالہ......... میرے بغیر تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے"۔ رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "مجھے
یقین ہے کہ میرے مقدر میں اللہ نے یہ سعادت لکھ دی ہے"۔

خالہ نے منصور کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ منصور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں خالہ'
مجبوری ہے۔ ورنہ دل تو میرا بھی نہیں چاہتا تھا"۔

"ٹھیک ہے منصور۔ میں تیرے خالو سے بات کر لوں گی"۔

رات کو خالو جان خود منصور کے پاس آئے۔ "بیٹا۔ مجھے تمہاری خالہ سے سب کچھ
معلوم ہو گیا ہے"۔ انہوں نے کہا۔ "تم بہو کی جگہ مجھ سے کام لے لو نا۔ مجھے بڑی آرزو ہے
کچھ کرنے کی۔ میرے بیٹوں کا لہو ہر وقت مجھے پکارتا رہتا ہے"۔

"یہ ممکن نہیں خالو جان۔ رابعہ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ ورنہ میں کبھی ایسا نہیں

کرتا"۔ منصور نے کہا اور پھر انہیں تفصیل سے سب کچھ سمجھایا۔

خالو جان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "بیٹے......... خدا تمہیں سرخرو کرے۔ میں تمہار
لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ میں کل ہی ویزے کے لیے درخواست دے دوں گا"۔

"کچھ اندازہ ہے۔ کتنے دنوں میں مل جائے گا ویزا؟"

"انشاء اللہ زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ میری بڑی جان پہچان ہے۔ مریض تو ضرور
مند ہوتا ہے نا۔ کبھی نہیں بھولتا اپنے طبیب کو"۔

"بس تو خالو جان' یہ کام کرلیں آپ"۔

منصور نے چھ دن خالہ اور خالو کی محبت اور مہمان داری کے مزے لوٹے۔ وا
چھوڑنے کے بعد پہلی بار اسے گھر میسر آیا تھا۔ وہ بہت خوش رہا۔ جانے سے پہلے اس نے خا
اور خالو سے تمام تفصیلات طے کرلیں۔ خالو جان ویزے کی درخواست پہلے ہی دے چکے تھے۔
اس نے پوری ایک ہفتے کی چھٹی سے استفادہ کیا تھا۔

O============☆============O

جبل پور میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ بس رابعہ نہیں تھی اور یہ منصور کو ب
بڑا فرق معلوم ہو رہا تھا۔ ملنے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔
منصور سوچتا' رابعہ بھی تو خالہ اور خالو کی محبت کے سائے میں ہے۔ لیکن میں تو اک
ہوں......... بالکل اکیلا۔ پھر وہ سوچتا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رابعہ بھی تو میری کمی اسی طر
محسوس کر رہی ہوگی۔

پڑوس کے لوگوں نے آکر اس سے رابعہ کی خیریت دریافت کی۔ چند ایک گھروں سے
کھانے کی پیش کش بھی ہوئی لیکن منصور نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ خالی گھر اسے کھا
کھانے کو دوڑتا تھا۔ چنانچہ اس نے خود کو کام میں گم کر لیا۔ صرف دس دن میں اس نے ایک
ہفتے کی چھٹیوں کی تلافی کر دی۔ وہ سائٹ پر جاتا۔ وہاں مصروف رہتا۔ سائٹ سے وہ دفتر واپ
آتا اور دیر تک کام کرتا۔ رات کا کھانا ہوٹل سے کھاتے ہوئے وہ گھر واپس آتا تو تھکن سے
چُور ہوتا۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آجاتی۔

مصروفیت میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ آخر کار اسے احمد آباد سے ٹیلی گرا
موصول ہوگیا۔ خالو جان نے خاصی زحمت کی ہوگی۔ بہرحال کام پکا ہوا تھا۔ ٹیلی گرام میں صر
اتنا لکھا تھا۔ فوراً آجاؤ۔ ریکھا۔

اگلے روز وہ ٹیلی گرام لے کر رام پرشاد کے پاس چلا گیا اور ٹیلی گرام اس کے سامنے
رکھ دیا۔ رام پرشاد نے ٹیلی گرام پڑھا اور مسکرا دیا "تو شبھ گھڑی آپہنچی"۔

"جی مہاراج۔ شبھ گھڑی آپہنچی' جس کا مجھے انتظار تھا"۔

"کتنی چھٹی چاہیے تمہیں؟"

"تین ہفتے کی"۔

"کل جاؤ گے"۔

"ابھی جانا چاہتا ہوں مہاراج!"

"ٹھیک ہے۔ چلے جاؤ"۔

"ایک کام اور کر دیں میرا"۔ منصور نے کہا۔ "میری پتنی نے منت مانی تھی کہ اس کی
گود ہری ہوئی تو رام مندر میں چڑھاوا دے گی اور پوجا کرے گی اور وہاں کا حال تو آپ جانتے
ہیں۔ مسلمان مندر کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ راستے ہی میں نہ روک
لیا جاؤں۔ آپ مجھے کمپنی کی طرف سے لیٹر دے دیں کہ میں رمیش چوہان آپ کی کمپنی کا
برسوں پرانا وفادار خادم ہوں"۔

"تم جاؤ۔ آدھے گھنٹے میں لیٹر تمہیں مل جائے گا"۔

لیٹر ملتے ہی منصور اجمیر کے لیے روانہ ہوگیا۔ ۳ مئی ۷۹ء کی صبح ساڑھے تین بجے وہ
نجمہ خالہ کے ہاں پہنچا۔ رابعہ کی حالت بہت خراب تھی۔ خالہ نے ایک معتبر دائی کو بلوا لیا تھا۔
منصور کی صورت دیکھتے ہی رابعہ کرب کے باوجود مسکرائی۔ منصور کو وہ دنیا کی حسین ترین
مسکراہٹ لگی۔

رابعہ شاید منصور کی ہی آمد کی منتظر تھی۔ اس کی آمد کے ٹھیک دو گھنٹے بعد اس نے
جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ منصور کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ خالہ اور خالو جان بھی بہت خوش
تھے۔ انہوں نے دائی کو بھی خوش کر دیا۔

منصور نے بچوں کے کانوں میں اذان دی۔ "میرے بچو۔ یہ میں تمہارا پہلا اور آخری
کام کر رہا ہوں"۔ اس نے بوجھل سرگوشی میں کہا۔

نجمہ خالہ رابعہ کی نگہداشت میں مصروف تھیں۔ خالو جان نے بتایا کہ انہیں ویزا مل گیا
ہے۔ جو ۲۷ اپریل سے تین ماہ کی مدت تک کے لیے ہے۔ منصور نے انہیں فوراً بکنگ کرانے کا
مشورہ دیا۔

"لیکن بیٹا' اتنی جلدی کیا ہے۔ بہو کو ذرا آرام مل جائے"۔

"خالو جان' یہ معاملہ جتنی جلدی نمٹ جائے اچھا ہے۔ پھر ریزرویشن بھی اتنی آسانی
سے تو نہیں ملے گی"۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل دہلی چلا جاؤں گا۔ فلائٹ تو دہلی سے ہی ملے گی ہمیں"۔ خالو جان
اگلی صبح دہلی کے لیے روانہ ہوگئے۔ انہیں اگلے روز واپس آنا تھا۔

بچوں کی پیدائش کے بعد منصور پہلی بار رابعہ کے پاس گیا تو رابعہ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا
لیکن اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی اور وہ بہت پاکیزہ......... بہت حسین لگ رہی
تھی۔ "مبارک ہو"۔ منصور نے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رابعہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "تمہیں بھی مبارک ہو پریتم۔ اللہ کا شکر ہے اور
تمہارا شکریہ' آج میں مکمل ہوگئی۔ میرے خواب کی تعبیر مل گئی"۔

"اور کمال یہ ہے کہ خواب ایک تھا' تعبیریں دو ہیں"۔ منصور نے شوخ لہجے میں کہا۔ "رابو' تم نے تو کمال کر دیا"۔

رابعہ شرما گئی۔ "کوئی نام بھی سوچا تم نے؟"

"بات گول کر گئیں نا۔ چالاک کہیں کی"۔ منصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا نہیں کہتیں کہ ایک تعبیر تمہاری ہے اور دوسری میری"۔

"نہیں۔ دونوں میرے بھی ہیں اور تمہارے بھی"۔

"لیکن ایک کا نام تو تم رکھو گی اور دوسرے کا میں۔ اب یہ طے کر لو کہ کون کر ہے"۔

رابعہ نے پہلو میں لیٹے ہوئے دونوں بچوں کو دیکھا۔ ایک کے بال سیاہ اور مو تھے...... منصور کی طرح اور دوسرے کے بال بھورے اور ریشم جیسے ملائم تھے...... را کے بالوں کی طرح۔ "یہ فیصلہ تو تمہیں کرنا ہے"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"یہ بھورے بالوں والا میرا ہے۔ یہ تم جیسا نکلے گا"۔

"بالکل ٹھیک۔ یہ سیاہ بالوں والا میرا ہے۔ یہ بالکل تم جیسا ہے"۔

"کوئی نام بھی تھا تمہارے ذہن میں؟" منصور نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن پہلے تم بتاؤ"۔

"نہیں۔ پہلے تم۔ تم بس اس سیاہ بالوں والے کا نام بتا دو۔ بھورے والے کا نام میں نے سوچ لیا ہے"۔

"بہت ضدی ہو۔ چلو...... میں پہلے بتا دیتی ہوں۔ یہ جو تم جیسا ہے نا' اس کا نام میں نے سرمد رکھا ہے...... سرمد صدیقی"۔ وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

"سبحان اللہ!" منصور نے بے ساختہ کہا۔

"واقعی اچھا لگا تمہیں؟"

"سچ...... بہت ہی اچھا نام ہے۔ تم نے تو نام رکھنے میں بھی کمال کر دیا"۔

"بس بناؤ نہیں زیادہ۔ اب تم بتاؤ"۔

"میں دوسرے بیٹے کا نام عبداللہ رکھ رہا ہوں"۔

"بہت خوب! اللہ مبارک کرے"۔

"اب میں تم سے ایک اہم بات پوچھ رہا ہوں۔ تم اتنے سخت مرحلے سے گزری ہو۔ ا بوجھ اٹھا سکو گی' جو اٹھانا ہے۔ ہم اپنے پروگرام کو بھی مؤخر نہیں کر سکتے"۔

"ہرگز نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس بوجھ سے تکلیف ہو گی۔ یوں میرے چہرے ا کرب سچا ہو گا۔ کوئی شک بھی نہیں کر سکے گا"۔

"لیکن رابعہ......"

"منصور...... ہم ایک ایسی زندگی کے راستے پر جا رہے ہیں' جس پر انسان کبھی نہیں

مرتا۔ ہمیشہ زندہ رہتا ہے"۔ رابعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔

اگلے روز خالو جان دہلی سے واپس آ گئے۔ انہیں سترہ مئی کی ریزرویشن ملی تھی۔

وہ عرصہ انہوں بہت ہنسی خوشی گزارا۔ دونوں بچوں میں گم رہے۔ خالو جان نے فیض آباد کے لیے کوپے کی بکنگ کرا دی تھی تاکہ رابعہ کو بے آرامی نہ ہو۔ فیض آباد سے اجودھیا انہیں بس میں سفر کرنا تھا۔ کوپے کی بکنگ سترہ تاریخ کی تھی۔ ٹرین کو صبح چار بجے روانہ ہونا تھا۔ خالو جان کی فلائٹ صبح چھ بجے کی تھی۔ طے پایا تھا کہ وہ سولہ کی رات دہلی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

خوشی کے وہ دن پلک جھپکتے بیت گئے۔ سولہ کا دن آ پہنچا...... جدائی کا دن۔ منصور کچھ دیر کے لیے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کیسٹ تھا۔ کیسٹ اس نے خالو جان کی طرف بڑھایا۔ "خالو جان' اس میں میرا پیغام ہے...... قوم کے نام۔ کوشش کیجئے گا کہ اسے کسی اتھارٹی تک پہنچا دیں"۔

محمود صاحب نے کیسٹ لے لیا۔ "لیکن بیٹا' یہ مشکل کام ہے۔ اول تو وہ کیسٹ لے جانے نہیں دیں گے۔ لے جانے دیا تو پہلے خود سنیں گے"۔

خالہ نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ لے لیا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا بندوبست کر لوں گی"۔

سورج ڈوب گیا۔ جدائی کی گھڑی آ پہنچی۔ خالہ اور خالو گھر کے در و دیوار کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب وہ یہاں کبھی نہیں آ سکیں گے۔ سب اداس تھے۔ منصور اور رابعہ بار بار بچوں کو پیار کر رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر خالہ اور خالو کا دل کٹا جا رہا تھا۔

بالآخر خالہ اور خالو کی روانگی کا وقت آ گیا۔ "میں نے تانگے والے سے کہہ دیا ہے وہ تین بجے تمہیں لینے آ جائے گا"۔ خالو جان نے منصور سے کہا۔

"جاتے وقت گھر کو تالا لگا دینا"۔ خالہ نے کہا۔

"وہاں سب کو میرا اور رابعہ کا سلام کہئے گا"۔ منصور نے کہا۔

ایک دوسرے کے گلے لگتے ہوئے کوئی بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔ بالآخر جانے والے چلے گئے۔ بچوں کے جانے سے گھر میں سناٹا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے اور ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے۔ وہ ان کے آخری آنسو تھے۔

O============☆============O

تین بجنے میں دس منٹ پر تانگے والے نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک خوش رو جوان آدمی نے کھولا۔ اس کی عمر ۳۵ کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے چہرے پر مونچھیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ تانگے والے نے سوچا' اس کے چہرے پر مونچھیں نہ ہوتیں تو یقیناً یہ

بہت خوبرو آدمی ہوتا۔

"حکیم صاحب نے حکم دیا تھا کہ آپ کو اسٹیشن پہنچانا ہے"۔ تانگے والے نے کہا۔

"ایک منٹ۔ میں ابھی آیا"۔

جوان آدمی باہر آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ایک حاملہ عورت کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ اس نے سوٹ کیس تانگے کے اگلے حصے میں رکھا اور عورت کو سہارا دے کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ پھر وہ خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ "چلو بابا"۔ اس نے کہا۔

O===========☆===========O

ٹرین کا سفر ناخوشگوار ہرگز نہیں تھا۔ خالو جان نے کوپے بک کرا کے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ رابعہ واقعی بڑی زحمت سے بچ گئی تھی۔ سفر کے دوران کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ بالآخر وہ فیض آباد پہنچ گئے۔ فیض آباد سے انہیں بس لینا تھی۔ وہاں بہت رش تھا۔ یاتریوں کا بڑا ہجوم تھا۔ وہاں بھی رابعہ کا حاملہ ہونا کام آیا۔ لوگ اس کے جذبے سے بہت متاثر نظر آرہے تھے۔ ایک عورت جو اس حال میں بھی منت پوری کرنے جا رہی تھی، ان کے لیے تو دیوی سمان تھی۔

انہیں بس میں جگہ مل گئی۔ ذرا دیر بعد وہ اجودھیا کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں پہلی بار انہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ایک جگہ بس روکی گئی اور مسلح فوجی بس پر چڑھ آئے۔ وہ بے حد الرٹ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے مسافروں کے سامان کی تلاشی لی۔ بعض مسافروں کی جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ وہاں منصور کا کمپنی کا لیٹر کام آیا۔ رابعہ اٹھنے لگی تو فوجی نے کہا۔ "آپ بیٹھی رہو بہن!"

O===========☆===========O

وہ سترہ تاریخ کی صبح تھی۔ وزیراعظم پاکستان نے اس روز پروٹوکول اور ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اسلام آباد سے کراچی کے لیے عام پرواز سے سفر کیا تھا۔ سفر کے دوران وہ ساتھی مسافروں کو آٹوگراف دیتے اور ان سے خوش خلقی سے باتیں کرتے رہے تھے۔

طیارے نے لینڈ کیا۔ وزیراعظم نے وی آئی پی لاؤنج میں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ پسنجر لاؤنج کی طرف چل دیئے۔ ان کے ساتھ صرف ان کا ایڈی تھا۔ وہاں وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عام مسافروں کے مسائل کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

لاؤنج میں مسافروں کا ہجوم تھا۔ دہلی سے آنے والی فلائٹ کے مسافر امیگریشن کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وزیراعظم بھی ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کا ایڈی پریشان اور متوحش دکھائی دے رہا تھا۔ وزیراعظم اس وقت ہمہ تن سماعت تھے۔

"میں اس ملک کی کسی اتھارٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

اس زوردار اور پروقار لہجے نے وزیراعظم کو چونکا دیا۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک دراز قد، خوبرو اور معمر آدمی امیگریشن کاؤنٹر پر ایک آفیسر سے مخاطب تھا۔

"دیکھئے........ یہ بے قاعدگی ہے۔ یہ بچے اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے"۔ امیگریشن آفیسر کہہ رہا تھا۔ "ان بچوں کا پاسپورٹ میں اندراج نہیں۔ پھر آپ خود کہتے ہیں کہ یہ آپ کے بچے نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہاں والوں نے ان بچوں کو جہاز پر سوار کیوں ہونے دیا"۔

"انہیں میں نے مطمئن کر دیا تھا۔ آپ کو میں بتا رہا ہوں کہ یہ بچے آپ کے ملک اور قوم کی امانت ہیں"۔ معمر آدمی نے کہا۔ "یہ ان ماں باپ کی اولاد ہیں، جو کچھ دیر بعد ایک بڑے مقصد کی راہ میں شہید ہونے والے ہیں"۔

"دیکھیے قبلہ........ میں ایسی کہانیاں روز سنتا رہتا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں آپ کو واپس بھجوا رہا ہوں"۔

"اور میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ یہ قومی اہمیت کا معاملہ ہے"۔ معمر آدمی نے زور دے کر کہا۔ "میرے پاس ملک کے سربراہ اور پوری قوم کے لیے ایک بے حد اہم پیغام ہے"۔

"آپ وہ پیغام مجھے دے دیں۔ میں فیصلہ کروں گا کہ........"

اس بار معمر شخص کی آواز بلند ہو گئی۔ "یہ معاملہ تمہارے لیول کا نہیں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کسی اتھارٹی سے میری بات کراؤ۔ میرے پاس جو امانت ہے، وہ پوری قوم کی ہے اور بہت حساس نوعیت کی ہے"۔

"سوری، میں آپ کو ڈی پورٹ کر رہا ہوں"۔

"وزیراعظم نے ایڈی کو اشارہ کیا۔ ایڈی کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے امیگریشن آفیسر سے کچھ کہا۔ آفیسر نے سر گھما کر اس طرف دیکھا۔ وزیراعظم کو دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ معمر شخص کو لے کر وزیراعظم کی طرف بڑھا۔ "سر! میں........" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ اب تم جاؤ اور ان لوگوں کو کلیئر کر دو"۔

امیگریشن آفیسر بغیر کچھ کہے کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ وزیراعظم معمر شخص کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "آپ کا اسم گرامی؟"

محمود صاحب نے بھی وزیراعظم کو پہچان لیا تھا اور اس حسن اتفاق پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ چند لمحے پہلے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا اور انہیں بچوں سمیت ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔ "خاکسار کو محمود احمد کہتے ہیں یور ایکسی لینسی"۔

"محمود صاحب، میں نے آپ کی گفتگو سنی۔ کچھ وضاحت کریں گے آپ!"

"یور ایکسی لینسی، معاملہ بہت حساس نوعیت کا ہے اور سخت رازداری کا متقاضی ہے"۔

وزیراعظم چند لمحے سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ "کوئی اشارہ دے سکتے ہیں آپ؟"

"معاملہ بابری مسجد سے متعلق ہے"۔ محمود صاحب نے سرگوشی میں کہا۔

وزیراعظم نے چند لمحے غور کیا۔ "آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ پھر ہم راز داری سے گفتگو کر سکیں گے"۔ کوئی انجانی حس انہیں بتا رہی تھی کہ معاملہ واقعی اہم ہے۔

O============☆============O

رام مندر کی پُرشکوہ اور عظیم الشان عمارت فوج کے گھیرے میں تھی۔ پوجا کے خواہش مند ہندوؤں کا جم غفیر تھا۔ مندر کی اردگرد خاردار تاروں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ اندر جانے کے لیے اجازت نامے جاری کیے جا رہے تھے۔ باڑھ / چار دیواری کے باہر سامنے کی طرف عارضی نوعیت کا ایک دفتر بنایا گیا تھا۔ اجازت نامے وہیں سے جاری ہو رہے تھے۔ اجازت نامے کے خواہاں لوگوں کی قطار بہت طویل تھی...... اتنی طویل کہ گھنٹوں میں نمبر آتا۔

منصور ایک فوجی کی طرف بڑھ گیا۔ رابعہ کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ چہرے پر حقیقی کرب تھا۔ جڑواں بچوں کی زچگی کے بعد تو عورت کے لیے چلنا بھی محال ہوتا ہے جب کہ وہ تو بہت بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے تھی۔

منصور بڑی مشکل سے فوجی کو رابعہ تک لے آیا۔ "یہ میری پتنی ہے شریمان جی۔ اس نے پوجا کی منت مانی تھی' اولاد کے لیے۔ ہمیں ایمرجنسی میں اجازت نامہ دلا دیجیے"۔

فوجی نے رابعہ کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن وہ بولا تو اس کا لہجہ خشک تھا۔ "اس حالت میں پوجا کی ضرورت کیا ہے؟"

وہاں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ "چاہے پران چلے جائیں' بھگوان سے کیا ہوا وچن تو نبھاؤں گی"۔

ایک بوڑھی عورت نے رابعہ سے کہا۔ "پر پتری' تیرا سمے تو قریب لگتا ہے"۔

"ماتا...... میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ میرا بچہ اس پوتر دھرتی پر...... بلکہ مندر میں آنکھ کھولے"۔

"دھنیہ ہو بیٹی"۔ عورت بولی۔

"جے بھگوان کی۔ جے رام جی کی"۔ کسی نے نعرہ لگایا۔

"دیکھو...... ایسے ہوتے ہیں بھگوان کے بھگت"۔ کوئی اور بولا۔

فوجی نے یہ رنگ دیکھا تو منصور سے کہا۔ "آؤ مہاشے میرے ساتھ۔ میں کچھ کرتا ہوں تمہارے لیے"۔

وہ منصور کو دفتر میں لے گیا اور اندر بیٹھے فوجی کو تفصیل بتائی۔ "ان کے لیے اجازت نامہ بنا دو کل کا"۔

"تمہارا نام؟"

"رمیش چوہان"۔ رمیش نے کمپنی کا لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"پتنی کا نام؟"

"ریکھا"۔

وہ چند منٹ میں اجازت نامہ لے کر نکل آیا۔ وہ خوش تھا کہ رابعہ کو آرام کے لیے مہلت مل گئی ہے۔ حفاظتی انتظامات کے پیش نظر مندر کے اوقات مقرر کر دیے گئے تھے...... صبح سات بجے سے شام سات بجے تک۔ سات بجے کے بعد مندر کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔

منصور رابعہ کو ایک طرف بٹھا کر ہوٹل کی تلاش میں نکلا۔ عام ہوٹلوں میں کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ بلکہ باہر چارپائیاں تک ڈال دی گئی تھیں۔ بڑے مشکل سے ایک بڑے اور مہنگے ہوٹل میں منصور کو کمرا مل گیا۔ منصور کو اس وقت مہنگے سستے سے غرض بھی نہیں تھی۔ وہ جا کر رابعہ کو ہوٹل کے کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں رابعہ نے بوجھ سے نجات حاصل کی اور آرام کرنے لیٹ گئی۔

وہ رات ان کے لیے عبادت کی رات تھی۔ وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سوئے۔ نوافل ادا کرتے اور خدا سے مدد طلب کرتے رہے۔

O============☆============O

محمود صاحب بولتے رہے تھے۔ وزیراعظم نے انہیں ایک بار بھی نہیں ٹوکا۔ لیکن ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نجمہ بیگم دونوں بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھیں۔

"تو یور ایکسی لینسی' یہ دونوں بچے اس شخص کے...... بلکہ پوری قوم کی امانت ہیں"۔ محمود صاحب نے دل گیر لہجے میں کہا۔

"یقین نہیں آتا"۔ وزیراعظم نے کہا۔ "بہرحال تصدیق ہو جائے گی۔ آپ مجھے منصور صدیقی کا پتا' اس کے رشتے داروں کے پتے اور دیگر تفصیلات دے دیں"۔

"ضرور یور ایکسی لینسی!" محمود صاحب نے تمام تفصیلات ان کے گوش گزار دیں۔ پھر انہوں نے وزیراعظم کی طرف منصور کا کیسٹ بڑھایا۔ "یہ آپ کی اور قوم کی ایک اور امانت ہے میرے پاس۔ اب میں بری الذمہ ہو رہا ہوں"۔

کیسٹ پلیئر میز پر ہی رکھا تھا۔ وزیراعظم نے کیسٹ خود اس میں لگایا' ری وائنڈ کیا اور پھر آن کر دیا۔ چند لمحے سرسری سنائی دی۔ پھر ایک خوبصورت آواز ابھری۔ وزیراعظم بہت غور سے سن رہے تھے۔ محمود صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"السلام علیکم۔ میں منصور صدیقی ولد منظور صدیقی اپنی قوم کے قائدین سے' اپنے بزرگوں' بھائیوں' نوجوانوں' بچوں سے' اپنی ماؤں اور بہنوں سے مخاطب ہوں۔ جس وقت آپ میری آواز سن رہے ہوں گے' میں پاکستان کی دینی اور ملی حمیت کی پیشانی پر لگے بدنما داغ کو

دھونے کی کوشش کر رہا ہوں گا۔ میں آپ سب کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ میرے حق میں
کیجئے گا۔

"۶ دسمبر ۹۲ء کا دن میں کبھی نہیں بھولا۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں بھول سکتا لیکن مجھے
افسوس ہے کہ اس سانحے پر ہمارا ردعمل ایک زندہ اور عاقل و بالغ قوم کے شایان شان نہ
تھا۔ پاکستانی ہندوؤں کو نقصان پہنچانا اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے منافی تھا۔ بابری م
کے انہدام کی خبر سن کر میرے سینے میں بھی وہی آگ بھڑکی تھی جو آپ سب کے سینوں م
بھڑکی تھی لیکن میں نے اس آگ کو باہر نہیں نکالا۔ میں نے اسے آنکھوں کی حدود سے با
نہیں آنے دیا۔ ایجی ٹیشن میرے نزدیک بے سود تھا کیونکہ ہمارا واسطہ جن لوگوں سے ت
انہوں نے مسلمانوں کی تو کیا' عالمی رائے عامہ کی بھی کبھی پروا نہیں کی۔ انہوں نے تو اس
معاملے میں عدلیہ کے فیصلے کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ میں چند ٹائر دو ایک گاڑیاں اور چند گ
جلا کر اپنے سینے کی آگ کو خاکستر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ قومی بچپنا تھا' میرے
نزدیک اس سلسلے میں حکومت پر بھی ذمے داری ڈالنا زیادتی تھی۔ اس بیسویں صدی میں جنگیں
بڑی ہولناک ہوتی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچتا اور پھر جنگ کا حاصل بھی کیا تھا۔ معاملہ تو وہیں
وہیں رہتا اور میرا نظریہ ہے کہ جہاں حکومتیں بے بس ہوں' وہاں افراد کو سوچنا پڑتا ہے۔ سو میں
نے فرد بن کر سوچا اور اپنے فرض کا تعین کیا۔ میں نے اپنے سینے میں بھڑکنے والی آگ کو ایک
مقدس راز کی طرح اپنے سینے میں رکھا۔ اسے خوب دہکایا۔ الاؤ بنا دیا اور اب انشاء اللہ وہ آگ
بابری مسجد کے ملبے پر تعمیر ہونے والے رام مندر کو جلا کر بھسم کر دے گی۔ یہاں یہ وضاحت کر
دوں کہ مجھے کسی مندر سے کوئی دشمنی نہیں۔ میرا ہدف صرف رام مندر ہے' جو غاصبوں نے
مسلمانوں کا حق چھین کر' ایک مسجد کی جگہ غصب کر کے تعمیر کیا ہے............"

وزیراعظم بہت توجہ سے سن رہے تھے۔ محمود صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے
تھے۔ وہ کیسٹ انہوں نے بھی پہلے نہیں سنا تھا۔

اب منصور اپنے منصوبے کی تفصیلات بیان کر رہا تھا۔ وہ رابعہ کا' اس کے کردار کا' اس
کے ایثار و وفا کا' فرض شناسی کا تذکرہ کر کے اسے خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ وہ اسلامی
معاشرے میں ماں کے کردار اور اولاد کی تربیت کی اہمیت کو اجاگر کر رہا تھا۔ منصوبے کی
تفصیلات سن کر وزیراعظم کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

کمرے میں منصور کی آواز گونج رہی تھی۔

"تو میرے بزرگو' دوستو' میری ماؤں بہنو۔ مجھے امید ہے کہ اللہ کی تائید کے زور پر میں
اور رابعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ہمارا آخری پیغام یہ ہے کہ اب قومی سطح پر سو
چھوڑیں اور بلوغت کی طرف قدم بڑھائیں۔ دینی اور ملی حمیت کو جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہو
تو سینوں کی آگ کو منفی ردعمل کے پانی سے نہ بجھائیں۔ سینوں کو روشن رکھیں۔ اندر الاؤ
دہکاتے رہیں۔ یہاں تک کہ چیلنج کرنے والے کو بھسم کر دیں۔ شخصیت پرستی سے باز رہیں کہ

نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ازل سے ابد
کائنات کے واحد کامل انسان ہیں۔ ان کی سیرت طیبہ کو دیکھنے کے بعد کم از کم مسلمانوں کے
لے تو شخصیت پرستی کی گنجائش ہی نہیں۔ ہم اس یقین کے ساتھ جان دے رہے ہیں کہ بابری
سجد کی جگہ رام مندر اگر ہزار بار تعمیر کیا جائے گا تو ہم ہزار بار اسے تباہ کر دیں گے۔ اور اکھنڈ
ارت کا خواب دیکھنے والے اکیسویں صدی سے پہلے ہی خود اپنے ہاتھوں اس کے ٹکڑے کرتے
ر آئیں گے"۔

"اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ التجا ہے کہ اگر کسی کا میری یا رابعہ کی طرف
وئی حساب نکلتا ہو تو خدا کو گواہ بنا کر اسے معاف کر دیا جائے۔ اللہ پاکستان اور پاکستانی قوم کو
شہ اپنی امان میں رکھے اور بلندیوں اور کامرانیوں سے سرفراز فرمائے۔ خدا حافظ فی امان اللہ"۔

کیسٹ اب خالی چل رہا تھا۔ لیکن وزیراعظم ایسی کیفیت میں تھے کہ انہیں کیسٹ پلیئر
اف کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ محمود صاحب کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ کیسٹ ختم ہوا تو پلیئر
ود بخود آف ہو گیا۔ اس کی آواز سن کر وزیراعظم جیسے ٹرانس سے باہر آ گئے۔ "مرحبا!" انہوں
نے بے ساختہ کہا۔ "جس قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوں' وہ کبھی سرنگوں نہیں ہو سکتی"

محمود صاحب خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے پوچھا۔ "ہمارے
لیے کیا حکم ہے یور ایکسی لینسی؟"

"یہ معاملہ واقعی حساس نوعیت کا ہے۔ ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ اس
قت تک ہمارے مہمان رہیں گے' آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ صورت حال واضح ہونے
کے بعد آپ جہاں کہیں گے' آپ کو پورے عزت اکرام سے وہاں پہنچا دیا جائے گا"۔

"جی بہت بہتر"۔

"اور ہاں۔ اب آپ بھارت واپس نہیں جا سکتے۔ آپ کو یہاں کی قومیت دی جائے
گی۔ آپ اپنے بارے میں تفصیل سے بتائیں مجھے"۔

اور اس باپ کی کہانی سن کر' جس کے تینوں جوان بیٹے ہندوؤں کے جنون کی بھینٹ
ڑھ گئے تھے' وزیراعظم کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

O============☆============O

زندگی کی آخری رات ۱۹۹۷ء

منصور کھانے کا کچھ سامان رات ہی کمرے میں لے آیا تھا۔ انہوں نے آخری رات
بادت کی۔ صبح صادق سے پہلے انہوں نے سحری اور نفلی روزے کی نیت کر لی۔ فجر کی نماز پڑھ
ر وہ نیچے آئے۔ کاؤنٹر پر ادائیگی کے بعد وہ باہر نکلے۔ انہوں نے ہار پھول لیے اور رام مندر
ی طرف چل دیے۔

بہت صبح کا وقت تھا۔ وہاں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مندر میں داخل ہو
ئے۔ مندر کا نقشہ منصور کے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس نے چھپنے کے لئے جوتہ خانہ منتخب کیا تھا'

اس کا محل وقوع اور میکنزم اسے ازبر تھا۔

وہ ایک بہت بڑا.......... بے حد وسیع و عریض ہال تھا۔ چاروں طرف کی دیوا
دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں نقش تھیں۔ بالکل سامنے رام جی کا ایک بہت بڑا مجسمہ ایستا
لوگ وہاں چڑھاوے دے رہے تھے۔ منصور اور رابعہ اس طرف جانے کے بجائے در
سے داخل ہوتے ہی داہنی سمت چل دیے۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا' جیسے شبیہوں کو دیکھ او
رہے ہوں۔ بڑھتے بڑھتے وہ کونے تک پہنچ گئے' جہاں دو دیواریں مل رہی تھیں۔

وہاں پہنچ کر منصور رک گیا۔ "بس' یہیں ٹھہر جاؤ رابو"۔ اس نے سرگوشی مِ
"اور یہ ظاہر کرتی رہو کہ شبیہیں دیکھ رہی ہو"۔ وہ خود دونوں دیواروں کے نقطہ اتصال
غور سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اسے وہ مورتی نظر آگئی جس پر دباؤ ڈالنے سے تہ خانے کا
کھلنا تھا۔ اس نے پلٹ کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ قریب کوئی نہیں تھا اور ان کی طرف کوئ
نہیں تھا لیکن منصور کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ تہ خانے کا دروازہ کھلنے میں گڑگڑاہٹ کی آوا
بلند ہوگی اور وہ اس آخری مرحلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

"رابعہ.......... میں موقع ملتے ہی اس مورتی پر دباؤ ڈالوں گا۔ تہ خانے کا دروازہ کھ
تم تیزی سے نیچے اتر جانا۔ بس الرٹ رہو"۔ اس نے سرگوشی میں رابعہ سے کہا۔

وہ دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ منصور بڑی احتیاط سے وقتاً فوقتاً گردو
جائزہ لیتا رہا تھا۔

اچانک ہی مندر کے پجاری نے بھجن شروع کر دیا۔ آواز کی گونج ایسی تھی کہ درد
سے' چھت سے' فرش سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ منصور نے پلٹ کر دیکھا اور پھ
سے پوچھا۔ "تیار ہو رابو؟" رابعہ کے اثبات میں سرہلاتے ہی اس نے بسم اللہ پڑھ کر مو
دباؤ ڈالا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اس کی یادداشت میکنزم کے معاملے میں دھوکا نہ
دے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

گڑگڑاہٹ کی وہ آواز کم از کم انہیں تو بہت تیز لگی تھی۔ منصور نے گھبرا کر قربان
طرف دیکھا لیکن بھجن کی آواز نے گڑگڑاہٹ کو دبا لیا تھا' اب پوجا کے لئے آئے ہوئے
بھی پجاری کی آواز میں آواز ملا کر بھجن گا رہے تھے۔

فرش کا ایک حصہ ہٹا اور نیچے سیڑھیاں نظر آئیں۔ رابعہ تیزی سے اس میں اتر
منصور پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ بھجن گانے والے جھوم جھوم کر زور و شور سے بھجن گانے
مصروف تھے۔ منصور پلٹا اور تیزی سے خلا میں اتر گیا۔ چار سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے
ہی ایک مورتی نظر آئی۔ اس نے اس پر دباؤ ڈالا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز پھر بلند ہوئی۔ اس
ساتھ ہی فرش کا وہ حصہ برابر ہو گیا۔

ان دونوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سکون کی سانس لی۔ ایک اور مشکل......
بے حد مشکل مرحلہ خدا کے فضل و کرم سے سر ہو گیا تھا۔ اللہ کی تائید ان کے ساتھ تھی۔

طرز کا تہ خانہ تھا اور کچھ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ وہاں گھٹن بالکل نہیں تھی۔ اندھیرا
تھا لیکن ذرا دیر گزرنے کے بعد ان کی آنکھیں اس تاریکی سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ رابعہ
نے سب سے پہلے بوجھ سے آزادی حاصل کی۔ منصور سامان کو ترتیب سے رکھنے میں مصروف
ہو گیا۔ "تم ذرا دیر آرام کر لو۔ یہ سخت فرش بھی نعمت ہے ایسے میں تو"۔ اس نے رابعہ سے
کہا۔

رابعہ لیٹ کر سانسیں درست کرنے لگی۔ منصور کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ سامان کم
ہرگز نہیں' ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے اور یہ بھی اچھا ہی تھا۔
پچھلے پورے دن انہوں نے پانی بالکل ہی نہیں پیا تھا ورنہ وضو کے لئے مسئلہ پیدا ہو جاتا
اور اب تو وہ روزے سے تھا۔

بیکاری کا وہ وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ وہ کبھی نفلیں پڑھتے اور کبھی آرام کے
لئے لیٹ جاتے۔ نماز پڑھتے وقت ان کی خوشی کا اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا
کہ وہ بابری مسجد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ انہوں نے ابتدا ہی
میں ہندوؤں کو عبرت ناک شکست دی تھی۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ اس بت کدے میں نماز ادا
کی جا رہی ہے۔ تہ خانے کے در و دیوار اللہ کے کلام کی تلاوت سے گونج رہے تھے۔

وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ دونوں بار بار اپنی گھڑیوں میں وقت دیکھتے۔
ڈیڑھ بجے انہوں نے ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر وہ سو گئے۔ عصر کے بعد تو وقت جیسے اڑنے لگا۔
انہوں نے نمک سے روزہ کھولا۔ عشاء پڑھنے کے بعد انہیں بے تابی ہونے لگی کہ اوپر جائیں۔
مندر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اب اوپر سناٹا ہو گا لیکن منصور کوئی خطرہ مول نہیں
لینا چاہتا تھا۔ اسے مندر کے بارے میں کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ پجاریوں کی تعداد کتنی ہے۔
وہ مندر ہی میں موجود رہتے ہیں یا نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آدھی رات کے بعد کا وقت
ہی مناسب رہے گا۔

پھر رات کے بارہ بج گئے۔ ان کے جسموں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ دلوں کی
دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ "اوپر چلیں"۔ رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ ہم احتیاطاً ایک گھنٹا اور انتظار کریں گے"۔ منصور نے جواب دیا۔

ٹھیک ایک بجے منصور نے تہ خانے کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے اپنا تمام سامان اوپر
پہنچایا۔ رابعہ بھی تہ خانے سے نکل آئی۔ منصور نے باہر نکلنے کے بعد تہ خانے کا دروازہ بند کیا۔
اس کے بعد اس نے گھوم پھر کر وہ اہم مقامات منتخب کئے' جہاں آتش گیر مادہ رکھنا تھا۔ وہ خود
تعمیراتی انجینئر تھا اور اس کے لئے ایسے مقامات کا انتخاب کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

"میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟" رابعہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ کام تو صرف میں ہی کر سکوں گا"۔

"تو میں کچھ نفل ادا کر لوں"۔

"ضرور"۔ منصور نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔
اب اصل مندر میں نماز ادا کی جارہی تھی۔ اور نماز پڑھنے والی ہستی وہ تھی جو
مندروں میں بتوں کی پوجا کرتی رہی تھی۔
منصور نے سب سے پہلے مندر کے صدر دروازے کو بوبی ٹریپ کیا۔ اب کوئی درو
کھولنے کی کوشش کرتا تو بہت طاقت ور دھماکا ہوتا۔ بڑے ہال کی سائیڈ میں بھی ایک درو
تھا۔ منصور نے اسے چیک کیا۔ وہ بھی مقفل تھا۔ منصور نے اسے بھی بوبی ٹریپ کردیا۔ اس
بعد وہ اصل کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ہر ستون کے ساتھ آتش گیر مادہ باندھ دیا۔
تمام تار یکجا کرکے اس نے ڈیٹونیشن وائر سے منسلک کردیے۔ اب اس کے ہاتھ میں مو
ڈیٹونیٹر ہی ہر چیز کا مرکز و محور تھا۔
ڈیٹونیٹر ہاتھ میں لے کر اس نے ہال کا جائزہ لیا۔ وہ مندر واقعی فن تعمیر کا شاہکار
اسے خوشی ہوئی کہ وہ اس کے ہاتھوں تباہ ہورہا تھا۔ "اے اللہ.......... اے میرے معبود......
میں تیرا شکر گزار ہوں آقا کہ تُونے یہ سعادت مجھے نصیب فرمائی"۔ اس نے خود کلامی کی۔ پھ
رابعہ کی طرف متوجہ ہوا' جس نے ابھی ابھی سلام پھیرا تھا۔ اس نے اشارے سے رابو
اپنے پاس بلایا۔ "دیکھو رابو.......... اب مجھے شکرانے کے نفل پڑھنے ہیں"۔ اس نے کہا۔ "
ڈیٹونیٹر سنبھالو۔ میں نے دونوں دروازوں کو بوبی ٹریپ کردیا ہے۔ کوئی دروازہ کھولنے کی کوش
کرے گا تو دروازے دھماکے سے اُڑ جائیں گے ایسا ہوتے ہی تم بلا تاخیر ڈیٹونیٹر کا یہ بٹن
دینا"۔ یہ کہہ کر اس نے رابعہ کی پیشانی چوم لی۔ "سمجھ گئی ہونا؟"
"تم بے فکر ہو کر نماز پڑھو"۔
وہ ۱۹ مئی ۹۷ء کی صبح تھی اور اس وقت تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔
منصور نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔ وہ نفل ادا کرنے کے بعد مزید دو نفل کی نیت باندھ
رابعہ ڈیٹونیٹر ہاتھ میں لئے چوکس کھڑی تھی۔
دھماکا ہال کے بغلی دروازے کی طرف ہوا تھا!
مندر کے تمام پجاریوں کے لئے باہر کمرے بنے ہوئے تھے۔ مندر کے بڑے پروہ
کمرا سب سے بڑا تھا۔ تین بج کر دو منٹ پر بڑے پروہت کی آنکھ کھلی تو اس کا جسم پسینے مے
رہا تھا۔ سینے میں دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگا تھا۔ چند منٹ وہ ب
لیٹا خواب یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ گھبراہٹ کا احساس جاگنے
باوجود بھی بدستور تھا۔
کسی انجانے احساس کے زیر اثر اس نے مندر کے بغلی دروازے کی چابی اٹھائی
کمرے سے نکل آیا۔ مندر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بات کیا
یہ گھبراہٹ کیسی۔ اسی کیفیت میں اس نے بغلی دروازے کے ہضمی قفل میں چابی ڈال
گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا..........

وہ دھماکا ساعت شکن تھا!
منصور اس وقت دوسری رکعت میں تھا اور دوسرا سجدہ کررہا تھا۔ دھماکے کی آواز سنتے
ہی اس نے سجدہ طویل کردیا۔ اب نماز پوری کرنے کی مہلت نہیں تھی لیکن یہ سعادت کم تو
نہیں تھی کہ وہ موت کے وقت سجدے کی حالت میں تھا۔ جہاں دروازہ تھا' وہاں اب ایک
مہیب خلا نظر آرہا تھا۔ رابعہ نے پلٹ کر منصور کو دیکھا۔ وہ سجدے میں تھا۔ موت اتنی
خوبصورت بھی ہوتی ہے۔ رابعہ نے سوچا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر اس نے بلند آواز
میں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھا' اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بج کر سولہ
منٹ ہوئے تھے اس نے ڈیٹونیٹر کا بٹن دبا دیا۔
ایک گھنٹے کے اندر اندر پورے بھارت میں کہرام مچ چکا تھا!

O============☆============O

وزیراعظم پاکستان کی سربراہی میں کابینہ کا اجلاس ہورہا تھا۔ کابینہ کے تمام اراکین منصور
صدیقی کا کیسٹ بھی سن چکے تھے اور رام مندر کی تباہی کی خبر بھی۔ بحث کیسٹ پر ہی ہورہی
تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیسٹ کو عوام کے سامنے لانا قومی مفاد کے خلاف تھا۔ کشیدگی بڑھنا تو لازم
تھا جنگ بھی ہوسکتی تھی۔
"بابری مسجد کے انہدام پر جنگ نہیں ہوئی تو رام مندر کی تباہی پر جنگ کیوں ہوگی؟"
وزیر داخلہ نے اعتراض کیا۔
"کاروائی ایک پاکستانی نے کی ہے بھارت اسے اپنے اندرونی معاملات میں سنگین ترین
مداخلت قرار دے گا"۔ وزیر خارجہ نے جواب دیا۔
"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں"۔ وزیر دفاع نے کہا۔
"لیکن اس کیسٹ میں بہت بڑا پیغام ہے قوم کے نام"۔ وزیر اطلاعات نے کہا۔
"بات یہ بھی ٹھیک ہے"۔
دیر تک بحث ہوتی رہی۔ بالآخر وزیراعظم نے کہا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کیسٹ
کو جوں کا توں ریلیز کرنا مناسب نہیں۔ اس کی تدوین کرنا ہوگی۔ اس کا وہ حصہ کاٹ دیا جائے
گا جس میں منصوبے پر گفتگو کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بھارت والوں کو اندازہ بھی ہو کہ
کارروائی کیسے ہوئی ہے۔ انہیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے دو۔ میں نہیں سمجھتا کہ منصور
نے کہیں کوئی سراغ چھوڑا ہے۔ اب یہ بھارتی سیکیورٹی ایجنسیوں کے لئے ناسور بنا رہے گا۔
ہاں ہم منصور صدیقی کے خیالات اور اس کا پیغام ضرور عوام تک پہنچائیں گے۔ لیکن گمنام
حیثیت میں.......... اس گمنام شہید کی حیثیت میں' جس نے رام مندر کو تباہ کرنے میں اپنی جان
قربان کردی"۔
"لیکن یہ زیادتی ہوگی"۔ وزیر محنت نے اعتراض کیا۔
"شہادت خود ایک صلہ ہے۔ منصور صدیقی نے نام و نمود کے لئے یہ کام نہیں کیا"۔

وزیراعظم نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم منصور کو ایکسپوز کر کے اس کے بچوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ راز منصور شہید کے بچوں کی امانت ہے۔ وہ بڑے ہوں گے تو انہیں ضرور بتا جائے گا"۔

O============☆============O

محمود احمد صاحب کو پاکستان کی شہریت دے دی گئی۔ سرمد صدیقی اور عبداللہ صدیقی کے لئے برسر روزگار ہونے تک معقول وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ ان کے تعلیمی اخراجات بھی حکومت کے ذمے تھے۔ وزیراعظم نے منصور شہید کی چاروں بہنوں کو شرف ملاقات بخشا تھا۔ انہوں نے قومی مفادات کے نام پر ان سے اپیل کی تھی کہ وہ ان تمام معاملات کو صیغہ راز میں رکھیں اور سب کو یہی بتائیں کہ منصور اور اس کی بیوی رابعہ فرانس میں ایک حادثے میں جان بحق ہوگئے۔ انہوں نے منصور کی آخری خواہش کے مطابق دونوں بچوں کو اس کی سب سے چھوٹی بہن نصرت کے سپرد کردیا۔

نصرت نے دونوں بچوں کو دل سے لگالیا۔ "منصور.......... میرے چھوٹے بھائی۔ تُو اپنی ابتدا ہی سے بڑا آدمی تھا۔ تجھے اللہ نے بڑائی دی تھی"۔ وہ بڑبڑائی۔

اگلے روز تدوین شدہ کیسٹ ریلیز کردیا گیا۔

منصور کا آخری پیغام ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے ہر پاکستانی کے دل کو چھو رہا تھا۔

".......... قومی سطح پر بچپنا چھوڑیں اور بلوغت کی طرف قدم بڑھائیں۔ دینی اور ملی اہمیت کو جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہو تو سینوں کی آگ کو منفی ردعمل کے پانی سے نہ بجھائیں۔ سینوں کو روشن رکھیں۔ اندر الاؤ دہکاتے رہیں۔ یہاں تک کہ چیلنج کرنے والے کو بھسم کردیں..........

".......... شخصیت پرستی سے باز رہیں کہ اللہ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ازل سے ابد تک کائنات کے واحد کامل انسان ہیں۔ ان کی سیرتِ طیبّہ کو دیکھنے کے بعد کم از کم مسلمانوں کے لئے تو شخصیت پرستی کی گنجائش ہی نہیں..........

".......... ہم اس یقین کے ساتھ جان دے رہے ہیں کہ بابری مسجد کی جگہ رام مندر اگر ہزار بار تعمیر کیا جائے گا تو ہم ہزار بار اسے تباہ کردیں گے.........."

اور سب جانتے تھے کہ یہ آواز اس شہید کی ہے، جس نے تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود رام مندر کو تباہ کردیا تھا۔ وہ سب اس کے مقروض تھے اور اس وقت کے منتظر، جب دوبارہ رام مندر تعمیر کرنے کوشش کی جائے گی۔

قوم بلوغت کی سرحد میں داخل ہوچکی تھی۔

اجنبی قدموں کی چاپ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ قریب آکر وہ ٹھہر گئی۔ بوڑھے نجمی کا اندازہ تھا کہ آنے والا عین اس کے سامنے کھڑا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کے دن تھے' یہ وقت اس کے اونگھنے کا تھا۔ ایسے میں بڑے تو کیا' بچے بھی کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سامنے پان والے کی دکان کی طرف سے بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اس وقت اپنے دوپہر کے ٹھکانے پر بیٹھا تھا۔ صبح جب وہ اور اس کی بیٹی آتے تو نکڑ والے مکان کی دیوار کے ساتھ چادر بچھا لیتے۔ وہاں سے لوگ کثرت سے جو گزرتے تھے! مگر گیارہ بجے کے قریب آنے جانے والوں کی تعداد کم ہو جاتی اور دھوپ زور پکڑنے لگتی۔ تب وہ زیبا سے کہتا "چل زیبا.......... پیڑ کے نیچے چادر بچھا لے"۔ شام تک وہ اسی درخت کے نیچے بیٹھے رہتے۔

آتے ہوئے قدموں کی چاپ اس کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔ پھر سکوت تھا۔ نہ کسی سکے کی کھنکھناہٹ' نہ کوئی لفظ' نہ آواز.......... اور نہ ہی جاتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ وہ سکوت بوڑھے نجمی کے ناتواں وجود میں ہول بن کر اترنے لگا۔ اس نے سوچا' زیبا سے ہی کوئی بات کر لے مگر اس وقت اس کی حساس سماعت سے ایک اور آتی ہوئی چاپ ٹکرائی ذرا دیر بعد ساکت قدم حرکت میں آئے اور جاتی ہوئی چاپ بتانے لگی کہ جانے والا جھجک کر قدم اٹھا رہا ہے۔ جیسے بادل ناخواستہ جا رہا ہو۔

آنے والے کے قدم ایک پل کو رکے۔ چادر پر بکھرے ہوئے سکوں میں ایک اور سکہ گرا اور یوں کھنکھنا کر ہنسا جیسے کوئی غیروں سے اپنوں کے درمیان آکر خوش ہوتا ہے۔ پھر قدم آگے بڑھ گئے۔ بوڑھا نجمی چھوئے بغیر بتا سکتا تھا کہ نووارد سکہ اٹھنی ہے۔

انسانی جسم کا نظام ایسا ہے کہ تمام اعضاء ایک گھرانے کے افراد کی طرح رہتے ہیں۔ دماغ اس گھرانے کا سربراہ ہے اور باقی تمام بھائی۔ اچھے گھرانوں میں جہاں یکجہتی ہوتی ہے' وہاں ایک بھائی.......... بالخصوص بڑے بھائی کو کچھ ہو جائے تو چھوٹے بھائی مل بانٹ کر اس کی ذمے

داری کا بوجھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ممکنہ حد تک اس کی کمی پوری کر دیں..........

لائی کر دیں۔ چنانچہ بینائی کھو جائے' جو کہ دماغ کی رہنمائی کرتی ہے تو انسان کی تمام حسیں خود کو اس ہنگامی صورت حال کے لئے تیار کر لیتی ہیں' چوکنا ہو جاتی ہیں۔ سماعت اور شامہ دماغ کی رہنمائی کے لئے اپنے نکتہ عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔

اس کی حِس سماعت پورے عروج پر تھی۔ اس نے بینائی گنوانے کے بعد انحصار ہی اسی حِس پر کیا تھا۔ ہوتا بھی یہی ہے' دیکھنے والی آنکھ موجود ہو تو آدمی دوسری حِسّوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ہاں کبھی گہرے اندھیرے میں گھر جائے جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا ہو تو وہ سننے اور سونگھنے کی قوت استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اندھاپن ایک ایسی مسلسل اور اتھاہ تاریکی کا نام ہے' جس میں کبھی روشنی کی کوئی کرن نہیں اترتی' تب حوصلہ افزائی کے نتیجے میں دوسری حِسّوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

ایک بار زیبا نے اس سے کہا بھی تھا "بابا' کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تمہیں سب کچھ دکھائی دیتا ہے' تم سامنے سے گزرنے والے کو کیسے پہچان لیتے ہو؟ پیسوں کی آواز بھی پہچان لیتے ہو!"

وہ بیٹی کو کیا جواب دیتا! اس نے ایک گھسا پٹا جملہ دہرا دیا تھا۔ "جب باہر کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں بیٹا!" وہ اس بچی کو اعضائے جسمانی کا نظام کیا سمجھاتا' جس نے کبھی اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ زیبا سے صرف کام کی بات کرتا تھا۔ بعض اوقات اس پر سنک سوار ہوتی تو بولتا جاتا۔ اسے یہ خیال بھی نہ رہتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' وہ معصوم بچی کی سمجھ میں آئے گا بھی یا نہیں لیکن اس کی بات اس کے سوا سننے والا کوئی تھا بھی تو نہیں! زیبا اور صغریٰ خالہ کے سوا پوری دنیا سے تو اس کی لڑائی تھی!

اب وہ سوچ میں تھا کہ آنے والا رک کر خاموش کیوں کھڑا رہا' اور دوسرے کے آتے ہی کیوں چلا گیا؟ اس کے دل میں وسوسہ سر ابھارنے لگا۔ وہ آنے والا کون تھا۔ جو سامنے.......... بہت قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا.......... جس نے کچھ دیا بھی نہیں.......... جو خاموش کھڑا رہا.......... پُرہول خاموشی کا لبادہ اوڑھے۔ جس سے خوف آنے لگا تھا۔

اور بوڑھے نجمی کا تجربہ تھا کہ اس کی بھیک کی دکان کے سامنے کوئی بے سبب نہیں ٹھہرتا۔ کچھ دینے کے لئے ٹھہرتا ہے اور جو کچھ نہیں دیتا' وہ لینے کے چکر میں ہوتا ہے۔

ایک بار پہلے بھی ایسے ہی کوئی اس کے قریب آکر رکا تھا۔ وہ اس وقت ان نوٹوں کو گن رہا تھا' جو اس نے سامنے والے کو ریزگاری دے کر لئے تھے۔ زیبا پان والے کی دکان سے سگریٹ لینے گئی تھی۔

قدموں کی وہ چاپ اس کے بہت قریب آکر ٹھہر گئی تھی پھر سکوت۔ گرد و پیش کی آوازیں اپنی جگہ تھیں.......... چھولے والے کی پکار.......... بارہ مسالے کے ہیں یہ.......... کھیلتے ہوئے بچوں کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹیں.......... سامنے کیسٹ کی دکان سے گانے

کی آواز! سب کچھ اپنی جگہ تھا مگر قدموں کی اس آہٹ نے' جو قریب آکر معدوم ہو گئی تھ
جیسے گرد و پیش کی ہر آواز کو سناٹے میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔

وہ نوٹ گنتے گنتے ٹھٹک گیا۔ قدموں کی اس ٹھہری ہوئی چاپ سے اسے الجھن ہو
لگی۔ سماعت کے ارتقاء کے ساتھ آنکھوں کی محرومی نے اسے ایک اور حس بھی بخشی تھ
سمجھنے کی حس! وہ قدموں کی چاپ سن کر آنے یا جانے والے کے متعلق اندازہ لگا لیتا تھا کہ و
کیسا آدمی ہے لیکن اس بار اس کا واسطہ خاموشی سے پڑا تھا۔

معاً وہ خاموشی اس کے لئے مفہوم اختیار کر گئی۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا' یہ بڑ
حریص خاموشی ہوتی ہے۔ اسی لمحے وہ ہوا اور بہت تیزی سے ہوا۔ کچھ فاصلے سے ز
چیخی......... بابا! دو ہاتھ اس کے ہاتھوں سے ٹکرائے۔ اس نے نوٹوں کو مٹھی میں بھینچنے ک
کوشش کی مگر اسے محسوس ہوا کہ کچھ نوٹ چھین لئے گئے ہیں اور کچھ رہ گئے ہیں۔ وہ چ
.... زیبا چیخی۔ کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ طرح طرح کی آوازیں
تھیں' ارے پکڑو بدبخت کو۔ بے چارے اندھے فقیر کو لوٹ کر بھاگا ہے۔ جانے نہ پائے' مار
سالے کو! لیکن بھاگنے والا ہاتھ نہ آیا۔

اس دن کے بعد اس نے کبھی باہر بیٹھ کر نوٹ گننے کی حماقت نہیں کی اور اس نے ی
بھی جان لیا کہ خاموشی بھی قدموں کی چاپ کی طرح کئی قسم کی ہوتی ہے۔

آج پھر اس کا واسطہ قدموں کے سکوت سے پڑا تھا اور وہ سہم کر رہ گیا تھا۔ اس کے
سامنے آکر رکنے والے نے اسے کچھ نہیں دیا تھا اور کچھ لیا بھی نہیں تھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا
کسی اور کو آتا دیکھ کر وہ واپس چلا گیا تھا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ کچھ لینا' کچھ چھیننا چاہتا تھ
لیکن اس کے پاس تھا ہی کیا! چادر پر بکھرے ہوئے کچھ سکے جو دس روپے بھی نہیں ہوں گے۔
وہ سوچتا اور پریشان ہوتا رہا پھر اس نے تفتیش شروع کر دی۔

"زیبا' یہ جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا........."

"کس کی بات کر رہے ہو بابا؟"

"وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ جو........."

"جس نے اٹھنی دی تھی.........؟"

"نہیں' جو خاموش کھڑا رہا تھا"۔

زیبا خاموش رہی' نجمی نے محسوس کیا کہ وہ جھجک رہی ہے۔

"بتانا بیٹا!" اس نے پھر پوچھا۔

"پتا نہیں کون تھا بابا"۔ زیبا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "پہلی بار دیکھا ہے
اسے"۔

"کیا کر رہا تھا یہاں کھڑا ہو کر؟"

چند لمحے خاموش رہ کر زیبا اٹک اٹک کر کہنے لگی۔ "بابا......... کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر

جب سے نوٹ نکالا......... مجھے دکھایا پھر اپنے گالوں اور ہونٹوں پر اسے ملتا رہا۔ اور بابا.........
وہ مجھے دیکھ کر مسکرا بھی رہا تھا۔ بڑی خراب مسکراہٹ تھی اس کی۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا
بابا........."

وہ بچی کو کیا بتاتا کہ اس سے زیادہ تو وہ خود ڈر رہا تھا۔ اب بھی ڈر رہا ہے "ارے بیٹا'
ڈرنے کی کیا بات ہے!" اس نے بچی کو دلاسا دیا پھر پوچھا "نوٹ کون سا تھا اس کے ہاتھ میں؟"

"لال نوٹ تھا' بڑا والا........."

بوڑھے نجمی کے وجود کے نیچے سے تو جیسے وہ عافیت کی چادر زمین کو بھی نکال لے گئی
جس پر بارہ سال سے اس کے لئے کھنکھناتا ہوا رزق اترتا آرہا تھا۔ وہ جیسے پاتال میں گرنے لگا
تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ چہرے پر پتھر جیسی سختی تھی پھر وہ سخت جھنجلاہٹ میں بدلی
اور آہستہ آہستہ نقوش نرمی کی تصویر بنتے گئے۔ آخر میں چہرے پر صرف شکست خوردگی اور
بے نور آنکھوں میں بے بسی رہ گئی۔ اس کے اندر ایک صدا' ایک پکار ابھری' "اے
خدا......... اے خدا' میں ہار گیا۔ میری مدد کر........." وہ بارہ سال پرانی جنگ ہار گیا تھا۔ بارہ
سال پہلے اعلان جنگ بھی اس نے کیا تھا لیکن اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اس بات کو بارہ برس ہو
گئے ہیں۔

○============☆============○

بارہ سال پہلے تک وہ نجم الحسن تھا۔ زندگی کی بھرپور امنگوں' متنوع رنگوں سے
سرشار......... سچے جذبے تھے اس کے پاس۔ وہ بہت کچھ نہیں مانگتا تھا بلکہ جو کچھ اس کے پاس
تھا اس پر خدا کا شکر ادا کرتا رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں دوسروں سے زیادہ روشن تھیں۔ شادی
سے پہلے تک وہ دنیا میں تنہا تھا' ماں' باپ' بہن بھائی' رشتے داروں سے محروم۔ وہ ہر رشتے کی
قدر جانتا تھا' گریجویٹ تھا۔ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹس کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا'
معقول تنخواہ تھی۔

۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش سے لٹے پٹے بہاریوں کی آمد کا سلسلہ شروع
ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ کسی ایسی بہاری لڑکی سے شادی کرے گا جو ہر رشتہ لٹا کر آئی ہو۔
جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ چنانچہ پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں
قمر النساء سے اس کی شادی ہو گئی۔

قمرن اس کی خواہش کے مطابق تھی جیسا کہ اس نے سوچا اور چاہا تھا۔ اس کے ماں
باپ' بھائی اس کی آنکھوں کے سامنے ختم کر دیئے گئے تھے۔ یہی نہیں مکتی باہنی کے غنڈوں نے
اسے جی بھر کے پامال بھی کیا تھا۔ وہ عذاب و اذیت کا ایک سمندر پار کر کے یہاں آئی تھی'
عافیت کی تلاش میں اور اسے یہاں آکر نجم الحسن کی پناہ بھی مل گئی تھی۔ اس نے قمرن کے ہر
غم کا مداوا کیا۔ ہر داغ اپنی محبت اور خلوص سے دھو دیا۔ اسے عزت کی روٹی' تن کے لئے اچھے
کپڑے اور روح کے لیے محبت دی۔ قمرن یہ سب کچھ پا کر جیسے جی اٹھی مگر اس کے نزدیک

ابھی ایک کمی تھی۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اپنا گھر نہیں تھا اور قمرن کو سب سے زیادہ آرزو اپنے گھر کی تھی۔

"وہ بھی ہو جائے گا"۔ نجم الحسن اسے دلاسا دیتا۔ "ویسے یہ گھر بھی برا تو نہیں!"

"میں بُرے بھلے کی بات کب کرتی ہوں؟ میرے لئے اپنی جھونپڑی کرائے کے بنگلے سے بڑھ کر ہے"۔

"اللہ کرے گا گھر بھی مل جائے گا ہمیں۔ بس تم خدا کا شکر ادا کرتی رہا کرو"۔

"خدا کا شکر کیسا؟"

نجم الحسن کو قمرالنساء کی یہی ایک بات بہت بری لگتی تھی۔ خدا سے تو جیسے اسے لگاؤ ہی نہیں تھا۔ شکر ادا کرنا تو جانتی ہی نہیں تھی مگر وہ سوچتا کہ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنے مصائب دیکھ کر، سہہ کر آئی ہے، دماغ سنک گیا ہے۔ ویسے اچھی بات یہ ہے کہ ہوس نہیں ہے اسے۔ ورنہ تو عورتیں ہر وقت کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں۔ مانگنے والی زبان کبھی نہیں تھکتی۔

"کیوں...... خدا نے سب کچھ تو دے دیا ہے تمہیں!" اس نے کہا۔

قمرالنساء جھنجلا گئی "کچھ بھی نہیں دیا، ہم سے تو سب کچھ چھین لیا ہے اس نے۔ ماں باپ، بھائی......"

"یہ نہیں سوچتیں کہ تم جہاں سے آئی ہو وہاں زندہ رہنا ممکن ہی نہیں تھا لیکن بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے بڑا تھا، اسی لئے بچ گئیں......"

"ہونہہ!" اس نے نہیں بچایا مجھے"۔ قمرالنساء کے لہجے میں دنیا جہان کا زہر تھا اور سانپوں کی پھنکار اتر آئی تھی "مجھے تو عزت گنوانے کے بدلے زندگی ملی ہے......"

نجم الحسن جانتا تھا کہ یہ زہر آسانی سے نکلنے والا نہیں۔ ہاں، کچھ عرصے بعد اس کی محبت اس زہر ہلاہل کو امرت بنا سکتی ہے۔ بات صرف نعمتوں کا احساس دلاتے رہنے کی تھی۔ اس نے دلیل دینا چاہی "اب تو سب کچھ میسر ہے نا تمہیں!"

"زندگی نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا"۔ قمرن نے پھر زہر اگلا۔

"اچھا یہ بتاؤ، یہ نعمت ہے کہ نہیں؟" اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

قمرن جیسے ایک لمحے میں بدل کر رہ گئی۔ اس نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "جو جانتے ہو وہ پوچھتے کیوں ہو؟"

"تو پھر بتاؤ، یہ نعمت تمہیں کس نے دی؟"

"یہ تو اوپر، بہت پہلے...... پہلے ہی دن میرے نام لکھ دی گئی تھی"۔ اس کے لہجے میں شیرینی اتر آئی "جوڑے تو اوپر بنتے ہیں نا جی!"

"بناتا کون ہے؟ کس نے مجھے تمہارے نام لکھا؟"

قمرن سٹپٹا گئی پھر شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "خدا نے"۔

"تو پھر تم اس کا شکر ادا کیوں نہیں کرتیں؟" نجم الحسن نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی "اس لئے کہ میں تمہیں وہ کچھ نہیں دے سکا جو اوروں کو میسر ہے؟ ریڈیو، ٹی وی، فریج اور بڑا سا مکان......"

قمرن نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ایسا مت کہو، مجھے غلط مت سمجھو۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے سوائے اپنے گھر کے، چاہے وہ کھلے آسمان کے نیچے ہو، بے چھت، بے دیوار ہو، بس میرا گھر ہو"۔

"اللہ کا شکر ادا کرنا سیکھو گی تو وہ بھی مل جائے گا، انشاء اللہ"۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی "ٹھیک ہے، اب سے کوشش کروں گی۔ واقعی ملا تو مجھے بہت کچھ ہے۔ میں بہت ناشکری ہوں نجم۔ بہت بری ہوں میں، اب سے کوشش کروں گی......" وہ دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر رونے لگی۔

نجم الحسن ہولے ہولے اس کے کندھے سہلانے لگا "ارے نہیں میری جان"۔ اس نے بڑے پیار سے کہا "مجھے تمہارے اور اس کے بیچ نہیں آنا چاہئے تھا، تم جانو اور وہ جانے۔ بس اب سمجھا، تم اس سے لڑتی ہو تو پیار میں۔ اس مان کے لئے جو تمہیں اس پر تھا اور تمہیں شاید پتا نہیں، اب بھی ہے......"

نجم الحسن قمرالنساء کو سب کچھ دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی زخم زخم روح کو محبت کے زم زم سے دھو دینا چاہتا تھا۔ اسے قمرن میں ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے بس واجبی سی تعلیم حاصل کی تھی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے کی گفتگو نے اسے ہلا ڈالا تھا۔ قمرن نے جو باتیں کی تھیں وہ کسی پڑھے لکھے کے بس کی بھی نہیں تھیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھی لیکن اس کا سینہ علم زندگی سے معمور تھا۔ زندگی انسان کو جو تعلیم دیتی ہے اس سے شخصیت میں عجیب سا سحر اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی بیوی جاہل نہیں۔

اس نے قمرن کو بتائے بغیر باقاعدگی سے پیسے جمع کرنا شروع کر دیے۔ اسے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی گھر کی صورت میں وہ اسے حیران کر دے گا۔ اس نے باقاعدگی سے اوور ٹائم بھی شروع کر دیا تھا۔ دفتر ہی میں ایک بیسی بھی ڈال لی تھی۔

ایک سال بعد ان کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ نجم الحسن ہمیشہ سوچتا تھا کہ بچوں کے بڑے خوب صورت اور منفرد نام رکھے گا۔ مگر وہ بچی کا نام سوچ ہی رہا تھا کہ قمرن نے فیصلہ بھی کر لیا۔

"یہ زیب النساء ہے"۔ وہ بولی۔

نجم الحسن بھونچکا رہ گیا۔ فرسودہ قرار دے کر اس نام کو بیک جنبش زباں مسترد کر دینا نہایت آسان تھا، بہت ہی آسان۔ مگر اس ایک لمحے میں نجم الحسن نے سوچا کہ یہ خوشیوں سے محروم قمرن کی پہلی سچی خوشی ہے۔ اسے خراب کرنے کے بجائے اس میں اپنی خوشی شامل کر لینا زیادہ بہتر ہے۔ قمرن بڑے غور سے اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نام میں نجم الحسن کو اپنے لئے بھی خوشی مل ہی گئی۔ شاید اس لئے کہ اس کی نیت بڑی کھری تھی۔

"واہ! بہت خوب صورت نام ہے"۔ اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں سچی خوشی
اسے پیار میں زیبا کہیں گے"۔

اس نے قمرن کی آنکھوں میں، اس کے چہرے کو نہیں دیکھا جہاں تشکر کے تا
جھلملا رہے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی خاطر نجم الحسن کی محبت نے ناپسندیدگی کو
میں بدل ڈالا ہے۔ درحقیقت اتنی دیر میں اس نے خود کو اس نام سے دست بردار ہو
لئے ذہنی طور پر تیار بھی کر لیا تھا لیکن نجم الحسن کی محبت نے اسے جتوا دیا۔

زندگی کی گھما گھمی زیب النسا.......... زیبا کے روپ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ
وہ بیٹھی، گھٹنوں چلی، اپنے قدموں پر کھڑی ہوئی اور ہنسنے بولنے، گنگنانے لگی۔ ننھی
سال کی ہو گئی۔ ان تین برسوں میں اس نے ماں باپ کو چھوٹی چھوٹی بے شمار خوشیوں
کر دیا تھا۔ اب تو قمرن کو وہ ایک کمی بھی یاد نہیں رہی تھی جس کا احساس اسے ستاتا
آسمان کے نیچے ہی سہی، ایک گھر کی کمی لیکن نجم الحسن اسے نہیں بھولا تھا۔ اس نے
حاصل کر کے ہی دم لیا۔ وہ کچی آبادی میں ایک کچا مکان تھا۔ اس کے دفتر کے ایک
تھا۔ چپراسی اسے بیچنا چاہتا تھا، نجم الحسن نے وہ مکان فوراً ہی دس ہزار میں خرید لیا۔

"تم بیچ کیوں رہے ہو اپنا مکان؟" نجم الحسن نے چپراسی سے پوچھا تھا۔

"بس یونہی صاحب، ضرورت ہے بیٹی کی شادی کے لئے"۔

"مکان ہے کہاں؟"

"چاندنی چوک ہے نا صاحب.........."

"ناظم آباد کے علاقے میں؟"

"ہاں صاحب، چاندنی چوک کے بس اسٹاپ سے ایک سڑک اندر جاتی ہے۔ کچھ
کر وہ سڑک بائیں جانب مڑتی ہے.........."

"لیکن اس قبضے کی کوئی قانونی حیثیت تو نہیں"۔ نجم الحسن نے اعتراض کیا"
جب چاہے مکان گرا دے"۔

"ہر بستی اسی طرح بستی ہے صاحب۔ لوگ جگہ گھیر لیتے ہیں، جب کوئی نئی حکو
ہے یا پرانی حکومت کو کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو کچی بستیوں کو لیز دے دی جاتی ہے۔
ہوتا تو میں دس ہزار میں کبھی دیتا بھی نہیں صاحب"۔

نجم الحسن پڑھا لکھا آدمی تھا اور پڑھے لکھے شریف لوگ قانون سے بہت ڈر
کچی آبادی اور اس میں بنے ہوئے مکان کی قانونی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ نجم الحسن
جیسے اس نے پانی پر بنا ہوا مکان خرید لیا ہو۔ حکومت کی مشینری حرکت میں آئی تو مکان
جیسے ڈوب گئے۔ وہ اپنے گھر کی بنیاد پانی پر نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن قمرن کے خواب کو
کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ قمرن کی خوشی کے سامنے دس ہزار رو
جو کھم بہت حقیر معلوم ہوا۔ اس نے سوچا، میں قمرن کو گھر دے رہا ہوں۔ اب یہ

نیب کہ یہ گھر اسے کتنے عرصے کے لئے ملتا ہے اور کون جانے یہ مکان قمرن کا مستقل ہی
گھر ہو۔

"تم آج مجھے چل کر مکان دکھا دو"۔ اس نے چپراسی سے کہا۔

اس روز اوور ٹائم کرنے کے بجائے وہ چپراسی کے ساتھ چلا گیا۔ مکان دیکھنا تو بس ایک
رسم تھی۔ قمرن کہتی تھی کہ میرے لئے اپنی جھگی کرائے کے بنگلے سے بڑھ کر ہے اور یہ کہتے
ہوئے اس کے لہجے میں بلا کی سچائی ہوتی تھی۔ اسے تو بس ایک ٹھکانا درکار تھا، جسے وہ گھر کہہ
سکے۔

اس نے وہ مکان دیکھا، چھوٹا سا کچا مکان جس میں چھت بھی تھی اور کھلا آسمان بھی۔
دیواریں بھی تھیں اور دروازہ بھی جس میں تالا بھی لگتا تھا۔ نجم الحسن کو مکان اچھا لگا۔ اس نے
فوراً بیعانہ ادا کیا اور چابی لے لی۔ اگلے روز پوری ادائیگی کے بعد وہ غیر قانونی مکان قانونی طور
پر اس کا ہو جاتا۔

بند مٹھی میں مکان کی چابی چھپائے وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ قمرن
کو اسے دیکھتے ہی احساس ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔

"کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہے ہو؟" اس نے پوچھا "اور آج گھر بھی جلدی آ گئے
ہو"۔

"میں کہاں خوش ہوں، جانو گی تو خوشی تو تمہیں ہوگی۔ بوجھو تو ایسی کون سی بات ہو سکتی
ہے؟" نجم الحسن نے کہا۔

"میں ناشکری سب کچھ ملنے پر بھی کب خوش ہوں!" قمرن نے سرد آہ بھر کر کہا "میری
خوشی اتنی آسان نہیں"۔

نجم الحسن نے ہنستے ہوئے دونوں بند مٹھیاں اس کے سامنے کر دیں۔ ننھی زیبا حیرت
سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ آج ابا نے اسے گود میں اٹھا کر پیار بھی نہیں کیا تھا "دیکھو قمرن، کسی
ایک مٹھی میں تمہارے ایک خواب کی تعبیر ہے۔ بتاؤ تو کون سی مٹھی ہے وہ؟"

قمرن اور اداس ہو گئی "میرے پاس بہت سے خواب کہاں؟ یہ تو دو آنکھیں ہیں۔ میری
ہزار آنکھیں ہوتیں تو بھی ایک ہی خواب دیکھتیں، اور اس خواب کی تعبیر اتنی آسانی سے نہیں
مل سکتی"۔

"مل سکتی ہے، تم بوجھو تو!"

قمرن کے ہونٹوں پر ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے شوہر کی داہنی مٹھی
کو دونوں ہاتھوں میں بھر لیا اور اسے آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ "یہ مٹھی خالی بھی ہو گی تو
میرے لئے خزانوں سے کم نہیں ہے، سچ کہہ رہی ہوں"۔

نجم الحسن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے کیسا کھیل کھیلا تھا۔ وہ
باعثِ آزار بھی ہو سکتا تھا۔ قمرن اب اس کی بند مٹھی کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مٹھی

کھلی اور چابی زمین پر گر پڑی۔ قمرن نے حیرت سے جھک کر چابی اٹھالی اور اسے غور سے
لی۔

"سائیکل خریدا ہے تم نے؟" اس نے پوچھا۔

نجم الحسن نے نفی میں سرہلا دیا۔

"پھر یہ کیا ہے؟"

"یہ........ یہ........" نجم الحسن سے بولا نہیں جا رہا تھا "یہ........ تمہارا........
ہے"۔ اس نے بمشکل کہا۔

"ایسا مذاق مت کرو نجمی"۔ قمرن نے کہا اور بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے
اسے روتے دیکھ کر زیبا بھی رونے لگی۔

"ارے........ ارے........ یہ کیا کرتی ہو پگلی!" نجم الحسن بوکھلا گیا "خوشی کے م
روتی ہو؟ دیکھو' زیبا بھی رو رہی ہے۔ یہ تو بہت بری بات ہے' پھر ناشکرا پن........"

"تو........ تو کیا سچ مچ؟" قمرن رونا بھول گئی۔

"ہاں۔ یہ تمہارے گھر کی چابی ہے جو تمہارا رستہ تک رہا ہے"۔

اب قمرن سکتے کی سی کیفیت میں چابی کو گھورے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس ے
ملے "تو کیا سچ مچ........؟ کیسے ہوا یہ؟"

نجم الحسن نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ ذرا دیر میں فضا بدل گئی۔ وہ تینو
رہے تھے۔

"تم نے دیکھا ہے میرا گھر؟" کچھ دیر بعد قمرن نے پوچھا۔

"ہاں' وہیں سے آرہا ہوں میں"۔

"تو مجھے بھی لے چلو"۔

"اس وقت؟" نجم الحسن نے گھڑی دیکھی' آٹھ بج رہے تھے۔

"ہاں' اپنے گھر تو آدمی کسی بھی وقت جا سکتا ہے"۔

"ہاں یہ تو ہے لیکن اس وقت کیا ضروری ہے' کل چلی چلنا"۔

"نہیں' میں تو ابھی چلوں گی"۔ قمرن نے کہا اور اپنی ریزگاری کے ڈبے میں جا
ٹھن ٹھن کرنے لگی۔ پھر وہ کچن کی طرف گئی' واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک پو
"چلو' بس چل دو"۔ اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

وہ زیبا کی انگلی تھام کر باہر آگیا۔ قمرن اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے درواز
تالا ڈالا اور انہیں لے کر مین روڈ کی طرف چل دیا۔ جیب میں کافی پیسے تھے چنانچہ اس
روک لیا۔ کچے مکان کے سامنے رکشے سے اُترے۔

"یہ ہے تمہارا گھر"۔ اس نے بھیگی بھیگی آواز میں قمرن سے کہا۔

قمرن کچھ دیر دروازے کو دیکھتی رہی پھر اس نے شوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا "یہ

وازہ کھولو"۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں' تالا تم ہی کھولو گی۔ اپنے گھر میں سب سے پہلے تم ہی قدم رکھو گی۔ چلو تالا
ولو"۔

علاقے میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ نجم الحسن کو اپنی بے پروائی پر
وس ہونے لگا۔ کاش وہ ٹارچ ہی لے کر آتا ساتھ۔ قمرن جھک کر تالے میں چابی لگانے کی
شش کر رہی تھی لیکن وہ لگ نہیں پا رہی تھی۔

"سنو' میرے چابی والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دو"۔ اس نے لرزیدہ آواز میں نجم الحسن
ے کہا۔

نجم الحسن نے جھک کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیا تو اسے احساس ہوا کہ
ن پوری جان سے کانپ رہی ہے "ارے تم سے تو اپنے گھر کا تالا ہی نہیں کھل رہا ہے"۔
ا نے قمرن کو چھیڑا۔

"تم نہیں جانتے نجمی! تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ گھر مجھے بہت جلدی' بہت آسانی سے
گیا ہے نا۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا"۔

نجم الحسن کے ہاتھ کے سہارے نے تالا کھلوا دیا۔ قمرن نے لرزتے ہاتھوں سے کنڈی
لی اور بڑی نرمی' بڑی آہستگی سے دروازے کو پیچھے دھکیلا' دونوں پٹ کھل گئے۔ گھر کا چھوٹا
آنگن ان کے لئے بانہیں کھولے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے کچی دیواروں اور چھت کا ایک کمرا
ر رہا تھا۔ وہ دیر تک کھڑے سامنے کی سمت تکتے رہے جیسے کوئی بہت خوب صورت منظر
وں کے روبرو ہو۔ ننھی زیبا بھی خاموش تھی' گویا وہ بھی ان لمحوں کی اہمیت سے واقف ہو۔

"چلو نا........ اندر چلو"۔ آخر کار نجم الحسن نے کہا۔

"ہم تینوں ساتھ ہی چلیں گے"۔ قمرن بولی۔

"نہیں' یہ تمہارا خواب ہے' اس گھر میں پہلا قدم تمہارا پڑے گا"۔

"خواب تو میرا تھا لیکن تعبیر ہم تینوں کی........ نہیں چاروں کی ہے"۔ وہ کہتے کہتے
ا گئی۔ اس کی نگاہیں اپنے پیٹ کی طرف جھک گئیں "ہم سب ایک ساتھ اس گھر میں قدم
یں گے۔ آؤ' پہلے سیدھا پاؤں بڑھانا اور بسم اللہ پڑھنا........"

وہ اس طرح گھر میں داخل ہوئے کہ زیبا بیچ میں تھی۔ ایک طرف سے اس نے باپ کی
دوسری طرف سے ماں کی انگلی تھامی ہوئی تھی۔

"ٹھہر جاؤ"۔ اندر داخل ہوتے ہی قمرن نے کہا۔ اس نے اپنی پوٹلی کھولی' اس میں پانچ
یاں تھیں اس نے وہ روٹیاں دروازے کے داہنی چوکھٹ کے ساتھ دیوار سے لگا کر رکھ
ا۔ پھر اس نے پانچ چونیاں نکالیں اور انہیں بائیں چوکھٹ کے ساتھ رکھ دیا۔

"یہ کیا ٹونا کر رہی ہو؟" نجم الحسن نے کہا۔

"یہ گھر کی خیر و برکت کے لئے ہے۔ بزرگ کہتے ہیں........"

"میں سوچتا ہوں جاکر موم بتیاں لے آؤں لیکن تمہیں........"

"تو لے آؤ نا!"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر........"

"جاؤ موم بتیاں لے آؤ"۔ قمرن نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن یہ اجنبی جگہ ہے۔ تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟"

"اجنبی جگہ؟ ارے........ یہ گھر ہے میرا۔ اپنے گھر میں بھی کسی کو ڈر لگتا ہے! جاؤ بتیاں لے آؤ۔ اچھا ہے، ہم پہلی ہی رات اپنے گھر میں روشنی کر لیں، اندھیرا نہیں ہونا چا جاؤ"۔

نجم الحسن گھر سے نکل آیا۔ دکان کی تلاش میں پہلی بار اس نے بستی کا جائزہ لیا۔ سی گلیاں تھیں۔ بے ترتیب کچے مکانات تھے۔ کہیں ایک آدھ پکا مکان بھی تھا اور کہیں جھونپڑیاں بھی تھیں۔ کچھ آگے جا کر اسے ایک دکان نظر آئی جو ایک کچے مکان کا ہی تھی۔ وہ موم بتیاں لے کر واپس آیا تو قمرن گھر کا جائزہ لیتی پھر رہی تھی۔ ننھی زیبا انگلی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"گھر تو بہت اچھا ہے"۔ قمرن نے چہک کر کہا۔ "میں نے ایک ایک کو لیا........"

"اتنے اندھیرے میں!"

"تمہیں کیا پتا، میری آنکھوں کی روشنی کتنی بڑھ گئی ہے"۔

نجم الحسن نے ایک موم بتی جلائی۔ پھر سگریٹ سلگائی۔

"آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں دکھاؤں"۔ قمرن نے اس سے کہا۔ وہ موم بتی ہا لئے اسے ایک ایک کونا دکھاتی پھری۔ نجم الحسن سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اس کے تبصرے سے بھی لطف لیتا رہا "میں دیواروں اور فرش کو روز مٹی سے لیپا کروں گی"۔

وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی "تم دیکھنا، لپائی کے بعد کیسی سوندھی سوندھ اٹھا کرے گی۔ گھر کیسا جگمگ جگمگ کرے گا۔ آنگن بہت ہوادار ہے۔ گرمیوں میں آجائیں گے۔ دو چارپائیاں ڈالا کریں گے آنگن میں، اور اس دیوار کے ساتھ میں کیاری گی۔ موتیا، چنبیلی اور گلاب لگاؤں گی، اور ہاں، رات کی رانی بھی۔ تم نے اتنی محنت رات ایک کئے اور مجھے گھر دیا تو اب اسے جنت بنتے بھی دیکھنا"۔

وہ کہتی رہی، نجم الحسن سنتا اور خوش ہوتا رہا۔ قمرن کا یہ لب و لہجہ اس کے لئے اس کی خوشی اس کی روح تک کو مسرور کر رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے لی ہے۔

"اب چلو بھی قمرن!" آخر کار اس نے کہا "ہمیں گھر بھی پہنچنا ہے"۔

"گھر؟" وہ جیسے خواب سے چونک اٹھی۔ "گھر میں ہی تو ہیں ہم........ جانا ضر

یا........؟"

"نہیں تو سوؤ گی کہاں؟"

"یہیں آنگن میں، زمین پر، کھلے آسمان کے نیچے"۔ وہ گنگنائی "یہ اپنا گھر ہے، اپنا"۔

وہ سنجیدہ تھی۔ نجم الحسن نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا۔ "ارے یہ تمہارا اپنا گھر ہے، پندرہ بیس دن کی ہی تو بات ہے، پھر ہم یہیں آجائیں گے۔ اب بچی تو نہ بنو"۔

"پندرہ بیس دن؟ وہ کیوں؟" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"ارے بھئی اب اس حالت میں تو تم سامان ڈھونے سے رہیں! زچگی سے نمٹ لو لے"۔ نجم الحسن نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق بچے کی پیدائش میں رف پانچ چھ دن باقی تھے۔

"نہیں، ہرگز نہیں ہم صبح ہی اپنا سامان یہاں لے آئیں گے"۔ قمرن نے فیصلہ سنایا یں اپنے گھر سے ایک پل بھی دور نہیں رہوں گی، اور سنو جی، میں یہیں سے اسپتال جاؤں گی بچے کو لے کر یہیں واپس آؤں گی۔ میرا یہ بچہ بے گھر نہیں ہوگا، گھر والا ہوگا"۔

"کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"بچوں جیسی باتیں! جانتے ہو جب بنگلہ دیش بن رہا تھا تو کتنی ہی بھاری حاملہ عورتوں نے عہد کر لیا تھا کہ غلام سرزمین پر بچہ نہیں جنیں گی۔ عورت آمادہ نہ ہو تو بچہ ہوتا بھی نہیں ہے لیکن عورت کی جان بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ کتنی ہی عورتیں اپنے بچے سمیت مر گئیں لیکن انہوں نے اپنی ضد پوری کی۔ خدا کا شکر ہے، میں تو آزاد زمین پر ماں بنی۔ اب اس کی حمت سے میرا دوسرا بچہ اپنے گھر میں آنکھیں کھولے گا۔ اپنے گھر کے آنگن کی مٹی چاٹے ا۔ میں گھر ہوتے ہوئے اسے بے گھری کیوں دوں؟"

"لیکن قمرن........"

"لیکن ویکن کچھ نہیں"۔ قمرن کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "اگر تمہیں دفتر سے چھٹی یں ملتی ہے تو نہ ملے۔ میں خود سب سامان اٹھوا لاؤں گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو"۔

نجم الحسن جانتا تھا کہ اب اسے نہیں سمجھا سکتا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس بار قمرن کا یس پیچیدہ ہے۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھتا رہتا تھا اور ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ اچھی علامت نہیں۔ یسے میں ذرا سی بھی بے احتیاطی خدانخواستہ مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا اگلے روز تر جا کر دس دن کی چھٹی کی درخواست دے گا اور واپس آکر شفٹنگ کا بندوبست کرے گا۔ مان نہ تو ان کے پاس زیادہ تھا، نہ ہی بھاری تھا، دو مزدور کافی تھے۔ اس کے پاس ابھی دو ہزار وپے پڑے تھے۔ پیسے کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

واپس پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا۔ نجم الحسن کو فوراً ہی نیند آگئی۔ آدھی رات کے ریب اس کی آنکھ کھلی تو قمرن کی آواز سنائی دی "اللہ تیرا شکر ہے، اللہ تیرا شکر ہے........" وہ لسل ایک جملے کی گردان کئے جا رہی تھی۔

"قمرن.......... قمرن.........." نجم الحسن نے اسے پکارا۔
لیکن وہ گہری نیند میں تھی۔ حالانکہ وہ اتنی گہری نیند کبھی نہیں سوتی تھی۔ اس کی اک
آواز پر جاگ اٹھتی تھی مگر اس وقت وہ اس کی ہر پکار سے نہ سننے کے فاصلے پر تھی۔ اس کی
آواز شکر کے بے پایاں جذبے میں بھیگی ہوئی تھی اور وہ بس یہی کہے جا رہی تھی۔ "اللہ تیرا شکر
ہے' اللہ تیرا شکر ہے.........."

نجم الحسن کے دل سے بھی بے ساختہ یہی آواز اٹھی "اللہ تیرا شکر ہے۔ تو نے میری
بیوی کو بھی شکر کی توفیق دی"۔ وہ بہت خوش تھا۔ بے وقت آنکھ کھلنے پر اسے وہ خوشی ملی تھی
جس کے لئے وہ چار سال سے ترس رہا تھا۔ شاید وہ دن ہی بہت اچھا تھا۔ جاگتے میں ناشکرا پن
کرنے والی قمرن سوتے میں بھی شکر ادا کر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر بستر پر آلیٹا۔
قمرن اب بھی اللہ کا شکر ادا کئے جا رہی تھی۔ پھر اسی شکر نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔

دفتر سے اسے دس دن کی رخصت مل گئی۔ اس نے اس سے پہلے کبھی چھٹی مانگی
نہیں تھی۔ شام تک وہ اپنا سامان نئے گھر میں قرینے سے رکھ چکے تھے۔ قمرن لمحے بھر کو
نہیں بیٹھی تھی' کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہی تھی۔ اس نے نجم الحسن سے کھدائی کروا کے کیاری
بنوائی تھی اور اب بیٹھی کھرپی سے مٹی کو برابر کر رہی تھی' "اب تم مجھے کھاد لا کر دو اور
پودے بھی' ایک موتیا کا' ایک چنبیلی کا اور ایک گلاب کا"۔ اس نے کہا۔

"اچھا لے آؤں گا"۔ نجم الحسن نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ تھکن سے اس کا برا حال
رہا تھا۔

"لے آؤں گا نہیں' ابھی لاؤ اور ہاں قیمہ بھی لے آنا۔ ساتھ ہی ہری مرچیں اور
بھی"۔

"اب چھوڑو نا۔ اتنی تھکی ہوئی ہو۔ ہوٹل سے لے آؤں گا کھانا"۔

"بس ایک وقت ہوٹل کا کھالیا' بہت کافی ہے۔ اس وقت تو میں قیمہ بھون کر روٹی ڈال
لوں گی۔ جاؤ سستی مت کرو"۔

نجم الحسن نے اٹھتے ہوئے انگڑائی لی اور گھر سے نکل آیا۔ وہ دن اور اگلے چار دن
سب کی زندگی کے خوش گوار ترین دن تھے۔ انہوں نے کچھ ضروری خریداری کی۔ ساتھ مل
ہر کام کیا۔ دیواریں اور فرش لیپا' پودے لگائے اور انہیں پانی دیتے رہے۔ نجم الحسن نے
بار کچن کے کاموں میں بھی قمرن کا ہاتھ بٹایا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس قدر مکمل طور پر
ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ ایک ایک لمحے سے محظوظ ہوتے رہے۔ وہ اپنے آپ میں' ایک دوسرے
میں یوں مگن ہوئے کہ انہیں پڑوسیوں سے ملنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

برابر والی بیوہ خود ہی ان سے ملنے چلی آئی' اس کی عمر پینتالیس پچاس کے درمیان
وہ موٹی تازی اور بہت خوش مزاج عورت تھی۔ اس کا نام صغریٰ تھا۔ وہ ان سے بہت
طرح ملی اور بہت خوش ہوئی۔

"میں تمہارے داہنے ہاتھ والے مکان میں رہتی ہوں"۔ اس نے کہا "کسی چیز کی
ضرورت ہو' کوئی بات ہو تو بے تکلف دروازہ کھٹکھٹا دینا"۔

وہ ضرورت اگلی صبح ہی پڑ گئی۔ دس بجے کے قریب قمرن کو درد اٹھا۔ پچھلی بار ڈاکٹر نے
کہا تھا' اس ہفتے میں جب بھی درد اٹھے فوراً اسپتال آجانا۔ تو اب انہیں عباسی شہید اسپتال جانا
تھا۔ مسئلہ بچی زیبا کا تھا۔ قمرن نے کہا کہ.......... زیبا کو صغریٰ خالہ کے ہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

"ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ' بچی کو میں سنبھال لوں گی"۔ صغریٰ خالہ نے کہا۔

زیبا ابھی پڑوسن سے مانوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ نجم اور قمرن
نے اسے سمجھایا۔ صغریٰ نہ جانے کہاں سے پلاسٹک کے کھلونے لے آئی اور اسے بہلانے لگی۔
بڑی مشکل سے وہ گھر سے نکل آئے۔ لیکن ان کا دل زیبا میں ہی اٹکا رہا۔ قمرن کے درد میں
اضافہ ہو گیا تھا لیکن انہیں چوک تک پیدل ہی جانا پڑا۔ چوک سے انہوں نے عباسی شہید اسپتال
کے لئے ٹیکسی کی۔ ہر چند کہ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ قمرن کا یہ حال تھا کہ چیخیں ضبط کرنے کی
کوشش میں وہ اپنا ہاتھ چبائے ڈال رہی تھی۔ اسپتال پہنچتے ہی قمرن کو فوراً لیبر روم میں لے جایا
گیا۔ نجم الحسن باہر ٹہلتا' ایک ایک پل شمار کرتا رہا۔ دو گھنٹے بعد ڈاکٹر باہر آئی۔ وہ دو گھنٹے اس
کے لئے ایک طویل عمر کے برابر تھے۔

"دیکھئے بلڈ پریشر بہت ہائی ہے"۔ ڈاکٹر نے اسے قریب بلا کر کہا "کیس کافی سیریس ہے۔
میں یہ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں۔ یہ لے آئیے جلدی سے"۔ اس نے دواؤں کا پرچا اسے
تھما دیا۔

نجم الحسن نے اسپتال کے قریب ہر میڈیکل اسٹور دیکھ لیا لیکن وہ دوائیں نہیں ملیں۔
ایک میڈیکل اسٹور والے نے کہا۔ "یہ دوائیں آج کل شارٹ ہیں۔ آپ ایسا کریں' صدر
چلے جائیں۔ وہاں مل جائیں گی"۔ اس نے صدر کے لئے رکشا کر لیا۔

نجم الحسن کو صدر کے ایک میڈیکل اسٹور سے دوائیں تو مل گئیں لیکن اسپتال جانے
کے لئے کوئی رکشا ٹیکسی والا تیار نہیں تھا۔ بسیں بھی بند ہو گئی تھیں۔ افواہ تھی کہ ناظم آباد کے
علاقے میں زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے۔ وہ دواؤں کا شاپنگ بیگ ہاتھ میں لئے حیران پریشان کھڑا
تھا۔ اسے اسپتال سے نکلے دو گھنٹے ہو چکے تھے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دوائیں جلدی لے آؤ۔ اب
دوائیں مل گئی تھیں تو ٹرانسپورٹ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فکر میں تھا کہ نہ جانے قمرن کا کیا
حال ہو گا۔ آخر کار منت سماجت کے بعد ایک خدا ترس بوڑھا رکشا والا اسے لے جانے پر آمادہ
ہوا۔

وہ لسبیلہ پہنچے تو پتا چلا کہ پل سے آگے راستہ بند ہے' ہنگامہ شدید ہے۔ آنسو گیس کے
اثرات یہاں تک محسوس ہو رہے تھے۔ رکشے والے نے رکشا داہنی سمت موڑ کر تین ہٹی کی
طرف دوڑا دیا۔ نجم الحسن اس وقت مجسم دعا بنا ہوا تھا۔ اندیشوں کے بوجھ سے اس کا دماغ سن
ہو رہا تھا۔ نگاہوں میں قمرالنساء کی صورت تھی۔ لیاقت آباد ڈاک خانے تک معاملہ ٹھیک ٹھاک

تھا البتہ...... جا بجا پولیس کی نفری اور گاڑیاں نظر آرہی تھیں لیکن ڈاک خانے اور دس نمبر کے درمیان سڑک پر اچانک ہنگامہ شروع ہو گیا' اب نہ واپسی کا راستہ تھا نہ دائیں بائیں مڑنے کا۔

"صاحب' اب میں کچھ نہیں کر سکتا"۔ رکشا ڈرائیور نے کہا۔ "اب آپ گلیوں میں سے نکل کر ناظم آباد پہنچنے کی کوشش کرو"۔

نجم الحسن نے بے حد ممنونیت سے اسے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس رکشا ڈرائیور کا احسان وہ کبھی نہیں چکا سکے گا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسے اسپتال پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی۔ اللہ تمہیں اس کی جزا دے"۔ اس نے رکشا کا کرایہ دیا اور آگے بڑھا۔

وہاں تو جیسے حشر برپا تھا۔ آنسو گیس کے شیل پھینکے جا رہے تھے۔ پولیس نے لاٹھی چارج بھی شروع کر دیا تھا۔ لوگوں کو منتشر ہونے کی وارننگ بھی دی جا رہی تھی۔ ہر طرف شور و غل تھا۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ اندھا دھند گلیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ وہ دواؤں کا شاپنگ بیگ سینے سے لگائے بھیڑ میں راستہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنسو گیس سے اس کی آنکھوں' ناک اور حلق میں جلن ہو رہی تھی۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔ وہ داہنی سمت مڑنے والی پہلی گلی سے کچھ دور تھا کہ اس کے سر پر لاٹھی لگی۔ اس نے چکرا کر گرتے گرتے خود کو سنبھالا۔ اسے اسپتال پہنچنا تھا اور گرنے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا۔

"خدا کے لئے...... مجھے راستہ دو' مجھے جانے دو' مجھے مت مارو۔ میری بیوی اسپتال میں......" وہ دیوانوں کی طرح چلانے لگا پھر نعروں کی گونج میں اس کے سر پر دوسری لاٹھی لگی۔ اس بار وہ آنسو گیس کی جلن سے بے نیاز ہو گیا کیونکہ اس کی آنکھوں میں خون بھر گیا تھا۔ سر میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ناقابل بیان اذیت تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس ہنگامے میں کوئی اس کی پکار' اس کی فریاد نہیں سنے گا...... کوئی نہیں سنے گا' سوائے خدا کے! سو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا رہا۔ وہ اندازے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنی دانست میں وہ گلی میں مڑ گیا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ لوگوں کے دھکوں نے اس کا رخ کس حد تک تبدیل کر دیا ہے' درحقیقت وہ اب بھی مین روڈ پر ہی تھا۔ خون کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے توانائی اور دماغ سے ہوش و حواس بھی رخصت ہو رہے تھے۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ لرزتی ٹانگوں نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔

"اے اللہ! وہ ڈوبتی آواز میں چلایا "اے اللہ میری مدد کر...... مجھ پر رحم کر۔ اے اللہ! اے اللہ"۔ بے ہوش ہو کر گرنے تک وہ یوں ہی پکارتا رہا۔ ایمبولینس اس کے قریب آکر رکی۔ اسے ایمبولینس میں ڈالا گیا لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

اسے ہوش آیا تو چیخ پکار کا وہی عالم تھا' لگتا تھا' وہ وہیں لیاقت آباد کی سڑک پر پڑا ہے۔ لیکن دواؤں کی مخصوص بو بتاتی تھی کہ وہ اسپتال میں ہے اور بینچ پر لیٹا ہوا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا "میں کہاں ہوں؟ خدا کے لئے مجھے عباسی شہید اسپتال لے چلو"۔

ایک شیریں آواز نے جواب دیا "تم عباسی شہید میں ہی ہو اس وقت"۔

اس کے جسم میں جیسے بجلی سی بھر گئی' وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ کسی نے دھکیل کر اسے پھر لٹا دیا "کہاں جا رہے ہو؟"

کسی نے سرگوشی میں کہا "سر کی چوٹ ہے نا' دماغ کے لئے خطرناک بھی ہو سکتی ہے"۔

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے"۔ وہ پاگلوں کی طرح چلایا اور پھر اٹھنے لگا۔

"تم جا کہاں رہے ہو؟" پہلی آواز نے پوچھا۔

"میٹرنٹی وارڈ...... لیبر روم"۔

"دماغ پر اثر ہو گیا ہے"۔ ایک سرگوشی ابھری۔

"میرے دماغ کو کچھ نہیں ہوا ہے"۔ وہ پھر چلایا "میری بیوی لیبر روم میں تھی"۔ پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ "ارے میری دوائیں کہاں ہیں؟ میں قمرن کے لئے دوائیں لے کر آیا تھا' مجھے وہ دوائیں پہنچانی ہیں"۔

"سنو! تم بہت زخمی ہو۔ اس وقت دماغ پر زور مت دو"۔

پہلی آواز نے کہا "ہم تمہاری بیوی کے متعلق معلوم کرا لیں گے"۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے "خدا کے لئے میری آنکھیں تو صاف کرو۔ شاید خون کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا مجھے......"

"آنکھیں تو تمہاری صاف کر دی گئی ہیں شاید سر کی چوٹ کی وجہ سے روشنی کم ہو گئی ہے۔ ہم ٹسٹ کرتے ہیں......"

لیکن اس وقت اسے قمرن کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی "جہنم میں گئیں آنکھیں' مجھے لیبر روم لے چلو"۔

"سنو ہم تمہاری بیوی کے متعلق معلوم کرا دیں گے۔ تمہیں آرام کی...... علاج کی ضرورت ہے۔ سر کی چوٹ تمہاری بینائی پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ہمیں معائنہ کرنے دو پلیز"۔ پہلی مہربان آواز نے کہا۔

"نہیں۔ پہلے قمرن...... میں بالکل ٹھیک ہوں"۔

پہلی آواز نے کسی سے کہا "ٹھیک ہے' اسے لیبر روم لے جا کر بیوی دکھا دو اور ساتھ ہی واپس لے آنا"۔

اب تیسری آواز سنائی دی۔ جھنجلاتی ہوئی آواز "یہاں کہرام مچا ہوا ہے' ڈاکٹر۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بے کار کے نخرے۔ زخمی ہیں کہ آئے چلے جا رہے ہیں اور آپ مجھ سے کہتے ہیں......"

"جاؤ' لے کر جاؤ اسے اور ساتھ ہی واپس لانا"۔ پہلی آواز نے سخت لہجے میں کہا۔
کسی نے بڑی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹ کر اسے لے چلا۔ راستے میں وہ کئی لوگوں سے ٹکرایا۔

"رک جاؤ یہیں' لیبر روم آگیا" نئی آواز نے بے زاری سے کہا۔
"اپنی بیوی کا نام بتاؤ' میں پوچھ کر آتا ہوں"۔
"قمرن.......... قمرالنسا"۔
"یہیں کھڑے رہو' میں ابھی آیا"۔

انتظار کے ان لمحوں میں بھی حقیقت اس پر نہیں کھلی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں سر سے بہہ کر آنے والا خون بھرا ہوا ہے۔ اسے فکر تھی تو قمرن اور نومولود کی۔ اب تک اسے ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ زیبا کو روتا چھوڑ کر آیا ہے۔ بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ قریب آکر رک گئی اور ہمدردانہ لہجے میں کہا گیا "ڈاکٹر شبانہ خود آئی ہیں تمہیں بتانے"۔

"آئی ایم سوری مسٹر نجم"۔ جانی پہچانی آواز سنائی دی "آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا لیکن مجھے افسوس ہے' میں دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں بچا سکی۔ شاید.......... شاید دوائیں مل جاتیں تو.........."

نجم الحسن کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھے گیا اور چند لمحوں بعد ہوش و حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ہوش آیا تو وہ بستر پر تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ قمرن مر چکی ہے اور اس کا نومولود بیٹا بھی مر چکا ہے۔ اسے جا کر انہیں دیکھنا ہے۔ ان کی تدفین کا بندوبست کرنا ہے۔ پھر اسے زیبا کا خیال آیا۔ معاً اسے تاریکی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن بے سود.......... اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔
"م.......... مجھے.......... مجھے کچھ نظر نہیں آرہا"۔
کچھ دیر خاموشی رہی پھر جواب ملا "مجھے افسوس ہے۔ سر کی چوٹ آپ کی بینائی لے گئی ہے"۔

اس کے سارے وجود میں سناٹے سے تیر گئے' اس نے سوچا' ہر کوئی اظہار افسوس کر رہا ہے' مجھے افسوس ہے' میں دونوں میں سے ایک کو بھی نہ بچا سکی۔ مجھے افسوس ہے' آپ دیکھ نہیں سکتے.......... تو میں اندھا ہو گیا؟ میری دنیا اندھیر ہو گئی؟ میرا سب کچھ لٹ گیا؟ اب ننھی زیبا کی سوا کچھ بھی نہیں ہے' میرے پاس.......... وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔
"کہاں جا رہے ہو؟" کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
"مجھے بہت کام کرنے ہیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا "مجھے اپنی قمرن کو اور اپنے بچے

کو گھر لے جا کر جانا ہے پھر انہیں رخصت کرنے کا بندوبست کرنا ہے۔ بہت کام ہیں مجھے' میرے پاس یہاں لیٹنے کی فرصت نہیں.........."
"لیکن اس حال میں.........."
"مجھے تو جو ہونا تھا' ہو چکا۔ اب اور کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا ذرا دیر رک جاؤ" ڈاکٹر نے کہا "میں ایمبولینس منگواتا ہوں۔ تمہیں اپنی بیوی اور بچے کی لاش کو اسی میں لے جانا ہوگا۔"

کچھ دیر بعد وہ ایمبولینس میں چادروں میں لپٹی ہوئی لاشوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اس کے کچے مکان کے سامنے رکی تو سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اب اسے روشنی کی ضرورت تھی نہ پروا۔ وقت جیسے ساکت ہو گیا تھا ہر چیز ٹھہر گئی تھی۔ بس اس کے وجود میں ایک مشین سی تھی جو چل رہی تھی اور اسے چلا رہی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ لوگ اس سے تعزیت کرنے لگے۔ جوان بیوی کی بے وقت موت پر اظہار افسوس کرنے لگے لیکن وہ خاموش تھا' اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ قبرستان جاتے ہوئے وہ کبھی بیوی کے جنازے کو کندھا دیتا اور کبھی بچے کو ہاتھوں پر اٹھا لیتا۔ کسی نے اس کے کندھے تھامے ہوئے تھے۔

تدفین کے بعد واپس آتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' اچھا ہی ہوا کہ آنکھیں چھن گئیں۔ میں نے قمرن کو مرنے کے بعد نہیں دیکھا۔ اب عمر بھر میرے تصور میں جیتی جاگتی قمرن چھم چھم کرے گی اور بیٹے کا دکھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو جیسے تھا ہی نہیں۔ میں نے اسے دیکھا جو نہیں' چلو اچھا ہوا۔ آنکھیں ہوتیں تو کیا اچھا ملتا دیکھنے کو..........

اور وہ ایسا اندھا تھا' جسے قدرت نے قسمت کی اس محرومی پر ماتم کرنے کی' خود کو آہستہ آہستہ اس محرومی کا عادی بنانے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ اسے تو اندھا ہونے کے محض چند گھنٹے بعد اپنی بیوی کے.......... اپنے نومولود ان دیکھے بیٹے کے جنازے کو کندھا دینا پڑا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا' میرے لئے اندھے پن کی زندگی کچھ مشکل نہیں ہوگی۔ میں نے تو پہلے ہی دن بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔

رسم دنیا کے مطابق ایک پڑوسی نے موت کے گھر کے لئے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو اس کی دل جوئی کرنے.......... اسے کھلانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ انہیں جھڑکتا رہا۔ زیادہ اصرار پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ "نہیں چاہئے مجھے کسی سے کچھ۔" وہ چلایا "ہمدردی بھی نہیں چاہئے۔"

لوگ ایک دوسرے کو اشارے کرتے رہے۔ دبی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ ایک دن میں اتنے صدمے! دماغ الٹ گیا ہے بے چارے کا۔ اللہ صبر دے گا ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک صغریٰ تھی جس سے وہ بات کر رہا تھا اس کا تو احسان تھا اس پر۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا

تھا کہ زیبا کو کیسے سمجھائے گا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ننھی بچی پر کیا گزر رہی ہے۔ لیکن زیبا نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی وجہ وہ سمجھ نہیں پایا۔ صغریٰ نے بہت اچھی طرح زیبا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی روئے گی' ضد کرے گی' امی سے ملنے کو کہے گی تو ابا کو بہت تکلیف ہو گی' ابا کو نظر بھی نہیں آتا ہے۔ بچی کچھ سمجھی ہو یا نہیں' وہ روئی نہ ماں کے لئے ضد کی۔

لوگوں نے سوچا تھا' ایک دن میں اتنے صدمے! دماغ الٹ گیا ہے بے چارے کا۔ اللہ صبر دے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن نجم الحسن کو صبر تو آ گیا مگر وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ اس نے زیبا اور صغریٰ خالہ کے سوا کبھی کسی سے بات نہیں کی' کبھی کسی جاننے والے سے.......... بلکہ کسی سے بھی کچھ نہیں مانگا۔ کوئی بات کرتا تو وہ خاموش رہتا' کوئی جواب نہ دیتا اور کوئی پیچھے پڑ جاتا تو اسے جھڑکتا' گالیاں بکنے لگتا۔

کوئی ہمدردی اور رحم کا کتنا ہی مستحق ہو' اس کا پاگل پن اور چڑچڑا پن زیادہ عرصہ کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ یہ تو غریب لوگ بھی برداشت نہیں کرتے جو سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ صغریٰ خالہ کے سوا بستی کا ہر شخص اس سے دور ہوتا گیا۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ قیامت کی رات سوئی ہوئی زیبا کو سینے سے لگا کر نجم الحسن نے اعلان جنگ کیا تھا "میں نے تجھے پکارا' تجھ سے مدد مانگی' رحم مانگا۔" اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا تھا "تو نے مجھے راستہ دلانے کے بجائے مجھ سے آنکھوں کی روشنی چھین لی۔ میں نے بیوی کی صحت مندی مانگی' تو نے اسے اور بچے کو موت دی۔ اب اندھے پن نے میرے کندھوں کو کمزور کر دیا ہے اور مجھے اس چھوٹی بچی کا بوجھ بھی اٹھانا ہے۔ مجھے تو نے ہی زندگی کی خوشیاں دی تھیں اور آج تو نے ہی مجھ سے سب کچھ چھینا ہے.......... جا' اب تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ آج سے تیری میری لڑائی۔ اب کبھی آواز نہیں دوں گا تجھے۔"

کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ نجم الحسن کو بھی آ گئی' زیبا اس کے سینے سے لپٹی سو رہی تھی لیکن وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی' کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی علم نہیں تھا کہ رات تھی یا دن نکل آیا تھا۔ اس نے زور زور سے اپنی آنکھیں ملیں پھر اس کے سینے میں درد سا اٹھا۔ اسے یاد آیا کہ اب وہ اندھا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ پہلے ہی دن اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ اسے اپنے اندھے پن سے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ لیکن زیبا کو پلنگ پر لٹا کر وہ اندازے سے لیٹرین کی طرف بڑھا تو راستے میں پڑی بالٹی سے ٹکرا گیا۔ اندھی بے بسی کا احساس اس کے وجود کو کاٹتا چلا گیا۔ لیٹرین میں ٹٹول کر دروازے کی کنڈی لگائی پھر پیروں سے ٹٹول کر بیٹھا.......... باتھ روم سے نکل کر اس نے منہ ہاتھ دھویا تو زیبا جاگ گئی۔ اس نے دو تین بار پکارا "امی.......... امی.........." پھر اچانک ہی وہ سہم کر خاموش ہو گئی۔ جیسے اسے صغریٰ نانی کی سمجھائی ہوئی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ اسے امی کو کبھی نہیں پکارنا تھا۔ ابا کو نظر تو آتا نہیں تھا' وہ چپکے چپکے بے آواز رونے لگی۔

نجم الحسن نے اس کی پکار سن لی تھی۔ اور آواز کی گھٹن کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ پلنگ کی طرف بڑھا اور زیبا کو بانہوں میں بھر لیا "میری بیٹی.......... میری زیبا۔"
اسے احساس ہوا کہ بچی کا جسم لرز رہا ہے۔ اس نے اس کے رخساروں کو چھوا' وہاں آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا "نہ رو میری بیٹی' نہ رو۔ میں خود تیرا منہ دھلاؤں گا۔"

زیبا لیٹرین سے آئی تو اس نے بڑی محبت سے اس کا منہ دھلایا۔ تھوڑی دیر بعد صغریٰ ناشتا لے آئی۔ چائے تھی' پاپے تھے۔ نجم الحسن نے کوئی اعتراض نہیں کیا' بس اتنا کہا "خالہ' مجھے تو خواہش نہیں ہے۔"

صغریٰ کے اشارے پر زیبا بولی "بابا میں بھی نہیں کھاؤں گی۔"

"کیسے نہیں کھائے گی! میں خود کھلاؤں گا اپنی بیٹی کو۔" یہ کہہ کر اس نے پاپا چائے میں بھگو کر اس کی طرف بڑھایا۔

"بیٹا نجمی' تو بھی کچھ کھا لے۔" صغریٰ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں خالہ' مجھے واقعی خواہش نہیں ہے۔"

صغریٰ کے اشارے پر زیبا نے پاپا چائے میں بھگو کر اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا "بابا کھا لیں نا!" اس کے لہجے میں سچی التجا تھی۔ نجم الحسن نے ہتھیار ڈال دیے۔

صغریٰ جانے لگی تو نجم الحسن نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے اور کہا "خالہ یہ لیتی جاؤ۔"

صغریٰ نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے لگا' نجم الحسن نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ لیکن وہ بہت سمجھ دار عورت تھی۔ نجم الحسن کی ذہنی کیفیت کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بھی سمجھ گئی کہ اسے ایک سچی نیکی' مسلسل نیکی کا موقع مل رہا ہے۔ ایسی نیکی جس کے لئے اسے ذلتیں بھی اٹھانی پڑیں گی۔

وہ پلٹ کر آئی اور نجم الحسن کے ہاتھ سے نوٹ لے لئے "میں سمجھ گئی' تم احسان لینا نہیں چاہتے حالانکہ یہ احسان نہیں' بیٹے! تم بس مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔"

نجم الحسن کی آنکھیں بھیگ گئیں "خالہ زیبا کے علاوہ ایک تم ہی ہو دنیا میں جس سے میری لڑائی نہیں۔ کچھ دن پہلے میں تمہیں جانتا بھی نہیں تھا۔ پر تم مجھے بہت اپنی لگتی ہو' ماں جیسی۔ بس مجھ سے بحث کبھی نہ کرنا۔ بہت کڑوا.......... زہریلا ہو گیا ہوں میں۔"

"میں تجھ سے کبھی کچھ نہیں کہوں گی نجمی۔ دوپہر کو میں کھانا لاؤں گی اور ہاں یہ پیسے تو بہت سارے ہیں۔"

"رکھ لو خالہ' ابھی تو مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ بہت کچھ سوچنا ہے مجھے۔"

وہ کئی دن تک سوچتا رہا۔ اسے کچھ کرنا تھا' آنکھوں سے محرومی کو بھی مد نظر رکھنا تھا۔

اس کے پاس جو دو ہزار روپے تھے وہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ کچھ خریداری کی تھی، کمرم
لگائے تھے۔ بچے ہوئے پیسوں میں قمرن کے کفن دفن کا بندوبست بھی ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ
قمرن کا کام پرائے پیسے سے ہو۔ اس پر وہ محلے والوں سے بہت لڑا تھا۔ اس سب سے نمٹ کر
اس کے پاس چار سو سے کچھ زائد روپے رہ گئے تھے۔ ان میں سے دو سو اس نے صغریٰ کو دے
دیے تھے، دو سو سے کچھ اوپر اس کی جیب میں تھے۔ اسے ان پیسوں میں ہی سے کچھ کرنا تھا مگر
کیا؟ ناپ تول کی کوئی چیز بیچنا ممکن نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے اس کے تصور میں ایک منظر لہرا گیا۔ جو سڑک اس کے گھر تک آتی تھی
وہ مڑ کر چاندنی چوک کی طرف جاتی تھی۔ یہ مقام اتصال وہ جگہ تھی۔ اس نے تصور کی نگاہوں
سے دیکھا کہ بہت سے بچے واٹر بال کا ربر اپنی انگلی میں باندھے اس سے کھیل رہے ہیں۔ وہ گیند
کو نیچے کی، آگے کی سمت دھکیلتے، انگلی میں بندھے ربر کے زور پر گیند آگے یا نیچے جاتی اور پلٹ
کر آتی تو وہ اسے کیچ کرتے اور پھر دھکیل دیتے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وہاں کھڑا ہو کر وا
بال بیچے گا۔ اس کام میں زیادہ پیسے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی بس ایک پمپ خریدنا ہوگا اور ر
کی گیندیں۔ یہ فیصلہ کر کے پہلی بار اسے کچھ طمانیت ہوئی۔

صغریٰ اکیلی عورت تھی۔ ۷۲ء میں مشرقی پاکستان سے لُٹ پِٹ کر پاکستان آئی تھی۔ ا
کے شوہر اور چار بیٹوں کو مکتی باہنی والوں نے شہید کر دیا تھا اور دو بیٹیوں کو اٹھا کر لے
تھی۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ صغریٰ نے مُردہ سمجھ کر انہیں صبر کر لیا تھا۔
کراچی آگئی۔ وہ بنگلہ دیش بننے کے بعد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لوگ ان پاکستانیوں کا بڑا احترام کر
تھے، جنہوں نے بنگلہ دیش میں ناچتی موت کے سامنے بھی پاکستان کے پرچم اور تصور سے د
بردار ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسا ہی ایک شخص اسے وزیر اعلیٰ کے پاس لے گیا۔ وزیر اعلیٰ
مہربانی سے اسے کچی آبادی میں سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا۔ تختی تھی۔ اسے علاقے میں دو
گھروں میں جھاڑو برتن کا کام مل گیا۔ روکھی سوکھی چلنے لگی۔

دکھوں کا کھولتا سمندر پار کر کے آنے والی صغریٰ کو نجم الحسن کے دکھ اور اذیت کا پو
طرح احساس تھا۔ وہ خود اب تک بے مقصد جیتی رہی تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ اپنے چار بیٹوں
کے بدلے ایک بیٹا مل گیا ہے۔ معذور بیٹا اور ننھی سی پوتی۔ قمرن کی موت کے روز تو اس
کام سے چھٹی کر لی تھی۔ اگلے روز سے اس نے یہ معمول بنایا کہ صبح ناشتے کے ساتھ ننھی
زیبا کے لئے کھانا بھی تیار کرتی اور دے کر چلی جاتی۔ وہ خود دوپہر کا کھانا اس گھر میں کھاتی
جہاں اس وقت کام کرتی تھی۔ شام کو واپس آتی تو رات کا کھانا پکا لیتی۔

اس صبح وہ ناشتا اور کھانا لے کر آئی تو نجم الحسن نے اسے روک لیا "خالہ، ایک کام
گی میرا؟"

"کیوں نہیں بیٹا؟"

"آج شام کو مجھے باہر لے چلنا، کسی بھی اسٹور پر جہاں سے میں ربڑ کی گیندیں اور

خرید سکوں..........."

"ضرور لے چلوں گی بیٹا۔"

پمپ اسی روپے میں آیا۔ ہزار گیندوں کا تھیلا سو روپے میں ملا۔ نجم الحسن کی جیب خالی
ہو گئی مگر اس رات وہ بڑے سکون سے سویا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد صغریٰ نے اس کے لئے تمام انتظامات کئے۔ زیبا کو گزشتہ روز اس
نے جگہ بھی دکھا دی تھی اور سب کچھ سمجھا بھی دیا تھا۔ نجم الحسن نے بہت ساری گیندیں تیار
کیں، انہیں پتلے ربڑ سے باندھ کر ربڑ کے سرے بالٹی پر لٹکائے اور گیندوں کو پانی سے بھری
ہوئی بالٹی میں ڈال دیا۔ بغیر بھری گیندوں کا تھیلا اور پمپ اس نے کپڑے کے ایک بڑے تھیلے
میں رکھ لیا۔ ننھی زیبا کے ہاتھ میں ایک چادر تھی۔

انہوں نے ایک دیوار کے ساتھ چادر بچھا کر اس پر اپنی چھوٹی سی دکان لگائی۔ نجم الحسن
نے ایک واٹر بال کو اپنی انگلی میں باندھا اور اسے مخصوص انداز میں تیز تیز اچھالنے لگا۔ ساتھ
ہی وہ پکار رہا تھا "آؤ بچو، واٹر بال آٹھ آنے میں.......... آٹھ آنے.........."

بچے جمع ہونے لگے۔ گیندیں بکنے لگیں۔ زیبا بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔ صغریٰ نے کھانا
باندھ کر دیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور جب ہر طرف دوپہر کا سکوت طاری ہو گیا تو
نجم الحسن کو اندازہ ہوا کہ اب دھندا شام کو ہی شروع ہوگا۔ اس نے واپس جانے کے بارے
میں سوچا۔ گھر جا کر ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے لئے اتنی دور اتنا سامان اٹھا کر
آنے جانے کی مشقت! یہ بہت مہنگا سودا تھا، سو وہ وہیں بیٹھا رہا۔ شام چار بجے کے بعد بچوں
کے قہقہے اور بھاگتے قدموں کی چاپیں پھر پیدا ہوئیں۔ دو گھنٹے میں اچھی خاصی گیندیں بکیں۔
چھ بجے انہوں نے دکان بڑھائی اور گھر کی طرف چل دیئے۔

پھر روز کا معمول بن گیا۔ وہ صبح ناشتا کرتے، نو بجے گھر سے نکلتے، دکان لگاتے دوپہر کا کھانا
کھاتے۔ پھر فرصت ہوتی تو وہ بالٹی کا جائزہ لیتا اور نئی گیندیں بھرتا۔ کبھی بکری اچھی ہوتی تو
گیندیں درمیان میں ہی بھرنی پڑ جاتیں۔ شام چھ بجے واپسی ہوتی۔ اوسطاً ہر روز اس کی سو
گیندیں بک رہی تھیں۔ یعنی پچاس روپے آمدنی۔ اس نے حساب کتاب لگا کر طے کیا کہ اسے
اپنی آمدنی کا چالیس فی صد تو کاروبار جاری رکھنے کے لئے بچانا ہوگا۔ گیندیں ختم ہو جانے پر
گیندیں خریدنی ہوں گی۔ ربڑ خریدنے ہوں گے۔ کسی بھی وقت کسی چیز کی قیمت بڑھ سکتی ہے،
کبھی پمپ بھی خراب ہو سکتا ہے۔ چالیس فیصد میں یہ تمام معاملات نمٹ سکتے تھے۔ اس نے
اس بچت کو اوسط پر فکس کر لیا۔ یعنی ہر روز بیس روپے۔ آمدنی فکس نہیں تھی۔ کسی روز
ساٹھ گیندیں بکتیں یعنی تیس روپے آمدنی، اس میں سے بھی وہ بیس روپے الگ رکھ لیتا، دس
روپے میں اپنا کام چلاتا۔ کسی روز آمدنی ستر اسی بھی ہو جاتی تب بھی وہ بیس روپے الگ کر لیتا۔
وہ باقی پیسے صغریٰ کو دیتا۔ صغریٰ ہر روز احتجاج کرتی۔

"دیکھو خالہ، تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے بحث کبھی نہیں کرو گی۔"

"یہ تو ہے لیکن.........."
"لیکن ویکن کچھ نہیں خالہ، میں اپنے گھر کا خرچ دے رہا ہوں۔"
صغریٰ کو خاموش ہو جانا پڑتا لیکن جس روز نجمی نے باون روپے دیئے اس روز وہ نہ رہ سکی "نجمی، معلوم ہے یہ کون سا مہینہ ہے؟"
"نہیں خالہ، مجھے تو دنوں اور تاریخوں کا بھی مشکل ہی سے پتا چلتا ہے اور مجھے فرق کیا پڑتا ہے!"
"یہ رجب کا مہینہ ہے نجمی!"
"تو مجھے کیا؟"
"رجب کے بعد شب برات اور پھر رمضان.........."
"تو پھر؟"
"رمضان کے بعد عید آتی ہے۔"
"اوہ!" نجمی لمحے بھر کو چونکا پھر اس نے سرد آہ بھر کر کہا "خالہ، اب ہماری کیا عید۔"

"چل تیری نہ سہی زیبا کی تو ہوگی، اس کے تو نئے کپڑے بنیں گے نا!"
"ہاں یہ تو ہے"۔ نجمی نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے تصور میں دیکھا، عید ہے۔ بچے رنگ برنگے نئے کپڑے پہنے عیدی میں ملنے والے پیسوں سے جیب اور چھوٹے رنگین پرس بھرے گلی گلی پھر رہے ہیں۔ آئس کریم کھاتے، رنگ برنگے غبارے اڑاتے، ایسے میں اس کی زیبا..........
"اس کے لیے ابھی سے بچت شروع کر دے نجمی!" خالہ نے اسے چونکا دیا "دیکھ تو اور بچی کے کھانے کا خرچ کچھ زیادہ نہیں۔ دس روپے اور حد سے حد پندرہ روپے کافی! اس کے بعد جو بچے اسے جوڑنا شروع کر دے تاکہ رمضان تک عید کا خرچا نکل آئے۔"
بات نجمی کی سمجھ میں آ گئی۔ اب وہ دو طرح کی بچت کرتا تھا۔ اگلی بار وہ صغریٰ ساتھ گیندیں اور ربڑ خریدنے گیا تو اس نے جیبوں والے دو بنیان بھی خرید لئے۔ اب جیب میں کاروباری بچت ہوتی تھی تو دوسری جیب میں ذاتی بچت۔ دونوں جیبوں کے نوٹوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

دفتر سے ایک روز چپراسی افضل اس کی خیریت دریافت کرنے آیا۔ وہی افضل جس نجمی نے وہ کچا مکان خریدا تھا۔ اس نے بتایا کہ دفتر والے اس کی بغیر اطلاع غیر حاضری پریشان ہیں لیکن وہ خود نجمی کے حلیے کے متعلق جان کر سناٹے میں رہ گیا تھا۔
"میں ڈائریکٹر صاحب کو آپ کے بارے میں بتاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کے کوئی کام ضرور نکال لیں گے۔" افضل نے کہا۔
"نہیں افضل، میں اب تو ایک کھوٹے سکے کے مانند ہوں۔ میں اب کسی کام کا

"لیکن کوئی کام مل جائے تو حرج ہی کیا.........."
نجمی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی "افضل، اگر تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے تو یہ بات مان لو، مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ کہہ دینا کہ گھر کر نہ جانے کہاں چلے گئے، کسی کو کچھ پتا نہیں۔"
"لیکن نجمی صاحب!"
"بس.......... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔
افضل کچھ دیر بعد چلا گیا۔ وہ باہر کی دنیا سے نجمی کا آخری رابطہ تھا جو ٹوٹا، اس نے خود

زندگی ایک مخصوص راستے پر چل پڑی تھی، جہاں چھوٹی موٹی اونچ نیچ تھی لیکن کوئی بڑا نہیں تھا۔ وہ اپنے مخصوص وقت پر آتا، پانی کی گیندیں بیچتا اور مخصوص وقت پر گھر کا رخ ا۔ ننھی زیبا گھر کے راستے سے خوب واقف ہو گئی تھی۔
زندگی کا اب کوئی بڑا مقصد نہ تھا۔ بس ایک ہی مقصد تھا.......... عید، ننھی زیبا کی عید۔
کی آمدنی زیادہ تر سکوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ دوسری طرف سامنے پان کی دکان والے کو گاری کی ضرورت رہتی تھی۔ چنانچہ شام کو جب نجمی اٹھنے والا ہوتا تو پان والا خود آتا اور کی ریزگاری کو دس پانچ کے نوٹوں میں بدل دیتا۔
نجمی گھر پہنچ کر ان نوٹوں کے حصے بخرے کرتا۔ پندرہ یا بیس صغریٰ کو دیتا۔ بیس روپے کی بائیں جیب میں جاتے وہ جیب سرمایہ کاری کی تھی۔ باقی رقم بنیان کی داہنی جیب میں - وہ عید جیب تھی۔ مزید رقم کا اضافہ کرنے کے بعد وہ رقم شمار ضرور کرتا ہر صبح وہ صغریٰ پوچھتا "عید میں کتنے دن رہ گئے ہیں خالہ؟" پھر رمضان کا مہینہ آ گیا۔ اس وقت تک اس بنیان کی داہنی جانب والی عید جیب میں موجود رقم چار سو سے تجاوز کر چکی تھی۔
زندگی اسی طرح گزرتی جاتی اگر ایک روز صغریٰ کی حالت اتنی نہ بگڑتی۔ پیٹ میں درد کایت اسے خاصے عرصے سے تھی لیکن وہ کسی سے کہتی نہیں تھی۔ کہتی بھی تو کس سے! مگر روز درد اتنا بڑھا کہ اس کی چیخوں نے پورے محلے کو ہلا کر رکھ دیا۔ لوگ جمع ہوئے، صغریٰ ریبی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ اسپتال والوں نے ے ایڈمٹ کر لیا پتا چلا کہ آپریشن ہوگا۔ یوں نجمی بالکل اکیلا ہو گیا۔ زندگی کے معمولات ہت فرق پڑ گیا۔ اب وہ ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا چوک کے ایک ہوٹل میں کھاتے لیکن ے بڑا فرق یہ پڑا تھا کہ نجمی انسانوں سے بالکل ہی کٹ گیا تھا۔ صغریٰ سے وہ تھوڑی بہت کر لیتا تھا مگر اس وقت اسے اس گفتگو کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ اب پتا چل رہا تھا کہ ں سے کٹ کر جینا کیا ہوتا ہے اور کسی سے کوئی بات کئے بغیر کئی کئی دن گزار دینے سے ے سناٹے اتر جاتے ہیں۔

ایک روز اس نے پان والے کو ریزگاری دیتے ہوئے پوچھا "عید میں کتنے دن
ہیں' بھائی؟"

"چھ یا سات دن۔"

نجمی نے فیصلہ کیا کہ عید سے دو دن پہلے زیبا کو بازار لے جائے گا اور سلے ہ
جوڑے دلوائے گا۔ جوتے اور چپلیں بھی خریدے گا اس کے لئے۔ چوک کے رائے
اس طرف والے فٹ پاتھ سے اس کے قدم خوب آشنا تھے۔ وہاں دکانیں ہی دکانیں تھ
سے خریداری کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی نجمی کو صغریٰ کی کمی محسوس ہوئی' وہ ہوتی تو اچھا

اگلے روز دوپہر کو سکون کے وقفے میں وہ ستا رہا تھا کہ کوئی اس کی طرف
آنے والے نے بڑی شائستگی سے اسے سلام کیا اور کہا "پانچ روپے کی چونیاں اور اٹ
سکیں گی؟"

نجمی نے اپنی جیب سے ریزگاری نکالی اور بڑی احتیاط سے گن کر اس کی ط
دی۔ اجنبی نے پانچ کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شکریہ ادا کیا پھر بولا "ایک با
آپ کو' اب نئے نوٹ جاری ہونے تک سو اور پچاس کے نوٹ مت لیجئے گا۔"

"کیا مطلب؟" نجمی نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟ گورنمنٹ نے سو اور پچاس کے نوٹ کینسل کر دیئے!
نوٹ بدلوانے کی آخری تاریخ تھی۔ اب جن لوگوں کے پاس یہ نوٹ ہوں گے ان ک
ردی کاغذ سے زیادہ نہیں ہو گی۔"

نجمی کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی تمام بچت سو اور پچاس کے
شکل میں تھی۔ اسے ۷۲ء کا تجربہ یاد آگیا جب نوٹ کینسل ہوئے تھے۔ بینکوں کے
بدلوانے والوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں اور بہت لوگ تو نوٹ بدلوا ہی نہیں سکے تھے۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا آپ کو؟" اجنبی نے پوچھا۔

"مم......... مجھے بھی نوٹ بدلوانے ہیں۔" نجمی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"نوٹ بدلوانے ہیں؟ لیکن اب تو ایک بج چکا ہے' بینک والے لین دین بند کر
کیا ہو سکتا ہے؟"

نجمی پر جیسے بجلی گر گئی۔ اس کے ہاتھ بے اختیار قمیض کے نیچے بنیان کی
طرف گئے اور فوراً ہی واپس آگئے۔ "اب......... اب کیا ہو گا۔"

"اوہ میں سمجھ گیا۔" اجنبی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "آپ کی پوری کمائی ڈ
ہے لیکن ٹھہریں' برانچ کا مینجر میرا جاننے والا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں' میں ا
مجبوری اور بے خبری کے متعلق بتا کر قائل کر لوں گا' آپ کے نوٹ بدل جائیں گے۔"

"میں بہت شکر گزار ہوں گا۔"

"تو آئیں میرے ساتھ۔"

نجمی زیبا کو لے کر اجنبی کے ساتھ چل دیا۔ بینک کے سامنے اجنبی نے کہا "آپ یہیں
ہے۔ بینک بند ہونے کے بعد کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ میں تو اپنے دوست مینجر کی وجہ سے چلا
ں گا۔ میں سعید سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔"

نجمی زیبا کا ہاتھ تھامے فٹ پاتھ پر کھڑا رہا۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ذہن میں ایک ہی
ل ڈنک مارے جا رہا تھا' نوٹ نہ بدلے گئے تو کیا ہو گا؟ تھوڑی دیر بعد اجنبی باہر آیا "میں نے
د کو رضامند کر لیا ہے' آپ کے نوٹ بدل جائیں گے' کتنے روپے ہیں آپ کے پاس؟"

روز حساب کتاب کرنے والے نجمی نے جھٹ کہا "ساڑھے آٹھ سو اور ڈھائی
گیارہ سو۔"

"لائیں' رقم مجھے دے دیں۔" اجنبی نے کہا "میں بدلوا لاتا ہوں۔"

نجمی ایک لمحے کو ہچکچایا پھر اس نے سوچا "یہ نوٹ تو اب ردی کے ٹکڑے ہو ہی چکے
۔ ایک شخص بدلوانے جا رہا ہے تو کیا حرج ہے ورنہ وقت تو گزر چکا ہے۔ اس نے بنیان کی
ں جیبیں خالی کر دیں۔

"مجھے دس پندرہ منٹ لگیں گے۔ آپ یہیں کھڑے رہیں۔"

نجمی زیبا کا ہاتھ تھامے وہیں کھڑا رہا۔ پندرہ منٹ ہوئے' آدھا گھنٹا ہوا پھر ایک گھنٹا گزر
اجنبی واپس نہیں آیا۔ نجمی کو تشویش ہونے لگی۔ وہ بینک کے گیٹ کی طرف بڑھا
ائی......... جو صاحب اندر گئے تھے انہیں بلا دو ذرا۔" اس نے چوکیدار سے کہا۔

"اندر.........؟ اندر تو کوئی نہیں گیا" چوکیدار نے سخت لہجے میں کہا "بینک بند ہو چکا
۔"

"تمہارے مینجر صاحب کے دوست اندر آگئے ہیں۔ وہی مجھے لے کر آئے تھے۔"

"میں کہہ رہا ہوں' اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ جاؤ بابا' معاف کرو۔"

نجمی کو غصہ آگیا کہ چوکیدار اسے بھکاری سمجھ رہا ہے "دیکھو سو اور پچاس کے نوٹ
سل ہو گئے ہیں نا۔ میں وہ نوٹ بدلوانے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ نوٹ بدلوانے کا وقت
چکا ہے مگر مجھے جو صاحب یہاں لائے ہیں وہ تمہارے مینجر سعید صاحب کے دوست ہیں۔
انہوں نے اندر جا کر سعید صاحب سے بات کی پھر مجھ سے نوٹ بدلوانے کے لئے لے
۔ تم انہیں بلا دو مہربانی کر کے۔"

"او بابا' کہاں کی ہانک رہے ہو تم۔" چوکیدار کا لہجہ اور سخت ہو گیا "کوئی نوٹ کینسل
ہوا۔ نہ بینک نوٹ بدل رہا ہے اور ہمارے مینجر کا نام بھی سعید نہیں' شہاب الدین ہے
اندر کوئی بھی نہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو.........؟"

چوکیدار کا لہجہ ایک دم نرم ہو گیا "کتنی رقم دی تھی اسے؟"

"گیارہ سو تھے۔" نجمی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"بس تو اب صبر کر لو۔" چوکیدار نے کہا۔

زندگی میں دوسری بار ایسا ہوا کہ نجمی کی ٹانگوں میں جان نہ رہی۔ وہ وہیں فرش
گیا۔ ننھی زیبا اس کے پاس بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھامے پوچھ رہی تھی "کیا ہوا بابا؟"
"کچھ نہیں بیٹا' ہم لٹ گئے۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

لوگ جمع ہو گئے۔ ہر شخص اس سے ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا' کیا ہوا؟ وہ بار
رہا' بتاتے بتاتے تھک گیا۔ اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا کہ لوگ اس نوسرباز کو برا
رہے۔ لیکن اس سے اس کی رقم تو نہیں مل سکتی تھی۔ لوگ اپنے راستے ہو لیے' وہ
ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ چوکیدار اپنے اسٹول پر جا بیٹھا تھا۔ آخر کار اس نے زیبا سے
بیٹا............"

وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو پتا چلا کہ کوئی ان پر آخری وار بھی کر چکا ہے۔ اس
واٹر بالز اور پمپ اور بغیر بھری گیندوں کا تھیلا غائب تھا۔ بس چادر موجود تھی جس کے
کونوں پر پتھر رکھے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے زیبا کا سر اپنے زانو پر
اور آسمان کی طرف منہ کر کے خلاؤں میں گھورنے لگا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک
تھا اور وہ یہ کہ اس کے پاس صرف پانچ روپے ہیں اور کچھ ریزگاری ہے اور سامنے
زندگی ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ شام ہو گئی ہے۔ اس نے ان سکوں کی کھنکھناہٹ
نہیں سنی جو راہ گیر چادر پر اچھالتے جا رہے تھے۔ اس نے بچی کی مسلسل فریاد
سنی............ بابا' بھوک لگ رہی ہے۔ بابا' بہت بھوک لگی ہے۔ اس کی تمام حسیات سامنے
پھاڑے کھڑے مسئلے کا حل سوچنے پر مرکوز تھیں مگر اسے کوئی حل سجھائی نہیں دیا۔
وقت آیا' اس نے بھوک سے نڈھال بیٹی کو چمکار کر کہا "چلو بیٹا گھر چلیں۔" اس نے چادر
تو اس پر پڑے ہوئے سکے زمین پر گر گئے "بابا پیسے گر گئے ہیں۔" زیبا نے کہا۔

"ہمارے نہیں ہیں بیٹا!" اس نے بے دھیانی سے کہا۔

اس روز گھر واپس جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا' اب پتا چلا' تہی دست ہونا کیا ہے
میں ہر روز یہاں آتا تھا' ہر شام یہاں سے جاتا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بالٹی اور ایک
تھا۔ آج میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ اسے کہتے ہیں تہی دست ہونا۔ گھر پہنچ کر وہ
کیفیت میں بیٹھا سوچتا رہا' اب کیا کرے............ اب کیا ہو؟

"بابا' بہت بھوک لگی ہے۔" زیبا کی روہانسی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے
ارے' میری بچی............ صبح سے بھوکی ہے۔ اس افتاد میں کھانے کا خیال ہی نہیں آیا
جانے............ دوپہر سے اب تک کتنی بار پکار چکی ہو اس طرح! "ابھی چلتے ہیں بیٹا"
اسے دلاسا دیا اور جیب سے ریزگاری نکال کر گننے بیٹھ گیا۔ پانچ روپے کے نوٹ کے علاوہ
کے پاس ریزگاری کی شکل میں سوا سات روپے موجود تھے۔ پانچ چھ روپے کھانے
جاتے۔ اگلی صبح ناشتا غائب' اس کے بعد ایک وقت کے کھانے کے پیسے اور ہوتے۔

پہلا مسئلہ پہلے۔ وہ زیبا کو ساتھ لے کر ہوٹل چلا گیا۔ کھانا کھا کر واپس آنے کے بعد اس
بچی کو تھپک تھپک کر سلایا اور پھر خود بیٹھا سوچتا رہا' نہ جانے کب اسے بھی نیند آ گئی۔
اگلی صبح ہاتھ منہ دھونے کے بعد زیبا نے کہا "بابا چلو گے نہیں؟"
"کہاں؟" اس نے بے خیالی میں پوچھا۔
"گیندیں بیچنے۔"
"اب کہاں جائیں گے بیٹا' سب ختم ہو گیا۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور بڑی مشکل سے
آنکھوں کی طرف بڑھنے والے آنسوؤں کو پیا۔

زیبا خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے ناشتے کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ نجمی بیٹھا سوچتا رہا لیکن
مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا اس کے پاس۔ اس نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ایک
کوشش کی تھی' اور اس سے ایک ہی سبق سیکھا تھا' وہ یہ کہ وہ کبھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑا ہو
سکتا۔ اس کی کھوئی ہوئی بینائی ہمیشہ اس کے راستے میں دیوار بنی رہے گی۔ کوئی بھی شخص کسی بھی
وقت اسے بے وقوف بنا کر لوٹ سکتا ہے۔ کیا کام کرے گا وہ؟ کیا کاروبار کرے گا؟ اور اب ہے
کیا اس کے پاس۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ دوپہر ہو گئی ہے۔
"بابا' بھوک لگی ہے۔" زیبا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

تب وہ چونکا۔ اسے تقدیر پر غصہ آنے لگا' جس نے اسے دوسری بار لوٹا تھا۔ وہ تو بیٹی
کے لیے عید کا سامان کر رہا تھا اور اب ایک وقت کے بعد اس کے پاس بیٹی کا پیٹ بھرنے کا
بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر جلنے لگیں' ایک بار پھر وہ آنسوؤں کا زہر پی گیا۔ وہ
اسے ہوٹل لے گیا۔ اس بار اس نے صرف زیبا کے لیے کھانا منگوایا۔
"بابا' آپ نہیں کھا رہے؟" زیبا نے کھاتے کھاتے اچانک پوچھا۔
"نہیں بیٹا' بھوک نہیں ہے مجھے۔"
بچی خاموش ہو گئی مگر چند لمحے بعد اس کا بنایا ہوا چھوٹا سا نوالہ اس کے لبوں کو چومنے لگا
"آپ کو میری قسم' کھا لیں نا!"
اس نے خاموشی سے منہ کھول دیا۔ پھر اس نے ایک روٹی اور منگوا لی اور زیبا کے ساتھ
چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا رہا۔ اس طرح اس نے زیبا کے لیے مزید ایک وقت کے کھانے کے
پیسے بچا لیے۔ اس کا خیال تھا کہ اس وقت تک وہ روزگار کی کوئی صورت نکال لے گا۔
وہ ایک اور قیامت کی رات تھی اس کے لیے۔ بے بسی کے احساس نے ذہن کو شل کر
رکھ دیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہر چند قدم کے فاصلے پر ایک اندھی گلی تھی۔ کہیں کوئی
نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا' جس سے وہ بات کر سکے۔ ننھی زیبا سو چکی تھی صغریٰ خالہ
میں تھی۔
صبح زیبا نے ناشتا کرنے کے بجائے ایک ہی فرمائش کی "بابا کام پر چلو۔" اس کے لہجے
رہی تھی۔ اصرار تھا۔

"کون سا کام بیٹا؟"

"بابا وہ بالٹی........... گیندیں کہاں گئیں؟" زیبا نے بھی اچانک سوال کر دیا۔

وہ سٹپٹا گیا۔ بچی کی حیرانی بجا تھی' اس نے بیٹی کو بتایا جو نہیں تھا کہ ان پر کیا تھی۔

"وہ........... وہ کھو گئیں بیٹا!" اس نے آخر کار جواب دیا۔

زیبا چند لمحے خاموش رہی پھر بولی "بابا ہم وہیں چل کر بیٹھیں گے' وہاں بیٹھنا ہے' بچے کھیلتے ہیں' وہ ہمارے پاس آتے ہیں۔"

وہ کیسے بتاتا کہ اب بچے ان کے پاس نہیں آئیں گے' اسے خاموش دیکھ کر زیبا ضد کرنے لگی۔ مجبور ہو کر اس نے چادر اٹھائی' بچی کو لے کر باہر نکلا' دروازے پر تالا انگلی اسے تھما کر چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ جگہ پر پہنچ گئے لیکن وہاں بیٹھنا فضول ہی تھا۔

انہوں نے مخصوص جگہ چادر بچھائی اور بیٹھ گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ننھی زیبا اس سے ٹکی بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد زیبا نے کہا "بابا آواز کیوں نہیں لگاتے؟"

"آواز لگانے کو ہے ہی کیا ہمارے پاس۔" اس بار وہ چڑ گیا۔

زیبا چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے خود ہی آواز لگا دی "واٹر بال لے لو...... برنگی واٹر بال........."

نجمی نے سختی سے بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچی سہم کر روئی تو اس کا دل کٹ رو میری گڑیا' دیکھو تو......... ہمارے پاس واٹر بال ہے ہی نہیں۔"

بچی روتی رہی' وہ اس کے رخسار سہلاتا......... آنسو پونچھتا اور اسے چمکارتا دھوپ سر پر آ گئی۔ پہلی بار دھوپ اسے ڈس رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ آدمی روزگار سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ آدمی محنت کر کے روزی کمائے تو دھوپ بری نہیں شاید اس لئے کہ روزی کی صورت میں آدمی کو اس کا معاوضہ ملتا ہے۔ اور روزگار دھوپ نہیں سہی جاتی۔ ایک دن پہلے تک یہی دھوپ اسے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اتنا تک نہیں ہوتا تھا اور آج جیسے وجود میں سوئیاں سی اتری جا رہی تھیں۔ اسے یاد آیا ایک پیڑ ہے۔ اس نے زیبا سے پوچھا "سامنے کوئی پیڑ ہے؟"

"ہاں بابا!"

"تو چل' وہاں چل کے چادر بچھا لے۔"

وہ پیڑ کے نیچے جا بیٹھے' زیبا بہت دیر سے بھوک ضبط کر رہی تھی۔ سمجھ گئی گیندیں نہیں ہیں تو پیسے بھی نہیں ملیں گے اور پیسے نہیں ہوں گے تو کھانا بھی نہیں بھوک برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ نجمی نے یہ بات محسوس کر لی

"کیا بات ہے بیٹا؟" اس نے پوچھا۔

"بھوک لگ رہی ہے بابا!"

وہ اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگا لیکن معصوم بچی روئے جا رہی تھی۔ انہوں نے گزشتہ دن کی طرح کھانا کھایا اور پھر پیڑ کے نیچے آ بیٹھے۔

دوپہر بیت گئی' شام گئی' آہٹیں جاگ اٹھیں۔ نجمی زیبا کو لے کر گھر کی طرف چل دیا۔

اس رات نجمی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ زیبا بھوک سے بلکتی رہی اور وہ کچھ نہ کر سکا۔ زیبا کی گھٹی گھٹی گریہ و زاری اس کے دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔ ہر آہ پر......... رونے کی ہر گھٹی ہوئی آواز پر اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ تھوڑا سا مر گیا ہے اور جب بہت دیر کے بعد پہلی بار زیبا نے کہا "بابا بھوک لگی ہے' کھانا کھلا دو۔" تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی زیبا کے ہونٹوں پر رکھ دی جیسے اسے اپنے آنسو پلانا چاہ رہا ہو "میری بچی' اس وقت صبر کر لے' اب تو ہوٹل بند ہو چکے ہیں۔" اس نے گھٹی آواز میں کہا "صبح تجھے کھانا کھلاؤں گا۔"

لیکن کھانا کہاں سے آئے گا' یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

اگلی صبح اسے زیبا کا منہ دھلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ کام بھوک کی وجہ سے بہنے والے آنسوؤں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔

"بابا......... گیندیں بیچنے چلو نا۔" زیبا نے......... ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

وہ پھر اسی دیوار کے ساتھ چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد زیبا پھر رونے لگی۔ اب وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مسلسل کہہ رہی تھی۔ "بابا بھوک لگی ہے' بابا کھانا کھلا دو۔" یہ آواز اور بچی کی سسکیاں نجمی کو پتھر بنائے دے رہی تھیں۔ بچی کو روتے اور باپ سے کھانا مانگتے ہوئے چند راہ گیروں نے دیکھا تو چادر کی طرف سکے اچھال دیئے۔ لحہ بہ لحہ پتھر بنتے ہوئے نجمی نے چیخ کر کہنا چاہا' میں کچھ نہیں مانگتا' میں بھکاری نہیں ہوں۔ اٹھا لو یہ سکے۔ لیکن یہ چیخ اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ سکے گرتے' کھنکھناتے' قہقہے لگاتے رہے' جیسے اس کی بے بسی اور شکست کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس کے اندر جنگ جاری تھی۔ ضمیر شعور پر ضربیں لگا رہا تھا۔

بچی کی گریہ و زاری بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی روح پر کوڑے برس رہے ہیں۔

پھر بچی کی آواز بتدریج ڈوبنے لگی۔ وہ اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ وہ اس کا سر سہلاتا رہا' بچی کا جسم' مسلسل لرز رہا تھا' اس کی پیشانی سرد ہو رہی تھی۔

نجمی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے اپنے پیٹ میں بھی اینٹھن ہو رہی تھی۔ ایسے میں اس کے ذہن میں جیسے منطق کا کوئی عالم جاگ اٹھا۔ میں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے' کسی سے کچھ نہیں مانگا' یہ بھیک تو نہیں.........

لیکن یہاں بیٹھے تو ہو ضمیر نے ملامت کی' ہاتھ نہیں پھیلاتے تو یہاں راستے میں چادر بچھائے کیوں بیٹھے ہو' گھر جا کر بیٹھو پھر دیکھو' کتنے سکے گرتے ہیں آنگن میں۔"

میری بچی بھوکی ہے' مرجائے گی۔ شعور کی آواز اُبھری اور اتنی شدت سے اُبھ
ضمیر دب گیا۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر گنا۔ وہ پونے گیارہ روپے تھے۔ اس نے پیسے سم
جیب میں رکھے' بچی کی انگلی پکڑی اور آہستہ آہستہ آہٹوں پر کان دھرے احتیاط سے قد
ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اس دن کے بعد زیبا بھوک سے کبھی نہیں روئی۔ اس عید پر وہ اسے نئے کپڑے
دلا سکا تھا لیکن اسے پانچ روپے عیدی بہرحال دی اور کہا "جا بیٹا' آئس کریم کھا.........
کھا' جا کر کھیل۔"

اور وہ خود پچھلی عیدوں کی' قمرن کی یادوں سے کھیلتا رہا۔

صغریٰ اسپتال سے رخصت ہو کر آئی تو اسے دیکھ کر دھک سی رہ گئی "
نجمی.......... یہ کیا ہوا تجھے؟"

نجم الحسن اتنے دنوں میں ہی ڈھل گیا تھا۔ وہ وقت سے کہیں پہلے بوڑھا لگنے لگ
صغریٰ کی بات سن کر وہ رو پڑا۔ آنسو تھمے تو اس نے صغریٰ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ
"نہ رو میرے بیٹے' نہ رو۔" صغریٰ نے اسے تسلی دی پھر دکھ بھرے لہجے میں
"تیرے کچھ پیسے بچے ہوئے تھے میرے پاس۔ انہیں بیماری کھا گئی۔ پھر بھی وہ تیری امانت
میرے پاس۔اب میں کل سے کام پر جاؤں گی۔ کچھ پیسے پیشگی لے لوں گی' کام چل جا
تنخواہ ملے گی تو تیرا قرض لوٹا دوں گی' تو پھر سے کام شروع کر دینا۔"

"نہیں خالہ' اب مجھ سے کوئی کام نہیں ہو گا۔"

"کیوں بیٹا؟ ایسے حوصلہ تو نہیں ہارتے!"

"خالہ' آنکھوں کے بغیر تو میں ہر قدم پر لٹتا رہوں گا۔ فریبی تو ہزار بہروپ بد
سامنے آتے رہیں گے۔ میں کس کس کو پہچانوں گا۔ نہیں خالہ' تم نہیں سمجھ سکتیں۔ مجھ
اب کبھی اعتماد پیدا نہیں ہو گا۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتا خالہ!"

جہاں دیدہ صغریٰ اس کا کرب اور بے اعتمادی سمجھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نجم
سے بھی کٹ جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس سے اختلاف نہ کرے۔ اب تو
نازک.......... اور زود حس ہو گیا تھا "بس اب تو کھانے کی طرف سے بے فکر ہو جا۔" اس
کہا۔

صغریٰ اسے بھیک لینے سے منع نہ کر سکی۔ زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ نجم
صبح صغریٰ کا لایا ہوا ناشتا کرنے کے بعد اور دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر زیبا کے ہمراہ گھر سے
دیوار کے سائے میں چادر بچھاتا اور بیٹھ جاتا۔ وہ خاموش بیٹھا رہتا۔ اس کے منہ سے کبھی
صدا نہ نکلتی۔ سورج کی کرنوں کے نیزے چبھنے لگتے تو وہ چادر اٹھا کر درخت کے نیچے جا
شام کو پان والے کو ریزگاری دے کر وہ نوٹ لیتا اور گھر کا رخ کرتا۔ صغریٰ کو خرچ کے
پیسے دینے وہ کبھی نہیں بھولا۔

O============☆============O

آج.......... اتنے برسوں کے بعد وہ پھر بدترین عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو گیا تھا۔
بیٹھا سوچتا رہا۔ اتنے برسوں میں اس نے کیا بھی کیا تھا! بس سوچتا اور جو نتیجہ نکالتا زیبا یا خالہ
ریٰ کے کانوں میں انڈیل دیتا' اسے اس سے غرض نہ ہوتی کہ ان کی سمجھ میں بھی کچھ آیا ہے
ہیں۔اس کے نطق کو تو بس کسی سماعت کی ضرورت تھی اور وہ صغریٰ کی تھی یا زیبا کی۔

ایسے ہی ایک موقع پر اس نے صغریٰ کو بتایا تھا کہ وہ نوٹوں اور سکوں کے بارے میں
ں انداز میں محسوس کرتا ہے۔ دونوں میں کیا فرق کرتا ہے "یہ سکے جو ہوتے ہیں نا خالہ'
ے کم ظرف ہوتے ہیں۔ سرگوشی بھی کرتے ہیں تو دور تک گونجتی ہے۔ کسی کی جیب میں
ں تو آپس میں لڑتے' ہنستے کھیلتے' اتنا شور مچاتے ہیں کہ ساری دنیا اسے دیکھنے لگے حالانکہ ہوتا
ہ زیادہ نہیں ہے' اس بے چارے کے پاس' دیا ہوتا ہے تو اس کے پیچھے لٹیرے' جیب کترے
، جاتے ہیں۔ کسی کی مدد کرتے ہیں تو ساری دنیا کو پتا چل جاتا ہے' اس کے برعکس نوٹ
ے ظرف والے ہوتے ہیں۔ ان کا لہجہ شیریں ہوتا ہے اور آواز اتنی دھیمی کہ کان لگائے
نے والوں تک بھی نہ پہنچے"۔

اور اب وہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس نے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھا تھا۔ خاموشی
ب ظرف کی نہیں ہوتی' بدنیتی کی بھی ہوتی ہے۔ بڑی خاموشی سے کسی کی طرف کچھ
انے والا ہاتھ بعض اوقات ضرورت مند کے پردے کا نہیں' اپنے گندے عزائم کے پردے کا
کرتا ہے۔ وہ کاروباری ہاتھ ہوتا ہے اور ایسے کسی کاروبار سے متعلق ہوتا ہے' جو کھلے
ں نہیں کیا جا سکتا۔ اور عزت ہی سب سے سستی جنس ہے اور عزت ہی سب سے مہنگی
اہے۔

لیکن راستے میں بیٹھے بھکاری کی تو کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ کم
م راستے سے گزرنے والوں کے نزدیک تو ہو بھی نہیں سکتی۔ چاہے اپنے تئیں وہ کچھ بھی
تا رہے۔

آج اچانک اسے شاک لگا تھا۔ اس کی بیٹی' اس کی ننھی زیبا جوانی کی سرحد میں قدم
چکی تھی۔ اس کا اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے نزدیک تو وہ وہی تین سال کی بچی
۔ وہ اسے تصور میں دیکھتا تو وہ اسی روپ میں نظر آتی جس میں وہ اپنی بینائی کے آخری دن
صغریٰ کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے پاس تو دیکھنے کے لئے وہی آخری حوالہ تھا اس کا۔
نے بیٹی کو بڑھتے دیکھا جو نہیں تھا۔ وہ تصور میں کیسے اسے جوان دیکھتا! اب وہ سوچ رہا تھا
دنیا کتنی بدل گئی ہو گی۔ چوک میں کتنی تبدیلیاں آ گئی ہوں گی' کتنے نئے مکان بنے ہوں
کتنی نئی دکانیں کھلی ہوں گی۔ کون جانے سامنے والا مکان دو منزلہ ہو گیا ہو' اس کے تو
میں وہی منظر آ سکتا تھا' جو اس نے بینائی گنوانے سے پہلے آخری بار دیکھا تھا۔ اندھے آدمی
لئے تو صرف آخری دید کا حوالہ ہوتا ہے۔ وہ تو اسی ایک حوالے سے گرد و پیش کا تصور کرتا

ہے۔ اچانک بینائی جانا ایسا ہے جیسے کوئی فلم چلتے چلتے ٹوٹ جائے۔ نہیں، ٹوٹ جائے نہ
جگہ روک دی جائے، ساکت ہو جائے، اِسٹل کر دی جائے۔

اس نے سوچا مجھ اندھے کو تو معلوم ہی نہیں کہ پُل کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا
پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو میری اپنی غلطی ہے۔ میری بینائی ہی تو گئی تھی، یادد
نہیں گئی تھی۔ میرے پاس اور حِسیّں بھی تو تھیں، جن سے میں بہتے وقت کے دھا
پیمائش کر سکتا تھا۔ تغیر کو سمجھنے کے لئے حوالے تھے میرے پاس۔ قمرن نے میرے ساتھ
جو کیاری بنائی تھی، جو پودے لگائے تھے، میں جانتا تھا کہ وہ پھل پھول رہے ہیں۔ چنبیلی
دیوار پر بندھی سُتلی کے سہارے چڑھتے چڑھتے خالہ صغریٰ کے گھر میں اتر گئی۔ گلاب بھ
ہیں اور ان کے محافظ کانٹے تیز اور چوکس ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں موتیا کیسے
کے مدھر گیت گنگنائے چلا جاتا ہے۔ اور رات کی رانی کا جادو کیسے سر چڑھ کر بولتا ہے۔
تو میں سمجھتا اور محسوس کرتا رہا، ہاتھوں سے چھو کر قمرن کی ان یادگاروں کو شباب ک
بڑھتے دیکھتا رہا۔ کیا ان کی مدد سے مجھے وقت کے گزرنے کا اندازہ نہیں ہو جانا چاہ
نہیں.......... غلطی میری ہی ہے۔ میں قمرن کی آخری نشانی کی طرف سے اتنا بے خبر کیسے
مجھے کیوں نہیں پتا چلا..........

لیکن جیسے وہ ہر شام چنبیلی کو.......... پودوں کو بڑی نرمی سے سہلاتا تھا، ان کے
پھولنے پر خوش ہوتا تھا، ویسے ہی وہ زیبا کو بھی چھوتا تھا۔ بلکہ زیبا کو تو وہ سینے سے لگا کر
لپٹا کر سوتا تھا، پھر میں کیوں بے خبر رہا؟؟"

لیکن آدمی اور پودوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پودے جلدی بڑھتے ہیں اور آدمی
بڑی مشکل سے پلتے ہیں۔ بہت آہستہ آہستہ.......... غیر محسوس طور پر بڑے ہوتے ہیں
بھی..........

پھر اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ بے خبری اس کی
تھی۔ وہ آنکھوں کا ہی نہیں، عقل کا بھی اندھا ثابت ہوا تھا۔ فطرت نے اسے بار بار اش
کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب فطرت لفظ تو بولنے سے رہی! وہ تو خوش
دھوپ کی.......... مختلف مظاہر کی زبان میں بولتی ہے۔ وہ نہیں سمجھا تو یہ اس کی اپنی
تھی۔

اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔

خاصا عرصہ پہلے.......... اب اس کے پاس وقت کا پیمانہ تو کوئی تھا نہیں، بس دن
گزرتے چلے گئے تھے اور کم ہی دن ایسے تھے جن میں کوئی خصوصیت تھی۔ یہاں تو عید
بھی ایک جیسی ہی گزری تھیں۔ بہرحال کچھ عرصہ پہلے ہر رات اس سے لپٹ کر سونے وا
کچھ بدل سی گئی تھی۔ وہ سمٹ کر سونے لگی تھی۔ وہ اسے خود سے قریب کرتا بھی تو وہ
دیر بعد غیر محسوس طور پر خود کو علیحدہ کر لیتی۔ اس سے دور ہو جاتی۔

پھر اچانک ایک رات اس نے کہا "بابا، میں الگ سوؤں گی"۔
"وہ کیوں بیٹا؟"
"میں بڑی ہو گئی ہوں بابا!"
نجمی کو اس کے لہجے کی معصومیت آج بھی یاد تھی۔ لیکن اس نے اس کی بات کو کوئی
نہیں دی تھی۔ بچوں کو بڑے ہونے کا بڑا ارمان ہوتا ہے۔ یہ کہنا ہر بچے کا خواب ہوتا ہے
میں بڑا ہو گیا ہوں۔ زیبا دوسری چارپائی پر الگ سونے لگی مگر نجمی کو کبھی گمان بھی نہیں ہوا
وہ بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے تصور میں تو بیٹی تین سال کی اس عمر پر ٹھہر گئی تھی، جس میں
نے اسے آخری بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔
اسے ایک اور بات یاد آئی۔ ایک صبح صغریٰ خالہ ناشتا لے کر آئی تو زیبا سو رہی تھی۔ وہ
وقت غسل خانے میں منہ دھو رہا تھا۔ صغریٰ نے زیبا کو جگایا۔ زیبا نے اسے سلام کیا تو وہ
دینے کے بعد بولی "زیبا.......... میری گڑیا۔ دیکھ لڑکیاں ایسے نہیں سوتیں"۔
"اچھا نانی!" زیبا نے جواب دیا تھا۔
اسے اور بھی بہت کچھ یاد آتا رہا۔
اسے ایک بار یوں ہی سا احساس ہوا تھا کہ صغریٰ زیبا پر زیادہ توجہ دینے لگی ہے لیکن
نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔
رات کے کھانے کے بعد اور صبح کبھی کبھی وہ زیبا کو الگ لے جاتی۔ شاید کچھ سمجھاتی
ایسے میں۔ اب سوچنے اور غور کرنے کے بعد وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کی
اب بچی نہیں رہی۔ جوان ہو رہی ہے۔ یہ یقین دلانے کے لئے تو آج کا واقعہ ہی کافی تھا۔
آنکھوں سے محرومی کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ لٹنے والے واقعے کے بعد سے اب
نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے کندھے شل اور جھکے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ یہ آنکھوں سے
ہی تھی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی زیبا بڑی ہو کر کیسی نکلی ہے، پھر اب
کی حفاظت کا بوجھ پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا۔ بیٹی کا بوجھ تو بادشاہوں کے سر اور کندھے
تا ہے، وہ تو پھر ایک بے بضاعت اندھا بھکاری تھا۔
اس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔ اے اللہ میں ہار گیا۔ مجھ پر رحم فرما۔ اس کے دل سے
۔ میری زیبا کی حفاظت فرما۔ اس کے نصیب اچھے کر دے۔
لیکن اسے اپنی اس دعا پر خود بھی یقین نہیں تھا۔ ایک تو پچھلے مصائب، پچھلے موقعوں پر
دعائیں کون سی قبول کی گئیں حالانکہ وہ انہونی نہیں تھی۔ اگر اس وقت خدا نے اس کی
ہوتی تو آج یہ حال کیوں ہوتا۔ خیر اس کڑے وقت نے اسے خدا سے پچھلی تمام تلخیوں
وجود قریب کر دیا تھا لیکن اب وہ اپنی پچھلی نامقبول دعاؤں کی وجہ سے بے اعتمادی محسوس کر
اللہ نے جب نہیں سنی تو اب یہ دشوار دعا کیا سنے گا۔
ایک ایسی لڑکی کے نصیب اچھے کیسے ہو سکتے ہیں، جو ایک بھکاری کی بیٹی ہو۔ بارہ سال

باپ کے ساتھ سڑک پر چادر بچھا کر بیٹھتی رہی ہو۔ جس میں کوئی خوبی' کوئی وصف نہ ہو
تعلیم نہ تربیت' نہ گھرداری کا شعور۔ وصف تو رشتہ مانگنے والے دولت مندوں کی بیٹیوں
بھی ڈھونڈتے ہیں۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ ایسے میں اچھے نصیب..........!

"بابا!" زیبا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کیا.......... کیا بات ہے بیٹا؟"

"گھر نہیں چلنا ہے کیا؟"

نجمی نے کوئی فوری جواب نہیں دیا۔ کیسے دیتا! اسے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ اسے
میں وقت تو لگتا! وہ تو آواز میں کھو گیا تھا۔ کیا یہ زیبا کی آواز ہے؟ وہ حیرت سے سوچ رہا تھا
کب سے ہے؟ یہ آواز کی کھنک اور موسیقیت.......... یہ لہجے میں اتراہٹ۔ یہ تو آتی ہی
کے ساتھ ہے۔ اندھوں کی تو سماعت بینائی بن جاتی ہے۔ میں کیسا اندھا تھا کہ اپنی بیٹی کی
اور لہجے کی تبدیلی بھی محسوس نہ کر سکا۔ یہ تو سورج والی بات ہے۔ سورج چڑھتا ہے تو اندھوں
کو بھی پتا چل جاتا ہے..........

"چلو نا بابا!"

"ہاں' چلو بیٹا چلتے ہیں"۔ گھر پہنچ کر بھی وہ گم صم رہا' بیٹھا سوچتا رہا۔ اب تک اس
بے حسی کی زندگی گزاری تھی۔ بے حسی بھی ایک حصار کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن آج وہ
ٹوٹ گیا تھا۔ اس رات صغریٰ کھانا لائی تو اس نے پوچھا "خالہ' قمرن کی موت کو کتنے برس
گئے ہوں گے؟"

"صغریٰ چند لمحے حساب لگاتی رہی پھر بولی۔ "بارہ سال سے کچھ اوپر ہو گئے ہیں۔

وہ خاموش ہو گیا۔ صغریٰ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کھانے کے دوران وہ سوچتا رہا
راستے پر خطرہ ہو اس پر تو عقل مند آنکھوں والے بھی پاؤں نہیں دھرتے۔ وہ تو پھر اندھا
بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب زیبا کو ساتھ لے کر جانا ٹھیک نہیں۔ اب
ہی جایا کرے گا۔ صغریٰ برتن لے کر جانے لگی تو اس نے آہستہ سے کہا "خالہ' ایک گھڑی
آسکتی ہو؟"

"کیا بات ہے نجمی؟ آج تو پریشان ہے بہت؟"

"ہاں خالہ' اسی سلسلے میں بات کرنی ہے تم سے۔ لیکن زیبا کے سامنے نہیں۔
جائے تو آجانا"۔

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گی"۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد تمام آہٹیں سو گئیں تو اس نے زیبا کو پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا
نے دوسرے پلنگ کی طرف جا کر ٹٹولا وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ کیاری کی طرف بڑھا
اس نے چنبیلی کی بیل کو سہلاتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر خوشبو سینے میں اتار
بڑبڑایا۔ "قمرن.......... میں بھول گیا تھا کہ تم نے اس کیاری میں چار نہیں پانچ پودے

ہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ پانچویں پودے میں مہکتے پھول کھلنے لگے ہیں۔ اب بتاؤ' میں اس کی
حفاظت کیسے کروں! میں تو خود بغیر سہارے کے چل نہیں سکتا"۔

"کچھ دیر بعد صغریٰ آگئی۔ اس نے زیبا کو سوتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ پھر کہا
"اب بتا' کیا بات ہے بیٹا؟"

نجمی نے اپنے دل کا بوجھ اتار دیا "خالہ' مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ بیٹی جوان ہو گئی ہے"۔
اس نے آخر میں کہا "یہ بوجھ میں کیسے اٹھا سکوں گا"۔

"جو بوجھ دیتا ہے وہ بوجھ اٹھانے کی طاقت بھی دیتا ہے"۔ صغریٰ بولی۔

"لیکن میرے ساتھ تو اس نے بڑا ظلم کیا ہے" نجمی کے لہجے میں سرکشی تھی۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹے!" صغریٰ نے نرم لہجے میں کہا "مجھے دیکھ۔ میں نے شوہر ہی نہیں'
چار جوان بیٹے اور دو جوان بیٹیاں گنوائی ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے
ہے اور اس میں انسان کے لئے بہتری ہوتی ہے' جسے وہ سمجھ نہیں پاتا' اور میں یہ بھی جانتی
ہوں کہ اسی شہر میں ہزاروں مجھ سے زیادہ دکھی لوگ بھی ہیں.........."

نجمی نے دل میں تسلیم کیا کہ صغریٰ بہرحال اس سے زیادہ مظلوم ہے۔ اتنا کچھ وہ گنواتا تو
شاید پاگل ہو جاتا۔ تاہم اس نے بہت بے زاری سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قمرن کی
اور میرے بیٹے کی موت میں میرے لئے کیا بہتری تھی۔ ہم نے تو سختی ہی دیکھی ہے"۔

"یہ زندگی تو چند روز کی ہوتی ہے نجمی' اگر یہاں راحت ہے اور اس زندگی میں جو کبھی
ختم نہیں ہوگی' سختی آئی تو وہ زیادہ برا ہے۔ جو یہاں صبر شکر سے سختی جھیل لیتے ہیں' ان کے
لئے وہاں کبھی نہ ختم ہونے والا آرام ہے۔ اس سے زیادہ بہتری اور کیا ہوگی"۔

نجمی تقریباً قائل ہو گیا۔ "خیر خالہ' ان باتوں کو چھوڑو۔ اس وقت تو میرے سامنے ایک
سنگین مسئلہ ہے۔ کل سے میں زیبا کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا"۔

"یہ تو میں تجھ سے بہت پہلے کہنا چاہتی تھی۔ مگر ڈر تھا کہ کہیں تو برا نہ مان جائے۔ پھر
قمرن بھی تو بچی کو اونچ نیچ بتاتی رہتی تھی"۔

"پر خالہ' میں زیبا کو اکیلے گھر میں کیسے چھوڑ دوں گا؟" نجمی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"اکیلی کیوں' وہ میرے پاس رہے گی۔ میں اسے خانہ داری بھی سکھاؤں گی۔ تعلیم تو
نہیں دے سکتی لیکن گھرداری تو سکھا سکتی ہوں اسے"۔

"مگر خالہ' تم کام پر جو جاتی ہو!"

"تو کیا ہوا' اسے بھی ساتھ لے جاؤں گی"۔

"لیکن خالہ.........." نجمی ہچکچایا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں زندگی میں پہلی بار صغریٰ نے اسے ڈپٹ کر کہا "تو سمجھتا ہی
نہیں۔ دنیا سے کٹ کر جینے والا کچھ بھی نہیں سیکھتا۔ جاہل ہی رہتا ہے۔ لوگوں میں اٹھے بیٹھے گی
تو بات کرنے کی تمیز بھی آئے گی۔ میں اس سے کام تھوڑا ہی کراؤں گی!"

نجمی اپنی جہالت کا تو پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اس نے یہ بات بھی مان لی۔ اس کے ا کا بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا۔ پوری طرح تو وہ زیبا کی شادی کے بعد ہی ہلکا ہو سکتا تھا اور وہ ج تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔

"میری ایک بات اور مان لے نجمی!" صغریٰ نے کہا۔

"بولو خالہ!"

"اب تُو کوئی کام شروع کر دے"۔

"صاف کہو نا کہ بھیک مانگنا چھوڑ دے"۔ نجمی نے بے حد تلخی سے کہا۔

"میں نے کوئی بری بات نہیں کہی ہے" صغریٰ نے ملائمت سے کہا "میں تو صرف یہ رہی ہوں کہ اب بیٹی کا باپ بن کر سوچا کر۔ دیکھ کوئی رشتہ آئے گا تو............"

اس کے بعد صغریٰ کہتی رہی لیکن نجمی نے کچھ نہ سنا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ بھی قمرن کی ذہنی سطح کو پہنچ چکا ہے۔ جیسے قمرن کہتی تھی کہ گھر کے نام پر مجھے ایک جھونپڑی مل جائے تو خدا کا شکر ادا کروں گی' ویسے ہی زیبا کا رشتہ اس کے لئے اہمیت اختیار کر گیا۔ اس کی سوچ بھی قمرن کی سی ہو گئی تھی' جیسا بھی ہو' بس زیبا کا رشتہ آجائے تو میں تمام عمر خ شکر ادا کرتا رہوں گا۔

"تُو نے جواب نہیں دیا' میری بات کا!" صغریٰ نے اسے چونکا دیا۔

"خالہ' اب مجھ میں لٹنے کی ہمت نہیں"۔

"ضروری نہیں ہے کہ تُو ہر بار لٹے............"

"لیکن خالہ............!"

"دیکھ' بیٹی کے باپ کے لئے محنت مزدوری میں کوئی برائی نہیں۔ کسی کے لئے نہیں............ خیر تُو مجھ سے زیادہ سمجھتا ہے"۔

"پر خالہ' میں کروں گا کیا؟"

"کچھ بھی۔ جو تجھے مناسب لگے"۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "کسی کام کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟"

"تیرے دیئے ہوئے پیسوں میں سے میں بچت کرتی رہی ہوں۔ پانچ ساڑھے پانچ سو میرے پاس"۔

نجمی کی آنکھیں ممنونیت کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز کہا "شکریہ خالہ' تم نے میری مدد بھی کی اور مجھے صحیح راستہ بھی دکھایا۔ میں سوچوں گا کہ کیا شروع کروں"۔

صبح ناشتے کے بعد زیبا نے کہا "چلو بابا!"

"نہیں بیٹا' آج میں کہیں نہیں جاؤں گا"۔ اس نے کہا "اور آج سے تُو نانی کے جایا کرے گی۔ نانی کے ہی ساتھ رہا کرے گی"۔

"کیوں بابا؟" زیبا گھبرا گئی "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں کہیں نہیں جا رہا ہوں پگلی!" وہ مسکرایا "اب تجھے گھر کے کام سیکھنے چاہئیں۔ نانی سکھا دے گی سب"۔

"اچھا بابا!"

صغریٰ خالہ' زیبا کو لے کر چلی گئی۔ ایک مسئلہ تو آسانی سے حل ہو گیا۔ کام کے لئے نے سوچا کہ وہی پرانا کام مناسب رہے گا' واٹر بال بیچنا۔ بس یہ ہے کہ اب وہ کسی پر اعتبار ں کرے گا۔ دوسرا مسئلہ اس کے اختیار میں نہیں۔ اس نے حقیقت پسند بن کر سوچا' لڑکیوں رشتے کا مسئلہ تو ہمیشہ سے بہت کٹھن رہا ہے۔ پھر اس کی زیبا میں تو کوئی خاص بات ہی نہیں ا۔ وہ صرف تعلیم سے ہی نہیں' تربیت سے بھی محروم تھی۔ صورت شکل کے بارے میں وہ ں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ قبول صورت ہوگی۔ جہاں اتنی کچھ کمی ہو' وہاں جہیز دے کر ہی اسے را کیا جاتا ہے لیکن وہ خود کو بیچ دے تب بھی معمولی سے جہیز تک کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ ے میں کون اس کی زیبا کو پوچھے گا۔ یہ خیال رہ رہ کر نجمی کے دماغ میں ڈنک چبھونے لگا۔

اس نے بارہ برس تک خدا سے لڑائی رکھی تھی۔ اپنی ہر تباہی پر اس سے نالاں رہا تھا۔ ں سے منہ موڑ رکھا تھا لیکن آج بیٹی کی فکر نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور گڑگڑایا "جیسا بھی ہو' میں تجھ سے اپنی بیٹی کے لئے بس ایک رشتے کا سوال کرتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں نخرے نہیں کروں گا۔ پہلے رشتے کو تیری نعمت سمجھ کر قبول کر لوں گا۔ بس اب تُو جان۔ یہ عہد بھی کرتا ہوں کہ جب بوجھ ہلکا ہو گیا تو زندگی کی ہر سانس میں تیرا شکر ادا کروں گا۔ آخری لمحوں تک تیرا شکر گزار ر مطیع رہوں گا۔ کبھی ناشکری' نافرمانی نہیں کروں گا"۔ پھر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

O============☆============O

ایک برس اور بیت گیا۔ زندگی کے دھارے نے اپنا ایک راستہ بنا لیا تھا۔ صبح صغریٰ اور زیبا اس کے ساتھ نکلتیں۔ گیندوں کی بالٹی' پمپ' خالی گیندوں کا تھیلا اور چادر ان کے ساتھ ہوتی۔ وہ اسے اس کی بے در و دیوار اور بے چھت دکان پر چھوڑتیں اور خود کام پر نکل جاتیں۔ وہ بچوں کو لبھانے کے لئے طرح طرح کے نعرے وضع کرتا۔ گیندیں بیچتا۔ دوپہر کے سناٹے میں کھانا کھاتا۔ بالٹی کا جائزہ لیتا اور تازہ گیندیں بھرتا پھر شام کو صغریٰ اور زیبا اسے لینے آجاتیں۔

اس عرصے میں اس کی طمانیت اور بڑھ گئی تھی اور اس کا سبب زیبا تھی۔ صغریٰ کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ زیبا اس کے ساتھ جاتی تھی لیکن ملازمہ کی حیثیت سے نہیں' صغریٰ اس سے بہت لاڈ کرتی تھی۔ کچھ وہ گھرانے بھی بہت اچھے تھے' جہاں وہ کام کرتی تھی۔ صغریٰ ان سے کہتی تھی' یہ پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہے' جو وقت کے پھیر میں آگیا ہے۔ وقت خراب نہ ہوتا تو یہ شہزادیوں کی طرح رہ رہی ہوتی............ زیبا کو ہم جولیاں بھی میسر آگئی تھیں۔ بڑی

عمر کی عورتوں سے اسے شفقت ملتی۔ وہ انسانوں سے تعلقات کی اہمیت سے واقف ہو گئی، جس کا اسے پہلے علم ہی نہیں تھا۔ اسے دوستی کرنا آیا تو بات کرنا بھی آ گیا اور بات کرنا آیا تو خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی۔ پہلے وہ حتیٰ الامکان بولتی ہی نہیں تھی۔ بولتی تو جھجکتی گھبراتی، سہم کر بولتی اور بول کر سہم جاتی۔

نجمی کو افسوس ہوتا کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ بڑھ رہی تھی، یہی تو وقت تھا اسے دیکھنے کا پھر بھی اس کی آواز سے، لہجے سے وہ اس کا ارتقائی عمل محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اسے چہکتے سنتا تو اس کے دل میں کلیاں سی چٹکنے لگتیں۔ جس دن زیبا نے خود اسے کھانا پکا کر کھلایا، اس دن تو اس کے دل میں بہار آ گئی۔ اس نے خوب لپٹا کر زیبا کو پیار کیا اور صغریٰ سے بولا "خالہ......... تم نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے، میں کچھ بھی کر لوں، تمہیں اس کا صلہ نہیں دے سکتا"۔

"تو مسکرا دے نجمی بیٹا، یہی میرا صلہ ہے"۔

نجمی مسکرا دیا۔ دوسری طرف تقدیر بھی مسکرا رہی تھی۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کی زندگی حادثوں سے عبارت ہوتی ہے۔ نجمی بھی ان ہی میں سے تھا۔ اس روز گیندیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ صغریٰ، زیبا کے ساتھ اسے گھر لے جانے کے لئے آئی تو اس نے کہا "خالہ، پہلے مجھے گیندیں اور ربڑ دلوا دو پھر گھر چلیں گے" چنانچہ وہ تینوں بازار کی طرف چل دیے۔

ایک جگہ انہیں سڑک پار کرنا تھا۔ صغریٰ نے نجمی کا ہاتھ تھام لیا۔ شام کا وقت تھا۔ ایسے میں بڑا رش ہوتا ہے، بسوں کی ریس رہتی ہے۔ صغریٰ کی پوری توجہ نجمی پر تھی۔ زیبا پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ رکی ہوئی ایک بس کے آگے سے نکلے ہی تھے کہ سامنے سے ایک اور بس پوری رفتار سے آتی نظر آئی۔ صغریٰ نے جلدی سے نجمی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا "جلدی کر بیٹا" بس کی تیز رفتاری کے باوجود وہ دونوں تیزی سے نکل گئے مگر اگلے ہی لمحے بس کے بریک خوف ناک آواز میں چیخے، فضا میں ایک چیخ گونجی۔ لوگ دوڑ پڑے، ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ چیخ زیبا کی تھی، جو نکلتے نکلتے بس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

"ہائے میری بچی" صغریٰ چلاتی ہوئی سڑک پر گری ہوئی زیبا کی طرف لپکی، وہ نجمی کو بھول ہی گئی۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر کھڑا پاگلوں کی طرح پوچھے جا رہا تھا۔ "کیا ہوا؟ ارے کیا ہوا؟"

کچھ لوگوں نے ڈرائیور کو کھینچ کر بس سے اتارا اور اس کی مرمت شروع کر دی۔ کچھ لوگ زخمی زیبا اور صغریٰ پر جھک گئے۔ صغریٰ تڑپ کر چیخے جا رہی تھی "ہائے میری بچی......... ہائے میری"۔

"اسپتال لے چلو اسے" کسی نے کہا۔

"کیا ہوا کیا؟" نجمی پوچھے جا رہا تھا۔

"اندھے ہو کیا؟" برابر کھڑے راہ گیر نے کہا "دیکھتے نہیں، ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے"۔

"ہاں، میں اندھا ہوں۔ بتاؤ کیا ہوا ہے؟" نجمی نے برا مانے بغیر کہا۔

راہ گیر نے مڑ کر اسے دیکھا "معاف کرنا بابا!" اس کے لہجے میں معذرت تھی "ایک لڑکی ...کی لپیٹ میں آ گئی ہے"۔

ایک ٹیکسی روک لی گئی تھی۔ زیبا کو اس میں لٹایا جا رہا تھا تب صغریٰ کو نجمی کا خیال ... اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، نجمی پر نظر پڑتے ہی وہ چلائی "ارے......... اسے تو بلاؤ، یہاں لاؤ ...ے، یہ لڑکی کا باپ ہے"۔

کچھ لوگوں نے بھیڑ ہٹائی اور نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیکسی تک لے آئے، "بیٹھ بابا" ...ے طرف وہ بیٹھا اور دوسری طرف صغریٰ۔ زیبا کا سر نجمی کی گود میں تھا۔ وہ زیبا کا سر سہلاتا ...

"کیا ہوا میری بٹیا، کیا ہوا رانی؟" وہ خود کلامی کر رہا تھا پھر اس نے صغریٰ سے پوچھا "کیا بات ہے خالہ؟ یہ بولتی کیوں نہیں؟"

"بے ہوش ہو گئی ہے بیٹا!" صغریٰ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس نے ٹکر مار ...."

نجمی اچھل پڑا "کیا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ میری زیبا......... میری جان......... ہم ...ہاں جا رہے ہیں؟"

"عباسی شہید اسپتال" صغریٰ نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

اسپتال کا نام سنتے ہی نجمی کے وجود میں سناٹے تیر گئے "عباسی شہید اسپتال؟" وہ بڑبڑایا۔

ایمرجنسی وارڈ میں ہمیشہ کی طرح ایمرجنسی ہی تھی۔ مریضوں اور زخمیوں کی کراہیں اور ...ئیں تھیں۔ ان کے متعلقین کا شور تھا۔ ڈیوٹی پر صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ بری طرح پریشان تھا ...کہ کس کو دیکھے اور کسے نہ دیکھے۔ وہ ایک مریض کو دیکھ رہا ہوتا تو دوسرے کے متعلقین اس ...کی آستین کھینچ رہے ہوتے۔ بے چارہ ڈاکٹر اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔

زیبا کو ایک بینچ پر ڈال دیا گیا تھا، صغریٰ اور نجمی بے بسی کی تصویر بنے آس پاس کھڑے تھے۔ وہ اب بھی بے ہوش تھی۔

اچانک وہاں سے گزرتے ہوئے ڈیوٹی ڈاکٹر کی نظر زیبا کے چہرے پر پڑی۔ وہ بری طرح ٹھٹکا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے، جیسے زیبا کو وہاں دیکھ اسے شاک لگا ہو "اس کے......... اس کے ساتھ کون ہے؟" وہ لہجے سے گڑبڑایا ہوا لگ رہا تھا۔

صغریٰ جلدی سے بولی "میں ہوں، اور یہ اس کا باپ ہے" اس نے نجمی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہوا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا اور پھر دوسرے مریضوں کے متعلقین پر برس پڑا جو اسے گھیرے کھڑے تھے "آپ لوگ بھیڑ نہ لگائیں۔ مجھے اس مریضہ کو دیکھنے دیجئے۔ اس کے بغیر میں یہاں سے نہیں ہلوں گا"۔

بھیڑ تو نہیں چھٹی۔ البتہ کچھ سکون ہو گیا۔ اکلوتے ڈیوٹی ڈاکٹر سے الجھنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔

"اسے کیا ہوا بڑی بی؟" اس نے قریب کھڑی صغریٰ سے پوچھا۔

"ایکسیڈنٹ ہوا ہے" صغریٰ نے جواب دیا "بس سے"۔

"تب تو یہ پولیس کیس ہے۔ پولیس رپورٹ سے پہلے ہم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے"۔

صغریٰ سہم گئی۔ جب تک پولیس میں رپورٹ درج نہ ہو' ڈاکٹر ایسے مریضوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر بول پڑا "خیر.......... یہ بتاؤ چوٹ کہاں آئی ہے؟"

"میرا خیال ہے سر پر.........."

ڈاکٹر جھک کر زیبا کا معائنہ کرنے لگا "ایکسیڈنٹ کے بعد سے مسلسل بے ہوش ہے؟"

"جی ہاں"۔

"کتنی دیر ہوئی ہو گی؟"

"پون گھنٹا ہو گیا.........."

"سر کی چوٹ میں بے ہوشی خطرناک ہوتی ہے" ڈاکٹر بڑبڑایا پھر بولا "دیکھئے میں انہیں ایڈمٹ کر رہا ہوں۔ ہم انہیں انڈر آبزرویشن رکھیں گے"۔

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!"

"زیبا کو انتہائی نگہداشت کے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ صغریٰ اور نجمی باہر کھڑے رہے۔ دونوں مہر بہ لب تھے' اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ نجمی جو کچھ سوچ رہا تھا' وہ اگر صغریٰ کو معلوم ہو جاتا تو وہ یہی سمجھتی کہ صدمے سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے حالانکہ وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں تھا۔ وہ اس وقت بہت حقیقت پسندی سے سوچ رہا تھا۔ بیٹی کی محبت اپنی جگہ' لیکن وہ جانتا تھا کہ اس بوجھ کو وہ عمر بھر اٹھا بھی نہیں سکتا اور پھر زندگی کا کیا بھروسا! وہ کس پر چھوڑ کر جائے گا اسے؟ دور دور تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ وہ یہ بوجھ کسی اور کو منتقل کر سکے گا۔ پھر وہ بیٹی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا خزانہ تھی' جس کی وہ آنکھوں سے محروم ہونے کے باعث پاسبانی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے تو اس نے خدا کے سامنے جھولی پھیلائی تھی کہ اس کے لئے رشتہ آجائے! لیکن کیا ضروری تھا کہ اس کی دعا مقبول بھی ہو جائے! ایسے میں یہ حادثہ تائید غیبی ہی تھا۔ اس کے نتیجے میں مسئلہ حل بھی ہو سکتا تھا۔ اگر..........

اپنی اس سوچ پر ایک لمحے کو اس کی روح بھی لرز کر رہ گئی۔ بیٹی.......... پھول سی بیٹی کی موت کی خواہش! لیکن پھر اس کی سوچ نے پلٹا کھایا۔ اس کے سوا حل ہے ہی کیا؟ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت لاکھ درجے بہتر ہوتی ہے۔ پہلی بار تو خدا نے میرے حق میں کوئی سبیل پیدا کی ہے۔ اس نے سوچا' میں نے دعا ہی غلط کی تھی۔ زیبا کے لئے رشتہ مانگنا میری

حماقت تھی۔ مجھے بیٹی کی موت کی ہی دعا کرنی چاہئے تھی.......... اسے جھرجھری آگئی۔

صغریٰ ڈاکٹر اور اس کے رویے کے بارے میں سوچ کر الجھ رہی تھی۔ وہ خود بھی اسپتال میں رہی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت حال سے بھی واقف تھی۔ وہاں تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر زیبا کو دیکھ کر چونکا تھا اور اس کے بعد ہی اس نے زیبا پر توجہ دی تھی اور اتنی دی تھی کہ وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ سوچتی اور الجھتی رہی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ڈاکٹر نے زیبا کو پہلے کہیں دیکھا ہو۔

"مریضہ کو ہوش آگیا ہے" ڈاکٹر نے انہیں چونکا دیا "اب پریشانی کی بظاہر تو کوئی بات نہیں۔ پھر بھی احتیاطاً" میں اسے وارڈ میں بھجوا رہا ہوں۔ دو ایک دن وہاں رہے گی وہ.........."

"ہم اس سے مل سکتے ہیں؟ صغریٰ نے پوچھا۔

"وارڈ میں مل لیجئے گا"۔

دس منٹ بعد زیبا کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ نجمی اور صغریٰ اس سے جا کر ملے۔ وہ ہوش میں تھی۔

"بابا' پریشان نہ ہونا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ وہ بولی۔ اسے باپ کی دلی کیفیت کا علم نہیں تھا۔ اسے کیا معلوم کہ اس کے بابا کے ذہن میں جوار بھاٹا ہے۔

"بس.......... اب آپ لوگ جائیں" ڈاکٹر نے وارڈ میں آکر کہا۔ "مریضہ کو آرام کرنے دیں۔ آپ صبح ان سے ملنے آسکتی ہیں۔ البتہ باپ کو ملاقات کے اوقات میں آنا ہوگا.......... شام چار بجے سے چھ بجے کے درمیان۔ یہ لیڈیز وارڈ ہے نا.........."

دونوں گھر آگئے۔ ان کی بھوک اڑ چکی تھی۔ سو وہ بغیر کھائے سو گئے۔ نجمی کو خود بھی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی پر سکون نیند سو سکے گا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ اس کے خدا پر مکمل یقین کی وجہ سے ہے۔ اس نے اپنا ہر معاملہ' ہر مسئلہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ صبح صغریٰ ناشتا لائی۔ اس کا خیال تھا کہ نجمی حجت کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ نجمی نے بڑے سکون سے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد صغریٰ نے پوچھا "نجمی بیٹا' تو گھر پر ہی رہے گا یا میرے ساتھ چلے گا؟"

"کہاں خالہ؟"

"اسپتال اور کہاں!" صغریٰ نے حیرت سے کہا "نہ جانے بچی کس حال میں ہو گی"۔

"انشاء اللہ سب ٹھیک ہی ہو گا خالہ"۔

صغریٰ کی حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ اسے منہ کھولے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی کایا پلٹ ہے۔ کہیں مسلسل صدمات کے بعد بیٹی کے ایکسیڈنٹ نے اس کا دماغ تو نہیں الٹ دیا؟ اتنی بے فکری' ایسی بے نیازی..........!

"خالہ میں اسپتال جا کر کیا کروں گا۔ ملاقات تو ہو نہیں سکتی"۔ نجمی نے کہا۔

"ہاں' یہ تو ہے۔ تجھے باہر رکنا پڑے گا"۔

"نہیں خالہ' میں تو دھندے پر جاؤں گا۔ مجھے شام کو اسپتال لے چلنا"۔

صغریٰ نے اس کی دکان داری کا سامان لیا اور اسے لے کر گھر سے نکل آئی۔ اسے درخت کے نیچے چھوڑ کر وہ کام والے گھر گئی۔ وہاں زیبا کے حادثے کا بتایا اور چھٹی لے کر اسپتال کی طرف چل دی۔

"ڈاکٹر صاحب نے میرا بہت خیال رکھا ہے" زیبا نے بتایا۔ "میں نے چھٹی کا کہا تو منع کر دیا۔ کہنے لگے 'کم از کم دو دن اور رکنا ہوگا"۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں بیٹی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں نانی' بابا کیسے ہیں؟ بہت پریشان ہوں گے وہ؟"

"پریشان تو ہے لیکن خود پر قابو پائے ہوئے ہے۔ شام کو لے کر آؤں گی اسے۔

صغریٰ وارڈ سے نکلی تو باہر ڈاکٹر یوں کھڑا ملا جیسے اس کا منتظر ہو۔

"صغریٰ پریشان ہو گئی۔ "اماں' مجھے تھوڑا سا وقت دے سکیں گی آپ؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں' کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب!"

"یہاں نہیں۔ کمرے میں چلیں۔ مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنا ہے"۔

صغریٰ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے درست ہی محسوس کیا تھا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ بہرحال یہ اچھی بات تھی کہ جو کچھ بھی تھا اب سامنے آنے والا تھا۔ کہیں زیبا کو کوئی اندرونی چوٹ تو نہیں آئی؟ خدانخواستہ اس کے بارے میں کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟ اس کا ذہن اندیشوں سے بھر گیا۔

"بیٹھئے" کمرے میں جا کر ڈاکٹر نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب' زیبا کے بارے میں کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں اماں۔ اسے انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟" صغریٰ نے اسے شک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"اماں.......... میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں"۔

"کیوں؟" صغریٰ محتاط ہو گئی۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا"۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب' پہلے مجھے وجہ معلوم ہونی چاہئے۔ آپ اس میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ ہم غریب لوگ ایسی باتوں سے بہت ڈرتے ہیں"۔

ڈاکٹر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ تاہم اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھ پر اعتبار کرو اماں۔ میں تمہیں ایسا ویسا نظر آتا ہوں کیا؟"

"کیا کریں بیٹا' زمانہ ہی ایسا ہے" صغریٰ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور پرائی چیز کی بڑی ذمے داری ہوتی ہے"۔

"اماں' تم مجھے پہلے اس کے بارے میں بتاؤ۔ پھر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا"۔ ڈاکٹر

نے تحمل سے کہا۔ صغریٰ نے چند لمحے ڈاکٹر کو بغور دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ ایسا ویسا نہیں لگتا۔ اچھے خاندان کا شریف آدمی ہے۔ لہٰذا بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ پتا تو چلے کہ بات کیا ہے! اس نے زیبا کے متعلق' جو کچھ جانتی تھی' ڈاکٹر کو بتا دیا۔ ڈاکٹر بڑے غور سے سنتا رہا۔

صغریٰ کے خاموش ہونے پر وہ بولا "اب میرے بارے میں سن لو۔ میرا نام وحید الدین ہے۔ میں اپنے تایا حمید الدین صاحب کے پاس نارتھ ناظم آباد میں رہتا ہوں۔ سوا سال پہلے ہم پر ایک المیہ گزرا' جس کے اثرات سے ہم' خاص طور پر تایا جان اب تک نہیں سنبھل سکے ہیں۔ کار کے حادثے نے میری امی' ابو' تائی جان اور میری تایا زاد بہن صوفیہ کو ہم سے چھین لیا۔ خاندان میں صرف ہم دو ہی افراد بچے۔ میں اور تایا جان۔ تایا جان کا بہت بڑا کاروبار ہے لیکن اب وہ زندگی سے ہی دور ہو گئے ہیں۔ انہیں صوفیہ سے بہت محبت تھی۔ ان کی جوان موت نے انہیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ خود میں نے تو اپنے آپ کو اسپتال کے لئے وقف کر دیا ہے"۔

اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا جس نے صغریٰ کے دل کو چھو لیا۔ اس نے سوچا' رنج والم' محرومیاں اور موت صرف غریبوں ہی کے لئے نہیں' ان سے دولت والے بھی نہیں بچتے "لیکن بیٹا' ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"آپ لوگ مجھے اور تایا جان کو سکون دے سکتے ہیں۔ ہمیں پھر سے زندہ دل کر سکتے ہیں"

"وہ کیسے؟"

"زیبا کو ہمیں دے دیجئے"۔

صغریٰ سن ہو کر رہ گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اگر اس کے سر پر ایک اندھے باپ کے سوا کوئی نہیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ بکاؤ مال ہے!" اس کے لہجے میں غضب کی کاٹ تھی۔

"غلط نہ سمجھیں۔ دراصل صورت حال ایسی ہے کہ میں ٹھیک طور سے سمجھا نہیں پا رہا ہوں آپ کو۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس طرح کی کوئی بات کرنا پڑے گی۔ یہ باتیں تو عورتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ خیر.........." ڈاکٹر نے میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر نکال کر صغریٰ کی طرف بڑھا دی "آپ ایک نظر اسے دیکھیں ذرا..........؟"

صغریٰ نے تصویر کو ایک نظر دیکھتے ہی بے ساختہ کہا "ارے یہ.......... یہ تو زیبا کی تصویر ہے! تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟"

یہ زیبا کی تصویر نہیں ہے اور یہ بات آپ بھی جانتی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں.........."

صغریٰ کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ زیبا کی تو کبھی کوئی تصویر کھینچی ہی نہیں۔ اس نے تصویر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ زیبا نہیں تھی لیکن شکل ہو بہو زیبا جیسی تھی۔ عمر میں وہ زیبا سے تین چار سال بڑی ہوگی۔ تصویر میں وہ جدید طرز کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایسا لباس زیبا نے خواب

میں بھی نہیں پہنا ہوگا۔ اگر تصویر والی لڑکی زیبا کے سے سادہ لباس میں ہوتی تو وہ اسے زیبا
کی تصویر سمجھتی۔ ڈاکٹر کسی بھی طرح اسے قائل نہ کرپاتا کہ تصویر زیبا کی نہیں ہے۔
"یہ.......... یہ تصویر کس کی ہے؟" اس نے پوچھا۔
"یہ میری تایا زاد بہن صوفیہ کی تصویر ہے' جس کی موت نے میرے تایا کو زندہ در گور
کر دیا ہے" ڈاکٹر وحید نے کہا "اور یہ میری منگیتر بھی تھی"۔
"مجھے بہت دکھ ہوا سن کر۔ مگر بیٹے' میں کیا کر سکتی ہوں؟"
"بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ میں نے کہا نا' آپ مجھے اور تایا جان کو سکون دے سکتی ہیں
انہیں زندہ کر سکتی ہیں پھر سے"۔
"اگر زیبا میری بیٹی یا نواسی ہوتی تو شاید میں کچھ کر سکتی" صغریٰ نے دکھ بھرے لہجے
کہا "لیکن بیٹے' اس پر میرا کوئی حق نہیں' اور اس کا اندھا باپ بہت خود دار ہے۔ اب تو
انسانوں پر اعتماد بھی نہیں رہا.........."
"لیکن وہ ایک بیٹی کا غریب باپ ہے اماں!" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیسی
مجبوری سہی' ایک زمانے میں وہ بھیک بھی مانگ چکا ہے۔ یہ زمانہ بھاری جہیز کا ہے اماں! بغیر
کے تو حسین ترین لڑکیاں بھی رشتے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بڑھاپے تک پہنچ جاتی ہیں۔
زیبا کا باپ پڑھا لکھا' سمجھدار آدمی ہے تو وہ یہ بھی سمجھتا ہوگا کہ زیبا کو ایک اچھی زندگی
نہیں دے سکتا۔ لیکن ہم دے سکتے ہیں.........."
بھیک کے حوالے پر صغریٰ کی رنگت متغیر ہوگئی "میں تمہیں ایک مشورہ دے سکتی
ڈاکٹر!" اس نے سرد لہجے میں کہا "زیبا کے باپ سے ملو تو اس انداز میں بات کرنے کی غلطی
کرنا۔ وہ ضرورت مند ہے لیکن تم اس سے بہت زیادہ ضرورت مند ہو۔ ضرورت مندوں
لہجہ راس نہیں آتا۔ میری بات تمہیں کڑوی تو لگے گی.........."
"نہیں اماں' تم نے بالکل ٹھیک کہا" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "اب مجھ پر ایک
اور کر دو' مجھے زیبا کے بابا سے ملوا دو۔ آج شام وہ زیبا سے ملنے آئیں گے نا؟"
"ہاں' تم آج ہی اس سے بات کر لینا۔ اب میں چلتی ہوں"۔
صغریٰ کے جانے کے بعد ڈاکٹر دیر تک سوچتا رہا۔ اسے ایک لاینحل مسئلے کا حل تو
تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے ہینڈل کر بھی سکے گا یا نہیں۔ اس نے تو
تھا' اندھے بھکاری کو کچھ دے دلا کر معاملہ کر لے گا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے
سنبھل کر بات کرنا ہوگی اور بڑا مسئلہ تایا جان تھے۔

☆

کام سے واپس جاتے ہوئے صغریٰ' نجمی کے پاس گئی۔ اس کا سامان دکان داری
پہنچوا کر وہ اسے اسپتال کی طرف لے چلی۔ راستے میں اس نے اسے ڈاکٹر کے متعلق بتایا۔
"اس کا یہ کہنے کا کیا مطلب تھا کہ زیبا کو ہمیں دے دیں؟" نجمی نے پوچھا۔

"شادی کے لئے ایسے ہی کہا جاتا ہے"۔
"لیکن خالہ.........."
"تو تو دکھ سمجھ سکتا ہے بیٹا اس کا۔ اس کے گھر میں تو کوئی ہے نہیں جو بات کرے۔ ہے
ہے! بھرا گھر اجڑ گیا بے چارے کا" صغریٰ نجمی کو ڈاکٹر کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کر
رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نجمی کے دل میں ڈاکٹر کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔
"تو اصولاً بات اس کے تایا کو کرنی چاہئے" نجمی نے نکتہ اٹھایا۔
"پہلے تو اس سے بات تو کر لے"۔
"ٹھیک ہے خالہ!"
نجمی کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا' خدا نے اس کی سن لی ہے۔ اس کا
وجود خوش امیدی سے جیسے بھر گیا تھا۔ اسپتال پہنچ کر وہ زیبا سے ملا۔ ملاقات کا وقت پورا ہونے
تک وہ اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو وہ وارڈ سے نکل آیا۔
صغریٰ اسے ڈاکٹر کے کمرے میں لے گئی۔ ڈاکٹر نے بڑے تپاک سے نجمی سے مصافحہ کیا اور
خیریت دریافت کی۔
"خالہ نے مجھے تمہارے متعلق بتایا" نجمی نے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا سن کر"۔
"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا بڑے صاحب! میرے لئے تو اب کوئی اچھی صورت نکلی ہے۔
میرے لئے تو یہ مقام شکر ہے"۔
"میں سمجھا نہیں۔ بہت سی باتیں مجھے خالہ بھی نہیں سمجھا سکیں' تمہارے ذہن میں کیا
ہے ڈاکٹر؟"
"زیبا ہو بہو میری تایا زاد بہن صوفیہ جیسی ہے۔ صوفیہ ہمیں واپس مل جائے تو میں اور
تایا جان پھر سے جی اٹھیں گے"۔
"کھل کر بات کرو ڈاکٹر وحید!"
"صوفیہ میری منگیتر تھی' اس سے میری شادی ہونے والی تھی۔ تایا جان کی وہ اکلوتی
اولاد تھی" ڈاکٹر وحید نے کہا۔ وہ اس اندھے شخص سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس کا لب و لہجہ نہ
صرف اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی غمازی کر رہا تھا بلکہ اس میں وہ رچاؤ بھی تھا' جو زندگی کو ہر
روپ میں بہت قریب سے دیکھنے والوں ہی کو میسر آتا ہے۔ نجمی خاموش بیٹھا رہا۔ خاموشی کہہ
رہی تھی کہ ابھی اس کے نزدیک ڈاکٹر کی بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔
ڈاکٹر وحید چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں زیبا سے شادی کرنا
چاہتا ہوں"۔

اندھے نجمی کے لئے وہ لمحہ ایسا تھا' جیسے اسے اس کی کھوئی ہوئی بینائی مل گئی ہو۔ زندگی
کی سب سے بڑی خوشی اس کے سامنے بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس نے بے حد شفقت سے
کہا "لیکن بیٹے' ایسی باتیں یوں تو نہیں کی جاتیں' زندگی میں ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں'

کوئی سلیقہ ہوتا ہے۔ یہ بات یہاں' اسپتال میں تمہیں مجھ سے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یہ با میرے گھر میں' تمہارے تایا جان کے منہ سے اچھی لگتی.........."

"آپ درست فرما رہے ہیں انکل!" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "لیکن آپ ان مجبوریوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں"۔

"کس مجبوری کی بات کر رہے ہو؟" نجمی نے پوچھا۔

"جو کچھ میں کہوں گا' اس سے آپ کو توہین کا احساس ہوگا لیکن کہے بغیر چارہ نہیں" ڈاکٹر وحید نے عاجزی سے کہا۔

"تم کھل کر بات کرو بیٹے' میں بدترین توہین پہلے ہی جھیل چکا ہوں"۔ نجمی کا لہجہ ا بھی شفقت آمیز تھا۔ اس لمحے اسے یاد آگیا کہ کوئی لفنگا اس کی بیٹی کو نوٹ دکھا رہا تھا۔ ا توہین نے تو اسے پھونک کر رکھ دیا تھا۔ یہ تو رشتے کی بات تھی.......... عزت کی بات!

"بات یہ ہے انکل کہ میں تو انسانوں کے معاملے میں اونچ نیچ کا قائل نہیں ہوں لی میرے تایا مختلف آدمی ہیں۔ میرا یہ کہنا بدتمیزی کے مترادف ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ا دولت کے گھمنڈ میں وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ ملازموں اور چھوٹے لوگوں کے ساتھ ان برتاؤ بہت خراب ہوتا ہے۔ پھر اس المیے کے بعد وہ چڑچڑے بھی بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ وجہ ہے کہ وہ آپ کے گھر زیبا کا رشتہ مانگنے نہیں آسکتے بلکہ میں نے انہیں اس سلسلے میں بتایا بھی نہیں ہے.........."

"تو پھر میری بیٹی کو اس گھر میں بہو اور بیٹی کا مقام کیسے دلوا سکو گے؟" نجمی کا لہجہ تلخ گیا۔

"دیکھئے انکل' صورت حال کو دیکھتے ہوئے جہاں تک میں سمجھا ہوں اور اس کا جو میر نظر میں حل ہے' وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ میری کچھ باتیں آپ کو بے رحمانہ لگیں گی لی حقیقت پسند بن کر سوچیں گے تو آپ مجھے معاف کر دیں گے"۔ ڈاکٹر وحید نے کہا۔ وہ چند سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ بالآخر اس نے کہا "لیکن پہلے میں دونوں طرف مسائل اور پوزیشن سامنے لے آؤں تو بہتر ہوگا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اب میرا تایا جان کے اور تایا جان کا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ حادثے کے بعد تایا جان کے اندر جو تھوڑ بہت نرمی تھی' وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ ان کی رعونت اور بددماغی بڑھ گئی ہے وہ آدم بیزار ا چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں' کہیں آتے جاتے نہیں۔ بس اپنی کاروبار مصروفیات میں الجھے رہتے ہیں۔ اب ایسے میں اگر انہیں صوفیہ کی ہم شکل زیبا مل جائے تو اسے اپنی بہو اور بیٹی کے طور پر قبول کرلیں گے لیکن ایک بات ہے۔ اگر بیٹی کے طور پر والی زیبا تعلق کی کسی ڈور میں بندھی ہوگی تو وہ جذباتی عدم تحفظ کا شکار رہیں گے اور...... میری بات کا برا نہ منایئے گا' میں پہلے ہی معذرت کر رہا ہوں' اگر اس تعلق کا بیک گراؤنڈ ا نہ ہوا تو وہ ہم شکل ہونے کے باوجود اپنے دل میں اسے بیٹی کا مقام نہیں دے سکیں گے"۔

نظریں اٹھا کر نجمی کے چہرے کو دیکھا جو اب تمتما رہا تھا "پلیز انکل!" اس نے ملتجیانہ لہجے کہا۔ "پہلے میری پوری بات ٹھنڈے دل سے سن لیں۔ آخری فیصلہ تو آپ کو ہی کرنا ہے۔ عرض کرنا ہے کہ صوفیہ کی ہم شکل لڑکی تعلق اور رشتے کی کسی ڈور سے بندھی نہ ہو' دنیا میں اکیلی ہو تو تایا جان فطری طور پر تحفظ محسوس کریں گے۔ وہ اسے فوراً ہی بیٹی کا مقام دیں گے' یہ سوچ کر اب وہ ان کی اپنی ہے اور وہ اسے آسانی سے اپنے من پسند رنگ میں سکتے ہیں"۔

"لیکن یہ.........."

"پلیز انکل' پہلے مجھے بات پوری کرنے دیں۔ اس کے بعد میں آپ کے ہر سوال کا اب دینے کی کوشش کروں گا۔ دوسری طرف میں ہوں۔ میں صوفیہ سے محبت کرتا تھا۔ میری سے شادی ہونے والی تھی۔ میں نے زیبا کو جو تھوڑا بہت دیکھا ہے تو اس سے مطمئن ۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری صوفیہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بہتر ہی ہے۔ اسے اپنی محرومیوں سے بچا کر خوشیوں بھری زندگی دینا چاہتے ہیں۔ آپ سے مل کر' آپ گفتگو سن کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ پڑھے لکھے سلجھے ہوئے انسان ہیں' جسے وقت مقدر کی سختیاں بھی نہیں کچل سکی ہیں۔ لیکن آپ وسائل سے محروم ہیں۔ سو انکل' میں شخص ہوں جو آپ کی بیٹی کو ایک گھر' عزت کی زندگی' محبت اور خوشیاں دے سکتا ہے۔ میں سے وعدہ کرتا ہوں کہ زیبا کو اپنی بساط سے زیادہ خوشیاں دوں گا۔ اس کا دل کبھی میلا نہیں نے دوں گا۔ یوں دونوں طرف کے مسئلے بخوبی حل ہو سکتے ہیں.........."

نجمی کے وجود میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پھر بھی اس نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم زیبا کو دنیا میں اکیلی کس طرح بتا سکو گے؟"

"میں پھر معذرت چاہتا ہوں۔ میری بات آپ کا سفاکانہ لگے گی لیکن مسئلے کا حل یہی ہے۔ میں زیبا کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا اور تایا جان سے کہوں گا کہ میں اسے کسی رفاہی ادارے سے لایا ہوں.......... صرف اس لئے کہ یہ صوفیہ کی ہم شکل ہے"۔

نجمی کا چہرہ ست گیا۔ صغریٰ کے چہرے پر سوئیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بار بار ملتجیانہ نظروں سے ڈاکٹر وحید کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

"سرجن ہو نا" بالآخر نجمی کے لب ہلے۔ اس کا لہجہ بہت دھیما تھا "گلے سڑے ناکارہ اعضاء کو ایک منٹ میں کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دینے کے قائل۔ جذباتیت سے پاک.........."

"میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں انکل۔"

"اچھا' ایک بات بتاؤ لیکن پہلے یہ تا دوں کہ ہم صرف مفروضوں پر بات کر رہے ہیں۔ اگر تمہارے تایا جان نے زیبا کو پھر قبول نہیں کیا تو کیا ہوگا؟"

"میں اپنے طور پر ایک مکمل اور آزاد مرد ہوں انکل" ڈاکٹر وحید نے مضبوط لہجے میں کہا

"اس صورت حال میں میں تایا جان کو چھوڑوں گا اور زیبا کے ساتھ اپنا الگ گھر بسالوں
میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا کیونکہ میں نے تایا جان کو زندگی کی خوشیاں لوٹانے کی بڑی
کوشش کی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تایا جان خود میری اور زیبا کی شا
کرائیں گے، خوشی سے۔"

"تمہارا مطلب ہے، زیبا سے تمہاری شادی تمہارے گھر پر ہوگی۔"

"یہ مجبوری ہے انکل۔"

"اور میں اس شادی میں شریک بھی نہیں ہوں گا۔"

ڈاکٹر وحید نے کوئی جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔

"چل نجمی، چلیں یہاں سے" صغریٰ نے غصے سے کہا "اب برداشت نہیں ہوگا
ہے۔"

"نہیں خالہ، لڑکی والوں کو تو بہت کچھ سننا پڑتا ہے اور پھر میری زیبا تو ہے
بد نصیب......" نجمی نے بجھے دل سے کہا۔

"ایسا نہ کہیں انکل" وحید نے التجا کی "آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"کر رہا ہوں...... بڑے خلوص سے کر رہا ہوں" نجمی نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں
"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری بیٹی میری چوکھٹ سے وداع نہیں ہوگی؟"

"جی انکل۔"

"اور میں شادی کے بعد اپنی بیٹی سے نہیں مل سکوں گا؟"

"باپ کی حیثیت سے...... نہیں لیکن ایسا زیادہ عرصے تک نہیں ہوگا۔ کچھ عرصے
جب تایا جان زیبا کو صوفیہ کی حیثیت سے قبول کرلیں گے، تو ہم انہیں سب کچھ بتادیں گے
پھر وہ حجت نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے، زیبا کو کھونا انہیں گوارا نہیں ہوگا......"

"مجھے بہلاوا دے رہے ہو!" نجمی نے تیز لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر وحید کی نظریں جھک گئیں۔

"اور تمہارے خیال میں یہ دونوں طرف کے مسائل کا حل ہے؟ میں تمہیں جانتا نہیں
پہچانتا نہیں۔ بغیر شادی کے اپنی معصوم بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں؟ اور اس
کہوں کہ بیٹی، اس شخص کے ساتھ چلی جا اور بھول جا کہ تیرا کوئی باپ بھی تھا۔ یہی چاہتے
تم؟"

"دیکھئے انکل...... لڑکے والے جہیز کے نام پر طرح طرح کے مطالبے کرتے ہیں اور لڑ
کے والدین سو سو جتن کرکے انہیں پورا کرتے ہیں۔ سمجھ لیں، میں آپ سے صرف یہی
مانگ رہا ہوں۔"

نجمی اب تک انگاروں پر کھڑا رہا اور ان انگاروں کی تپش اس کے پورے وجود کو

تھی۔ اس کی انا اس کے دماغ میں پھن کاڑھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی حقیقت
ی نے اسے ان پھنکاروں کی طرف سے کان بند کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس تمام گفتگو کے
ران بننے کے ساتھ ساتھ وہ سوچتا بھی رہا تھا اگر بیٹی کا گھر بس جائے اور وہ ہنسی خوشی عزت
ساتھ زندگی گزارے تو اس کے عوض وہ مر بھی سکتا ہے۔ اب زندگی میں اور تھا ہی کیا! پھر
نے خدا سے کہا تھا...... جیسا بھی ہو، میں تجھ سے اپنی بیٹی کے لئے بس ایک رشتے کا سوال
تا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں نخرے نہیں نہیں کروں گا۔ پہلے ہی رشتے کو تیری نعمت
ہ کر قبول کرلوں گا......۔ مگر یہ کیسا رشتہ ہے کہ بیٹی دلہن بن کر اس کے گھر سے وداع نہیں
رہی ہے بلکہ یوں لے جائی جارہی ہے جیسے نیلامی میں بولی سے چھڑائی گئی کوئی چیز۔ دوسری
ف اگر یہ رشتہ تھا تو ایسا رشتہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ شاید وہ خدا کی طرف سے
ہی تھی۔

بہرحال ایک بات تھی۔ ڈاکٹر وحید اپنی باتوں سے، اپنے لہجے سے اسے کھرا آدمی معلوم
رہا تھا پھر بھی...... اسے وہ شخص یاد آیا جو اس کے نوٹ بدلوانے لے گیا تھا، جس نے اسے
مانگنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ نوٹ تھے، یہ تو بیٹی تھی...... اس کی عزت، اس کی آبرو،
کھوں سے محروم آدمی کسی پر اعتبار کرسکتا ہے؟

دل نے کہا۔ ہاں، خدا پر کرسکتا ہے اور کرنا چاہئے۔ تم نے اس سے جو مانگا تھا، وہ اس
تمہیں دے دیا۔ اب کیوں کفران نعمت کرتے ہو۔ اور وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

"ٹھیک ہے بیٹے" اس نے کہا "میں تمہیں تمہارا منہ مانگا جہیز دینے پر تیار ہوں۔ میں
دی کے بعد بھی کبھی اس سے نہیں ملوں گا لیکن ایک شرط میری بھی ہے۔"

"فرمائیں انکل۔"

"تم چاہے چار آدمی ساتھ لے کر آؤ لیکن تمہیں میرے گھر آکر نکاح کرنا اور میری زیبا
رخصت کرا کے لے جانا ہوگا۔"

"لیکن انکل......"

"اس کے بعد تم گھر جا کر اپنے تایا سے کچھ بھی کہنا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہاں
ہے تم دوبارہ شادی کرلینا۔ میرا اپنی بیٹی کو شادی کرکے وداع کرنے کا ارمان پورا ہو جائے
"

ڈاکٹر وحید چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا "ٹھیک ہے انکل، مجھے منظور ہے۔ یہ نہ
اتو یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

"شکریہ بیٹے!"

"میں کل اماں کو لے جا کر اپنا گھر دکھا دوں گا۔ بعد میں یہ جب چاہیں، آکر زیبا سے مل
ان کی خیریت دریافت کرسکیں گی لیکن آپ یقین رکھیں، آپ کی بیٹی کو کبھی کوئی تکلیف

نہیں ہو گی۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"کل زیبا اسپتال سے رخصت ہو جائے گی۔ پرسوں میں چند دوستوں کے ساتھ آ کر گھر آجاؤں گا۔ ابھی میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں' آپ کا گھر دیکھ لوں گا۔"

ڈاکٹر وحید اپنی کار میں انہیں گھر چھوڑنے آیا۔ صغریٰ اور نجمی نے اسے اصرار کر روکا اور چائے پلائی۔

"کل شام کو آکر زیبا کو لے جایئے گا" ڈاکٹر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "اور آپ صبح گیارہ بجے تیار رہیئے گا۔ میں آپ کو اپنا گھر بھی دکھا دوں گا۔ ملوانے کے لئے نوکروں کے سوا تو کوئی ہوگا نہیں۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد صغریٰ نے نجمی سے کہا "بیٹے' تو نے بہت جلدبازی کی......"

"نہیں خالہ' میں نے بہت سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیا ہے۔"

"پھر بھی........"

"دیکھو خالہ' دھڑکا صرف ایک ہی ہے نا کہ کہیں یہ دھوکا نہ ہو' تو کل تم جا کر اس دیکھ لوگی۔ بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی وہ بڑے اسپتال کا بڑا ڈاکٹر ہے' کوئی آدمی تو ہے نہیں۔"

"خیر........ اس کے متعلق میں اسپتال میں بھی پوچھ گچھ کروں گی۔ گھر بھی دیکھ گی لیکن بیٹا........"

"بعد کی بات کر رہی ہو نا خالہ' تو میں جانتا ہوں کہ ہر چیز کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑ آدمی کو اور میرے نزدیک یہ سودا مہنگا نہیں۔ ویسے ہی میں کون سا دیکھ سکتا ہوں اپنی بیٹی اس سے مل آیا کرنا اور بتا دیا کرنا کہ وہ خوش ہے۔ مجھے اور کیا چاہئے۔"

"لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ زیبا........"

"اسے تم سمجھا دینا خالہ' وہ بہت سمجھ دار ہے اور ہر بات مان بھی لیتی ہے۔ پھر میں سمجھا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' اب میں کھانا پکاتی ہوں۔ تجھے بھوک لگ رہی ہو گی۔"

O==========☆==========O

اس رات نجمی کو پتا چلا کہ دکھ تو جیسا بھی ہو' آدمی کو تھپکیاں دے دے کر سلا د لیکن خوشی میں نیند بالکل ہی اڑ جاتی ہے۔ وہ ایک پل بھی نہ سو سکا۔ صبح کا انتظار کرتا رہا۔ بس چلتا تو وقت کو اڑاتا اور اس شام کو جلدی سے اپنے دروازے پر لے آتا' جس شام ا بیٹی کو وداع ہونا تھا۔

صبح صغریٰ نے اسے ناشتا کرایا اور اس کا سامان لے کر اس کے ٹھکانے پر چھوڑ

لے آئی۔

"اب میں چلتی ہوں' نجمی!"

"ڈاکٹر وحید کا گھر دیکھنے جاؤ گی نا؟"

"ہاں بیٹے!"

"اور دوپہر کا کھانا لاؤ گی نا؟"

"ہاں اور ڈاکٹر کے گھر کا حال بھی بتاؤں گی۔" صغریٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔ نجمی جھینپ گیا۔ اسے کھانے سے اتنی دلچسپی نہیں تھی' جتنی صغریٰ کی رپورٹ سے تھی۔ صغریٰ نے یہ بات بھانپ لی تھی۔

اسے دوپہر تک وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خوشی میں اندیشے ایسے گھل مل گئے تھے کہ اس سے کچھ سوچا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بس ایک اضطرار سا تھا' جو اس پر طاری تھا۔ بالآخر صغریٰ کھانا لے آئی۔

"لے نجمی' تو کھانا کھاتا جا اور میں تجھے ڈاکٹر کے گھر کا حال سناتی جاؤں" وہ بولی۔

نجمی بے دلی سے نوالے لیتا رہا۔ صغریٰ نے ہیجانی لہجے میں کہنا شروع کیا "بہت بڑا گھر ہے ڈاکٹر کا۔ میرے تیرے گھر کو ملایا جائے تو اس سے دگنا تو باغیچہ ہے اس کا۔ بہت سارے کمرے ہیں۔ بہت خوبصورت! سامان سے بھرا گھر ہے۔ بس اس میں نوکر ہی نوکر رہتے ہیں۔ باورچی الگ ہے۔ مالی ہے' صفائی کرنے والی دو عورتیں ہیں۔ ڈرائیور ہے اور ان سب کے کوارٹر بھی بنگلے میں ہی بنے ہوئے ہیں۔"

نجمی کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی "تمہیں یقین ہے کہ وہ بنگلا اسی کا ہے خالہ؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ........ یہ بھی ہو سکتا ہے اس نے کسی جاننے والے کا بنگلا تمہیں دکھا دیا ہو۔"

"نہیں' وہ بنگلا اسی کا ہے۔ وہ وہاں رہتا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو خالہ؟"

"ارے پگلے' تمام نوکر اسے چھوٹے صاحب کہتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے! مالک کے دوست کے بیٹے کو بھی چھوٹے صاحب کہا جا سکتا ہے۔"

"گھر میں اس کی تصویریں لگی ہیں' ایک تصویر منگیتر کے ساتھ بھی تھی۔"

نجمی کو اطمینان ہو گیا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا........ اے اللہ' تیرا شکر ہے "تم مطمئن ہو خالہ؟"

"ہاں۔ تُو کل مطمئن تھا اور میں آج ہوئی ہوں۔" صغریٰ نے کہا۔

"تب ٹھیک ہے خالہ!"

"شام کو اسپتال چلے گا زیبا کو لینے؟"

"نہیں خالہ، تم لے آنا اور واپسی میں مجھے بھی ساتھ لے چلنا گھر۔"

"ٹھیک ہے۔"

اب نجمی کی عجیب کیفیت تھی۔ اندیشے چھٹ گئے تھے تو بے یقینی آ گئی تھی۔ وہ سوچ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر وحید اپنا ارادہ تو نہیں بدل لے گا۔ اسی کشمکش میں شام ہو گئی۔ صغریٰ زیبا کو رکشے میں لے آئی۔ زیبا نے باپ کو سلام کیا۔

"کیسی ہے بیٹا؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ کہیں درد تو نہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں بابا!"

"بالکل ٹھیک؟"

"بالکل ٹھیک بابا، ڈاکٹر صاحب اجازت دے دیتے تو میں اسی روز گھر آ جاتی۔ مجھے تو ہوا ہی نہیں تھا۔"

"چل نجمی، اب گھر چلیں، باقی باتیں وہیں کر لینا۔ زیبا بالکل ٹھیک ہے۔" صغریٰ کہا۔

گھر پہنچ کر زیبا نے صغریٰ سے پوچھا "میں کھانا پکا لوں نانی؟"

نجمی نے احتجاج کیا مگر صغریٰ نے اسے سمجھا دیا "میں نے ڈاکٹر سے بھی پوچھ لیا تھا۔ کہہ رہے تھے، زیبا بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔" پھر وہ زیبا کی طرف مڑی "جا بیٹا" تو دال چڑھا دے جا کر۔" زیبا باورچی خانے میں گئی تو وہ کہنے لگی "نجمی، میں نے اسپتال میں بھی پوچھ تاچھ کی تھی۔ ڈاکٹر تین سال سے اس اسپتال میں ہے۔ سب لوگ، چھوٹے کیا اور بڑے کیا، اس شرافت کے گن گاتے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں، اللہ نے ہماری زیبا کی تقدیر ہی بدل دی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" نجمی نے بے ساختہ کہا۔

"اور ڈاکٹر وحید کہہ رہے تھے کہ وہ کل شام چھ بجے اپنے چند دوستوں کے ساتھ آئیں گے۔ قاضی صاحب ان کے ساتھ ہوں گے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" نجمی نے دہرایا پھر چونک کر پوچھا "خالہ، ہمیں کچھ کپڑوں بندوبست کرنا ہوگا اور کوئی زیور.........."

"ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے، اس کی کوئی ضرورت نہیں اور بیٹا، وہ اسے دلہن بنا کر گھر تھوڑا ہی لے جائیں گے۔ سرخ جوڑا اور زیور تو وہ وہیں پہنے گی، اس دکھاوے کی شادی میں۔"

"ہاں.......... میں تو بھول ہی گیا تھا خالہ!" نجمی اداس ہو گیا۔ "لیکن کھانے کا تو کچھ کر ہو گا۔"

"ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ انہوں نے یہ وقت اسی لئے رکھا ہے۔ سات ساڑھے سات بجے تک واپس چلے جائیں گے وہ۔ نکاح شربت پر ہوگا، کھانے کا تو وقت ہی نہیں ہو گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے خالہ، پر زیبا کے لئے ایک اچھا سا نیا جوڑا ضرور لیں گے ہم۔ ان کپڑوں میں رخصت کریں گے اسے اور خالہ، بستی کی دو چار لوگوں کو ضرور بلا لینا بلکہ مجھے لے چلنا، میں خود بلاوا دوں گا انہیں۔"

"تُو کوئی فکر نہ کر نجمی، زیبا کے لئے نئے کپڑے بھی آئیں گے، اس کے ہاتھوں میں مہندی بھی لگے گی اور لڑکیاں گیت بھی گائیں گی شادی کے۔"

"اور خالہ.......... تم نے زیبا سے بات کر لی؟"

"ابھی کرتی ہوں جا کر۔" صغریٰ نے کہا اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

رات کے کھانے کے بعد اپنے گھر جاتے وقت صغریٰ نے چپکے سے نجمی سے کہا "میں نے زیبا کو سمجھا دیا ہے لیکن وہ بہت پریشان ہو رہی ہے۔ تُو بھی اس سے بات کر لینا ذرا پیار سے، ڈھنگ سے سمجھا دینا اسے۔"

"ٹھیک ہے خالہ!"

صغریٰ کے جانے کے بعد نجمی نے زیبا کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ "بیٹا، خالہ نے تجھ سے بات کی تھی نا؟"

"جی بابا!"

"بیٹا، میری گڑیا، دیکھ کل سے انشاء اللہ تیری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے.........."

"لیکن بابا، میں تم سے دور نہیں جانا چاہتی۔"

"کوئی بھی لڑکی نہیں جانا چاہتی میری بچی، لیکن ہر بیٹی کو اپنے بابا سے دور جانا پڑتا ہے۔ کوئی بیٹی عمر بھر اپنے باپ کے پاس نہیں رہتی۔ خدانخواستہ رہے تو دونوں ہی خوش نہیں رہتے۔ بیٹیوں کو اصل خوشیاں اپنے باباؤں سے دور جا کر ہی ملتی ہیں بیٹی!"

"لیکن بابا، نانی کہہ رہی تھیں کہ پھر میں تم سے بھی نہیں مل سکوں گی۔"

"دیکھ بیٹا، میں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا نا، کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

"نہیں بابا!"

"تو سن، تیرا بابا تجھ سے پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہا ہے تُو بڑے گھر میں جا رہی ہے میری بچی۔ تیرا بابا بہت چھوٹا آدمی ہے، اللہ تجھے بڑا بنا رہا ہے، تو وہاں سب کا خیال رکھنا، سب کو خوش رکھنا۔ اللہ نے چاہا تو وہاں تجھے تیرے بابا سے اچھا بابا مل جائے گا۔"

"مجھے تو بس میرا اپنا بابا چاہئے۔" زیبا رونے لگی۔

نجمی نے اسے گلے سے لگایا "میری بات نہ کاٹ میری جان!" میری بات غور سے سن

اور وعدہ کر کہ اس پر عمل کرے گی۔ اپنے شوہر کی اور دوسرے بابا کی خوب خدمت کرنا' ا
کہنا ماننا۔ دوسرے بابا کی بیٹی بالکل تجھ جیسی تھی۔ وہ تجھے اپنی بیٹی ہی سمجھیں گے۔ میرے
پریشان نہ ہونا' کبھی میرا ذکر نہ کرنا۔ دیکھ' تیری نانی تو میرے پاس ہوگی' میرا خیال رکھے گی
وہاں تیرے گھر آتی رہے گی' تجھے میری خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ کبھی قسمت میں ہوگا
مل بھی جائیں گے۔ میری بچی' تو وہاں جا کر اپنے اس اندھے مجبور بابا کی لاج رکھنا' کو
شکایت کا کوئی موقع نہ دینا" وہ اس کی ہچکیوں سے لرزتے جسم کو تھپتھپاتا' اسے چمکارتا رہا"
ہاں' نانی نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے وہ ایک پل کے لئے بھی نہ بھولنا۔ وہاں جا کے وہی کچھ
جو تیرا شوہر کہے۔ میں لاوارث ہوں۔ ماں باپ یاد نہیں۔ کوئی مجھے اس ادارے میں چھوڑ گیا
جہاں سے ڈاکٹر صاحب لائے ہیں۔ وہیں پلی بڑھی ہوں۔ سمجھ گئی نا بٹیا رانی؟"

زیبا اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی "یہ ب
بہت مشکل ہے بابا' کیسے ہوگا مجھ سے!"

نجمی نے اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کی آنکھوں
چوم لیا "مشکل نہیں بیٹا' ایک بیٹی کے اندھے باپ کی حیثیت سے تیرہ سال گزارنے سے زیا
کچھ بھی مشکل نہیں میری بچی! جب بھی کچھ مشکل لگے' اپنے اندھے بابا کا تصور کر لینا۔" ا
نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ہچکیاں تھم گئیں۔ زیبا نے اپنے بابا کو بہت غور سے دیکھا اور
جانے اس کے چہرے پر کیا دیکھا کہ اسے قرار آگیا "بابا' تمہاری بات پوری کرنے کو میں ہر مشکل
سے گزر جاؤں گی لیکن بابا' تم بہت یاد آؤ گے۔"

"یاد تو میں بھی تجھے بہت کروں گا میری بچی!" نجمی نے دل میں کہا۔ پھر اس نے زیبا
سر تھپتھپا کر کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچی۔ جا' اب سو جا۔"

O============☆============O
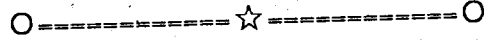
نجمی کے لئے اندھا ہونے کے باوجود وہ زندگی کی خوب صورت ترین صبح تھی۔ وہ بہت
خوش تھا۔ بات بات پر چہک رہا تھا۔

"جانا نہیں ہے کیا نجمی؟" ناشتے کے بعد صغریٰ نے مذاق سے پوچھا۔

"آج کیوں جاؤں گا؟ آج تو میری بیٹی کی شادی ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد یہ پہلی
خوشی ہے جس نے میرے دروازے پر دستک دی۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود بہت اچھا لگ رہا
ہے مجھے۔"

صغریٰ ہنس دی "پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"پہلے تو بلاوے دینے چلیں گے پھر زیبا کے لئے کپڑے' چوڑیاں اور مہندی خریدیں گے
چل کر۔"

صبح ہی صبح وہ صغریٰ کے ساتھ جا کر بستی کے چند گھروں میں بلاوے دے آیا۔ لوگ

ے دیکھ کر اس کی خوش قسمتی پر حیران تھے۔ سب نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئیں گے۔ گھر
ہیں جاتے ہوئے نجمی ہنسا۔

"کیا بات ہے؟" صغریٰ نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں' آج مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ زیبا کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر آیا
ں۔"

"اطمینان ہو گیا ہے نا!"

"گھر پر ان گھروں کی لڑکیاں بالیاں موجود تھیں' جن کے ہاں بلاوے دیے گئے تھے۔
ب لڑکی ڈھولک لے آئی تھی اور اب گیت گائے جا رہے تھے۔ انہیں باہر ہی سے آوازیں
ائی دے گئیں۔

"یہ اپنے گھر میں ہو رہا ہے نا خالہ؟"

"ہاں۔"

"واہ خالہ' میری قسمت دیکھو! میری خوشی میں سب شریک ہیں۔" اس نے خوش ہو کر
ہا۔

صغریٰ کہنے والی تھی کہ دکھ میں بھی سب ہی شریک تھے مگر پھر اس نے خود کو روک
۔ خوشی کے موقع پر زخم کریدنا کیا معنی! گھر سے چائے کی ایک پیالی پی کر وہ صغریٰ خالہ کے
تھ خریداری کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ واپس آنے کے بعد اس نے جیسے تیسے کھانا کھایا۔ خوشی
نے بھوک ہی اڑا دی تھی۔ پہلی بار اس کے گھر میں چہل پہل ہو رہی تھی۔ زندگی کا ہنگامہ تھا۔
رتیں بھی آگئی تھیں۔ وہ بار بار جا کر زیبا کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ چار بجے کے بعد یہ حال ہو گیا
ہ وہ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتا "کیا بجا ہے بھئی؟" پھر صغریٰ کو پکارتا۔ "خالہ......... سب انتظام
مل ہے نا؟"

پونے چھ بجے وہ محلے کے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دروازے پر جا کھڑا ہوا "اب کسی
بھی وقت ڈاکٹر وحید آجائیں گے اپنی گاڑی میں" وہ ان سے کہتا۔ سوا چھ بج گئے تو وہ تشویش
میں مبتلا ہو گیا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ڈاکٹر نے ارادہ تو نہیں
بدل دیا؟ ہم تو ہیں ہی بدنصیب۔ کہیں ڈاکٹر کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟ طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی
ان کی؟ ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا خدانخواستہ؟ اب تو وہ ڈر کے مارے وقت بھی نہیں پوچھ رہا
تھا کسی سے۔ چھ بج کر بیس منٹ پر دو گاڑیاں آتی دکھائی دیں لیکن وہ سجی ہوئی نہیں تھیں۔ نجمی
نے انجن کی آواز سنتے ہی کہا۔ "بارات آگئی۔"

"نہیں۔" پڑوسی نے کہا "گاڑی سجی ہوئی نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب سادگی کے قائل ہیں۔" نجمی نے جلدی سے کہا۔

وہ گاڑیاں نجمی کے گھر کے سامنے ہی رکیں۔ صغریٰ نے کہا۔ "بارات آگئی۔

جاؤ......... ہار ڈالو۔"

"بارات میں سات آدمی تھے۔ وہ سب کے سب پڑھے لکھے، معقول اور خوش لباس
جو اس علاقے کے اعتبار سے بے حد مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں صرف ڈاکٹر
سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر جناح کیپ تھی۔ قاضی صاحب نکاح کا رجسٹر ہاتھ میں
الگ دکھائی دے رہے تھے۔ دروازے پر استقبال کے لئے کھڑے لوگوں نے ان سب کے
میں ہار ڈالے۔ ڈاکٹر وحید نجمی کے سامنے آکھڑا ہوا۔ نجمی نے اس کے گلے میں سب سے بڑا
ڈال کر اسے لپٹا لیا۔ ذرا ہی دیر بعد نکاح ہو گیا۔ دلہا کی طرف سے چھوہارے تقسیم کئے گئے
دلہن والوں نے سب کی شربت سے تواضع کی۔ ڈاکٹر وحید کا ایک دوست کیمرا لے کر آیا تھا
تصویریں بناتا رہا۔ دولہا دلہن کی ایک دوسرے کے ساتھ بھی تصویریں بنائی گئیں۔ زیبا کے سر
صرف ایک سرخ دوپٹا تھا جو اسے دلہن ثابت کر رہا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب وحید کے ایک دوست نے نجمی سے کہا۔ "انکل، اب ہمیں اجازت
دیں۔"

"ضرور بیٹا، سر آنکھوں پر۔"

رخصتی کے وقت زیبا کا برا حال تھا۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا اور آنسو تھمتے ہی نہیں
تھے، وہ اتنا روئی کہ بے ہوش ہو گئی۔

صغریٰ ڈاکٹر وحید کو الگ لے گئی "ڈاکٹر صاحب، زیبا بہت گھبرا رہی ہے۔"

"فطری بات ہے۔" وحید نے کہا اور کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "اماں! ایسا کرو،
ہمارے ساتھ چلی چلو۔ لڑکیوں کے ساتھ ایسے موقعوں پر کوئی رشتے دار تو جاتا ہی ہے۔"

"اپنے تایا سے کیا کہو گے؟"

"ان سے کہوں گا، رفاہی ادارے کے قانون کے مطابق کوئی لڑکی وہاں سے شادی کے
بغیر رخصت نہیں ہو سکتی۔ میرے اصرار پر انہوں نے قانون میں لچک پیدا کر لی لیکن اپنا ایک
نمائندہ ساتھ بھیج دیا ہے۔"

"اے بیٹا، تم جھوٹ بڑا زبردست بولتے ہو۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے تم سے۔" صغریٰ
ہنس کر چوٹ کی۔ وحید جھینپ کر رہ گیا۔

صغریٰ نے نجمی سے بات کی تو وہ خوش ہو گیا "یہ تو بہت اچھا ہے۔ زیبا بہلی رہے گی۔"

"لیکن تو اکیلا ہو جائے گا۔ میرا دل یہاں اٹکا رہے گا۔"

"اب میری فکر مت کرو، خالہ تم جاؤ۔ اب میں کمزور اور معذور نہیں رہا۔" نجمی
خوش دلی سے کہا۔

بٹی رخصت ہو گئی۔ گنتی کے مہمان بھی اپنے اپنے گھر چلے گئے، اب وہ اکیلا تھا لیکن
دل و دماغ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی جیب میں جا

دبارے پڑے تھے۔ بٹی کے نکاح کے چھوہارے، اس نے ایک چھوہارا نکال کر اسے چبایا۔ وہ
کچھ زیادہ ہی میٹھا لگا۔ رشتہ آ گیا تھا، بٹی رخصت ہو گئی تھی، اسے اپنا وعدہ یاد آیا.........
رکا وعدہ!

"اے اللہ تیرا شکر ہے......... اے اللہ، تیرا شکر ہے" وہ اسی ایک جملے کو دہرائے چلا
پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا "یہ میں زور زور سے کیوں بول رہا ہوں، کیا دنیا کو سنانا ہے؟"

اب وہ خاموش تھا، لیکن اس کی زبان اسی ایک جملے کے لئے حرکت کر رہی تھی۔ اسے
لگا کہ اس کی دھڑکنیں، اس کی سانسیں بھی اسی جملے سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں، پھر چنبیلی کی
، موتیا، گلاب اور رات کی رانی کے پودے بھی اسی لے پر جھومنے لگے۔ اے اللہ تیرا شکر
۔ رات گزر گئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔ وہ زیر لب اسی جملے کو دہراتا رہا۔ اے اللہ تیرا شکر
۔ فجر کی اذان نے اسے چونکایا۔ شکر کی پہلی رات گزر گئی تھی۔

صبح اس کا کام پر جانے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ ناشتا تھا ہی نہیں،
ہش بھی نہیں تھی۔ وہ کیاری کی طرف چلا گیا۔ چنبیلی کی بیل بے تکی پھیل رہی تھی۔ اس
، اس کی چھٹائی شروع کر دی۔ اس تمام وقت میں وہ زیر لب اے اللہ تیرا شکر ہے، کہتا رہا
۔ کام کے دوران کبھی کبھی وہ اس احساس سے چونکتا کہ اس کی زبان رک گئی ہے۔ وہ شکر ادا
کر رہا ہے۔ یوں شکر کا سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔

صغریٰ آ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ "بہت بہت مبارک ہو نجمی بیٹے!" اس نے آتے ہی
۔

"تمہیں بھی مبارک ہو خالہ، کیسی گزری؟"

"بہت اچھے لوگ ہیں بیٹا، بڑے صاحب تو بہت ہی اچھے ہیں۔ زیبا کو دیکھتے ہی گلے سے
اور رونے لگے۔ دیر تک روتے رہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو ڈانٹا کہ دھوم دھام سے شادی کر
کیوں نہیں لائے ہو اسے! کہنے لگے، پوری رسمیں ابھی ہوں گی۔ جلدی سے دوستوں،
وں کی ضیافت کا انتظام کیا پھر زیبا کو ساتھ لے کر گئے۔ سہاگ کا جوڑا، بہت سارے کپڑے
زیور دلا کر لائے۔ زیبا کو دلہن بنایا گیا اور خوب رونق لگی۔ بڑے صاحب بار بار کہتے اللہ! تو
جھ گناہ گار پر کتنا بڑا احسان کیا۔ میری کھوئی ہوئی بٹی واپس دے دی۔ عمر بھر اسے سنبھال کر
وں گا، دل سے لگا کر۔ بار بار روتے اور زیبا کو گلے سے لگاتے........."

نجمی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اے اللہ تیرا شکر ہے، اے اللہ......... "زیبا خوش ہے"
اس نے پوچھا۔

"ارے تو تو صبح سے بھوکا بیٹھا ہو گا"۔ صغریٰ کو اچانک خیال آیا۔

نجمی نے ایک گہری سانس لی۔ اے اللہ تیرا شکر ہے، اے اللہ......... "مجھے بھوک ہی
نہیں خالہ!"

"ابھی کھانا پکاتی ہوں۔"
ظہر کی اذان ہوئی تو نجمی کے قدم خود بخود غسل خانے کی طرف اٹھ گئے۔ وضو
دوران وہ حیرت سے سوچتا رہا۔ کہتے ہیں کہ آدمی پریشانی میں دکھ اور تکلیف میں اپنے رب
طرف جاتا ہے اور جب اس کا مطلب نکل جاتا ہے تو پھر بدل جاتا ہے لیکن اسے تو دکھوں
کبھی نماز کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب دکھ چھٹے ہیں تو پہلی بار نماز کی سوجھی۔ اس دن کے
اس کی کبھی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔

O============☆============O

زیبا کی شادی کو پندرہ دن ہو چکے تھے۔ زندگی پھر اپنے معمولات کی طرف لوٹ آئی
لیکن کچھ فرق کے ساتھ۔ اب صرف صغریٰ تھی جو نجمی کو اس کے سامان سمیت اس کی
چھت اور بے درودیوار کی دکان پر چھوڑ کر جاتی تھی اور لینے آتی تھی۔ ایک فرق یہ بھی
وہ خوش مزاج ہو گیا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو وہ اسے نرمی سے، محبت سے جواب دیتا۔ اس کی
بے زاری ختم ہو گئی تھی۔ خود سے البتہ وہ کسی سے بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ اس کی زبان
اے اللہ تیرا شکر ہے کہ ورد میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اس کی
ٹھہر گئی ہے، شکر کا سلسلہ موقوف ہو گیا ہے۔ ایسے میں وہ دل ہی دل میں گڑگڑا کر کہتا۔
اللہ میں ناشکرا بہت شرمندہ ہوں، بار بار بھول جاتا ہوں۔ وہ پھر شکر ادا کرنا شروع کر دیتا۔
کسی سے بات کرتے ہوئے بھی دل ہی دل میں مسلسل شکر ادا کرتا۔
ایک روز قریب ہی ایک گاڑی آکر رکی۔ لاؤڈ اسپیکر پر ایک آواز گونجی، انعام کا
ثواب کا ثواب، بلائنڈ ر ویلفیئر سوسائٹی ریفل کا ٹکٹ خریدیئے، صرف دس روپے میں۔ آ
دی ہوئی یہ رقم آنکھوں سے محروم لوگوں کی بھلائی کے کام آئے گی، ثواب دلائے گی اور
ممکن ہے کہ آپ کا انعام نکل آئے۔ پہلا انعام دس لاکھ روپے نقد، دوسرا انعام.........
نجمی اپنی جگہ سے اٹھا اور آواز کی سمت چل دیا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر اس
"اے بھائی، تمہاری سوسائٹی اندھوں کی کس طرح مدد کرتی ہے؟"
"ہم انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ ہنر سکھاتے ہیں تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے
معاشرے کے لئے کارآمد بنیں، بھکاریوں کے روپ میں بوجھ نہ بنیں۔ ہم انہیں ایک خو
ماحول دیتے ہیں، ایک گھر دیتے ہیں انہیں........."
"ایک ٹکٹ دے دو مجھے۔"
نجمی نے وہ ٹکٹ لے کر بنیان کی، گھر کے خرچ والی جیب میں ڈال لیا۔ اس
اندازی کی تاریخ بھی غور سے نہیں سنی۔ اسے انعام کی طلب تھی بھی نہیں۔ وہ تو ایک
میں حصہ لے رہا تھا۔ زندگی مدہم سُروں میں گنگناتی ہوئی چلتی رہی۔ نجمی کی زبان، سانس
دھڑکنیں اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔

ایک روز وہ انگلی سے بندھی گیند اچھال رہا تھا کہ کسی نے اس سے پوچھا "بابا، تم پھر
بیچنے لگے؟" آواز کسی نوجوان کی تھی۔
"ہاں بیٹا، اللہ کا شکر ہے۔" نجمی نے جواب دیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ نوجوان اس کے
مانگنے والے عرصے کا حوالہ دے رہا ہے۔
"بابا" تیرا چودہ سال پہلے میں بھی بچہ تھا اور تم سے ہر روز ایک گیند خریدا کرتا تھا۔"
ن نے کہا "اور جب تم نے گیندیں بیچنا چھوڑ دیا تو میں بہت رویا تھا۔" اس نے یہ نہیں
کہ بعد میں وہ گیند کی اٹھنی ہر روز چپکے سے اس کی چادر پر ڈال جاتا تھا۔
"ہاں بیٹا، مجبوری نے میرے پیروں کی جان نکال لی تھی۔ مجھے بھکا دیا تھا، بھٹکا دیا تھا۔ پھر
نے مجھے راہ دکھائی، مجھے سہارا دیا، میری ٹانگوں کو قوت دی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو
ں۔ شکر ہے میرے مالک کا۔"
"اور بابا، تمہاری ایک بیٹی بھی تو ہوتی تھی!؟"
"ہاں بیٹا، اللہ کا شکر ہے اس کی شادی ہو گئی۔"
"تمہارا نام کیا ہے بابا؟"
"نجم الحسن۔ سب جاننے والے نجمی بابا کہتے ہیں مجھے۔"
"نجمی بابا، مجھے یہاں سے گئے نو سال ہو چکے ہیں لیکن میں تمہیں کبھی نہیں بھولا اور
مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔ اچھا بابا، مجھے ایک گیند دے دو لیکن پیسے نہیں ہیں میرے
پاس۔"
"ارے کوئی بات نہیں بیٹا" یہ لو۔" نجمی نے ایک واٹر بال اس کی طرف بڑھا دیا "اور
تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ اب کہاں رہتے ہو تم؟"
نوجوان واٹر بال اچھالتے اور پکڑتے ہوئے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ نجمی بابا.........
تمہارا حساب برابر ہو گیا، اب صرف میں مقروض ہوں "میرا نام امجد ہے بابا اور گلشن اقبال
رہتا ہوں۔ اچھا اب چلتا ہوں بابا، خدا حافظ۔"
"فی امان اللہ، خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"
چند روز بعد اس کے ٹھکانے کے پاس ایک گاڑی آکر رکی، دروازہ کھلا، کوئی اترا اور اس
طرف بڑھا "تم ہی نجم الحسن ہو......... نجمی بابا؟" اس سے پوچھا گیا۔
نجمی ایک لمحے کو پریشان ہوا پھر اس نے خود کو سنبھال لیا "ہاں میں ہی نجم الحسن ہوں،
ں؟"
"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"
"کہاں لے جاؤ گے مجھے؟"
"اسپتال۔ میں لائنز کلب سے آیا ہوں، تمہیں لے جانے کے لئے۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہاں تمہارے آنکھیں لگیں گی' پہلے ڈاکٹر یہ چیک کریں گے کہ تمہارے آنکھ بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ ٹسٹ کامیاب ہو گیا تو آپریشن ہو گا اور اس کے بعد انشاء اللہ تم دیکھ گے۔"

"دیکھ سکوں گا!" نجمی حیران رہ گیا۔ ایک لمحے کو تو وہ شکر ادا کرنا بھی بھول گیا میرے پاس اتنا پیسہ کہاں کہ آنکھ خرید سکوں؟" اس نے کہا۔

"کسی نے اپنی آنکھوں کا عطیہ خاص طور پر تمہیں دیا ہے' اسی لئے میں تمہیں ڈ ہوا یہاں آیا ہوں۔"

"کس نے دیا ہے مجھے آنکھوں کا عطیہ۔"

"اب یہیں سب پوچھتے رہو گے یا چلو گے بھی۔"

"چلتا ہوں لیکن گھر پر تو بتا دوں۔"

O============☆============O

نجمی اسپتال سے نکلا تو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا پورا وجود خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جسم کا رواں سجدہ ریز تھا۔ ٹسٹ کامیاب ہوا تھا پھر آپریشن بھی کامیاب ہوا۔ اس کی بینائی لوٹ اس نے ڈاکٹر سے کہا "خدا کے لئے......... اب تو مجھے میرے محسن کا نام بتا دو۔"

"اس کی آخری خواہش تھی کہ اس کی آنکھیں تمہارے لگا دی جائیں لیکن تمہیر کے متعلق کچھ نہ بتایا جائے۔"

"لیکن ڈاکٹر' میرا خیال ہے آپ لوگ آنکھ کا عطیہ غیر مشروط لیتے ہیں' یوں فرمائ پوری نہیں کرتے کسی کی؟"

"ایسا بھی ہوتا ہے لیکن یہ جس شخص کا معاملہ ہے وہ ہمارے لئے رضاکارانہ طور کرتا تھا۔ اس نے آنکھوں کے عطیے کے سو سے زیادہ فارم پُر کرا کے ہمیں دیے تھے۔ ا ایکسیڈنٹ ہوا تو اس نے ہمیں بلوایا اور تمہارے متعلق بتا کر کہا اس کی آنکھیں تمہیں ل جائیں۔ اُس کی خواہش کا احترام ہم پر فرض تھا۔"

"خدا کے لئے ڈاکٹر اس کا نام نہیں بتا سکتے تو مجھے اس کے متعلق کچھ تو بتاؤ۔"

"بس میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا نجمی بابا کہ میں اپنی گناہ گار آنکھیں انہیں دے رہا ہوں کہ شاید اسی طرح یہ پاک ہو جائیں۔ ان کہنا' مجھے معاف کر دیں' اور میری مغفرت کے لئے دعا کرتے رہیں۔"

اس کے اصرار کے باوجود ڈاکٹر نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ نجمی کو یقین تھا وہی لڑکا امجد ہے جس نے چند روز پہلے اس سے باتیں کی تھیں اور واٹر بال بھی لی تھی۔ سال پہلے اس سے گیند خریدا کرتا تھا۔ جو نو سال پہلے گلشن اقبال چلا گیا تھا لیکن گناہ گار آنکھ

اور معاف کر دینے والی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ الجھن دور نہ ہوئی تو اس اپنے ان دیکھے' ان جانے محسن کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے زیر لب کہا "اے میں تجھ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس شخص کی جس نے مجھے آنکھیں دی ہیں' ہر معاف کی۔ اپنی رحمت سے اس کی مغفرت فرما میرے معبود' اور اسے جنت الفردوس میں عطا فرما۔"

اسپتال سے نکل کر اس کا جی چاہا کہ پوری دنیا دیکھے۔ دنیا نہ سہی' اپنا شہر ہی دیکھے۔ پھر نے سوچا' پہلے گھر جانا چاہئے۔ وہ چوک پر بس سے اترا' سب کچھ اسے بہت عجیب لگ رہا سب کچھ جانا پہچانا لیکن اجنبی اجنبی سا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی یادداشت تیرہ چودہ سال واپس آئی ہے۔ اس نے پان کی دکان کو غور سے دیکھا' دکان کا مالک بہت بدل گیا تھا۔ اس اس پیڑ کو دیکھا جس کے سائے میں اس نے بھیک بھی کمائی تھی اور روزی بھی۔ اس نے دیوار کو دیکھا جس کے ساتھ وہ چادر بچھاتا تھا۔ اس کے تصور میں اس چادر پر بیٹھا ہوا وہ خود ننھی زیبا آ گئی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ زیبا جوان ہو چکی' اس کی شادی ہو چکی' تو میں اسے دیکھوں تو پہچان بھی نہیں سکوں گا۔ وہ تیزی سے جانے پہچانے راستے پر چل گھر کی طرف۔ اس کی آنکھیں شکر کے آنسو بہا رہی تھیں۔ اس کی سانسوں اور دھڑکنوں ایک ہی آواز تھی' اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.........

ایک بوڑھی پھونس عورت دروازے پر کھڑی تھی۔ جانی پہچانی سی صورت.........
ت اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔ ارے' یہ تو صغریٰ خالہ ہے' اتنی بڈھی ہو گئی! اس سوچا۔

"نجمی! آگیا تُو۔ ارے رو کیوں رہا ہے' کیا خدانخواستہ.........؟"

"نہیں خالہ' میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں' اللہ کا شکر ہے۔" نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"تو رو کیوں رہا ہے' پگلے' تُو نے تو مجھے ڈرایا دیا تھا۔"

اس نے صغریٰ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر لیا "یہ تو شکر کے' خوشی کے آنسو ہیں خالہ ت۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھوں گا۔"

"ارے پگلے' اندر چل' میں تو تجھے ایسی چیز دکھاؤں گی کہ خوش ہو جائے گا تُو۔ چل ے ساتھ۔"

صغریٰ اسے گھر میں لے گئی "بیٹھ' میں وہ چیز لاتی ہوں۔"

وہ چارپائی پر بیٹھ کر چنبیلی کی بیل اور ان پودوں کو تکنے لگا جو قمرن نے لگائے تھے۔ ٰی واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں البم تھی۔

"یہ زیبا کی شادی کی' یہاں کی اور وہاں کی اور شادی کے بعد کی تصویریں ہیں۔ ڈاکٹر

صاحب یہ البم لائے تھے۔ میں نے تجھ سے ذکر نہیں کیا کہ تجھے آنکھوں سے محرومی کا ا
احساس ہوگا۔ پوری بستی دیکھ چکی ہے یہ تصویریں' سب ہی بہت خوش ہوئے تھے۔ آج خ
نے یہ دن بھی دکھایا کہ تُو دیکھ سکتا ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار کا۔"

"نجمی نے البم کی پہلی تصویر دیکھی۔ تروتازہ' شاداب نوخیز قمرن اس کے روبرو ت
لیکن اس نے تو قمرن کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ارے دیوانے اس نے خود سے کہا یہ
زیبا ہے' اس نے البم چارپائی پر رکھی اور صغریٰ کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی گود میں سر ر
دیا "تم بہت اچھی ہو ماں.......... بہت اچھی۔"

"تُو تصویریں تو دیکھ لے۔" صغریٰ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھ لوں گا ماں' دیکھتا ہی رہوں گا انشاء اللہ۔ پہلے اپنی جنت تو کمالوں۔" اس ـ
جواب دیا۔ اس کی سانسیں گنگنا رہی تھیں' اے اللہ' تیرا شکر ہے' اے اللہ..........

O============☆============O

زندگی اب بہتے پانی کی طرح نہیں تھی۔ وہ سمندر کا روپ دھار گئی تھی۔ ٹھہراؤ
ٹھہراؤ۔ ظرف ہی ظرف' شکر ہی شکر۔ نجمی کو آنکھیں ملے تین دن ہو گئے تھے۔ پہلے ر
صغریٰ نے اس سے کہا تھا کہ زیبا سے ملنے' اسے دیکھنے چلے لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ ا
نے ڈاکٹر وحید سے وعدہ جو کیا تھا "میں یونہی بہت خوش ہوں ماں' تم مجھے بتاتی رہو کہ وہ خو
ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔"

ایک تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ صغریٰ کو خالہ کے بجائے ماں کہنے لگا تھا۔ اس نے صغ
سے کہہ دیا تھا کہ اب اسے کام پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صغریٰ نے اسے سمجھانے
بہت کوشش کی تھی مگر پھر تھک ہار کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ نابینا سے بینا بننے والی تبدیلی ک
معمولی تبدیلی نہیں تھی۔ وہ اندر سے بدل رہ گیا تھا۔ بے نام خدشے' وسوسے' خوف اب
بھی نہیں تھا۔ ایک گہری طمانیت تھی جس نے اسے اندر سے روشن کر دیا تھا۔

لیکن وہ لمحہ بہت عجیب تھا جب اس نے پہلی بار آئینہ دیکھا۔ اس کا دل دھک سے
گیا' الجھے ہوئے' چپکے ہوئے سفید بال' جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ' اندر دھنسے ہوئے رخسار ا
جھلسی ہوئی رنگت۔ اس چہرے پر وہ شفاف' روشن اور خوب صورت آنکھیں بے حد اجنبی ل
رہی تھیں۔ "یہ میں ہوں؟" وہ بڑبڑایا تھا "نہیں' ہرگز نہیں! میں کہاں گیا؟ کہاں چلا گیا م
آئینے میں دیکھتا ہوں' میں کہاں چلا گیا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

اسی لمحے اس کے اندر کسی نے پھنکار کر کہا "کم ظرف' ناشکرے' جب تک کچھ د
نصیب نہیں تھا تو دیکھنے کو ترستا تھا۔ ناممکن ممکن ہو گیا' دیکھنے والی آنکھیں مل گئیں تو آپے
باہر ہو رہا ہے! وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ معبود! معاف کر دے مجھے۔ وہ بڑبڑایا' شرم
ہوں۔ بہت بڑا ناشکراپن سرزد ہوا ہے مجھ سے۔ اس نے پھر آئینے میں خود کو دیکھا۔ "ٹھیک

ہے' اس نے خود سے کہا' خود اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ پہلے بال بنوانا' نہانا اور صاف ستھرے
کپڑے پہننا چاہئے تھا' پھر خود سے ملنا چاہئے تھا مجھے' اور یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے تھا کہ میں
خود کو تقریباً چودہ سال بعد دیکھ رہا ہوں۔"

اس نے بال کٹوائے' شیو بنوایا' دھلے ہوئے کپڑے پہنے پھر آئینے کے روبرو گیا۔ ایک
باوقار بردبار شخص اس کے سامنے تھا۔ ہاں' یہ میں ہوں۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔ اے
اللہ' تیرا شکر ہے' اے اللہ..........

اگلے روز اس نے اپنی گیندوں کی بالٹی اٹھائی اور صغریٰ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔
اس روز اسے احساس ہوا کہ واٹر بال بیچنا صرف روزگار ہی نہیں ایک دلچسپ کھیل بھی ہے۔ وہ
دنیا دیکھ رہا تھا۔ اب تیسرا دن تھا۔ معمول پھر بن چکا تھا مگر اب وہ صرف گیند اچھالتا رہتا تھا۔
صدا نہیں لگاتا تھا۔ صدا لگانا تو کیا' وہ حتی الامکان بولنے سے بھی گریز کرتا تھا۔ وہ تو بس مسلسل
خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا اور اللہ نے شاید اس کے جذبے کو قبولیت سے نواز دیا تھا۔ اسی لئے تو
اسے اپنی دھڑکنوں تک سے صاف' اے اللہ تیرا شکر ہے' کی آواز سنائی دیتی تھی' سانس بھی
جیسے اسی لَے پر چلتی تھی۔

رات کھانے کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی کر کے وہ بستر پر لیٹتا تو بس وہ ہوتا اور خدا کا
دربار۔ ایسی تقدس آمیز خاموشی ہوتی کہ وہ خود کو سجدے میں محسوس کرتا اور وہ کہتا رہتا' اے
اللہ تیرا شکر ہے۔ بعض اوقات تو اسی کیفیت میں فجر ہو جاتی۔ وہ سوتا تو اس جملے کا ورد کرتا ہوا
اور آنکھ کھلتی تو بھی اس کی زبان پر یہی جملہ ہوتا۔ ہر روز وہ سوچتا' آج مجھے آنکھیں ملے چوتھا
دن ہے' آج پانچواں دن ہے۔ پھر وہ گنتی بھول گیا۔ بینائی بھی معمولات میں شامل ہو گئی تھی۔

اب اخبار بھی اس کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ اخبار والا روز اخبار ڈال جاتا۔ وہ
صبح ناشتے سے پہلے بیٹھ کر اخبار چاٹتا رہتا۔ اخبار کو تو وہ ترسا ہوا تھا۔ اس روز وہ اخبار کا پچھلا
صفحہ دیکھ کر چونکا۔ بلائینڈز ویلفیئر سوسائٹی ریفل کی قرعہ اندازی کا نتیجہ شائع ہوا تھا۔ اسے یاد آیا
کہ اس نے بھی ایک ٹکٹ خریدا تھا۔ اس نے بنیان کی جیب سے ٹکٹ نکالا اور اخبار پر رکھ
لیا۔ اس نے چھوٹے انعامات والے نمبروں کی فہرست میں اپنی ٹکٹ کا نمبر دیکھنا شروع کیا جو
خاصی طویل تھی۔ فہرست ختم ہو گئی تو وہ مسکرایا' ثواب کا ثواب' انعام کا انعام.......... اس نے
ٹکٹ پھاڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ سب سے اوپر موٹے ہندسوں میں چھپے نمبر دیکھ کر اسے لگا کہ
اس کے ہندسے اس کے ٹکٹ کے نمبر سے مل رہے ہیں۔ اس نے ایک ایک کر کے ہندسے
ملائے اور کئی بار ملائے لیکن نتیجہ ہر بار ایک ہی تھا۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں ملتا اور نمبر ملاتا رہا۔
اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ٹکٹ کو پہلا انعام ملا تھا۔ دس لاکھ روپے!

دس لاکھ! اس نے سوچا' دس لاکھ تو بہت ہوتا ہے۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے
اللہ.......... اس نے صغریٰ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ناشتے کے بعد وہ دھندے پر جانے کے بجائے

شناختی کارڈ جیب میں ڈال کر بلائینڈز ویلفیئر سوسائٹی کے دفتر چلا گیا۔

"آپ کے ریفل کی قرعہ اندازی میں میرا انعام نکلا ہے' پہلا۔" اس نے کلرک کو بتایا۔

کلرک نے اسے غور سے دیکھا "مبارک ہو آپ کو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "اپنا شناختی کارڈ لائے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔" نجمی نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"شناختی کارڈ کی اور انعامی ٹکٹ کی فوٹو اسٹیٹ بنوا کر لے آئیں۔"

نجمی باہر جا کر مطلوبہ فوٹو اسٹیٹ بنوا لایا۔ کلرک نے دراز سے ایک فارم نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ فارم پُر کر دیجئے اور انعامی ٹکٹ اور شناختی کارڈ اس کے ساتھ منسلک کر دیں۔ فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھیں اور فارم مجھے دے جائیں۔"

"دے جاؤں!"

"جی ہاں۔ تقسیم انعامات کی بہت بڑی تقریب ہوگی۔ وزیر صحت بھی آئیں گے اس میں۔ آپ کو اس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا جائے گا پھر تقریب میں آپ کو انعامی رقم کا چیک ملے گا۔"

نجمی فارم پُر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.........

تقریب ایک ماہ بعد ہوئی۔ وزیر صحت کے ہاتھوں سے اسے چیک ملا۔ فلم بھی بنی' تصویریں بھی کھنچیں۔ اخباری نمائندے بھی اس کے پیچھے پڑے رہے۔ وہ ریفل کے لئے زبردست پبلسٹی کا سبب بن گیا تھا۔ کتنی غیر معمولی بات تھی کہ جب اس نے ٹکٹ خریدا' وہ اندھا تھا اور جب اس نے انعام وصول کیا تو وہ دیکھ سکتا تھا' واپس آ کر اس نے صغریٰ کو بتایا۔

"اللہ کا شکر ہے' اب تو بڑا آدمی بن گیا۔" صغریٰ نے بے حد سچے لہجے میں کہا۔

"کیسے ماں' بڑا آدمی کیسے بن گیا میں؟"

"دس لاکھ روپے کم نہیں ہوتے۔"

"ہاں ماں' کم نہیں ہوتے لیکن آدمی کو بڑا بھی نہیں بنا سکتے۔"

اس رات وہ سوچتا اور شکر ادا کرتا' شکر ادا کرتا اور سوچتا رہا۔ اب اسے کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ نے اسے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے گا۔ زیبا کی شادی کے وقت اس نے سوچا تھا' میں بیٹی کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا' کبھی اللہ نے موقع دیا تو کروں گا۔ اب اللہ نے موقع دے دیا تھا' وہ بہت کچھ کر سکتا تھا......... بس بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتا تھا' اس سے مل نہیں سکتا تھا' اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے زیبا اور وحید کے سلسلے میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے حساب لگایا' زیبا کی شادی کو ڈھائی مہینے ہوئے تھے اور اس کے ایکسیڈنٹ کو تقریباً پونے تین مہینے۔ صرف ڈھائی مہینے! وہ حیران رہ گیا۔ وہ تقریباً چودہ سال پہلے اندھا ہوا تھا۔ چودہ سال پہلے اس کی قسمت بگڑی تھی۔ چودہ سال کی بگڑی ڈھائی مہینے میں بن گئی تھی۔

واہ میرے مالک! تیری شانِ کریمی! اتنے کم وقت میں کتنا کچھ دے دیا تو نے کہ خواب سا لگتا ہے۔ بیٹی کے لئے اچھا رشتہ اور خوشیوں بھری زندگی۔ پھر کھوئی ہوئی بینائی کی واپسی اور اب اپنے بھکاری کو لکھ پتی بنا دیا۔ واقعی مالک' تیرے کرم کی کوئی حد نہیں' تو تو لمحوں میں کایا پلٹ کر دے۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.........اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ کیا کام کرے گا۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.........

O============☆============O

صبح ناشتے کے بعد صغریٰ نے کہا "اب تو کیا کرے گا نجمی؟"

"کام پر جاؤں گا ماں!"

"اب تجھے کام پر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب گیندیں نہیں بیچوں گا ماں!"

"ہاں' کوئی بڑا کاروبار کر لے۔"

"ہاں ماں' بڑا کاروبار ہی کروں گا انشاء اللہ مگر کل سے۔ آج اس کی تیاری کرنی ہے' کچھ پیسے ہوں گے ماں؟"

"کتنے چاہئیں؟"

"کتنے ہیں؟"

"چار سو سے کچھ اوپر ہیں۔ مزید کا انتظام بھی ہو سکتا ہے' پر تجھے کرنا کیا ہے؟"

"نئے کپڑے خریدنے ہیں اچھے اور چار چھ دن گھر کا خرچ چل جائے بس۔"

"مذاق کر رہا ہے مجھ سے۔ تیرے پاس تو بہت ہے بیٹا۔"

"ہاں ماں' بہت ہے۔ شکر ہے مالک کا لیکن آج چیک جمع کرواؤں گا تو کلیئر ہونے میں بھی چار چھ دن لگیں گے۔"

"گھر کی تو فکر نہ کر۔ کپڑے تو آج لے آنا' دو گھنٹے میں پیسے مل جائیں گے مجھے۔ کاروبار تو کل ہی سے شروع کرے گا نا؟"

"ہاں ماں!" وہ مسکرا دیا۔

اس نے چوک جا کر بینک میں پانچ روپے سے اکاؤنٹ کھولا اور پھر انعامی رقم کا چیک جمع کرایا۔ یہ وہی بینک تھا جہاں وہ نوٹ بدلوانے کے نام پر لٹا تھا۔ آج وہ یہاں دس لاکھ روپے جمع کرانے آیا تھا۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.........

اگلی صبح اس نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے اور چادر اٹھائی۔

"ارے......... یہ چادر لے کر کہاں چلا؟" صغریٰ نے اسے ٹوکا۔

"نیا کاروبار کرنے جا رہا ہوں ماں۔"

"یہ چادر لے کر؟!"

"ہاں ماں' یہ ضروری ہے۔"
"تو نئی چادر خرید لی ہوتی۔"
"نہیں ماں' یہی چادر ضروری ہے۔"
"میں شام کو واپس آؤں گا ماں!"

اس نے اسی پیڑ کے نیچے چادر بچھائی جہاں اس نے چودہ سال گزارے تھے۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنے نئے کام میں مصروف ہو گیا۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.......... اس کاروبار کے لئے یہیں بیٹھنا ضروری تھا جہاں اسے بن مانگے بھیک ملتی رہی تھی۔ اس کاروبار کے لئے بہت اچھے' صاف ستھرے کپڑے پہننا بھی ضروری تھا ورنہ لوگ اسے بھکاری سمجھ کر بھیک دینا شروع کر دیتے۔ اب ایسا ہونے کا امکان کم ہی تھا' ہوتا تو وہ ٹوک دیتا۔ چار چھ دن میں سب جان لیتے کہ وہ بھکاری نہیں ہے۔

وہ اللہ کی چاکری کر رہا تھا۔ موسم کیسا ہی ہوتا' وہ صبح نو بجے پیڑ کے نیچے چادر بچھا کر بیٹھ جاتا اور شام پانچ بجے اٹھ جاتا۔ 'اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.......... وہ وہاں بیٹھا اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا۔ ابتدا میں اسے کچھ لوگوں کو ٹوکنا پڑا۔ جو رک کر جیبوں میں ہاتھ ڈال رہے تھے۔ تین چار دن کے بعد سب عادی ہو گئے۔ سب نے اسے شاید ایک پیر ہی کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ ایک ہفتے بعد وہ بینک گیا منیجر نے اسے بتایا کہ اس کا چیک کلیئر ہو گیا ہے۔ اسے چیک بک بھی مل گئی۔

اس روز اس نے اللہ میاں سے آدھے دن کی چھٹی لی' اس نے ڈاکٹر وحید الدین کے نام پانچ لاکھ کا ایک چیک لکھ کر کراس کیا اور اسے جیب میں ڈال کر اسپتال کی طرف چل دیا۔ اسپتال سے پتا چلا کہ ڈاکٹر وحید چھٹی پر ہیں۔ اس نے ڈاکٹر کے گھر کا ایڈریس لیا اور نارتھ ناظم آباد جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر وحید کا بنگلا ویسا ہی تھا جیسا صغریٰ نے بیان کیا تھا۔ گیٹ پر چوکی دار موجود تھا۔ اس نے چوکی دار سے وحید کے متعلق پوچھا۔

"چھوٹے صاب تو بیگم صاب کے ساتھ کہیں گئے ہیں۔" چوکیدار نے بتایا۔
"بیگم صاحب؟" اس کا دل دھڑکنے لگا۔
"ہاں' ان کا بیوی' بابا.........."

چیک کراس تھا اس لئے ڈر کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے جیب سے کاغذ بال پن نکا
اور مختصر سا رقعہ لکھا۔

وحید بیٹے'

صرف تم سے ملنے اور کچھ دینے آیا تھا۔ زیبا سے ملنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ ا
وعدہ آخری سانس تک نبھاؤں گا۔ بیٹی کو بیٹی کہہ کر نہیں پکاروں گا لیکن اسے خالی ہاتھ رخصت

با تھا' دل میں پھانس سی تھی۔ آج اللہ نے اتنا نوازا تو خیال آیا کہ یہ پھانس بھی نکال دوں۔ ا چیک کو ایک نادار لیکن خوش نصیب باپ کی طرف سے جہیز سمجھ کر قبول کر لو اور اسے جس ح چاہو' خرچ کر لو' اسی میں میری خوشی ہے۔

دعاؤں کے ساتھ

نجم الحسن

رقعے کے ساتھ چیک منسلک کر کے اس نے چوکیدار کو دیا "یہ اپنے چھوٹے صاحب کو ے دینا۔"

"ضرور دے دے گا۔"

اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ.......... بارہ بجے کے قریب وہ اپنے ٹھکانے پر آبیٹھا۔

اس شام وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو دروازے پر ایک کار کھڑی نظر آئی۔ وہ اندر اخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر زیبا پر پڑی۔ زیبا اسے دیکھتے ہی لپکی اور اس سے لپٹ گئی۔

"بابا.......... میرے بابا!"

"بیٹا تو!" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں اندر کمرے سے دو افراد نکلے۔ یک معمر تھا اور دوسرا نوجوان۔ صغریٰ ان کے ساتھ تھی۔

"آ.......... آپ.........." وہ ہکلایا۔

"میں حمید الدین ہوں۔" معمر آدمی نے کہا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نجمی نے زیبا کو ایک طرف ہٹا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"زیبا کے سسر..........؟" اس نے صغریٰ کی طرف دیکھا۔

"سسر نہیں باپ۔" حمید الدین نے جلدی سے کہا "اور میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں اپنی اور وحید کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ ان جانے میں آپ اور زیبا کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کاش وحید نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوتا۔ یہ مجھے غلط سمجھتا رہا.......... نہیں جانتا تھا کہ جب آدمی کچھ گنواتا ہے تو اس کا دماغ درست ہو جاتا ہے اور میرا تو سب ہی کچھ لٹ گیا تھا۔ تم جو کوئی بھی تھے' میرے بھائی تھے۔ میرے محسن تھے۔ تم نے تو میرا گھر بھر دیا تھا۔ میں تو عمر بھر تمہیں خود سے بڑا سمجھوں گا.........."

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا.........." نجمی نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

"اگر چوکیدار نے وہ رقعہ مجھے نہ لا کر دیا ہوتا تو نہ جانے یہ زیادتی اور کب تک جاری رہتی" حمید الدین نے وضاحت کی۔

وحید آگے بڑھ آیا "میں بہت شرمندہ ہوں انکل!" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دیں پلیز!"

نجمی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ حمید الدین نے چیک نجمی کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا؟"

"اس کی ضرورت نہیں میرے بھائی!" حمید الدین نے کہا۔

"تم نے تو مجھے کھوئی ہوئی بیٹی دی ہے جو مجھے کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ بے بدل شے۔"

"نہیں بھائی صاحب! یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔"

"حمید الدین ہچکچائے پھر بولے "ٹھیک ہے بھائی! میں بحث نہیں کروں گا اب چلیں۔"

"نہیں کھانا کھائے بغیر میں نہیں جانے دوں گا آپ کو۔" نجمی نے کہا۔

"نہیں بھائی، ہم تو آپ کو اور بہن کو لینے آئے ہیں۔" حمید الدین نے صغریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کھانا وہیں کھائیں گے اور کل ہم آپ کے ہاں دعوت اڑائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھائی صاحب!" نجمی مسکرا دیا۔

اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ..........

O===========☆===========O

زندگی شکر کے راستے پر رواں رہی۔ نجمی کی زبان، سانسیں اور دھڑکنیں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں۔ ایک دن وہ اپنے ٹھکانے پر آنکھیں موندے مجسم شکر بنا بیٹھا تھا۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت گود میں بچے کو لئے بیٹھی زارو قطار رو رہی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی؟" اس نے پوچھا۔

"میرا بچہ بہت بیمار ہے بابا!"

"تو اسے کسی ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال لے جاؤ۔"

"ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے بابا، بس تم ہی کچھ کر سکتے ہو۔"

"میں.......... میں کیا کر سکتا ہوں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"مجھے نہیں معلوم، بس مجھے تو بشارت ہوئی تھی خواب میں.......... یہاں آنے کو کہا گیا تھا۔ بابا خدا کے واسطے دعا کرو، میرے بچے کے لئے۔"

"اچھا بی بی کر دوں گا۔"

"ابھی کر دو، میرے سامنے۔"

"اچھا بی بی!" نجمی نے کہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عورت یوں اس کی جان نہیں چھوڑے گی۔ اسے ترس بھی آرہا تھا اس پر "لیکن بی بی.......... میں کوئی بزرگ نہیں ہوں۔" اس نے آخری کوشش کی۔

"ہوا نہیں، میرے بچے کے لئے دعا کر دو۔"

نجمی نے سر جھکایا اور گڑگڑا کر کہا "اے اللہ، اپنی رحمت سے اس عورت کے بچے کو

شفائے کاملہ عطا فرما۔"

عورت بچے کو لے کر چلی گئی، دو دن بعد وہ پھر آئی۔

"اب کیا ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

"میرا بچہ اچھا ہو گیا۔"

"اللہ کا شکر ہے بی بی، اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔"

"ضرور کروں گی بابا، مگر اس وقت تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔"

"بس اللہ کا شکر ادا کرو۔"

اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ طرح طرح کے لوگ آنے لگے۔ کسی پر جادو کا اثر تھا، کسی کا شوہر ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اس کی تو داڑھی بھی نہیں تھی لیکن اس کے لاکھ انکار کے باوجود اس سے دعا کرائے بغیر کوئی ٹلتا نہیں تھا۔ وہ عاجز آگیا۔ اتنے لوگ آنے لگے تھے کہ اس کی چاکری میں بھی خلل پڑنے لگا تھا اور یہ بات اسے گوارا نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر بیٹھ کر ہی چاکری کرے گا لیکن نو بجے کے بعد گھر بیٹھنے سے اسے وحشت ہونے لگی۔ ارتکاز ہی نہیں رہا۔ لگتا تھا، وہ شکر ادا کرنا بھول رہا ہے۔ اس کے اندر کسی نے کہا "نجمی، اللہ کو تیری وہیں کی چاکری قبول ہے بس۔" وہ شکر کے دھاگے سے بندھا وہیں پہنچ گیا۔

اب تو لگتا تھا، پورا شہر اس کے پاس آتا ہے۔ آخر کار اسے سُوجھ ہی گئی۔ جب یہ لوگ مجھے جعلی بزرگ بنا ہی رہے ہیں تو کیوں نہ بن ہی جاؤں۔ اس نے سوچا، یہ بھی مطمئن رہیں گے اور میری چاکری بھی چلتی رہے گی۔ شکر ادا کرنے میں خلل بھی نہیں پڑے گا۔ اگلے روز وہ ایک کتاب میں کاغذ کے تہ کئے ہوئے کچھ پُرزے لے آیا۔ اسے شرمندگی تو ہو رہی تھی لیکن یہ خیال بھی تھا کہ اللہ نیتوں کا جاننے والا ہے۔

اب جو کوئی بھی آکر اپنا مسئلہ بیان کرتا، وہ آنکھ کھول کر اسے دیکھے بغیر کتاب میں سے ایک پُرزہ نکالتا اور اسے دے دیتا۔ "اسے بازو پر باندھ لو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔" وہ کہتا پھر اس نے یہ کہنا بھی چھوڑ دیا۔ اب اس کی زبان شکر کے لئے آزاد تھی۔ تعویذ ختم ہو جاتے تو وہ کہتا "کل آنا۔"

اب وہ صبح نو بجے سے پانچ بجے تک وہاں بیٹھتا اور عشاء کے بعد گھر پر بیٹھ کر تعویذ لکھتا۔ اب سو تعویذ بھی کم پڑنے لگے تھے۔ تعویذ ختم ہو جاتے تو اس کی زبان کی آزادی شکر بھی چھن جاتی لہٰذا وہ زیادہ سے زیادہ تعویذ لکھ کر لاتا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ وہ شہر بھر میں نجمی بابا کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

ایک صبح پیڑ کے پاس ایک کار آکر رکی۔ ایک شخص کار سے اتر کر اس کے پاس آبیٹھا۔

"بابا جی، میرا کاروبار ٹھپ ہو رہا ہے، دعا کریں۔"

نجمی نے ایک تعویذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شخص تعویذ لے کر کار میں بیٹھا

اور واپس چلا گیا۔ وہ شہر کا مشہور عامل دلدار رضوی تھا۔ ایک بڑے چوک پر اس نے اپ
عملیات کی دکان سجا رکھی تھی۔ بہت اچھا دھندا چل رہا تھا۔ نجمی بابا کی شہرت سن کر اسے ایک
اچھوتا خیال سوجھا تھا۔ بتانے والے بتاتے تھے کہ نجمی بابا گھر سے تعویذ لکھ کر لاتا ہے اور ہر
ضرورت مند کو بند آنکھوں سے ایک تعویذ نکال کر دے دیتا ہے۔ اور ہر شخص کی حاجت پوری
ہو جاتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہر تعویذ ایک سا ہی ہوتا ہو گا۔ گویا ہر مسئلے کا ایک
ہی حل۔ دلدار رضوی کو یقین ہو گیا کہ نجمی بابا کے پاس اسم اعظم ہے اور اسے حاصل کرنا کچھ
دشوار بھی نہیں۔

یہی سوچ کر وہ آج خود تعویذ لنے آگیا تھا اور اب خوش خوش واپس جا رہا تھا۔ اس کے
جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ کائنات کا سب سے بڑا راز اس کے ہاتھ لگ گیا تھا' اس پر کھلنے
والا تھا۔ کائنات کا سب سے بڑا راز!

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر قمیض کی جیب سے
تعویذ نکالا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم کا ہر مسام پسینہ اُگل رہا تھا۔ اس نے
لرزتی انگلیوں سے تعویذ کی تہیں کھولنی شروع کیں۔ اسم اعظم' کائنات کا سب سے بڑا راز
اب کھلا ہوا کاغذ اس کے سامنے تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ مایوسی نے
اس کے وجود کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ کاغذ پر بہت نفیس اور خوشنما تحریر میں لکھا تھا۔ اے
اللہ' تیرا شکر ہے۔

اس نے کاغذ کی گولی سی بنائی اور ڈسٹ بن میں پھینک رہا تھا کہ کچھ خیال آگیا۔ اس
نے کاغذ کو میز کی دراز میں ڈالا اور دراز بند کر دی۔ اس کی مایوسی اور جھنجلاہٹ کی کوئی حد
نہیں تھی۔

اسم اعظم! کائنات کا سب سے بڑا راز!
اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ..........

اندھی گلی

جیسے ہی لائٹ گئی' اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سسٹم ہی کچھ ایسا تھا حالانکہ خواب
میں محض مدہم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور وہ خاصی گہری نیند سو رہی تھی لیکن ہمیشہ ایسا
ہوتا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی کے بغیر وہ سو ہی نہیں سکتی تھی۔ لائٹ جاتے ہی اس کا اٹھ
لازمی تھا۔

سو وہ اٹھ بیٹھی لیکن وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اسے اندھیرے سے خوف نہیں آتا تھا بلکہ
اندھیرا اسے بے حد رومان انگیز محسوس ہوتا تھا۔ ایسے میں اس کے جسم میں یہ احساس سنسنی کی
طرح دوڑ جاتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اندھیرے سے خوف نہ آنے کے
باوجود وہ اندھیرے میں سو نہیں سکتی تھی۔

اس نے عادتاً سرہانے رکھی ہوئی زرد چادر اٹھائی اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کاہ
رنگ کے لباس میں تھی۔ وہ بیڈ روم سے نکلی اور سٹنگ روم میں چلی آئی۔ اندھیرے کی وجہ
سے اسے دشواری ہوئی لیکن اس نے موم بتی نہیں جلائی' وہ اس رومان انگیز ماحول کو تباہ نہیں
کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتی رہی۔

اپنا سٹنگ روم اسے بے حد پسند تھا۔ اس کی تعمیر اور آرائش کے سلسلے میں اس نے
بہت مغز ماری کی تھی۔ وہ فرنیچر سے بچتی بچاتی سامنے والی دیوار کی طرف بڑھ گئی جس کے
دوسری طرف سڑک تھی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے سبز پردوں کو ایک طرف سمیٹا۔ سٹنگ
روم کی وہ دیوار درحقیقت شیشے کی تھی۔ پوری دیوار پر لکڑی کے فریموں کا جال سا تھا اور
فریموں کے درمیان شیشے لگے تھے جن سے باہر کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا لیکن اس وقت باہر
دیکھنے کو تھا ہی کیا سوائے تاریکی کے' البتہ پردے سمیٹنے سے یہ ضرور ہوا کہ تاریکی کا احساس
قدرے کم ہوگیا' کینوس جو وسیع ہوگیا تھا۔

وہ پرستائش نظروں سے سٹنگ روم کو دیکھتی رہی۔ وہ امریکن اسٹائل کا پارلر تھا۔
چند لمحے بعد وہ شیشے کی دیوار کے پاس جاکھڑی ہوئی اور باہر دیکھنے لگی۔ جس جگہ وہ کھڑی

وہاں سے ایک سڑک اس کی سیدھ میں آجاتی تھی اور دوسری سڑک شیشے کی دیوار کے
ازیا تھی۔ وہ شیشے ایسے تھے کہ ان سے باہر تو دیکھا جاسکتا تھا لیکن باہر کھڑے ہوئے کسی
کے لئے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر اچانک اسے دیوار کے پیش منظر میں کوئی بیس گز دور ایک سفید
نظر آئی۔ وہ چیز معلق تھی' وہ حیرت سے دیکھتی اور سوچتی رہی کہ یہ کیا ہوسکتا ہے پھر اس چیز
قریب ایک اور چمک دار چیز نظر آئی۔ اس بار اس کی سمجھ میں آگیا۔ وہ دوسری چیز یقینی طور
ریڈیم ڈائل والی گھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے پتا چل گیا کہ پہلے نظر آنے والی سفید چیز
ہیٹ ہے۔ گویا وہ کوئی شخص تھا جو گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے والی سڑک کی
سمت تھا۔ اسی وقت اس نے اس شخص کے مقابل سڑک کی بائیں طرف ایک اور شخص
دیکھا۔ وہ بھی صرف اپنی سفید ٹوپی ہی کی وجہ سے نظر آیا تھا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔
اسے کچھ پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

اچانک دور سے دو ننھی منی روشنیاں حرکت کرتی نظر آئیں۔ وہ اسی کی سمت پیش
کر رہی تھیں اور جیسے جیسے قریب آ رہی تھیں' ان کا حجم بڑھتا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد
اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک کار ہے۔ کار اب کافی قریب آگئی تھی اور وہ واضح طور پر اسے دیکھ
تھی۔ وہ پرانے ماڈل کی کار تھی.......... اس نے سڑک کے دونوں طرف موجود افراد کو اپنی
سمت دیوار کے ساتھ دبکتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ان دونوں
پاس خود کار گنیں تھیں اور وہ گنیں بلند ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف کار بدستور بڑھ رہی
کار کا ڈرائیور اس بات سے بے خبر تھا کہ وہاں دو افراد اس کے لئے گھات لگائے بیٹھے

سفید ہیٹ والا اور اس کا ساتھی' دونوں پوری طرح تیار تھے' وہ ان کے انداز سے سمجھ
اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ کار اب بہت قریب آگئی تھی۔
"اور پھر جو کچھ ہوا' بہت تیزی سے ہوا' سڑک کے اطراف موجود دونوں افراد نے
شروع کر دی۔ کار کسی شرابی کی طرح ڈگمگائی۔ ڈرائیور نے بریک لگائے.......... کار
روم کی شیشے والی دیوار سے ذرا سی دور رکی۔ ڈرائیور نے تیزی سے دروازہ کھولا اور باہر
یقیناً زخمی تھا۔ دوسری طرف سڑک کی دونوں جانب سے دونوں مسلح افراد نمودار ہوئے۔
انے فائر کئے اور کار کا.......... نوجوان ڈرائیور ایک چیخ مار کر ڈھیر ہوگیا.......... وہ کار کے
ٹیمن سامنے گرا تھا اور یقینی طور پر ختم ہوچکا تھا۔ اس کے قاتل آگے بڑھے۔ سفید ہیٹ
نے اپنی گن جھکالی تھی جب کہ سفید ٹوپی والا ابھی تک چوکنا تھا۔
وہ پورا منظر کسی فلم سے متعلق معلوم ہوتا تھا.......... کار کی ونڈشیلڈ میں دونوں جانب
سوراخ تھے۔ شیشہ کئی جگہ سے چٹخ گیا تھا۔ اس پر خون کے چھینٹے بھی تھے.......... کار کی

چھت پر اور سامنے والی جالیوں پر بھی گولیوں کے کئی سوراخ تھے البتہ اس کی ہیڈ لائٹز
بھی روشن تھیں۔

سفید ہیٹ والے نے جھک کر اپنے شکار کو دیکھا پھر اسے مردہ پا کر مطمئن ہو گیا
کے بعد وہ کھڑا ہو گیا.......... پھر اچانک ہی اس کی نظر شیشے کی دیوار پر پڑی۔ یاسمین کو ایسا لگا
وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ باہر سے اندر کا منظر دیکھنا
ہے لیکن آنکھیں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جانے کا احساس بدستور تھا۔ بے شک' قاتل
نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے اس کی موجودگی کا شک تو ہو سکتا تھا۔ ایسے میں وہ واحد عینی
مٹانے کے لئے کیا کر سکتا تھا؟ وہ پوری دیوار کو چھلنی کر سکتا تھا اور یقیناً وہ شکار ہو جاتی'
کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر سٹنگ روم کے اندرونی دروازے کی طرف
اسے بہت دور نظر آیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو اس کے جسم میں درجنوں گولیاں پیو
جاتیں۔ وہ پلٹی' قاتل بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے تیور کڑے
ہونٹوں پر بے حد سفاک مسکراہٹ تھی' یاسمین کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کی تمام قوت
کر لی گئی ہے۔ اب وہ ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ قاتل نے اپنی گن بلن
یاسمین نے چیخنے کی کوشش کی اور مسلسل کوشش کرتی رہی۔ بالآخر اس کے حلق سے
طویل چیخ آزاد ہوئی۔

یاسمین خود اپنی ہی چیخ سن کر بیدار ہوئی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ نائٹ بلب
بجھ چکا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے لائٹ چلی گئی ہو گی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا جسم سو
کی طرح کانپ رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھی۔

اچانک لائٹ آ گئی' نائٹ بلب روشن ہو گیا۔ اس کی کچھ جان میں جان آئی۔ ا
اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی اور دوبارہ بستر پر آ بیٹھی۔ اس نے سرہانے سے گھڑی اٹھا
دیکھا' چار بجے تھے۔ اب اتنا خوفناک خواب دیکھنے کے بعد سونے کا تو سوال ہی نہیں
خواب اور اس کے اسباب کے متعلق سوچنے لگی۔

وہ تنہا تھی۔ نہ ماں باپ' نہ بہن بھائی۔ اسے اس کی خالہ نے پالا تھا جو راجن
رہتی تھی۔ انہوں نے ہی اسے تعلیم دلائی تھی جس کے نتیجے میں اب وہ اپنے پیروں
تھی۔ اس خوفناک خواب کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ انگریزی کے سنسنی خیز ناول بہ کثر
تھی۔ خواب میں امریکن طرز کا پارلر دیکھنے کا سبب بھی یہی تھا۔ ناولوں نے اس کی
گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ وہ آزاد خیال تھی' مرد اور عورت کی دوستی کی قائل
اسے ایڈونچر بہت پسند تھا۔ بے باک ہونے کے باوجود اس نے کبھی بے راہ روی قبول
تھی۔

وہ ٹالبوٹ اینڈ کمپنی میں ایگزیکٹو مینیجر کی سیکرٹری تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اسے

ے آج آفس بھی نہیں جانا ہے بلکہ اب کبھی بھی نہیں جانا ہے۔ حکومت کی کاروباری
یوں کے خلاف احتجاج کے طور پر ٹالبوٹ کے مالکان نے فرم کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
شتہ رات اس سلسلے میں ملازمین کو الوداعی پارٹی دی گئی تھی' وہ خود اس پارٹی سے ایک بجے
تو واپس آئی تھی۔

اچانک اسے زبردست شاک لگا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے' اس کا جسم پھر لرزنے
اس کی سمجھ میں اس خوفناک خواب کا اصل سبب آ گیا تھا۔
پارٹی سے گھر واپس آتے ہوئے اس نے قتل کی ایک حقیقی واردات دیکھی تھی..........
آنکھوں سے.......... اور اس نے قاتل کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پورا
ر پھر گیا۔

O==========☆==========O

وجہ تو معلوم نہیں' البتہ وہ پارٹی میں بے حد بور ہو رہی تھی۔ جمی نے اس کی اکتاہٹ
محسوس کر لیا تھا۔ جمی بھی کمپنی میں ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ بور ہو کر باہر نکل آئی
اور جمی بھی چند لمحے بعد اس کے پاس چلا آیا تھا۔ چند لمحے کی رسمی گفتگو کے بعد جمی نے
۔ "اب تم کیا کرو گی؟"

"ملازمت تلاش کروں گی"۔

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ ایسا کرو' میرے ساتھ میرے انکل کے گھر چلو۔ ان کے
آج پارٹی ہے' وہاں میں تمہاری ملازمت کی بات بھی کرا دوں گا"۔

ایڈونچر پسند اور رجائی یاسمین اس کی باتوں میں آ گئی۔ باہر جمی کی کار موجود تھی۔ جمی
انکل کے گھر پہنچ کر پتا چلا کہ جمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ جمی کے انکل دو ہفتے پہلے امریکہ
لے گئے تھے۔ جمی نے وہاں پہنچتے ہی دست درازی شروع کر دی۔ یاسمین نے بے حد سمجھ
ری سے کام لیا اور اسے بہلاتی رہی۔ وہ بے حد سنسان علاقہ تھا' وہ جانتی تھی کہ چیخ و پکار
ے کام نہیں چلے گا' مزاحمت کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا' وہ جمی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں
کتی تھی' اس نے خود سپردگی کا مظاہرہ کیا لیکن درد سر کا بہانہ بھی کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جمی اس
لئے کافی بنانے چلا گیا۔ جمی کے جاتے ہی وہ بڑی آہستگی سے بنگلے سے نکل آئی۔ بنگلے سے
ہی اس نے اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ٹیکسی مل
۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور وہ پانی پانی ہو گئی.......... بہرحال گھر
نا زیادہ اہم تھا۔

سڑکیں سنسان تھیں۔ اب ٹیکسی ان علاقوں سے گزر رہی تھی' جہاں رہائشی ہوٹل
یب سے واقع تھے۔ ایسے ہی ایک ہوٹل کے سامنے اس نے وہ واردات ہوتے دیکھی۔
منے سے ایک کار آ رہی تھی۔ اس کی رفتار خوفناک حد تک تیز تھی اور ہیڈ لائٹس کی روشنی

بھی بے حد تیز تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار کم کی اور اسے سائڈ میں کرلیا۔ مخا
سمت میں ایک شخص فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر کار کی طرف دیکھا اور اچا
بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر دہشت تھی۔ کار خاصی دور تھی لیکن اس کی رفتار
زیادہ تیز تھی۔ پلک جھپکتے میں وہ بھاگتے ہوئے شخص کے سر پر پہنچ گئی۔ کار کے ڈرائیور نے
فٹ پاتھ پر چڑھا دی۔ فضا میں ایک کریہہ چیخ گونجی۔ بھاگنے والا شخص پہیوں کے نیچے آگر
گیا تھا۔ اس کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کار کے ڈرائیور نے کار کو فٹ پاتھ سے اتا
ایک لمحے کے لئے کار کی رفتار کم ہوئی اور پھر وہ گولی کی طرح نکلتی چلی گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بریک لگائے۔ چند لمحے تو ساکت بیٹھا رہا پھر وہ اترا اور کار کے شکا
طرف بڑھ گیا۔ یاسمین بھی اتر رہی تھی لیکن ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع
دیا۔ یاسمین ٹیکسی ہی میں بیٹھی رہی۔ رات بہت ہوچکی تھی' اس کے باوجود ہوٹلوں سے ا
خاصے لوگ نکل آئے۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس آگئی۔ ایک پولیس افسر یاسمین کے پاس آیا۔ پہلے تو اس
یاسمین سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آرہی ہے پھر اس نے پوچھا کہ کیا اس نے کار ڈرائیور کا
دیکھا تھا؟

"میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی"۔ یاسمین نے پوری سچائی سے کہا۔ "وہ دا
نکال کر ہنس رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑی حد تک بگڑا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے شکار کی بے
محظوظ ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی تھی اور ہنسنے کے انداز میں بھی۔ اس کی عمر
تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ بال گھنگرالے تھے' وہ یقیناً خوبرو تھا لیکن اس وقت ہرگز نہیں لگ
تھا۔ میں اس کے چہرے کے تاثر کو بیان نہیں کرسکتی"۔

پولیس افسر نے اس کا پتا نوٹ کرنے کے بعد اسے فوراً ہی گھر جانے کی اجازت
دی تھی' وہ گھر پہنچتے ہی سوگئی تھی' اور اب اس خوفناک خواب نے اسے جگا دیا تھا۔

یہ سوچ کر کہ آفس نہیں جانا ہے' اسے خاصا سکون ہوا۔ اس نے بستر پر لیٹ کر آ
موند لیں۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آگئی۔

O============☆============O
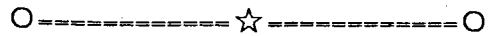
اگلے چند روز ملازمت کی تلاش اور پولیس کے چکر میں گزرے۔ پولیس کو وہ سبز
مل گئی تھی جس سے ہوٹل کے مالک کو کچل کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن کار کے ڈرائیور کا سراغ
تک نہیں مل سکا تھا۔ یہ طے ہوگیا تھا کہ قاتل نے کار چرائی تھی۔ کار کے اصل مالک
وقوعے سے چند گھنٹے پیشتر کار کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ اخبارات چند روز
اس خبر کو اہمیت دیتے رہے پھر خبر کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بتدریج معدوم ہوگئی۔ لاینحل کی
کی فائل میں ایک اور کیس کا اضافہ ہوگیا تھا۔

اس نے ملازمت کے حصول کے سلسلے میں اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے
ایک خط ملا۔ بیگم تمکین شاہ کو جو پہاڑی شہر رام گڑھ میں رہتی تھی' ایک سوشل سیکرٹری کی
ضرورت تھی۔ انہوں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے وکیل سے انٹرویو کے سلسلے میں مل
لے۔ چنانچہ وہ مقامی وکیل کے پاس گئی۔ انٹرویو بخیر و خوبی نمٹ گیا۔

"اس سے پہلے بیگم شاہ ملازمت کی شوقین خواتین کو موقع دیتی رہی ہیں"۔ وکیل نے
بتایا۔ "لیکن ایسے لوگ جنہیں ملازمت کی ضرورت نہ ہو' نہ تو مستعدی سے کام کرتے ہیں اور
نہ کہنا مانتے ہیں۔ بیگم شاہ نے کئی سیکرٹریز گنوا کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس بار وہ کسی ضرورت مند
کو رکھیں گی۔ آپ ضرورت مند ہیں نا؟" وکیل نے پوچھا۔

"جی ہاں' مجھے کام سے بھی دلچسپی ہے"۔ یاسمین نے جواب دیا۔ انٹرویو کے ایک ہفتے
بعد بیگم شاہ کا خط آیا۔ انہوں نے یاسمین کو معقول تنخواہ کی پیش کش کی تھی۔ انہوں نے اسے
جمعرات کے روز روانگی کی ہدایت کی تھی۔ اسٹیشن پر گاڑی اس کی منتظر ہوگی۔ انہوں نے گرم
کپڑوں پر بالخصوص زور دیا تھا۔ کیونکہ رام گڑھ میں پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے خاصی سردی
پڑتی تھی۔

یاسمین بہت خوش تھی۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں ایک ایسی جگہ جا رہی تھی' جہاں
متوسط طبقے کے افراد تفریح کی غرض سے جانے کے محض خواب دیکھتے رہتے تھے۔ گویا روزگار کا
روزگار اور تفریح کی تفریح' سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس رات کے بعد وہ شدت سے یہ
شہر چھوڑ دینے کی خواہش مند تھی۔ قاتل ڈرائیور کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی رہتی
تھی۔

اس نے کچھ گرم کپڑے خریدے اور جمعرات کو رام گڑھ کے لئے روانہ ہوگئی۔
اسٹیشن پر بیگم شاہ کا ڈرائیور نادر اس کا منتظر تھا۔ خاصا معمر آدمی تھا وہ اور کم گو بھی۔ کار کا سفر
خاصا طویل تھا اور یاسمین سوالات سے بھری ہوئی تھی لیکن نادر ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں
میں دینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ چنانچہ یاسمین نے خاموشی کو بہتر سمجھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے
لگی۔ رام گڑھ واقعی جنت نظیر علاقہ تھا۔ پھیپھڑوں میں اترنے والی ہوا بے حد شفاف اور تازہ
محسوس ہو رہی تھی۔ سینے میں جیسے روشنی سی اترتی جا رہی تھی۔

بالآخر کار پتھر کے بنے ہوئے ایک محرابی گیٹ میں داخل ہوئی۔ ڈرائیو وے کے اطراف
میں بید مجنوں کے درختوں کی قطار تھی۔ قریب ہی ایک پہاڑی چشمہ گنگنا رہا تھا۔ مکان قدیم طرز
تعمیر کا نمونہ تھا اور بے حد حسین تھا۔ نادر نے گاڑی پورچ کے سامنے روک دی اور باہر نکل کر
اس کے لئے دروازہ کھولا' وہ کار سے اتر آئی۔

"میں کار گیراج میں لے جا رہا ہوں پھر آپ کا سامان اندر لے آؤں گا"۔ نادر نے کہا۔
اسی وقت مکان کا دروازہ کھلا اور ایک جوان العمر شخص نمودار ہوا۔ اس نے یاسمین کو

مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ "میں آپ کو شاہ پیلس میں خوش آمدید کہتا ہوں مس!"

یاسمین نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا' وہ مسکرائی پھر اس نے نوجوان کے چہرے کو پوری طرح دیکھا اور بری طرح لرز کر رہ گئی۔ وہ سبز ڈاٹسن کے ڈرائیور کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا جس نے اس رات ہوٹل کے مالک کو کچلا تھا۔ فرق صرف تاثر کا تھا اور بہت بڑا فرق تھا یہ...... وہ چہرہ جس قدر ناخوشگوار تھا' یہ چہرہ اتنا ہی خوشگوار تھا۔

یاسمین نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا لیکن اسے ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے نوجوان نے اس کے انداز کی تبدیلی کو محسوس کرلیا ہے۔ اب وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھ رہا تھا لیکن پھر اسے ایسا لگا کہ وہ محض اس کا وہم تھا۔

"میرا نام حارث شاہ ہے"۔ جوان العمر شخص نے کہا۔ "ممی یقیناً آپ کو دیکھ کر خوش ہوں گی"۔

چند لمحے بعد یاسمین کو پتا چل گیا کہ نوجوان نے غلط نہیں کہا تھا۔ بیگم شاہ اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔ "مجھے تمہاری آمد سے خوشی ہوئی۔ میری ڈنر پارٹی تباہ ہونے سے بچ گئی"۔ بیگم شاہ نے کہا۔ پھر انہوں نے حارث سے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میرا بیٹا حارث ہے"۔

"ممی کو ڈنر پارٹی کی فکر ہے کیونکہ ناصرہ اچانک ہی چلی گئی ہے"۔ حارث نے وضاحت کی۔

"ناصرہ میری یتیم بھانجی ہے' اکثر میرا ہاتھ بٹاتی ہے"۔ بیگم شاہ نے کہا پھر اچانک پوچھا۔ "تم پھول سجانا جانتی ہو؟"

"جی ہاں' یقیناً"۔ یاسمین کے بجائے حارث نے جواب دیا۔ "یہ بہت اہل لڑکی معلوم ہوتی ہیں' ہر کام کر سکتی ہیں' سوشل سیکرٹری جو ہوئیں"۔

یاسمین گھبرا گئی۔ اس نے شوقیہ یہ کام کیا تو تھا لیکن اسے اس کام کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ "جی ہاں' میں پھول سجا سکتی ہوں"۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

بیگم شاہ نے گھنٹی بجا کر خادمہ کو طلب کیا۔ خادمہ' یاسمین کو اوپر لے گئی۔ وہ دوسری منزل کی کئی راہداریوں سے گزری۔ یاسمین کو وہ مکان بھول بھلیاں محسوس ہونے لگا۔ وہ راستہ یاد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ تنہا ہونے کی صورت میں وہ بھٹک جائے گی اور ادھر ادھر چکراتی پھرے گی۔ اب وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ پہلی بار دائیں جانب اور دوسری بار بائیں جانب مڑی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا' وہ الجھ کر رہ گئی' لیکن اپنا کمرا دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ وہ بے حد وسیع و عریض اور خوبصورت کمرا تھا۔ اس کا سامان پہلے ہی کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ خادمہ سامان کھول کر اسے قرینے سے رکھنے میں مصروف ہوگئی۔

یاسمین کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلی گئی۔

وہ کپڑے بدل کر نکلی تو حارث کمرے میں موجود تھا' وہ اسے دوسرے کمرے میں لے

گیا۔ جہاں پھول موجود تھے...... بہت سارے پھول "مجھے پھولوں کا ذرا بھی تجربہ نہیں"۔
حارث نے کہا۔ "پھر بھی میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں"۔

یاسمین ہنس دی پھر وہ فوراً ہی پھولوں کو سیٹ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

○============☆============○

تمام کام نمٹ چکے تھے' پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ پارٹی میں شریک مہمانوں سے یاسمین کا تعارف بیگم شاہ نے کرایا۔ ان میں جج شاکر علی بھی تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے اور اب قریب ہی واقع اپنے کاٹیج میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بھتیجا عامر بھی تھا جو ارضیات کا طالب علم تھا' ایم اے کر رہا تھا۔ وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے چچا کے پاس آیا ہوا تھا اور رام گڑھ میں چٹانوں کی ساخت کے سلسلے میں تحقیقی کام کر رہا تھا۔ جج شاکر علی نے بتایا کہ ان دنوں وہ جرائم کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں' اس سلسلے میں انہوں نے جج کی حیثیت سے اپنے تجربات سے استفادہ کیا ہے۔

حارث بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں یاسمین اس سے خوفزدہ بھی تھی۔ وہ ان بارے میں سوچتی رہی۔ شاید اس کے خوف کا سبب یہ تھا کہ وہ قاتل ڈرائیور سے مشابہت رکھتا تھا لیکن یاسمین کو یقین تھا کہ حارث وہ ڈرائیور ہے نہیں۔

مہمانوں کے درمیان رام گڑھ میں حال ہی میں ہونے والی ڈاکا زنی کی واردات کے بارے میں بات چل نکلی تھی۔ اس واردات میں ایک تقریب کے دوران جواہرات لوٹ لئے گئے تھے۔ حارث بے حد دلچسپی سے سن رہا تھا کیونکہ وہ تین ہفتے دارالحکومت میں گزارنے کے بعد دو دن پہلے ہی رام گڑھ واپس آیا تھا۔

یاسمین یہ سن کر چونکی۔ اس کا مطلب تھا کہ جس رات دارالحکومت میں قتل کی واردات ہوئی' حارث وہیں تھا۔

"آپ ڈاکو کو پہچان سکتی ہیں؟" جج صاحب نے بیگم باقر سے پوچھا جو اس تقریب میں شریک تھیں' جس میں ڈاکا زنی کی واردات ہوئی تھی۔

"میری شامت آئی ہے کیا؟" بیگم باقر نے کہا۔ ان کا جسم کپکپا اٹھا۔ "میں سن چکی ہوں کہ ایسے لوگوں کا کیا انجام ہوتا ہے' مجھے زندگی بہت پیاری ہے' ویسے بھی اس کے چہرے پر نقاب تھا"۔

"کسی مجرم کو شناخت کرنے کا مرحلہ ویسے بھی بڑا نازک ہوتا ہے"۔ جج صاحب نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ "میری کتاب میں ایسے کئی کیسوں کا حوالہ ملے گا جن میں مجرموں کو شناخت کرنے میں گواہوں سے غلطی سرزد ہوئی۔ گواہوں نے ان لوگوں کو مثبت طور پر مجرموں کی حیثیت سے شناخت کیا جو بعد میں بے قصور ثابت ہوئے۔ ان میں سے بعض تو سزائیں بھی کاٹ چکے تھے"۔

"میں تو کسی ایسے مجرم کو بھی شناخت کرنا نہیں چاہوں گی جسے میں نے واضح طور
ہو"۔ یاسمین نے کہا۔ "گزشتہ دنوں میری آنکھوں کے سامنے قتل کی ایک لرزہ خیز وا
ہوئی۔ میں نے قاتل کا چہرہ دیکھا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ بے شمار لوگوں کے ایسے چہر
گے۔ اب میں صرف مشابہت کی بنیاد پر ان میں کسی کو شناخت کر بیٹھوں تو یہ میری
ہوگی"۔ اس کی نظریں بلا ارادہ حارث کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے یقین تھا کہ حارث نے ا
بات سنی ہے لیکن وہ کسی اور طرف متوجہ ہو کر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں سنا۔

"لیکن بی بی، ایک اچھے شہری کے کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں"۔ جج شاکر علی نے
انداز میں کہا۔ "بہرحال، یہ بھی ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں آدمی الجھ جاتا ہے
کرے اور کیا نہ کرے۔ تم کسی دن، میرے کاٹیج آؤ، میں تمہیں اپنی کتاب کا مسودہ دوں،
پڑھ کر دیکھنا کہ کیسے دلچسپ اور عجیب و غریب واقعات پیش آتے رہے ہیں"۔

"میں ضرور آؤں گی، شام کے وقت مجھے فرصت ہوگی"۔ یاسمین نے کہا۔

مہمان رخصت ہونے لگے۔ عامر نے بڑے مہذب لہجے میں یاسمین سے کہا۔ "ا
بڑا دلچسپ مضمون ہے، اگر آپ ہفتے کی شام فارغ ہوں تو میرے ساتھ چلیں۔ میں یہاں چ
کی ساخت پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ کبھی کبھار بہت قیمتی پتھر بھی مل جاتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے۔ بیگم شاہ نے ہفتے اور اتوار کی چھٹی کا وعدہ کیا ہے، ہفتے کو میں فارغ
گی، میں ضرور چلوں گی آپ کے ساتھ"۔

"تم بھول رہی ہو سیمی!" عقب سے حارث کی آواز سنائی دی۔ لہجہ بے تکلفانہ
"ہفتے کو تم میرے ساتھ سیر کو چلوگی، تم وعدہ کر چکی ہو"۔

یاسمین سناٹے میں آگئی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر وہ تردید بھی نہ کر سکی۔

"کوئی بات نہیں پھر کسی دن سہی"۔ عامر نے جلدی سے کہا۔ اس کا لہجہ دوستا
لیکن اس کی نظروں میں حارث کے لئے پسندیدگی نہیں تھی جو مسکرا رہا تھا۔

O============☆============O

صبح بیگم شاہ نے یاسمین کو اس کا دفتری کمرا دکھایا۔ وہاں دفتری ضرورت کی ہر چیز م
تھی پھر بیگم شاہ نے اسے کام کے متعلق سمجھایا۔ گھر کے تمام افراد کو ایک تقریب کے سلسلے
کنٹری کلب جانا تھا۔ اب گھر پر صرف یاسمین اور ملازم رہ گئے تھے۔ یاسمین کام میں جت گ
بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ کاغذات بے ترتیب تھے اور ان کی فائلنگ ہونا تھی۔

اچانک کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اونچی ہیل کی آواز سے اسے پتا چل گیا کہ آنے
کوئی لڑکی ہے۔ "کون ہو تم؟" ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

یاسمین نے پلٹ کر دیکھا، لڑکی سرو قامت اور حسین تھی۔ "میں یاسمین ہوں، بیگم
کی سوشل سیکرٹری"۔ اس نے کہا۔

"اوہ! نئی سیکرٹری اب یا تو تم حارث کے چکر میں پڑ جاؤ گی یا حارث تمہارے چکر میں پڑ
جائے گا، میرا نام ناصرہ ہے"۔

یاسمین کو اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ اس نے سرد نگاہوں سے لڑکی کو گھورا پھر وہ بغیر کچھ
کہے ٹائپ رائٹر پر جھک گئی۔ ناصرہ چلی گئی لیکن چند لمحے بعد وہ دوبارہ چلی آئی۔

"آؤ، ذرا میرا سامان رکھوا دو"۔ اس نے یاسمین سے کہا۔

"کسی خادمہ سے مدد طلب کرو"۔ یاسمین نے سرد لہجے میں کہا اور بدستور ٹائپ کرتی
رہی۔

"سب کا یہی حال ہے، میں نے ایک خادمہ سے کہا تو وہ بولی، میں مصروف ہوں، کمبخت
کو نوکری سے نکلوا دوں گی، پلیز یاسمین، میری مدد کرو"۔ ناصرہ کا لہجہ التجائیہ ہوگیا۔

یاسمین کو اس کی بے بسی پر ترس آگیا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناصرہ کے ساتھ کچھ دیر گزار
کر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ بے حد خود پسند اور مغرور لڑکی ہے۔ وہ کپڑوں کے، زیوروں کے
بارے میں لاف و گزاف کرتی رہی اور یاسمین بور ہوتی رہی۔ وہاں سے جان چھڑا کر وہ اپنے
آفس میں آئی اور کام میں مصروف ہوگئی۔

O============☆============O

شام کو حارث کے سوا سب لوگ واپس آگئے۔ بیگم شاہ نے کام کا جائزہ لیا اور بہت
خوش ہوئیں۔ انہیں یاسمین کا فائلنگ سسٹم بہت پسند آیا۔ یاسمین چائے کے بعد لان میں چہل
قدمی کے لئے نکلی تو وارث شاہ صاحب کو کرسی پر بیٹھے پایا۔ انہوں نے اشارے سے اسے بلایا
اور اپنے برابر والی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یاسمین ان کی شخصیت سے بے حد متاثر
تھی۔ ان کے انداز میں بلا کی شفقت تھی، وہ ان سے مکان کے بارے میں بات کرتی رہی۔
انہوں نے بتایا کہ یہ مکان ان کے دادا نے بنوایا تھا۔

"کسی دن تم میرا ذخیرہ بھی دیکھنا"۔ شاہ صاحب نے بچگانہ لہجے میں کہا۔

"کاہے کا ذخیرہ؟"

"لکڑی کی مورتیوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے میرے پاس، بڑی بڑی نادر چیزیں ہیں ان
میں"۔

"واہ! بہت اچھی ہابی ہے"۔ یاسمین نے کہا۔ "دیکھوں گی کسی دن آپ کا ذخیرہ"۔

کچھ دیر بعد شاہ صاحب اندر چلے گئے۔ یاسمین گلاب کی روشوں کے پاس ٹہلنے لگی۔
اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا، وہ دیر تک ٹہلتی رہی۔ سورج غروب ہوگیا، اندھیرا چھا گیا
مگر اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ بجری بچھے ہوئے راستے پر قدموں کی چاپ ابھری پھر اسے حارث
کے گھونگریالے بال نظر آئے، وہ گھر کی طرف جا رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر اس طرف چلا آیا۔

"کہو کیا حال ہے، کیسا دن گزرا؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک، بہت لطف آیا مجھے"۔ یاسمین نے جواب دیا۔ وہ اسے سفید سنگی بنچ کی طرف لے گیا۔ وہ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے۔ اچانک حارث کو کھڑکی میں ناصرہ کی جھلک دکھائی دی۔ "اوہ! تو ناصرہ واپس آگئی"۔ اس نے کہا پھر یاسمین کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "اسے منہ نہ لگانا، بڑی بدتمیز ہے، فوراً تم پر سواری گانٹھنے لگے گی، سب کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے، سوائے میرے"۔

یاسمین کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ ناصرہ اور حارث دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے لیکن اس سے اس کا کیا تعلق؟ وہ تو یہاں کام کرنے آئی ہے، اسے اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔

"یہ جگہ تو تمہیں دارالحکومت سے بہت مختلف لگی ہوگی؟" حارث نے پوچھا۔

"ہاں، یہاں ہوا میں تازگی کا احساس ہوتا ہے، بہت خوبصورت جگہ ہے یہ، صنعتی شہروں کی زندگی میں تو دھوئیں اور گرد کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا"۔

"اور وہ حادثہ؟ اتنی رات گئے تم کہاں سے آ رہی تھیں؟ میں اسے حادثے کی بات کر رہا ہوں، جس کا تذکرہ تم جج شاکر علی سے کر رہی تھیں"۔

"الوداعی پارٹی سے واپس آ رہی تھی"۔

"تمہیں احتیاط برتنی چاہئے، لڑکیوں کو تنہا نہیں جانا چاہئے اور وہ بھی اتنی رات کو"۔ حارث نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ پھر جیسے وہ چونک سا گیا۔ "اوہ! اخبارات میں جس پراسرار گواہ لڑکی کا تذکرہ تھا، وہ کہیں تم تو نہیں تھیں؟" اس نے یاسمین کو بہت غور سے دیکھا۔

"خیر، میری گواہی کی کوئی اہمیت نہیں تھی، میں پولیس کو کچھ زیادہ تو نہیں بتا سکی"۔ یاسمین نے بے پروائی سے کہا۔

"بہت خوفناک تجربہ تھا، تم نے پولیس کو ڈرائیور کا حلیہ تو بتایا ہوگا؟ میرا خیال ہے، تم نے اسے واضح طور پر دیکھا تھا!"

"نہیں اور میرا خیال ہے، اس جیسے بہت سے لوگ ہوں گے۔ اس کے خدوخال بہت عام سے تھے، میں نے رات بھی یہی کہا تھا کہ میں اسے شناخت نہیں کر سکتی"۔

"خنکی بڑھ گئی تھی، یاسمین کو سردی لگنے لگی۔ اس نے اندر چلنے کو کہا۔ حارث نے اس کا ہاتھ تھام لیا "ایسے نہیں، پہلے کل کا پروگرام طے کرو، کل تم میرے ساتھ کوہ پیمائی کرو گی پہلے کی ہے کبھی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں لیکن جی بہت چاہتا ہے"۔

"بس تو ٹھیک ہے، کل صبح ہی نکل چلیں گے۔ کھانا ساتھ لے لیں گے، میں ممی سے اجازت لے لوں گا۔ ویسے بھی کل اور پرسوں تمہاری چھٹی ہے ہی"۔ حارث نے کہا۔

وہ دونوں گھر کی طرف چل دیئے۔

اس رات بھی یاسمین اس ہولناک قتل کے بارے میں سوچتی رہی، جس کی وہ عینی گواہ

تھی۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اس واقعے کو بھول کیوں نہیں جاتی، شاید اس لئے کہ حارث کا چہرہ مجھے قاتل ڈرائیور کی یاد دلاتا رہتا ہے، اس نے سوچا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ ڈرائیور حارث نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ اتنی محبت کرنے والے ماں باپ.......... بے اندازہ دولت.......... نہیں وہ نہیں ہو سکتا لیکن وہ مجھے اس سلسلے میں کرید رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ اخبارات والی پراسرار گواہ لڑکی میں ہی ہوں۔ وہ یہ اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے قاتل ڈرائیور کا چہرہ واضح طور پر دیکھا ہے اور اسے پہچان بھی سکتی ہوں۔ کیوں؟ شاید میری وجہ سے.......... شاید وہ مجھے پسند کرتا ہے، میں خود بھی اسے ناپسند نہیں کرتی، وہ بے وقوف، رومان پسند لڑکیوں کی طرح سوچتی رہی، بالآخر اسے نیند آ گئی۔

O============☆============O
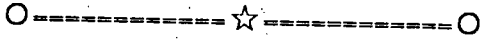
اگلی صبح وہ کوہ پیمائی کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ یاسمین جینز اور ٹی شرٹ میں تھی اور پیروں میں ہلکے جوتے تھے۔ گھر سے وہ کار میں چلے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں شاہ فیملی کا گیراج تھا۔ حارث نے کار گیراج میں کھڑی کر دی۔ اب انہیں پیدل چلنا تھا۔ انہوں نے چڑھائی کا سفر شروع کر دیا۔ حارث کمنٹری بھی کرتا جا رہا تھا پرندوں کی چہچہاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اوپر چڑھتے رہے، راستہ دشوار تر ہوتا گیا اور اسی حساب سے ان کی رفتار کم ہوتی گئی۔ وقتاً فوقتاً وہ کسی پہاڑی چشمے کے قریب رکتے۔ ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھوتے اور پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے۔ پانی بے حد خوش ذائقہ اور فرحت بخش تھا۔ حارث نے بتایا کہ یہ ان جڑی بوٹیوں کا کمال ہے، جن سے پہاڑی چشمے گزرتے ہوئے فیض اٹھاتے ہیں۔

"کھانا کب کھائیں گے ہم؟" یاسمین نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سورج اب سر پر آ پہنچا تھا۔

"ابھی لو، تم نے مناسب ترین مقام پر کھانے کی فرمائش کی ہے"۔ حارث نے کہا اور چھجے کی طرح پھیلی ہوئی چٹان کی طرف بڑھ گیا، جس کے نیچے خنک سایہ تھا۔ قریب ہی ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد انہوں نے چڑھائی کا سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد حارث نے کہا۔ "اب ہمیں واپس چلنا ہوگا۔ اس ہائیکنگ کے اثرات کل ظاہر ہوں گے، جسم کا جوڑ جوڑ دکھے گا"۔

"ٹھیک ہے"۔ یاسمین نے کہا۔ "میں تھک بھی گئی ہوں لیکن میں واپسی سے پہلے کچھ پہاڑی پھول جمع کرنا چاہتی ہوں"۔

وہ پھول جمع کرنے میں مصروف ہو گئی پھر اسے ایک چٹان پر خوبصورت گلابی پھول نظر آئے، وہ بے اختیار بڑھی اور چٹان پر چڑھ گئی۔ چٹان کے نیچے شاید کوئی پہاڑی چشمہ تھا جس کی وجہ سے چٹان پھسلواں ہو گئی تھی۔ نیچے سینکڑوں فٹ گہری مہیب کھائی تھی۔ پھولوں کا پودا چٹان کے آخری سرے پر تھا۔

"احتیاط سے"۔ عقب سے حارث نے چیخ کر کہا پھر یاسمین نے اس کے لپکتے قدموں کی آواز سنی' وہ بے حد احتیاط سے آگے بڑھتی رہی۔ "بے وقوف .... یہ چٹان پھسلواں ہے"۔ حارث نے کہا اور پیچھے سے اس کا سوئٹر تھاما۔ لیکن اگلے ہی لمحے یاسمین نے محسوس کیا کہ اس کا سوئٹر حارث کے ہاتھ سے نکل گیا ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ بھی توازن کھو بیٹھی ہے' وہ پھسلی اور پھر اس نے خود کو خلا میں محسوس کیا' وہ گر رہی تھی' اس نے ہاتھ چلائے اور چٹان پر اُگے ہوئے سبزے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن بے سود' اس کے پھسلنے کی رفتار بڑھ رہی تھی پھر اچانک اسے جھٹکا لگا' وہ دیودار کے ایک درخت سے ٹکرائی تھی......... درخت سے پھسلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کا داہنا ہاتھ درخت کے تنے سے لپٹ گیا ہے' اسی چیز نے اسے پوری طرح گرنے سے بچالیا۔ درخت کی جڑ تک پہنچ کر اسے ایک اور جھٹکا لگا' اگر اس کے اوسان ٹھکانے نہ ہوتے تو ہاتھ کی وہ گرفت بھی جاتی رہتی لیکن اس کا بایاں ہاتھ اپنے جسم اور اس چٹان کے درمیان دب کر رہ گیا' جس پر وہ مہربان درخت کھڑا تھا۔ اسے اپنے بائیں ہاتھ میں درد کی شدید لہر اٹھتی محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنی توجہ دائیں ہاتھ پر مرکوز رکھی جو تنے کے گرد لپٹا ہوا تھا' وہ خوف کے مارے بالکل ساکت ہو گئی۔

وہ اسی بے تکی پوزیشن میں لٹکی رہی۔ سامنے ہی پہاڑی راستہ تھا' جس پر سے وہ اوپر جاتے ہوئے گزری تھی۔ پھر اسے حارث نظر آیا' وہ اس کے قریب آگیا۔ "میں تنہا کچھ نہیں کرسکوں گا' تم ہمت کرکے خود کو بچائے رکھو' میں پہاڑی لوگوں کو مدد کے لئے لے کر ابھی آیا"۔ یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔

یاسمین نے اس کے چہرے پر عجیب تاثر دیکھا۔ سفاکی اور شیطینت میں لپٹی ہوئی فتح مندی کا تاثر جو پہلے بھی وہ کسی چہرے پر دیکھ چکی تھی۔ ہوٹل کے مالک پر کار چڑھانے والے ڈرائیور کے چہرے پر......... لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ شاید یہ اس کی نگاہوں کے زاویے کا کرشمہ تھا۔ ورنہ حارث کے لہجے میں تو فکر مندی تھی' تشویش تھی......... محبت آمیز تشویش اور پھر اس نے تو اس کا سوئٹر تھام کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ سنبھالنے یا گرانے کی؟ کیونکہ یامین کو ایسا لگا تھا جیسے حارث نے اسے آگے دھکیلا ہو لیکن یہ بھی اس کا وہم ہی تھا۔ حارث نے اس کا سوئٹر تھاما تھا لیکن فوراً ہی وہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا' پھسل گیا تھا یا اس نے دانستہ چھوڑ دیا تھا؟ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ وہ حارث کے سنبھالنے کی کوشش سے پہلے پھسلی تھی یا بعد میں۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ ان احمقانہ باتوں پر سوچنے کا وقت نہیں' اسے خود کو ساکت رکھنے پر توجہ دینی چاہیے۔

یا تو وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا......... یا حارث کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ کون سی بات درست تھی' کون سی بات غلط تھی' یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ جسم کے نیچے دبا ہوا اس کا بایاں ہاتھ بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلو بدل

...اسے باہر نکال لے لیکن اس صورت میں دائیں ہاتھ کی گرفت ہلکی ہونے کا خطرہ تھا اور نیچے ...گہری کھائی تھی' جس کا وہ تصور ہی کرکے دہل گئی۔ نیچے دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ ...ں کا سرمہ کروانے کے مقابلے میں بائیں ہاتھ کی تکلیف بے وقعت تھی۔ چنانچہ اس نے دم ...دہ لیا۔

اچانک بارش شروع ہوگئی۔ یخ بستہ پانی کے چھینٹوں نے اس کے چہرے کو سن کر دیا۔ ...د کو ساکت رکھنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا اور درخت کے تنے سے لپٹا ہوا ...ا کا داہنا ہاتھ بہرحال' اس کے جسم ہی کا ایک حصہ تھا بلکہ اس وقت تو وہ اس کے جسم کا اہم ...ین حصہ تھا۔ وہ حارث کے بارے میں سوچنے لگی۔ حارث کہاں ہے؟ اس نے سنا تھا کہ ان ...ڑی جنگلوں میں درندے بھی ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حارث کسی درندے کا لقمہ بن ...یا ہو' اگر ایسا ہے تو اس کا اپنا حشر کیا ہوگا' وہ اس طرح کب تک لٹکی رہ سکے گی۔

بارش رک گئی لیکن اب وہ نڈھال ہوچکی تھی۔ جسم میں جیسے توانائی رہی ہی نہیں ...ی۔ اپنے آشیانوں کی طرف واپس جاتے ہوئے پرندوں کی چہکار نے اسے احساس دلایا کہ شام ...چکی ہے اور سورج غروب ہونے والا ہے۔ ایک ہی پوزیشن میں رہنے کی وجہ سے اس کے ...رے جسم میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس پوزیشن میں کب تک رہ سکتی ...ہے۔ بالآخر اسے پوزیشن بدلنی ہوگی پھر اسے یہ خوف ستانے لگا کہ اگر وہ اسی عالم میں بے ہوش ...گئی تو کیا ہوگا۔ نیچے گرنے کا تصور ہی جان لیوا تھا۔

ایسے میں کچھ آوازیں سنائی دیں تو اس نے انہیں فریبِ سماعت قرار دے کر مسترد کر دیا ...لیکن آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں پھر اسے پہاڑی راستے پر کچھ لڑکیاں نظر آئیں' وہ ...گاگروں میں پانی بھر کے واپس جا رہی تھیں۔ اس نے جسم و جان کی پوری قوت سے انہیں پکارا ...مدد......... میری مدد کرو"۔ لیکن اس کی آواز کراہ سے بلند نہیں تھی۔

لڑکیوں تک اس کی آواز پہنچ گئی پھر ایک لڑکی نے اسے دیکھا۔ چند لمحے بعد تمام لڑکیاں ...قریب آگئیں۔ "اوہ! مضبوطی سے پکڑے رہو"۔ ایک لڑکی نے پکارا۔ "ہم ابھی مدد لے کر آتی ...ہیں"۔

پھر وہ لڑکیاں بھی حارث کی طرح چلی گئیں۔ اب یاسمین کو آنکھیں کھلی رکھنا دوبھر ہو ...رہا تھا۔ تھکن اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ جسم کے نیچے دبا ہوا بایاں ہاتھ اب ...بری طرح سن ہوگیا تھا۔ اب تو وہ چاہتی بھی تو پوزیشن نہیں بدل سکتی تھی۔ ذہن اندھیروں ...میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

اچانک اسے حرارت کا احساس ہوا' وہ کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ "کیا تم اکیلی تھیں؟" ...ایک مردانہ آواز نے پوچھا۔

"نہیں' حارث مدد لینے کے لئے گئے تھے"۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

اس کے بعد ذہن میں پھر تاریکی چھاگئی۔
دو گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے حارث کی صورت نظر آئی۔ اس کے
پٹی بندھی ہوئی تھی۔ "حارث! تم زخمی ہو؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں لیکن تم سکون سے لیٹی رہو"۔
وہ اس کے احتجاج کے باوجود اٹھ بیٹھی' اس کا بند بند دکھ رہا تھا۔ "کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں' میرا بھی پاؤں پھسل گیا تھا' چوٹ زیادہ نہیں آئی لیکن میں چار پانچ گھنٹے
ہوش رہا ہوں۔ تمہارے بتانے پر ان پہاڑی لوگوں نے مجھے بھی تلاش کیا' میں تمہارا شکر
ہوں"۔
"خدا کا شکر ہے"۔
"ہمیں یہاں شب بسری کرنی پڑے گی' ہم اس وقت پہاڑی لوگوں کے درمیان ہیں
برابر والی جھونپڑی میں ہوں"۔
اسی وقت ایک پہاڑی ان کے لئے کھانا لے آیا۔ کھانا کھاتے ہی یاسمین کو نیند آگئی۔
اگلی صبح انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ حارث تمام راستے اس سے معذرت
رہا.......... اپنے غیر ذمے داری پر.......... اور وہ بڑے خلوص سے اسے یقین دلاتی رہی کہ
میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن وہ سوچتی رہی کہ کیا واقعی حارث نے اسے سنبھا
کوشش کی تھی یا اسے دھکیلا تھا۔
پھر اسے اپنی اس رکیک سوچ پر غصہ آگیا۔ حارث نے تو اسے وہ پھول توڑنے کو
کہا تھا جو اس چٹان کے آخری سرے پر کھلے ہوئے تھے اور وہ چٹان خطرناک بھی تھی پھر
حارث کے چہرے کے وہ خوفناک تاثرات یاد آگئے۔ وہ سوچتی اور الجھتی رہی۔
راستے میں وہ آرام کرنے کے لئے رکے اور ایک چٹان سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔
نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور یاسمین کی طرف بڑھا دیا۔ یاسمین نے اسے کھول کر
اور حیران رہ گئی۔ وہ ایک خوبصورت انگوٹھی تھی۔ حارث نے انگوٹھی اس سے لے لی او
۔ "لاؤ اپنا ہاتھ' میں خود پہناؤں گا تمہیں"۔
"یہ بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے' میں نہیں لوں گی یہ انگوٹھی"۔
"کیوں نہیں لوگی' میں جو دے رہا ہوں تمہیں"۔ حارث نے سخت لہجے میں کہا۔
یاسمین نے انگوٹھی اس سے لے لی اور اسے بغور دیکھا۔ وہ نیلم تھا' اردگرد چ
چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔
"بہت خوبصورت انگوٹھی ہے"۔ اس نے کہا۔
"یہ میری خاندانی انگوٹھی ہے' میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پہنو"۔
"ٹھیک ہے' میں اس میں زنجیر ڈلواؤں گی اور اسے بطور لاکٹ استعمال کروں گی"۔

"یہ اور بھی اچھا ہے' میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی اس انگوٹھی کو تمہارے پاس دیکھے۔
ی چیزوں کے لئے تو لوگ قتل بھی کر دیئے جاتے ہیں"۔
"پلیز' مجھے ڈراؤ مت"۔ یاسمین نے کہا اور اس کا جسم لرز اٹھا۔
"حارث پھر چلا گیا ہے؟" بیگم شاہ نے کہا۔ "میں اس لڑکے کے کاروباری دوروں سے
آ گئی ہوں' گھر میں مہمانوں کی طرح رہتا ہے"۔
یاسمین نے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں سوال کرنا ضروری نہ سمجھا۔
لیکن بیگم شاہ نے خود ہی وضاحت کر دی۔ ان کا لہجہ فخریہ تھا۔ "وہ سرمایہ کاری کرتا
ہے' بے حد ذہین لڑکا ہے' کاروبار میں بے حد کامیاب ہے۔ میرے شوہر نے بہت کوشش کی کہ
وہ ان کی فرم میں کام کرے' ان کا ہاتھ بٹائے لیکن اس کے مزاج میں خود مختاری ہے۔ اس نے
ان سے کبھی مدد نہیں لی۔ کتنی بڑی بات ہے' کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو کچھ کرنے کی بجائے دولت
اڑاتا خیر.........."۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں ۔ "یاسمین.......... اس ہفتے میں بہت
مصروف ہوں' تمہارے پاس میرا پورا شیڈول ہے نا؟"
"جی ہاں"۔
یہ گفتگو ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ یاسمین ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے آفس روم میں
آگئی۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ یاسمین نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف جج شاکر علی تھے۔
"تم کب آ رہی ہو؟ میں اپنی کتاب کے متعلق تم سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔
یاسمین نے ان سے آنے کا وعدہ کرلیا اور وعدہ وفا کرنے کا موقع اسے چار دن بعد ملا۔
ان چار دنوں میں کام کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔ بیگم شاہ کے کام بہت پھیلے ہوئے تھے۔ سینکڑوں
رفاہی اداروں کو ماہانہ امداد.......... پھر رفاہی تقریبات اور اس پر ان کی سوشل مصروفیات'
بہرحال' چار دن میں یاسمین نے پچھلا تمام کام نمٹا دیا۔ بیگم شاہ اس کی کارکردگی سے بے حد
خوش تھیں۔
وہ جنگل کے راستے جج کے کاٹیج تک پہنچی۔ کاٹیج کے آس پاس دور دور تک کوئی مکان
نہیں تھا۔ کاٹیج بے حد خوبصورت تھا۔ جج صاحب نے اسے آتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے
دروازے پر اس کا استقبال کیا۔ یاسمین سحرزدہ سی کاٹیج کو دیکھتی رہی۔
"اس کا ڈیزائن میں نے خود تیار کیا تھا"۔ جج صاحب نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ "اس میں
تین کمرے ہیں۔ صفائی کے لئے ایک خادمہ ہفتے میں دو بار آتی ہے۔ کبھی کبھار جب مہمان
آئے ہوئے ہوں تو کھانا بھی پکا دیتی ہے' ورنہ بیشتر اوقات کھانا میں خود ہی پکاتا ہوں اور بہت
مزے دار پکاتا ہوں"۔
"کسی دن اس کا تجربہ بھی ہو جائے گا"۔ یاسمین نے خوشدلی سے کہا۔
"یہ تو ہے' فی الحال کافی سے کام چلاؤ"۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کاٹیج کی بیٹھک میں بیٹھے کافی کے گھونٹ لے رہے تھے پھر مجرموں کی
غلط شناخت کی بات چل نکلی۔ جج صاحب نے اس سلسلے میں اپنے کئی تجربات سنا ڈالے
"دشواری یہ ہے کہ ہر پولیس افسر محض یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ملزم نے جرم کیا
ہے۔ اس سمت میں کوئی نہیں سوچتا کہ الزام غلط بھی ہو سکتا ہے اور یہ بنیادی خامی ہے"۔ جج
صاحب نے اپنا مسودہ سنبھالا' اس کی ورق گردانی کی اور پھر بولے۔ "اب یہ کیس دیکھو' دو
افراد ڈکیتی کے ایک کیس میں گرفتار ہوئے' جس کے دوران فائرنگ ہوئی تھی اور ایک شخص
ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ چند ہفتے بعد ان کے خلاف سماعت شروع ہونے والی تھی۔ استغاثے کا کیس
شہادتوں کی وجہ سے بے حد مضبوط ہو گیا تھا۔ ملزمان کو جس وقت گرفتار کیا گیا تو ان کے پاس
ریوالور بھی تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی وہ ریوالور نہیں تھا' جس سے ڈکیتی کے دوران
مقتول کو شوٹ کیا گیا تھا۔ بہرحال' یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ ریوالور انہوں نے واردات کے فوراً
بعد ادھر اُدھر کر دیا ہو گا.........

"پھر ہوا یہ کہ مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی۔ ادھر ایک اور واردات کے دوران دو
مجرم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ تفتیش کے دوران انہوں نے اس ڈکیتی کا اعتراف بھی کیا' جس
کے سلسلے میں دو دوسرے افراد پر پہلے ہی مقدمہ چل رہا تھا' نو گرفتار شدگان میں سے ایک کے
پاس وہ ریوالور موجود تھا جس سے مقتول کو شوٹ کیا گیا تھا۔ شناخت کرنے والوں کے سامنے
نئے مجرموں کو لایا گیا۔ انہوں نے انہیں بھی شناخت کر لیا۔ درحقیقت ان کے درمیان مشابہت
بہت زیادہ تھی۔ واردات رات کے وقت ہوئی تھی' اس لئے گواہ دھوکا کھا گئے"۔

"اور اگر اصل مجرم اتفاقاً گرفتار نہ ہوئے ہوتے تو کیا ہوتا؟" یاسمین نے پوچھا۔

"وہ دونوں بے قصور یقیناً سزا پاتے"۔ جج صاحب نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ایسا
کئی بار ہو چکا ہے"۔

"میں آپ کی کتاب میں بہت زیادہ دلچسپی محسوس کر رہی ہوں' یہ کب تک چھپ جائے
گی؟"

"یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کتاب انگریزی میں ہے' پہلے تو مجھے اسے ٹائپ کروانا
ہو گا"۔

"ٹائپ میں کر دوں گی۔ شام کو تو مجھے فرصت ہوتی ہے"۔

"نہیں' یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو گی۔ دن بھر ٹائپ کرنے کے بعد آرام کے بجائے پھر
ٹائپنگ........"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل' یہ میری تفریح ہو گی۔ درحقیقت مجھے اس موضوع سے بے
حد دلچسپی ہے"۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں گا لڑکی"۔ جج صاحب نے بے حد اپنائیت سے کہا۔

یاسمین کاٹیج سے نکل ہی رہی تھی کہ عامر کی کار آ کر رکی' عامر کار سے اترا اور یاسمین
دیکھ کر مسکرایا۔ "آؤ میں تمہیں شاہ پیلس چھوڑ دوں"۔ اس نے یاسمین سے کہا۔ یاسمین
ں میں بیٹھ گئی۔ عامر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "انکل کی
ب میں دلچسپی لے رہی ہو نا؟" اس نے پوچھا۔ یاسمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "لیکن
یں کسی دن میرے ساتھ پتھروں کی تلاش میں نکلنے کے لئے بھی وقت دینا ہو گا' سمجھیں"۔

"ٹھیک ہے"۔

عامر نے اسے دروازے پر ڈراپ کیا' وہ اندر داخل ہو گئی۔ اچانک ایک طرف سے
رث اس کے سامنے آ گیا' وہ گھبرا گئی۔ "اوہ حارث! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا"۔ اس نے شکایتی
جے میں کہا۔

"لگتا ہے' میری عدم موجودگی میں عامر سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی ہو"۔ حارث
نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا؟"

"میں یہ برداشت نہیں کر سکتا"۔ حارث نے سختی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

یاسمین نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا! کیا میں تمہاری پابند
ں"۔ اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔

"سوری سمی"۔ حارث کا لہجہ بدل گیا۔ "میں طبعاً حاسد ہوں' میں تمہیں کسی سے پینگیں
اتے نہیں دیکھ سکتا اور خاص طور پر.........."

"اپنی زبان کا خیال رکھو مسٹر حارث!" یاسمین نے سخت لہجے میں کہا۔ "اطلاعاً عرض ہے
میں کسی سے پینگیں نہیں بڑھا رہی ہوں اور دوسری بات یہ کہ مجھے تمہارے سامنے صفائی
کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اسے
ث کی نامعقولیت پر طیش آ رہا تھا پھر اسے خیال آیا کہ کہیں حارث نے اسے اپنی محبت سے
کرنے کے لئے رقابت کا ڈھونگ تو نہیں رچایا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اس سے محبت کیوں
لگا۔ اس کے لئے لڑکیوں کی کمی تو نہیں لیکن پھر وہ انگوٹھی.......... اس نے انگوٹھی کو
غور سے دیکھا' وہ یقیناً قیمتی انگوٹھی تھی۔ یاسمین نے فیصلہ کیا کہ بڑی نرمی سے..........
ث کو تکلیف پہنچائے بغیر وہ انگوٹھی اسے واپس کر دے گی۔ اسے اس بات کا خیال رکھنا ہو گا
ارث غصے کا بہت تیز ہے اور وہ اس کے غصے سے خوفزدہ تھی۔

O==========☆==========O

مقامی میلے کا دن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا' یاسمین کی مصروفیات اور کام بڑھتا جا رہا تھا۔
اگلے دن دوپہر کے کھانے پر باتوں کے دوران بیگم شاہ نے انکشاف کیا کہ ان کے تمام مسروقہ
رات برآمد ہو گئے ہیں' سوائے نیلم کی اس انگوٹھی کے جس کے گرد چھوٹے چھوٹے ہیرے

جڑے ہوئے ہیں۔ یاسمین یہ سن کر بری طرح چونکی۔
حارث نے غیر محسوس طور پر گفتگو کا رخ بدل دیا۔ "ممی' یہ بتائیں میلے کے سلسلے
آپ کا کیا پروگرام ہے؟"
"پروگرام تو بہت سے ہیں لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ جرائم کے سلسلے میں جج شاکر
کا لیکچر بھی رکھا جائے"۔
"گڈ!" حارث نے کہا۔ اس کی نظریں یاسمین کے گلے کی زنجیر پر جمی ہوئی تھیں۔ "
اس زنجیر کے ساتھ کون سی قیمتی چیز ہے' ہمیں نہیں دکھاؤ گی؟" اس نے اچانک ہی یاسمین
مخاطب کیا۔ یاسمین کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تاہم اس نے بے حد ٹھہرے ہوئے اور طنزیہ لہجے میں
"بے حد عام اور غیر اہم سی چیز ہے"۔ حارث کے چہرے پر پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر اسے
ہوئی۔
اس سہ پہر وہ عامر کے ساتھ پتھروں کی تلاش میں نکلی۔ اس کا وقت بہت اچھا گزرا
جاتے وقت اس کا سامنا حارث سے ہوگیا۔
"میرا خیال ہے' مجھے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ تم کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی
حارث نے سخت لہجے میں کہا۔
"میں عامر کے ساتھ جا رہی ہوں' ہم لوگ قیمتی پتھر تلاش کریں گے"۔ یاسمین
سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔
"قیمتی اور اس سے بہتر جواہرات حاصل کرنے کے اور طریقے بھی ہیں جو نسبتاً
بھی ہیں"۔
"تمہارا اشارہ شاید چوری کی طرف ہے"۔ یاسمین نے بے ساختہ کہا اور پشیمان
کیونکہ حارث کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ "میں مذاق کر رہی تھی پھر ملیں گے"۔ یاسمین نے
آگے بڑھ گئی۔ وہ راستے میں سوچتی رہی کہ اس نے جواہرات کے سلسلے میں چوری کی
کیوں چھیڑی۔ شاید اس لئے کہ اسے حارث کی دی ہوئی انگوٹھی اور بیگم شاہ کی مسروقہ
میں کوئی قدر مشترک محسوس ہوئی تھی۔
لیکن عامر سے مل کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ عامر کے کندھے سے کینوس کا بیگ
تھا۔ اس نے خاص قسم کی بیلٹ کمر سے باندھی ہوئی تھی۔ "تم تو پوری تیاری سے نکلے
یاسمین نے کہا۔
"ماہر ارضیات کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے"۔ عامر نے فخریہ لہجے میں کہا۔
وہ بہت بڑے بڑے پتھروں کے درمیان پھرتے رہے۔ "یہ شمالی علاقے کی
ہیں"۔ عامر نے وضاحت کی۔ "بڑے بڑے گلیشیر ان چٹانوں کو اس طرف لڑھکا دیتے
راستے میں وہ جگہ جگہ رک کر چٹانوں کا اپنے خوردبینی آلات سے جائزہ لیتا رہا اور ان

"یہ جو بڑی بڑی چٹانوں پر گومڑے سے ہیں نا' یہ تامڑا ہے"۔
یاسمین جھک کر دیکھنے لگی۔ اس کے گلے کی زنجیر باہر نکل آئی اور جھولنے لگی۔ یاسمین
پیچھے ہٹی اور اس نے انگوٹھی کو چھپالیا۔
"یہ کیا ہے' منگنی کی انگوٹھی؟" عامر نے پوچھا۔
"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں"۔
"ذرا مجھے دکھاؤ۔ تمہیں معلوم ہے' مجھے پتھروں سے دلچسپی ہے"۔
"نہیں' میں نہیں دکھا سکتی"۔ یاسمین نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے
میں بہت وہمی ہوں' میں کسی اجنبی کو یہ انگوٹھی کبھی نہیں دکھاتی"۔
"اور جب اجنبی دوست بن جائیں تب؟"
"دیکھیں گے"۔ یاسمین نے نروس ہونے لگی۔ وہ پھر چٹان پر جھک گئی' جہاں سرخ
کا گومڑ سا ابھرا ہوا تھا۔ واقعی' وہ تامڑا تھا۔
"یہ پتھر تمہارے نیلم اور ہیروں جیسے قیمتی نہیں ہیں"۔ عامر نے کہا۔
یاسمین سوچ میں پڑ گئی۔ عامر نے یقیناً انگوٹھی کو پوری طرح دیکھ لیا تھا۔ اب اسے
وں کی تلاش میں بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتی تھی۔
از کم وہ اب قیمتی پتھروں کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے موضوع
۔ "میں اب تھک گئی ہوں' کہیں سستانے کی جگہ تلاش کر کے بیٹھتے ہیں پھر تم مجھے آثار
یمہ کے متعلق بتانا"۔
عامر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "آثار قدیمہ کو چھوڑو' میں تمہارے متعلق
کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں تم خمس صدی پرانی ہو"۔ اس نے کہا۔
یاسمین کو ہنسی آگئی۔ "تمہارا اندازہ غلط ہے' میں چوتھائی صدی پرانی ہوں"۔
"اوہ.......... اور میں صرف انتیس سال کا ہوں"۔ خیر' یہ بتاؤ کیا تم حارث کو یہاں آنے
پہلے سے جانتی ہو؟"
"یہ کیوں پوچھ رہے ہو تم؟"
"اس لئے کہ وہ تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتا ہے' جیسے پہلے سے تم دونوں کی جان
پہچان ہو"۔
"تمہیں وہم ہوا ہے۔ میں حارث سے پہلی بار اس دن ملی ہوں' جب شاہ پیلس آئی
تھی"۔
"یہ بھی بہت ہے۔ حارث سے اتنی شناسائی بھی کم نہیں"۔
"کیوں' کیا مطلب؟ یہ بات کیوں کہی تم نے؟"
"بلا ارادہ کہہ گیا ہوں"۔ عامر نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "میں اس شخص کو ذرا

بھی پسند نہیں کرتا"۔

یاسمین ہنسنے لگی۔ "گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی' وہ بھی تمہیں پسند نہیں کرتا"۔

"خیر چھوڑو' تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ' تم کیا پسند کرتی ہو اور کیا ناپسند۔ تم کھانا پکاتی ہو؟ تمہیں شاعری اچھی لگتی ہے؟"

"ایک منٹ' پہلے مجھے ایک سوال پوچھنا ہے۔ یہ بتاؤ اس ملک میں ایک جیالوجسٹ کا مستقبل کیسا ہوتا ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"ہاں' یہ سوال مجھے پسند آیا۔ جب کوئی لڑکی کسی مرد سے ایسا سوال پوچھتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے"۔

یاسمین نے اس کی طرف پتھر اچھالا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں بچوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ عامر آگے آگے تھا اور یاسمین پیچھے پیچھے پھر وہ تھک گئے اور ایک ہی پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ دیر تک وہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں بتاتے رہے۔

O============☆============O

یاسمین واپس آئی تو لائبریری کا دروازہ کھلا دیکھا۔ حارث میز پر اخبار پھیلائے اس پر جھکا کھڑا تھا۔ یاسمین نے ذرا ہٹ کر جھانکا تو پتا چلا کہ وہ اخبار سے کوئی تراشا نکال رہا ہے۔ یاسمین نے اسے پکارا تو اس نے تراشا تہہ کئے بغیر ہی اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔

"تو تمہیں تراشے جمع کرنے کا شوق بھی ہے؟" یاسمین نے مذاقاً پوچھا اور فوراً ہی شرمندہ ہوگئی کیونکہ حارث کا چہرہ زردہ پڑ گیا تھا۔

"میرے مطلب کی کاروباری خبر تھی"۔ حارث نے صفائی پیش کی"۔ دراصل میں سرمایہ کاری کرتا ہوں"۔

یاسمین اپنے کمرے میں چلی گئی' وہ سوچ رہی تھی کہ حارث اس بری طرح کیوں گھبرایا تھا۔

کچھ دیر بعد شاہ صاحب نے شکایت کی کہ کسی نے دارالحکومت کے اخبار سے وہ خبر کاٹ لی ہے جس میں وہ دلچسپی لے رہے تھے۔ اس وقت حارث بھی کمرے میں موجود تھا۔ یاسمین کو توقع تھی کہ وہ جیب سے اخبار کا تراشا نکال کر شاہ صاحب کی طرف بڑھا دے گا لیکن حارث نے تو جیسے شاہ صاحب کی بات سنی ہی نہیں۔ اب یاسمین کی اس تراشے میں دلچسپی اور بڑھ گئی۔

اگلی صبح یاسمین کو مقامی میلے کے سلسلے میں چندہ طلب کرنے کے لئے التجائی خطوط کا ڈھیر پوسٹ کرنا تھا۔ اس نے ایک خط دارالحکومت کے اس اخبار کے مقامی ایجنٹ کے نام بھی پوسٹ کر دیا' جس میں اس نے گزشتہ روز کے اخبار کا ایک شمارہ طلب کیا تھا۔

جیسے جیسے میلے کی تاریخ قریب آ رہی تھی' یاسمین کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایک دن عامر آفس روم میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا کہ سیلانی ناصرہ نازل ہوگئی۔ عامر سے وہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ ناصرہ نے فوراً ہی کمپل ہونے کی کوشش کی لیکن عامر نے اسے ٹال دیا۔ وہ چیں بہ جبیں ہوئی لیکن خاموشی سے چلی گئی۔ یاسمین کو احساس ہوگیا کہ وہ بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گی۔

ہوا بھی یہی۔ میلے والے دن ناصرہ عامر کو لے اڑی۔ اس میں اداس ہونے کی کوئی بات نہیں تھی لیکن یاسمین پھر بھی اداس تھی۔ وہ مہمانوں کے ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی اور ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ میلے کے سلسلے میں پارٹی کا اہتمام شاہ پیلس کے لان پر کیا گیا تھا۔

وہ ٹہل رہی تھی کہ اچانک ایک درخت کے عقب سے حارث نکلا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ بہت اچھے موڈ میں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اسے مہمانوں میں سے ایک ایک کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ ان سب سے' ان کے پس منظر اور حیثیتوں تک سے واقف تھا۔ کس کی مالی حیثیت کیا ہے اور کس کے پاس کتنے اور کتنی مالیت کے زیورات ہیں' اسے سب معلوم تھا۔

"مجھے معلوم ہے' بیشتر معلومات تمہاری گھڑی ہوئی ہیں"۔ یاسمین نے کہا۔

"ایسی بات نہیں' یہاں کے سب سے اہم بینک میں میرا ایک دوست کام کرتا ہے۔ لوگ اپنے زیورات بینکوں میں ہی تو رکھواتے ہیں"۔

"لیکن بینک والے اپنے موکلوں کے متعلق اس قسم کی معلومات کسی کو بھی فراہم نہیں کرتے"۔

حارث نے قہقہہ لگایا اور موضوع بدل دیا' وہ ٹہلتے رہے۔ اسی دوران یاسمین کو عامر اور ناصرہ کی جھلک دکھائی دی پھر ان کا ٹکراؤ بیگم شاہ سے ہوا جو حارث کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔

"چلو میرے ساتھ"۔ بیگم شاہ نے حارث سے کہا۔ "میں تمہیں عرفان سے ملوانا چاہتی ہوں' وہ لکڑی کی مورتیاں بڑی مہارت سے تراشتا ہے۔ تم تصویر کھنچوانے اور بنوانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ یہی سہی' لکڑی کی مورت ہی بنوا دو میرے لئے"۔ انہوں نے حارث کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا لیکن حارث نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

یاسمین نے اس لمحے حارث کی ایک جھلک دیکھی اور حیران رہ گئی۔ چہرے کتنی تیزی سے بدل جاتے ہیں۔ حارث بہت زیادہ غصے میں تھا۔ اس کا چہرہ یاسمین کو ایک اور خوفناک چہرے کی یاد دلا رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اس کی حماقت ہے' وہم ہے۔ کاش! پولیس قاتل ڈرائیور کو گرفتار کر لے تو وہم کی یہ دھند ہی چھٹ جائے۔

O============☆============O

جج شاکر علی اسٹیج پر کھڑے تھے۔ "مجھے خوشی بھی ہے اور حیرت بھی کہ اتنے بہت سے

لوگ میرے تجربات کے متعلق جاننا چاہتے ہیں"۔ انہوں نے کہا۔ "سراغرسی کے سلسلے
میرے تجربات و مشاہدات عجیب و غریب ہیں۔ قتل اور چوری کے بہت سے کیس ایک مع
سے سراغ کی وجہ سے حل ہوسکتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی کہ
نہ کہیں کوئی غلطی کرتا ہے اور سراغ چھوڑ جاتا ہے۔ حالانکہ اسے اپنے طور پر یہی یقین
ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ غیر پیشہ ور مجرموں کی تو بساط ہی کیا ہے۔

کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ ایک قاتل کو محض سفید الو کے ایک پر کی وجہ سے
جاسکا' وہ شادی شدہ تھا' معمر تھا لیکن اسے ایک نوجوان لڑکی سے محبت ہوگئی۔ لڑکی نے اظ
محبت کے جواب میں ہمیشہ شادی شدہ ہونے کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ حالانکہ اس
مطلب صرف یہ تھا کہ ان کی عمروں میں بہت زیادہ تفاوت ہے۔ تاہم مرد پر اس کا رد عمل
ہوا کہ بیوی کو راہ کی رکاوٹ سمجھنے لگا۔

بعد میں اس کی بیوی قتل کردی گئی۔ شوہر کا دعویٰ تھا کہ قاتل کوئی چور ہے۔ اس
بیان دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک تقریب سے واپس آیا۔ اس وقت رات بارہ بجے کے
کا وقت تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ کسی نے اس کے سر پر وار کیا۔ وار شاید اوچھا پڑا تھا'
لئے وہ بچ گیا۔ بہرحال' اسے ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو اس نے بیوی کی لاش دیکھی جو چور کا و
نہ سہہ سکی تھی۔

پولیس نے تفتیش شروع کی۔ انہیں آلہ قتل کی تلاش تھی اور وہ انہیں فوراً ہی
گیا۔ وہ ایک ہتھوڑا تھا۔ نیا ہتھوڑا جس کا سرا ایک اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ قاتل نے سب
پہلے مکان میں داخل ہونے کی غرض سے ایک کھڑکی کا شیشہ توڑا تھا۔ شاید آواز کم کرنے
لئے اس نے ہتھوڑے کے سر پر اخبار لپیٹ دیا تھا۔ وہ مکان میں داخل ہوا لیکن نکلنے سے پ
ہی اسے ان میاں بیوی کا سامنا کرنا پڑگیا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں پر حملہ کردیا۔ بیوی کے
کی چوٹ مہلک ثابت ہوئی۔

پولیس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ چوری کی غرض سے داخل ہوا تھا۔ الماری میں سے
زیورات غائب تھے۔ اس کے علاوہ خاتون خانہ کی موت کے بعد وہ تمام زیورات جو وہ پ
ہوئے تھی' اتار لئے گئے تھے۔ شوہر کے بٹوے سے ساڑھے سات سو روپے بھی غائب تھے۔

تفتیش بے حد دشوار ثابت ہوئی۔ مجرم نے کہیں انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑ
تھے۔ مکان میں کہیں سگریٹ کے ٹوٹے بھی نہیں پائے گئے تھے۔ پولیس کے لئے لے دے ک
بس وہ ایک ہتھوڑا ہی تھا۔ ہتھوڑا بالکل نیا تھا۔ شوہر کا کہنا تھا کہ ہتھوڑا ہمارا نہیں ہے' گو
ہتھوڑا بھی کسی قسم کا سراغ فراہم نہ کرسکا۔

پھر ہتھوڑے کے آہنی سر پر لپٹا ہوا اخبار کھولا گیا۔ وہ گزشتہ روز کا اخبار تھا لیکن عجیب
بات یہ ہوئی کہ اخبار کے ساتھ ایک سفید پر چپکا ہوا تھا اور اس سفید پر نے کیس حل کردیا۔

گھر میں ایک اسٹینڈ پر ایک بُھس بھرا ہوا سفید اُلو موجود تھا' وہ پر اسی الو کا تھا۔ کیمیادی
تجزیے سے یہ بات ثابت ہوگئی۔ مکان کے عقبی صحن میں ایک کیاری میں سے زیورات اور
چرائی ہوئی رقم بھی برآمد ہوگئی۔ شوہر پر بیوی کے قتل کا مقدمہ چلا اور جرم بھی ثابت ہوگیا۔
ایسے ہی ایک اور کیس میں.........."

جج شاکر نے ایسے تین چار واقعات سنائے پھر انہوں نے کہا۔ "حاضرین! میں یہ بتانا چاہتا
ہوں کہ جرم کبھی نہیں پھلتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ معمولی سا سراغ بھی مجرموں کی گرفتاری کا
سبب بن جاتا ہے۔"

سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ یاسمین نے دیکھا۔ حارث کسی سنگی بت کی طرح
ساکت وصامت تھا۔

O============☆============O

وارث شاہ صاحب کے نمائندے نے دارالحکومت میں کچھ چوبی مجسمے خریدے تھے۔
شاہ صاحب نے اپنی بیگم کی اجازت سے ایک دن کے لئے یاسمین کی خدمات مستعار لیں۔
انہوں نے چوبی مجسموں کے سلسلے میں باقاعدہ کیٹلاگ بنا رکھا تھا۔ اس وقت وہ یاسمین کو اسی
سلسلے میں کچھ سمجھا رہے تھے۔ یاسمین نے چوبی مجسموں کی پیکنگ کھول ڈالیں اور کام میں
مصروف ہوگئی۔ وہ کام میں اتنی گم تھی کہ اسے دروازہ کھلنے تک کا پتا نہیں چلا۔ حارث نے
جب اس کے عین پیچھے کھڑے ہو کر اسے پکارا تو وہ اچھل پڑی۔

"بڑی کھوئی ہوئی ہو کام میں"۔ حارث نے کہا اور مجسمے ایک طرف ہٹا کر میز پر اپنے
بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"دیکھ کر......... یہ بہت نازک ہیں' گر گئے تو ٹوٹ بھی سکتے ہیں"۔

"کاٹھ کباڑ ہے یہ سب"۔ حارث نے بے پروائی سے کہا۔

"تو تم مجھ سے یہی کہنے آئے تھے' بس اب جاؤ اور مجھے کام کرنے دو"۔

"کام چھوڑو' اس وقت مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے"۔ حارث نے کہا۔

یاسمین نے سرد آہ بھری' کیٹلاگ بک ایک طرف رکھی اور سوالیہ نظروں سے حارث کو
دیکھنے لگی۔

"کل جج شاکر علی نے جو لیکچر دیا وہ تمہارا آئیڈیا تھا؟"

"نہیں' آئیڈیا عامر کا تھا اور بیگم شاہ تک بیگم باقر نے پہنچایا تھا"۔

"عامر......... لعنت ہے........." حارث غرایا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ عامر کو یہ بات
تم نے سمجھائی ہوگی"۔

"ہرگز نہیں' لیکن مجھے لطف آیا اور میرے خیال میں سبھی لوگ محظوظ ہوئے"۔

"میرے خیال میں صرف تم محظوظ ہوئیں۔ ویسے بھی تم جج کے کانچ کی طرف کچھ زیادہ

ہی جانے لگی ہو۔ شاید اس سے مجرموں کی شناخت کے طریقوں پر گفتگو کرتی ہوگی"۔

"مجھے یہ موضوع بہت دلچسپ لگتا ہے۔"

"اس قاتل ڈرائیور کا چہرہ پوری طرح یاد آیا تمہیں؟ جج نے اس سلسلے میں کیا مشورہ دیا تمہیں؟"

یاسمین اسے بغور دیکھ رہی تھی' اس وقت حارث خوبرو نہیں لگ رہا تھا۔ سکڑی ہوئی آنکھیں' بھنچے ہوئے ہونٹ' اس وقت وہ ہوش مند بھی نہیں لگ رہا تھا۔ "میں نے جج صاحب سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی"۔ بالآخر یاسمین نے کہا۔ "میں اس واقعے کو بھول جانا چاہتی ہوں"۔

"جھوٹ نہ بولو' اگر یہ بات ہوتی تو تم اس اخبار کی دوسری کاپی کیوں منگواتیں' جس میں کیس کی پیش رفت کی خبر چھپی ہے"۔

یاسمین سن ہو کر رہ گئی' اخبار کی دوسری کاپی ابھی اس تک نہیں پہنچی تھی' گویا حارث نے درمیان ہی میں غائب کر دی تھی اور اب وہ خود بتا رہا تھا کہ اس میں اس کیس کے متعلق خبر چھپی تھی' وہ خوفزدہ ہو گئی کیوں؟ آخر حارث اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ کیا وہی .... کیا وہی؟ لیکن اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ نہیں حارث وہ قاتل ڈرائیور نہیں ہو سکتا اور اگر یہ درست ہے تو اسے فوری طور پر شاہ پیلس سے نکل بھاگنا ہوگا۔

حارث نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لئے۔ "اگر بھاگنے کے متعلق سوچ رہی ہو تو میرا مشورہ ہے کہ اس قسم کی احمقانہ کوشش نہ کرنا"۔ اس نے کہا۔

یاسمین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"ارے! میں تو یونہی تمہیں ڈرا رہا تھا۔ تم جرم اور مجرموں میں اتنی دلچسپی لیتی ہو۔ میں تم پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ خوف کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ میری بات مانو تو جج اور اس کے مسودے سے دور ہی رہو۔ وہ جرائم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا' وہ صرف عدالتی کارروائیوں سے واقف ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہمی! تم مجھے اچھی لگتی ہو' مجھے اس بات پر کبھی متاسف ہونے کا موقع نہ دینا کہ میں نے تم سے محبت کی ہے"۔

اس کے جانے کے بعد یاسمین نے کیٹلاگ اٹھایا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ کاش کوئی ایسا ہوتا' جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی۔ جج؟ لیکن سوال یہ تھا کہ اس کے پاس بتانے کے لئے ہے کیا' یہ بھی کوئی بات ہے کہ حارث کو دیکھ کر اسے قاتل ڈرائیور کا چہرہ یاد آتا ہے' جبکہ یہ بات وہ پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ وہ قاتل ڈرائیور کو مثبت طور پر شناخت نہیں کر سکتی اور پھر حارث نے اپنی تنبیہ کے سلسلے میں وضاحت بھی تو کر دی ہے' وہ اس سے محبت کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ جرائم اور مجرموں کے چکر میں پڑ کر وہ کسی خطرے سے دو چار ہو۔

O============☆============O

آئندہ چند ہفتے یکسانیت سے گزرے۔ بیگم شاہ کی سوشل مصروفیات کا لامتناہی سلسلہ ری تھا' اگر وہ مصروفیات لامتناہی نہ ہوتیں تو اسے ملازمت کیسے ملتی۔ ہفتے میں تین چار بار وہ ے کاٹیج جاتی اور اس کی کتاب کا مسودہ ٹائپ کرتی۔ ایسے میں اسے ٹائپنگ کا کام بھی فنون نطق معلوم ہونے لگتا۔ جج نے جو کچھ لکھا تھا' وہ آرٹ ہی کے زمرے میں آتا تھا۔

عامر عموماً غائب رہتا' وہ چٹانوں میں سر کھپاتا رہتا لیکن شام کو وہ واپس آتا اور یاسمین کو پلیس چھوڑ کر آتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یاسمین کار میں جانے پر جنگل کے مختصر راستے سے پیدل ر کو ترجیح دیتی۔ عامر اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ دیودار کے درختوں کے درمیان سے ہاتھ میں ہاتھ الے گزرتے۔ ایسے ہی ایک لمحے میں یاسمین پر منکشف ہوا کہ وہ عامر سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس نے اس خیال کو ذہن سے دھکیل کر نکالنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ وہ حیران تھی کہ محبت نے چپکے چپکے دل میں گھر کرتی ہے کہ آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا اور جب پتا چلتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

اسی طرح جون کا مہینہ بھی گزر گیا پھر جولائی آگیا اور پھر اگست آگیا۔ ہر طرف یوم آزادی کی تقریبات کا شور تھا۔ یوم آزادی پر شاہ پیلس میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ یاسمین کو خادماؤں کی زبانی پتا چلا کہ بیشتر مہمان بھاری زیورات اپنے ساتھ لائے ہیں۔ یاسمین کو نیلم کی وہ انگوٹھی یاد آگئی جو حارث نے اسے دی تھی۔ وہ یہ سوچ کر لرزتی رہی کہ اگر کسی نے وہ انگوٹھی دیکھ لی تو وہ اس سلسلے میں کیا وضاحت کرے گی' وہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ اس کے پاس کوئی زیور نہیں ہے۔

حارث کسی کاروباری سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ یاسمین اکثر اس کے متعلق سوچتی' حارث ہمیشہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس سے بہت متاثر ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ سچا ہے یا محض اپنی انا کی تسکین کے لئے جواباً اس کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتنا تو یاسمین کو اندازہ تھا کہ حارث کے لئے اس کی انا بہت زیادہ اہم ہے۔

ان دنوں یاسمین اور ناصرہ کے درمیان عارضی جنگ بندی تھی۔ وہ یوم آزادی کے سلسلے میں شاہ پیلس کی آرائش میں مصروف تھیں۔ ہر طرف جھنڈیاں اور برقی قمقمے لگائے جا رہے تھے۔ ناصرہ کو غباروں کا خبط تھا۔ شاہ صاحب نے شاہ پیلس کے لئے بہت بڑا اور اونچا پرچم بنوایا تھا۔

یوم آزادی کی صبح یاسمین تنہا کام کر رہی تھی۔ ناصرہ ساڑھے دس بجے کے قریب آئی۔ اس نے بتایا کہ کنٹری کلب میں اس کا ٹینس میچ ہے۔ یاسمین کو معلوم تھا کہ یوم آزادی کی تقریب کے سلسلے میں کنٹری کلب میں بہت بڑا اجتماع ہوگا۔

"عامر گیارہ بجے مجھے لینے کے لئے آئے گا"۔ ناصرہ نے دھماکا کیا۔

یاسمین ششدر رہ گئی۔ "عامر!"

"ہاں' وہی تو میرا پارٹنر ہے' وہ ٹینس کا بہت اچھا کھلاڑی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے'
اس نے بالآخر مجھے اپنا پارٹنر بنا کر چھوڑا' ہم یقیناً یہ میچ جیتیں گے"۔

یاسمین بجھ سی گئی' وہ ناصرہ کے پاس سے ہٹ آئی۔ عامر نے اسے بتایا تک نہیں
اس نے ناصرہ کے ساتھ کوئی پروگرام بنایا ہے اور وہ کب سے یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ یوم
آزادی وہ عامر کے ساتھ منائے گی۔ اسے کنٹری کلب میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسے اس بات
کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ عامر کے ساتھ جنگل میں خوب گھومے پھرے گی
پکنک منائے گی۔

انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد گاڑی کی آواز
سنائی دی۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا' عامر نے ہارن بجایا اور ناصرہ تیزی سے کار کی طرف لپکی
وہ اگلی نشست پر بیٹھی اور اگلے ہی لمحے کار روانہ ہوگئی۔ عامر' ناصرہ کو لینے آیا تھا اور اس نے
اس کے بارے میں پوچھا تک نہیں تھا۔ وہ بالکونی میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئی اور خود سے باتیں
کرتی رہی۔ اس نے خود ہی تو فرض کرلیا تھا کہ عامر آج کا دن اس کے ساتھ گزارے گا۔ عامر
نے تو ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے' وہ خود کو کسی
ننھے بچے کی طرح محسوس کر رہی تھی جسے سب نے نظرانداز کر دیا ہو۔

سب لوگ چلے گئے تھے۔ اب گھر میں اس کے اور ملازمین کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ
آفس روم میں چلی آئی۔ دوپہر کا کھانا اس نے آفس روم میں کھایا۔ آفس میں کام کرتے ہوئے
اسے احساس ہوا کہ بیکاری میں کام کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

وہ کام میں مگن رہی پھر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا اور وہ عامر کو دیکھ
کر حیران رہ گئی۔

"تو تم یہاں چھپی بیٹھی ہو' میں تو سمجھا تھا کہ تم حارث کے ساتھ ہوگی"۔ عامر نے کہا۔

"میں تو صبح سے یہیں ہو' یاسمین نے مختصراً کہا پھر باوقار لہجے میں پوچھا"۔ تم جیت
گئے؟"

"ہاں" میں یہ کہوں گا کہ ہم جیت گئے۔ ناصرہ کا کھیل بہت اچھا ہے"۔

"مبارک ہو"۔ یاسمین نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن حارث کہاں ہے' ناصرہ نے تو کہا تھا کہ تم حارث کے ساتھ ہوگی"۔

"حارث تو یہاں ہے ہی نہیں' وہ تو کل ہی شہر سے باہر چلا گیا تھا"۔

عامر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "خدا کی پناہ...... تو
ناصرہ نے میرے لئے جال بچھایا تھا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ تم حارث کے ساتھ جارہی ہو
وہ رو رہی تھی۔ اس کا ٹینس کا پارٹنر فیض کسی وجہ سے میچ کھیلنے سے قاصر تھا۔ اس نے مجھ سے
یہ درخواست کی کہ میں اس کا ساتھ دوں۔ تمہاری مصروفیت کی وجہ سے میں نے ہامی بھرلی

میچ ختم ہوتے ہی پتا ہے' کیا ہوا؟ وہ فیض کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک طرف چلی گئی
اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ غضب خدا کا' میں کتنا بے وقوف ہوں کہ اس کے جال میں آگیا' تم
مجھے معاف کر دو گی یاسمین!"

"ارے' ایسی کوئی بات نہیں"۔

"تو ٹھیک ہے' تم میرے ساتھ چلو"۔

O============☆============O
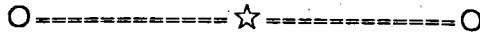
اس رات یاسمین بے حد خوش تھی۔ عامر کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ عامر ہر
لحاظ سے بے حد مہذب آدمی تھا۔ اس کے رویے میں شائستگی تھی۔ ان کے درمیان محبت کی
کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ان کی آنکھوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ اشارتاً شادی کی گفتگو بھی ہوئی
تھی۔

وہ گھر پہنچی تو وہاں سناٹا تھا۔ میزبان اور مہمان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ ملازمین
اپنے کوارٹرز میں تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک عامر اور اس
کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کے متعلق سوچتی رہی۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

وہ گہری نیند میں تھی۔ اس کے باوجود اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید اس کی وجہ طوفان
تھا۔ بادل گرج رہے تھے' بجلی چمک رہی تھی' کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں سے
پانی بوچھار کی صورت میں اندر آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر کھڑکی بند کردے لیکن تساہل
نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ وہ سوچتی رہی کہ اٹھے یا نہ اٹھے پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی
آنکھ کھلنے کا سبب صرف طوفان نہیں ہے' اس کے ساتھ ہی اسے کمرے میں کسی کی نقل و
حرکت کا احساس ہوا اور وہ خوف کے مارے ٹھٹھر کر رہ گئی۔ کمرے میں کوئی تھا.......... ڈریسر
کے قریب' کوئی سایہ سا تھا جو ڈریسر پر جھکا ہوا تھا۔

اس نے بہ مشکل خود کو چیخنے سے باز رکھا۔ اس کا جسم اکڑ سا گیا' وہ خود کو پوری طرح
ساکت رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بجلی کا جھماکا ہوا بجلی جیسے کمرے میں اتر آئی ہو۔ اسی وقت کمرے میں روشنی ہوگئی' اس
نے آنکھیں بند کرلیں' کوئی اسے دیکھ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے اس پر بیدار ہونے
کا شبہ ہو۔ چند لمحے اسی عالم میں گزرے پھر کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ اس نے آنکھیں کھول
دیں' کمرے میں اب کوئی بھی نہیں تھا لیکن یہ احساس روشنی کے بعد اچانک گھپ اندھیرے کی
وجہ سے تھا۔ چند لمحے بعد اسے وہ سایہ پھر نظر آیا' اس بار اسے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی مرد ہے۔
وہ اب بھی جھکا کھڑا تھا پھر وہ سیدھا ہوگیا' شاید اسے جس چیز کی تلاش تھی' وہ مل گئی تھی' اس
نے روشنی بھی اسی لئے کی ہوگی۔

اب وہ سایہ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور سایہ باہر نکل گیا۔

باہر راہداری تاریک تھی حالانکہ ہر رات وہاں کم روشنی کا ایک بلب آن چھوڑا دیا جاتا تھا
دروازہ اب بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا لیکن باہر تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مداخلت کار
دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاگ جائے' یہ امکان بھی تھا
وہ دروازے سے لگا کھڑا ہو' اس کا ردعمل دیکھنے کے لئے۔ شاید اسے یہ یقین نہ ہو کہ وہ وا
سو رہی ہے اور اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔

وہ دیر تک بستر پر ساکت رہی۔ اس کی اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر اس نے ہا
بڑھا کر بیڈ لیمپ روشن کر دیا۔ باہر اب کوئی آہٹ نہیں تھی' وہ ہمت کر کے اٹھی اور درواز
کی طرف بڑھی' اس نے دروازہ بند کیا اور بولٹ بھی چڑھا دیئے۔ یہاں قیام کے دوران پہ
بار اسے بولٹ چڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی پھر وہ ڈریسر کی طرف بڑھی۔ اسے جاننا
کہ سایہ کس چیز کی تلاش میں وہاں آیا تھا۔

اس نے ڈریسر کا جائزہ لیا۔ اس کا ہینڈ بیگ اوپر ہی رکھا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیہ
اس نے سوتے وقت چھوڑا تھا۔ بہ ظاہر تو کوئی چیز نہیں چھیڑی گئی تھی لیکن پھر ایک خیال ۔
اسے چونکا دیا۔ نیلم کی انگوٹھی والا لاکٹ! وہ اوپر ہی رکھا تھا اور اب موجود نہیں تھا۔ اس ۔
پورا ڈریسر چھان مارا لیکن لاکٹ نہ ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ چور کو لاکٹ کی تلاش تھی لیکن
لاکٹ کے بارے میں کسی کو بھی تو نہیں معلوم تھا۔ سوائے حارث کے .... اور حارث شہ
سے باہر گیا ہوا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کرے' شور مچائے؟ لیکن چور جا چکا تھا اور کیا پتا' وہ کسی او
کمرے میں ہو۔ اس وقت شاہ پیلس میں جواہرات تو بہت تھے' یقیناً یہی بات ہوگی تو کیا وا
پولیس کو فون کرے' لیکن اس صورت میں انہیں بتانا ہوگا کہ چور اس کے کمرے میں آیا تھا او
اس نے اس کی نیلم والی قیمتی انگوٹھی چرا لی ہے' اس صورت میں پولیس اس سے انگوٹھی کے
بارے میں پوچھے گی' اگر اس نے حارث کا نام لیا تو حارث سے پوچھ گچھ ہوگی اور حارث کو اس
پر غصہ آئے گا' وہ حارث کے غصے سے خوفزدہ تھی۔ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ انگوٹھی کا تعلق
دارالحکومت میں اس رات کار کے ذریعے قتل کی اس واردات سے ثابت ہو جائے' بہ ظاہر تو
کوئی ایسا امکان نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں' اسے شدت سے یہ خیال آ رہا تھا کہ اس طرح وہ
حارث کے لئے مشکلات کھڑی کر دے گی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا' اگر شاہ پیلس میں مہمانوں کے زیورات چوری ہوئے ہیں تو
وہ یقینی طور پر پولیس کو مطلع کریں گے چنانچہ ہر چیز کا فیصلہ صبح ہو جائے گا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔
بارش نہ جانے کب کی رک چکی تھی پھر بھی اس نے کھڑکی بند کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے بعد
وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اسے نیند آ گئی لیکن وہ اچھی نیند نہیں تھی۔

اگلی صبح ثابت ہو گیا کہ اس کا فیصلہ درست تھا۔ رات کو شاہ پیلس ڈکیتی کی بہت بڑی

واردات کی زد میں آیا تھا۔ چرائے جانے والے زیورات کی مالیت کا تخمینہ لاکھوں میں لگایا گیا۔
دن بھر پولیس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ پولیس کے خیال میں یہ ایک منظم گروہ کا کام
تھا جو اس سے پہلے بھی کئی وارداتوں میں ملوث رہا تھا۔ تفتیش میں یاسمین کو بھی شامل کیا گیا
لیکن اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

حارث کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوئی' وہ اخبارات میں ڈکیتی کی تفصیل پڑھ چکا تھا۔ یہ
جان کر وہ بہت خوش ہوا کہ ممی کے تمام زیورات محفوظ ہیں۔ "یہ تو چور کی مہربانی ہے"۔ اس
نے بیگم شاہ سے کہا۔

"ہاں' مجھے تو چور اپنے رشتے دار لگتے ہیں"۔ بیگم شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں شروع ہی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ زیورات لاکر میں رکھوا دیں"۔ حارث نے
سنجیدگی سے کہا۔

"میرے زیورات لکی ہیں"۔ بیگم شاہ نے بے پروائی سے کہا۔

"دیکھو نا' پچھلی ڈکیتی میں بھی میرے زیورات محفوظ رہ گئے تھے"۔

"پولیس کا کیاں خیال ہے' دونوں وارداتیں ایک ہی گروہ نے کی ہیں؟" حارث نے
پوچھا۔

"ہاں' ان کا یہی خیال ہے۔ ملازمین سے بڑی سختی سے پوچھ گچھ کی گئی۔ تاہم بدقسمت
مہمانوں کو جانے کی اجازت مل گئی"۔

O============☆============O
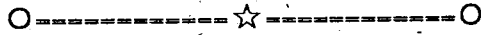
اگلی صبح یاسمین لان میں چہل قدمی کر رہی تھی کہ حارث آ گیا۔ اس کے چہرے پر اس
بلی کا سا تاثر تھا جو ملائی کھا کر آئی ہو۔ یاسمین کا دل ڈوبنے لگا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ
حارث سے خوفزدہ ہے۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو"۔ حارث نے رومانی لہجے میں کہا۔

یاسمین نے جلدی سے موضوع بدلا۔ "کہو تمہارا کاروباری دورہ کیسا رہا؟"

"ٹھیک ٹھاک' ایک بات بتاؤ' تمہیں میری کمی محسوس ہوئی تھی؟"

"میرا یوم آزادی بہت اچھا گزرا' میرا مطلب ہے' ڈکیتی سے پہلے کا وقت"۔

"اور وہ انگوٹھی کہاں ہے' مجھے تمہاری زنجیر نظر نہیں آ رہی ہے"۔

"وہ .... وہ .... وہ.........." یاسمین کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "وہ تو کہیں کھو گئی' شاید
میں کہیں رکھ کر بھول گئی"۔

"کب کی بات ہے؟"

"ڈکیتی کی رات کی"۔

"اس کا مطلب ہے' وہ بھی چوری ہو ئی لیکن اخبارات میں جو مسروقہ زیورات کی

فہرست شائع ہوئی ہے' اس میں تو وہ شامل نہیں"۔

"میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ میرا خیال تھا.........'

"کہ وہ چوری کی ہے"۔ حارث نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں' میرا خیال تھا کہ کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں"۔ تلاش کروں گی تو جائے گی"۔

"جھوٹ مت بولو"۔ حارث نے سخت لہجے میں کہا"۔ تم نے اس کی رپورٹ اس نہیں کرائی کہ تم خوفزدہ تھیں کیونکہ تمہیں وہ انگوٹھی میں نے دی تھی تم مجھے چور سمجھتی ہو'

"نہیں حارث' میں ایسا نہیں سمجھتی۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تم پریشان ہو' تم کسی او غصہ مجھ پر اتار رہے ہو' میں یہ برداشت نہیں کر سکتی"۔

"نہیں کر سکتیں تو نہ کرو اور سنو! یہ کہانی لے کر جج کے پاس نہ دوڑ جانا"۔ یہ کہہ کر پلٹا اور مکان کی طرف چلا گیا۔

یاسمین اپنے آفس روم میں چلی آئی' وہ فوراً ہی کام میں مصروف ہو گئی لیکن اسے توجہ کام پر مرکوز رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ حارث کے انداز اور لہجے کے بارے سوچے جا رہی تھی کیا وہ ذہنی مریض تھا؟ یاسمین کو اپنی یہ ملازمت بہت پسند تھی۔ بس کا کاش حارث موجود نہ ہو۔ آخر وہ میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔

O============ ☆ ============O

پولیس کی تفتیش کی گاڑی رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ یاسمین کو جب بھی فر ہوتی' وہ جج شاکر علی کے کاٹیج کا رخ کرتی۔ اس نے مسودے کا خاصا بڑا حصہ ٹائپ کر دیا کبھی کبھی ٹائپ کرنے کے بجائے وہ جج صاحب کی باتیں' ان کے تجربات سنتی رہتی' کئی بار نے سوچا کہ قاتل ڈرائیور اور حارث سے مشابہت کے بارے میں جج صاحب کو بتا کر دل کا ہلکا کر لے لیکن وہ خوفزدہ تھی کہ جج صاحب اسے اس سلسلے میں کوئی عمل قدم اٹھانے کا دیں گے بلکہ اصرار کریں گے۔

ایک دن تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہ بوجھ ہلکا کر کے رہے گی لیکن اسی دن جج کا شناخت کا ایک اور کیس یاد آگیا۔ اس کیس کے سلسلے میں ایک بے قصور شخص نے چھ سال با مشقت کی سزا کاٹی تھی اور چھ سال بعد پتا چلا تھا کہ مجرم کوئی اور تھا۔ ظاہر ہے' اس چارے کو زندگی کے چھ سال کسی بھی طرح واپس نہیں مل سکتے تھے۔

یاسمین لرز کر رہ گئی۔ مجرموں کو شناخت کرنا واقعی بے حد اہم کام تھا۔ غلط شناخت شخص کی زندگی بھی برباد کر سکتی ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے سلسلے میں اس کی ہمت ج دے گئی تھی۔

اتنی دیر میں عامر آگیا' وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ

دارالحکومت میں بہت اچھی ملازمت کی پیش کش ہوئی ہے۔ "مجھے فوری طور پر جانا ہے میں کام کی نوعیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں"۔ اس نے بتایا۔

"اور تمہاری تعلیم؟" یاسمین نے پوچھا۔

"وہ بھی تعلیم ہی ہو گی......... عملی تعلیم"۔

یاسمین نے مسکرانے کی کوشش کی' وہ اداس ہو گئی تھی' "مبارک ہو" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

عامر نے اسے بے حد غور سے دیکھا۔ "اگلے مہینے میں واپس آ جاؤں گا' کل میری روانگی ہے"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا' مجھے ایک پبلشر سے بات کرنا ہے"۔ جج شاکر علی نے کہا۔

"اور میں تنہا رہ جاؤں گی"۔ یاسمین نے زیر لب کہا۔

عامر اس روز بھی یاسمین کو شاہ پیلس تک چھوڑنے آیا' راستے میں اس نے اپنی کار کی چابیاں یاسمین کو دیں۔ "گیراج تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ تمہیں کار کی ضرورت پڑ سکتی ہے"۔ اس نے کہا۔

"شکریہ"۔ یاسمین نے چابیاں لیتے ہوئے کہا۔ "واقعی مجھے ضرورت پڑے گی۔ جب تم اور جج صاحب یہاں نہیں ہوگے تو میں فرصت کے اوقات میں لمبی ڈرائیو پر نکل جایا کروں گی"۔

"حارث واپس آگیا ہے کیا؟" عامر نے پوچھا۔ یاسمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "مجھے افسوس ہے اس کی آمد کا۔ پتا نہیں کیوں' میں تمہیں اس کے قریب چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا"۔

"ارے' ایسی کوئی بات نہیں' شاہ پیلس بہت بڑا ہے اور اس میں بہت لوگ رہتے ہیں"۔ یاسمین نے کہا۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ عامر کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر دے لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اس طرح حارث اور عامر کے درمیان یقیناً ٹھن جائے گی' ویسے بھی عامر کو اگلے روز جانا تھا۔ بیکار ہے اسے پریشان کرنا جبکہ معاملہ اس کے مستقبل کا تھا۔ ویسے بھی وہ حارث کے متعلق کیا جانتی تھی .... کچھ بھی نہیں۔ باتوں سے وہ بہت بڑا گینگسٹر لگتا تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔

اب وہ شاہ پیلس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عامر نے یاسمین کا ہاتھ تھام لیا۔ "اگر سارے معاملات ٹھیک ٹھاک ہوئے تو واپسی پر میں تم سے کچھ مانگوں گا"۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اسی وقت مانگ لونا"۔ یاسمین نے کہا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' وہ اپنے

لہجے کی التجا کو چھپا نہیں سکی تھی۔

"نہیں، یہ مناسب وقت نہیں، ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے اچھا، خدا حافظ! ملیں گے انشاء اللہ"۔

"خدا حافظ"۔ یاسمین نے کہا۔ شاہ پیلس کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے وہ بے حد گرفتہ تھی۔

عامر کو گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور اب تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ کوئی خط، نہ فون، وہ سوچ رہی تھی کہ کیا عامر کو اس کا بالکل خیال نہیں، کیا وہ اسے بھول ہے۔

اس صبح وہ ناشتے کے دوران اخبار پڑھتی رہی۔ اخبار میں جواہرات کے لیٹرو گرفتاری کے متعلق تفصیلی خبر چھپی تھی۔ اخبار کے مطابق اس سلسلے میں تفتیش دو سال شروع ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں دارالحکومت میں جواہرات کے ایک ایسے ڈیلر کو گرفتار گیا جو مسروقہ جواہرات خریدتا رہا تھا۔ اس کے ذریعے گینگ کے پانچ افراد کا پتا چلا، انہیں گر کرلیا گیا۔ ان کا سرغنہ ایک اور شخص تھا جسے وہ بھورے کے نام سے جانتے تھے یہ نام اس بھورے بالوں کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے اصل نام اور پتے سے نا واقف تھے۔

تفتیش کے نتیجے میں یہ بھی پتا چلا کہ کچھ عرصہ پہلے گینگ کا چھٹا رکن گینگ سے علیحہ ہوگیا تھا۔ اس نے جرائم سے توبہ کرلی تھی اور صاف ستھری زندگی گزارنے لگا تھا۔ بھورے خدشہ تھا کہ وہ شخص پولیس میں مخبری کردے گا چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کے قت کے منصوبے میں شریک کرنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکامی پر اس نے ایک رات اپنے ا سابق ساتھی کو کار سے کچل کر ہلاک کر دیا۔ وہ شخص ایک مقامی ہوٹل کا مالک تھا اور اس قتل کا معما اب تک حل نہیں ہوسکا تھا۔ پولیس اب بھورے کو تلاش کر رہی تھی لیکن انہ اس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں تھی، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ بھورے کے با گھونگریالے اور بھورے ہیں اور وہ خوش رو نوجوان ہے۔

یاسمین نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ گویا قتل کا وہ کیس پھر زندہ ہو رہا تھا جسے بھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب اگر پولیس نے اسے تفتیش کے سلسلے میں طلب کرلیا تو؟ پریشان ہوگی۔ اسے یقین تھا کہ حارث نے بھی یہ خبر پڑھ لی ہوگی، وہ پورے دن خوفزدہ رہی فون کی گھنٹی بجتی تو اس کا دل لرزنے لگتا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ لائبریری میں گئی تاکہ وقت گزارنے کے لئے کوئی کتاب نکال لے۔ اسی وقت حارث اس کے پاس چلا آیا۔ "باہر چلو، مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے" اس نے یاسمین سے کہا۔

یاسمین ہچکچائی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں، میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں"۔

حارث نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں زیادہ وقت نہیں لوں گا"۔

یاسمین انکار نہ کرسکی، وہ اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔ حارث لان کے دور افتادہ گوشے طرف بڑھا، وہ دونوں گلاب کی بڑی جھاڑی کے عقب میں بینچ پر بیٹھ گئے۔

"کیا عامر کا تم سے شادی کا ارادہ ہے؟" حارث نے پوچھا۔

"نہیں لیکن تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے، میں جا رہی ہوں"۔ یہ کہہ کر سمین اٹھ کھڑی ہوئی۔

حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گرفت بے حد سخت تھی۔ "تم نے اخبار میں وہ خبر لی ہے اور اب تم پولیس کو مطلع کردو گی کہ قاتل ڈرائیور میں تھا"۔ اس نے تند لہجے میں ا۔

"ہرگز نہیں اور میرے خیال میں تم وہ ڈرائیور بھی نہیں ہو"۔ یاسمین نے تردید کی۔

"لیکن میں وہ ڈرائیور ہوں"۔ حارث نے زور دے کر کہا۔ "اب تم کیا کہتی ہو؟"

"تم مذاق کر رہے ہو"۔ یاسمین کی آواز لرزنے لگی۔

"نہیں اور اب تم پولیس کو یہ سب کچھ بتانے کے لئے بے تاب ہو رہی ہوگی؟"

یاسمین خوفزدہ تو تھی ہی .... اب اسے غصہ آگیا۔ "اگر بیگم شاہ کو پتا چل جائے کہ کا بیٹا کیا حرکتیں کرتا پھر رہا ...."

"تم انہیں کچھ نہیں بتاؤ گی، سمجھیں؟" حارث نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم پولیس کو کچھ نہیں بتاؤ گی، اگر وہ تم سے پوچھیں تو تم کہو گی کہ تم اس واقعے کے متعلق سب کچھ ا چکی ہو، تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہے"۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ "اگر تم زبان کھولی تو میں انہیں اس انگوٹھی کے بارے میں بتا دوں گا، جس کی چوری کی تم نے رٹ درج نہیں کرائی، اس لئے کہ تم ڈاکوؤں کے اس گینگ میں شامل ہو۔ پولیس والے یہ خود ہی اخذ کرلیں گے کہ تم نے ہی اپنے ساتھیوں کو شاہ پیلس کے متعلق بتایا ہوگا، ان کی ی ہوگی جبکہ تمہارے ساتھی تمہارے کمرے میں غلطی سے آئے ہوں گے اور انہوں نے ی انگوٹھی چرالی ہوگی"۔

یاسمین سناٹے میں آگئی پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ "تمہارا کہا ہوا ہر لفظ مجھے مجبور کر رہا ے میں جا کر پولیس کو حقیقت بتا دوں حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا"۔ اب یاسمین کا غصے سے لرز رہا تھا۔

"اس وقت تمہاری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں، غضب کی لڑکی ہو تم بھی۔ ث نے ستائشی لہجے میں کہا "میرا خیال ہے، میں تم سے شادی کرلوں، اس طرح قانوناً تم خلاف گواہی بھی نہیں دے سکو گی"۔

"پاگل ہوگئے ہو؟" یاسمین نے بے بسی سے کہا۔

"نہیں' یہ نہ سمجھو کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ انکار کروگی تو میں سب کو بتادوں گا کہ تم شادی کے سلسلے میں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہو اور اسی لئے دارالحکومت سے یہاں آئی ہو"۔

"تم مجھے ہرگز بلیک میل نہیں کرسکتے"۔

"ہاں' یہ ممکن ہے"۔ حارث نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرلیا۔ "لیکن جان' اگر میں کہوں کہ شادی کرو یا میں.........." اس کے ہاتھ کھسک کر یاسمین کی گردن پر آگئے اور وہ دھیرے دھیرے گرفت بڑھانے لگا۔ "اگرچہ یہ کام تمہاری محبت کی وجہ سے دشوار ثابت ہوگا لیکن کرنا تو پڑے گا ہی' بس تمہاری گردن پر ذرا سا دباؤ اور.........."

یاسمین نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے محض گھٹی گھٹی چیخیں نکل کر رہ گئیں' وہ بری طرح ہاتھ پیر پھینکنے لگی۔ اسی وقت کسی ملازم نے اسے پکارا۔ "مس یاسمین! آپ کہاں ہیں' آپ کا فون ہے دارالحکومت سے"۔

حارث نے ہاتھ ہٹالیا۔ یاسمین لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا"۔ حارث نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اندر چلے آئے۔ یاسمین نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے عامر بات کررہا تھا۔ "سوری ڈیئر! میں نے دیر سے کال کیا' مصروفیت تھی بہت' سب معاملات طے ہوگئے ہیں"۔

"بہت خوب" یاسمین نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کیا بات ہے! یہ تمہاری آواز کو کیا ہوگیا' طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" عامر کے لہجے میں تشویش تھی۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے امید ہے تم جلد ہی واپس آجاؤ گے"۔

یاسمین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی۔ "عامر.......... جلدی سے آجاؤ' مجھے تمہاری ضرورت ہے"۔ لیکن حارث اس کے سر پر کھڑا تھا یاسمین کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ ایک سفاک قاتل ہے۔

"چچا نے تمہیں دعائیں کہلوائی ہیں اور تم نے کار بھی استعمال کی میری؟"

"نہیں' ابھی نہیں" یاسمین نے بہ مشکل کہا۔

"اپنا خیال رکھنا' شب بخیر"۔

ریسیور رکھنے کے بعد یاسمین پلٹی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ "شب بخیر"۔ حارث نے طنزیہ لہجے میں کہا' وہ جواب دیئے بغیر سیڑھیاں چڑھتی رہی۔

اپنے کمرے میں یاسمین' حارث ہی کے بارے میں سوچتی رہی اگر وہ شاہ صاحب اور بیگم شاہ کو حارث کی دھمکی کے بارے میں بتائے تو وہ اس کی بات پر یقین کہاں کریں گے کوئی

بھی یقین نہیں کرے گا اور پھر وہ اس سلسلے میں حارث سے وضاحت طلب کریں گے' یہ اور برا ہوگا اس صورت میں حارث مشتعل ہوگا اور اور اس کی جان کے درپے ہوجائے گا پھر اس نے چاہا کہ عامر کو فون کرکے اس صورت حال کے متعلق بتائے لیکن شاہ پیلس میں کئی ایکسٹینشن موجود تھے۔ یہ خدشہ تھا کہ حارث اب فون پر نظر رکھے گا۔ اسے احساس ہوگیا کہ وہ عامر سے مدد طلب کرے یا پولیس سے' دونوں صورتوں میں امکان یہی ہے کہ حارث مدد لینے سے قبل اسے ٹھکانے لگادے گا۔ اس کے بعد وہ گرفتار ہو بھی جائے تو کیا فائدہ۔

وہ سوچتی رہی۔ شاہ پیلس سے نکل بھاگنے ہی میں اس کی عافیت تھی۔ بشرطیکہ وہ اس طرح نکلے کہ کسی کو پتا نہ چلے اور اس کے پاس کار ہو پھر اسے خیال آیا کہ اس کے پاس عامر کی کار کی چابیاں تو ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آج رات ہی نکل سکتی ہے سوال یہ ہے کہ وہ جائے گی کہاں.......... دارالحکومت؟ ناممکن' پھر اسے اپنی راجن پور والی خالہ کا خیال آگیا' وہ اسے دیکھ کر خوش بھی ہوں گی' کب سے اسے بلا رہی تھیں۔

اب وہ فرار کا منصوبہ ترتیب دینے لگی۔ اسے سورج طلوع ہونے سے پہلے نکلنا ہوگا کیونکہ اس وقت سب لوگ گہری نیند میں ہوں گے' وہ کسی بک شاپ سے علاقے کا سیاحتی نقشہ لے گی اور سفر شروع کردے گی۔ اسے یہ سوچ کر افسوس ہونے لگا کہ وہ مسز شاہ کو نوٹس دیئے بغیر ملازمت چھوڑ رہی ہے بلکہ بھاگ رہی ہے لیکن وہ مجبور تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ بیگم شاہ کو رقعہ لکھے گی اور معذرت کرلے گی۔

اس نے گھڑی دیکھی' چار بج رہے تھے۔ سوچنے میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے اپنا پرس ٹٹولا' رقم اچھی خاصی تھی' تمام کپڑے اور سامان لے جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ اٹیچی کیس نہیں لے جانا چاہتی تھی' صرف ایک سفری بیگ بہت تھا۔ اس میں اس نے چند جوڑے کپڑے اور کچھ ضروری سامان رکھ لیا۔ اسے جج صاحب کے کاٹیج تک پہنچنے کے لئے جنگل والا شارٹ کٹ راستہ استعمال کرنا تھا چنانچہ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی۔ ٹی شرٹ پر سویٹر اور پیروں میں چپلیں پھر اس نے بیگم شاہ کے نام رقعہ لکھا کہ بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ فوری طور پر جانے پر مجبور ہوگئی ہوں' معذرت خواہ ہوں پھر اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ راہداری سنسان تھی' اس نے اپنے آفس روم میں ٹائپ رائٹر پر رقعہ چڑھایا اور وہاں سے نکل آئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے صدر دروازے کا بولٹ گرایا' باہر نکل کر دروازہ بھیڑ دیا۔ کنکریوں والے راستے پر چلنے کے بجائے اس نے لان کو ترجیح دی وہ کوئی آہٹ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے لان کو عبور کرلیا اور جنگل میں داخل ہوگئی۔ تاریکی بہت گہری تھی لیکن وہ بے فکر تھی کیونکہ راستہ جانا پہچانا تھا۔ وہ مطمئن اور پرسکون تھی۔ اسے سویرا ہونے سے پہلے جنگل عبور کرکے جج کے کاٹیج پہنچنا تھا جہاں عامر کی کار موجود تھی اور یہ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ دوسری طرف حارث کو شبہ بھی

نہیں ہوگا کہ وہ اتنی صبح فرار کی غرض سے نکل سکتی ہے اور جج کے کاٹیج کا رخ کر سکتی ہے
نہیں جانتا تھا کہ عامر اپنی کار کی چابیاں اسے دے گیا ہے۔ کار میں بیٹھتے ہی وہ محفوظ ہو جاتی۔

رات کے وقت جنگل بے حد مختلف لگ رہا تھا۔ یاسمین نے اندازہ لگایا کہ تھوڑی
دیر میں سپیدۂ سحر نمودار ہو جائے گا۔ بالخصوص درختوں کے نیچے گہری تاریکی تھی۔ اسے خو
آنے لگا۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی۔ تمام تر قوت ارادی استعمال کرنے کے باوجود اس کے
آگے بڑھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اسے کچھ دور راہ میں درپیش پہاڑی نالے کا خیال آگیا۔ دن
تو اسے عبور کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ابھرے ہوئے پتھروں پر پیر رکھتے ہوئے پار کر لیا جاتا
وہ ابھرے ہوئے پتھر قدموں کی طرح تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس اندھیرے میں وہ نالہ پا
آسان نہیں ہوگا۔

شاہ پیلس واپسی دشوار نہیں تھی' دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ
ملازم نے اتفاقاً اٹھ کر دیکھا ہو کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور اسے بند کر دیا ہو۔ اس صورت
وہ صبح کے وقت گھر کے باہر ٹہلتی پائی جاتی تو کتنی عجیب لگتی۔ یہی کچھ سوچ کر وہ بے اختیار
دی اور اس ہنسی کے ساتھ ہی اس کا کھویا ہوا حوصلہ لوٹ آیا' وہ آگے بڑھ گئی۔

جنگل میں صرف حشرات الارض کی سرگوشیوں اور سرسراہٹوں کے سوا کوئی آواز
تھی پھر اسے اپنے عقب سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ میں باقاعدگی تھی۔ گویا وہ
جانور کے پیروں کی چاپ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا کوئی تعاقب کر رہا ہے۔

وہ ٹھہر گئی۔ اس چاپ کے سلسلے میں اسے یقین درکار تھا پھر اسے محسوس ہوا کہ
کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی عقبی چاپ بھی معدوم ہوگئی ہے۔ گویا وہ اس کی اپنی چاپ
بازگشت تھی۔ شاید وہ نروس تھی' اس لئے اس بازگشت سے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اسے ا
ہوا کہ اسے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ یونہی ڈرتی رہی تو وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی خوف
مارے مر جائے گی۔ اس جنگل میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی' وہاں چھوٹے جانور
الٹا اس سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے۔

وہ پھر چل پڑی۔ عقب سے سنائی دینے والی چاپ بھی جاگ اٹھی لیکن اب وہ
فاصلے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں
وہ خشک نالے کے پاس پہنچ گئی تھی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ کوئی سا
سانپ اس کے پیر کے نیچے نہ آجائے۔ اس نے اپنا بیگ نیچے رکھا' جھک کر پتھر اٹھایا اور
پھینک دیا۔ پتھر دوسرے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے گرا پھر اس نے دوسرا پتھر اچھالا لیکن
سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دی۔

اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور بے حد احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ وہ پھونک پھونک
رکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ نالے میں نیچے تک پہنچ گئی۔ اب اسے نالہ عبور کرنا تھا۔ نالے

زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ درمیان میں پتھر تھے لیکن آخری پتھر کے بعد فاصلہ زیادہ تھا۔ اس پتھر پر پیر
رکھ کر دوسری جانب اگی ہوئی جھاڑیوں کو تھام کر چھلانگ لگانا پڑتی تھی۔ اس نے جھاڑی کی
طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے کلائی میں لپٹا ہوا بیگ اس کے ہاتھ سے نکلا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے سوچتی رہی لیکن کڑھنے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی' وہ اس سمت میں
نیچے اتری جہاں اس کے اندازے کے مطابق بیگ گرا تھا لیکن بیگ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا
مطلب تھا کہ وہ گرنے کے دوران دائیں یا بائیں سمت لڑھکا ہے۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹولا پھر
ٹھوکروں کے ذریعے اندازہ لگانے کی کوشش کی پھر وہ دائیں سمت چلی۔ بالآخر اسے بیگ نظر
آگیا۔ اس بار اس نے بیگ کو کلائی پر دہرا کر کے لپیٹا' اس کے بعد وہ پھر اوپر چڑھنے لگی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ آگے راستہ بند ہے یا شاید ہے ہی نہیں۔ حالانکہ یہ ممکن
نہیں تھا' وہ جس راستے پر چل رہی تھی وہ تو بالکل سیدھا تھا اور جج کے کاٹیج کی طرف جاتا تھا۔
سیدھے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں موڑ نہیں آتے تھے لیکن وہ کسی بھی مقام پر بند نہیں ہوتا
تھا' اس کا مطلب تھا کہ نالے سے نکل کر وہ غلط راستے پر آگئی ہے۔

وہ ٹھہر گئی اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اصل راستہ یقیناً قریب ہی ہوگا کیونکہ بیگ
تلاش کرتے ہوئے وہ زیادہ دور نہیں ہٹی تھی' وہ دائیں جانب ہٹی تھی' اس کا مطلب تھا کہ
صحیح راستہ بائیں سمت ہوگا۔ اس راستے پر دیودار کا ایک چھوٹا سا درخت تھا اس کی کمر جتنا بلند'
وہ اس درخت تک پہنچ گئی لیکن اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ وہ درخت نہیں ہے۔ اس
وقت وہ جس راستے پر تھی' وہ بے حد تنگ تھا' شاید جانوروں کی گزرگاہ لیکن وہ اس توقع پر اس
راستے پر چل دی کہ شاید وہ اسے اصل راستہ تک پہنچا دے گا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ بری طرح بھٹک گئی ہے۔ اب اسے وہ راستہ
بھی نہیں مل رہا تھا جسے اس نے بند پایا تھا' ورنہ وہاں سے دائیں سمت چل کر دیکھتی۔ ایسا لگتا
تھا کہ اب صحیح راستہ تلاش کرنے کے لئے اسے صبح تک انتظار کرنا ہوگا' وہ تھکے تھکے انداز میں
بڑے گول پتھر پر ٹک گئی۔

اچانک اسے پھر قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور وہ چوکنا ہوگئی۔ اس بار وہ اسے بازگشت
قرار نہیں دے سکتی تھی کیونکہ وہ خود ٹھہری ہوئی تھی پھر قدموں کی چاپ رک گئی۔ اس نے
کسی ابھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر لگنے کی آواز' کراہ اور مردانہ آواز میں گالی بھی سنی اس کا جسم
لرزنے لگا۔

یہ بات طے ہوگئی کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ اس راستے پر
تھا جس سے وہ بھٹک گئی تھی۔

اس نے بہت تیزی سے سوچا اور پھر اردگرد کوئی جائے پناہ تلاش کرنے میں مصروف
ہوگئی' اس وقت تو راہ سے بھٹکنا ہی اس کے کام آگیا تھا ورنہ وہ بازگشت کے دھوکے میں رہتی

اور بہ آسانی ماری جاتی۔ وہ جھاڑیوں میں گھسی آگے بڑھتی رہی۔ کھلی جگہ پر بھاگتے ہوئے
جھک جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ متعاقب اسے دیکھے۔ بالآخر وہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی۔ اس
سانس پھول گیا۔

اسی وقت اسے دو بڑے گول پتھروں کے درمیان ایک غار سا نظر آیا۔ اس نے اطمینا
کا سانس لیا اور رینگتی ہوئی غار میں داخل ہوگئی' اسے خوف تھا کہ وہ کسی جانور کی آرام گ
ثابت نہ ہو لیکن خوش قسمتی سے غار خالی تھا پھر بھی وہ اس غار میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سک
تھی۔ متعاقب کسی بھی لمحے اسے تلاش کرسکتا تھا۔ ویسے بھی اسے جلد از جلد جج کے کاٹیج تک
پہنچنا تھا بلکہ عامر کی کار تک۔ چنانچہ کچھ دیر سانس درست کرنے کے بعد وہ غار سے نکل آئی او
آہستہ آہستہ ایک طرف چل دی۔ اس بار وہ خود کو تھکا دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اسے کھویا ہوا راستہ مل گیا۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ اس سے کیا غلط
سرزد ہوئی تھی۔ بیگ اٹھانے کے بعد اس نے سمت کا تو خیال رکھا تھا لیکن نالے کے اس
کنارے کی طرف نکل گئی تھی جس سے آئی تھی۔ ظاہر ہے' اس کے نتیجے میں سمت بھی غلط
ہوگئی اور وہ اصل مقام سے دور ہوگئی۔

صحیح راستے پر پہنچ کر اسے سوچنا پڑا۔ کیا اس راستے پر سفر کر کے وہ خود اپنے شکاری کے
پاس جا رہی ہے؟ لیکن کچھ بھی ہو' اسے یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا' وہ جانے پہچانے راستے پر چل
پڑی' اب اس کی رفتار تیز تھی۔ بالآخر اسے جج کا کاٹیج نظر آیا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ "وہ رہا"
اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ جنگل کے سناٹے میں آواز دور تک جاتی ہے لیکن اس
کی چیخ کے ساتھ کوئی پرندہ بھی چہچہایا تھا۔ اس کی آواز دب گئی۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہ
کسی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ گیراج کی طرف بھاگنے لگی۔ جو اب تھوڑی ہی
دور رہ گیا تھا۔ اب وہ ہانپ رہی تھی' بیگ اسے منوں وزنی محسوس ہو رہا تھا۔

گیراج کے دروازے پر پہنچ کر اس نے تالے میں چابی لگائی اس کا دل زور زور سے
دھڑک رہا تھا۔ عامر نے بھول سے غلط چابی نہ دے دی ہو لیکن چابی گھومی' دروازہ کھل گیا
اندر کار موجود تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر بیگ کار میں پھینکا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر
بیٹھ گئی۔ اس نے کار اسٹاٹ کر کے باہر نکالی۔ گاڑی کو نیوٹرل میں ڈال کر وہ اتری اور اس نے
گیراج کا دروازہ مقفل کر دیا۔ پھر وہ دوبارہ کار میں بیٹھی اور اسے آگے بڑھا دیا۔

بلا ارادہ اس کی نظر اس راستے کی طرف اٹھ گئی جس پر چل کر وہ کاٹیج آئی تھی۔ وہ
سورج کی اولیں کرنوں کی چمک تھی یا بھورے گھونگریالے بال؟ بہرحال ایک جھاڑی کے پیچھے
اس نے ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اب وہ مطمئن تھی' وہ پیدل نہیں تھی بلکہ کار میں تھی اور
فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

کار بہت اچھی کنڈیشن میں تھی' وہ پوری رفتار سے اسے دوڑا رہی تھی۔ اسے احساس

پٹرول ڈلوانا بہت ضروری ہے لیکن وہ پہلے اپنے اور اپنے شکاری کے درمیان معقول فاصلہ
کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے سفر جاری رکھا۔

سات بجے کے قریب اس نے کار پٹرول پمپ پر روکی۔ اٹینڈنٹ کو ٹنکی فل کرنے کی
ہدایت دے کر وہ قریبی ریسٹورنٹ کی طرف چل دی۔ وہاں اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور
باہر نکل کر ایک بک شاپ سے سیاحتی نقشہ لیا۔ واپس آکر اٹینڈنٹ کو ادائیگی کی اور سفر
دوبارہ شروع کر دیا۔

راستے میں اس نے نقشہ پھیلا کر اس کا جائزہ لیا اور اپنا راستہ ذہن نشین کرلیا۔ اس
وقت وہ جس سڑک سے گزر رہی تھی' اس کے اطراف میں بے حد دلکش مناظر تھے۔ اس کا جی
چاہا کہ اتر کر سیر کرے لیکن ہر بار خوف آڑے آگیا' وہ اب بھی اپنے اور حارث کے فاصلے سے
مطمئن نہیں تھی۔

اس کی کار کے آگے تین ٹرک تھے۔ ان کی رفتار بہت سست تھی۔ سڑک بہت پتلی
تھی۔ اس نے ہارن دیا اور اوورٹیک کرلیا۔ سامنے سے کئی گاڑیاں آ رہی تھیں۔ اس نے
ٹرکوں کو اوورٹیک کرنے کے بعد گاڑی کو اپنی سائیڈ پر ڈالا لیکن اس سے پہلے ہی وہ عقب نما
آئینے میں کچھ دیکھ چکی تھی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اسے لرزانے کے لئے کافی تھا۔ ایک
لمحے کے لئے اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ تینوں ٹرکوں کے پیچھے اچانک ہی ایک سرخ کار
نمودار ہوئی تھی اور وہ یقینی طور پر حارث کی کار تھی۔

ایکسیلیریٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا گیا۔ اس نے عقب نما آئینے پر بھی نظر رکھی
تھی۔ حارث کو ٹرکوں کو اوورٹیک کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میل تیزی سے اڑتے جا رہے
تھے۔ ابھی تک حارث کی کار نہیں دکھائی دی تھی۔ اب کار پہاڑ کی دوسری سمت ڈھلوان کا سفر
طے کر رہی تھی۔ موڑ بے حد خطرناک تھے۔ اب عقب نما آئینے میں ٹرک بھی نظر نہیں آ رہے
تھے۔ اس نے اپنی کار کی رفتار کم نہیں کی۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔

سامنے ایک پہاڑی قصبے کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ اس نے سوچا کہ رک کر کچھ
کھانے پینے کا بندوبست کرے لیکن زندگی بہرحال بھوک سے زیادہ قیمتی تھی۔ اس نے سفر
جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ منزل ابھی خاصی دور تھی۔

قصبے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسکول کے بچوں کا اجتماع نظر آیا' وہ کسی قسم کی پریڈ
کی تقریب معلوم ہوتی تھی بچے یونیفارم میں تھے۔ آگے کچھ اساتذہ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں
پرچم تھے' وہ سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یاسمین نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ جلوس کے
سڑک پر پہنچنے سے پہلے وہ سڑک کے اس حصے سے آگے نکل چکی تھی۔ اس نے کار کی رفتار کم
کر کے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ جلوس اب سڑک پر پہنچ گیا تھا اور سڑک پر وہ اسی طرف بڑھ
رہا تھا جس طرف سے وہ آئی تھی۔ اس نے سکون کی سانس لی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

قصبے کی حدود سے نکلتے ہی اس نے کار کی رفتار پھر بڑھا دی۔ خوش قسمتی اس کے ساتھ
تھی۔ حارث کو پہلے تین سست رفتار ٹرکوں نے روکا تھا اور اب اسے یقیناً جلوس کی وجہ سے
تاخیر ہوگی۔ یاسمین کو احساس تھا کہ حارث کی کار رفتار کے اعتبار سے اس کی کار پر فوقیت رکھتی
ہے' اسی لئے وہ اپنی خوش قسمتی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاکر فاصلہ آخری حد تک بڑھانے
کی خواہش مند تھی۔

جیسے ہی پہلی ذیلی سڑک نظر آئی' اس نے گاڑی اس پر ڈال دی۔ سڑک کے اطراف
میں ہرے بھرے کھیت تھے۔ چند میل کا فیصلہ طے کرنے کے بعد لکڑی کا ایک پُل سامنے آیا۔
وہ دیکھنے ہی میں خاصا مخدوش لگ رہا تھا۔ اس قسم کے پُل اس علاقے میں بہت عام تھے۔ پُل
کے نیچے تندو پرشور پہاڑی دریا بہہ رہا تھا۔ چٹانوں سے سر ٹکراتا' شور مچاتا' جھاگ اڑاتا۔ پُل
کی اس طرف ایک بورڈ نصب تھا۔ یہ پُل مخدوش ہے' اس پر سے گزرتے ہوئے اپنے گھوڑوں
سے اتر جایئے۔ گاڑیاں گزارنے کی سخت ممانعت ہے۔ یاسمین نے بغیر ہچکچائے گاڑی پُل پر
دوڑا دی۔ پل چرچراتا رہا' خطرناک آواز میں احتجاج کرتا رہا۔ چند ایک تختے بھی نکل کر دریا میں
جاگرے۔ پل کے ساتھ ساتھ کار بھی بری طرح ڈول رہی تھی۔ لیکن واپسی کا سوال ہی نہیں تھا۔
وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈرائیو کرتی رہی' اس نے عقب نما آئینے میں پُل کے عقبی حصے کی
طرف بنے ہوئے کیبن سے ایک بڈھے آدمی کو نکلتے دیکھا' وہ اسے دیکھ کر ہاتھ لہرا رہا تھا اور
چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا پھر اس نے پُل کے راستے پر زنجیر کھینچ کر باندھ دی۔

بالآخر وہ بخیریت پُل کی دوسری طرف پہنچ گئی۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے گاڑی پوری
رفتار پر چھوڑ دی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مخدوش پُل پر سے اپنی کار سمیت بخیر و
عافیت گزر آئی ہے۔ اسی لمحے اس عقب نما آئینے میں حارث کی سرخ کار کی جھلک دکھائی دی۔
سرخ کار پُل کے سرے پر رکی۔ حارث چند لمحے پُل کے بڈھے چوکیدار سے بحث کرتا رہا۔
یاسمین نے اسے دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھا۔

یاسمین نے گاڑی بائیں جانب والی سڑک پر موڑ دی۔ ایکسی لیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ
بڑھ گیا تھا۔

○ ========== ☆ ========== ○

یاسمین کا خوف بڑھ گیا تھا۔ حارث نے اس کی توقع کے برعکس فاصلہ بہت تیزی سے طے
کیا تھا۔ پُل عبور کرنے کی صورت میں یہ بات یقینی تھی کہ حارث جلد ہی اسے آلے گا۔ اس
نے جلدی سے نقشہ کھولا۔ یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ صحیح راستے پر تھی۔ دو منٹ بعد وہ
روڈ پر پہنچ گئی۔ راجن پور اب زیادہ دور نہیں تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ بات نامناسب معلوم ہوتی تھی کہ وہ حارث کو اپنے پیچھے لگا کر
زبیدہ خالہ کے گھر پہنچے اور اپنے ساتھ انہیں بھی مصیبت میں پھنسائے لیکن اس کے علاوہ کوئی

راستہ بھی تو نہیں تھا۔ آدمی مصیبت کے وقت اپنوں ہی کی طرف تو دیکھتا ہے چنانچہ وہ راجن پور
کی طرف بڑھتی رہی۔

راجن پور پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ وہ بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی لیکن
زبیدہ خالہ کی صورت دیکھ کر اسے بڑا سکون ملا۔ خالہ بھی اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

وہ نہا دھو کر تر و تازہ ہوگئی لیکن حارث کا خوف اب بھی اس کے ذہن پر مسلّط تھا۔
خالہ نے ریڈیو آن کر دیا۔ خبریں ابھی شروع ہوئی تھیں۔ پھر نیوز ریڈر کی آواز نے
اسے چونکا دیا۔ آج راجن پور سے بیس میل دور ایک حادثے میں ایک شخص ہلاک ہوگیا۔ متوفی
اپنی کار میں تھا۔ حادثہ ایک مخدوش پُل سے گزرتے ہوئے پیش آیا۔ پُل گر گیا اور کار ایک
پہاڑی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ لاش نکال لی گئی ہے۔ کاغذات سے پتا چلتا ہے کہ
متوفی حارث شاہ رام گڑھ کا رہنے والا تھا۔ وہ رام گڑھ کے مشہور صنعت کار وارث شاہ اور
مشہور سماجی شخصیت بیگم شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پُل کے چوکیدار نے اسے کار کو پُل پر سے لے
جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور اسے سمجھایا تھا مگر متوفی نے چوکیدار کو بے ہوش کر دیا
اور اس من مانی کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا........"

یاسمین نے بے اختیار سکون کا سانس لیا پھر اسے زیادتی کا احساس ہوا۔ کسی انسان کی
موت پر یوں سکون بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال ڈاکوؤں کا سرغنہ اور دارالحکومت کے
ایک ہوٹل کے مالک کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا اور اب وہ محفوظ تھی۔ اسے اس بات کی
خوشی تھی کہ اس کے جرائم کا راز فاش نہیں ہوا اور یوں شاہ صاحب اور بیگم شاہ شرمندگی سے
بچ گئے۔ اب وہ عمر بھر اپنے مرحوم بیٹے کو محبت کے ساتھ یاد رکھیں گے۔ اچانک اسے عامر کا
خیال آگیا۔ اس نے خالہ کے گھر سے عامر کو فون کیا۔ "ہیلو عامر........ میں یاسمین بول رہی
ہوں"۔

"تم کہاں ہو' میں نے شاہ پیلس فون کیا تھا.........؟"

"وہ تمام تفصیل میں ملنے پر بتاؤں گی"۔ یاسمین نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر اس نے
اسے خالہ کا پتا بتایا۔

"یہاں میری ملازمت کے تمام معاملات طے پاگئے ہیں"۔

"مبارک ہو"۔

"اور اب میں تم سے وہ بات پوچھ رہا ہوں جو مجھے پوچھنا تھی' مجھ سے شادی کرو گی؟"

یاسمین کا چہرہ تمتما اٹھا' اسے احساس تھا کہ خالہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہیں"۔

"ہاں اگر خالہ سے بات کرنا"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"او کے' میں انشاء اللہ پرسوں آ رہا ہوں' اپنا خیال رکھنا' میری خاطر' خدا حافظ"۔

اس نے ریسیور رکھ دیا لیکن وہ خالہ سے نظریں چرا رہی تھی۔

"یہ تم نے اچھا کیا کہ مجھ سے بات کرنے کو کہا"۔ خالہ بولیں۔ "آخر تمہاری رخم
یہیں سے ہوگی' اب مجھے اس عامر کے بارے میں بتاؤ"۔

وہ شرماتی رہی اور عامر کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے حارث کے بارے میں ا
لفظ بھی نہیں کہا۔ یہ بوجھ تو وہ صرف عامر کے سامنے ہلکا کرسکتی تھی اور عامر پرسوں آ رہا تھا۔

اگلے روز اخبار کے ذریعے اسے پتا چلا کہ حارث' وارث شاہ اور بیگم شاہ کا بیٹا نہیں
لے پالک تھا۔ شاید اسی لئے وہ خود کو منوانے کی غرض سے جرم کی راہ پر چل نکلا تھا لیکن
کے جرام کا راز آخر تک فاش نہیں ہوسکا تھا' اس کے بارے میں صرف وہ جانتی تھی یا اب،
کو معلوم ہوگا لیکن اس نے طے کرلیا تھا کہ نہ خود زبان کھولے گی اور نہ عامر کو کھولنے د
گی' اچھے لوگوں کو بلاوجہ کیوں دکھ دیا جائے۔

سچ تو یہ ہے کہ جب اے ایس آئی راشد عزیز کو رشوت ستانی کے الزام میں محکمہ
پولیس سے نکالا گیا تو مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا۔ حد تو یہ ہے کہ مجھے اس سے ہمدردی بھی
محسوس نہیں ہوئی۔ میری دانست میں اسے محکمے سے نکال کر اس کے ساتھ عملاً ہمدردی کی گئی
تھی۔ یہ جمہوریت کا دور ہے اور اس میں اکثریت کی چلتی ہے۔ جہاں ننانوے فیصد لوگ رشوت
لیتے ہوں' وہاں رشوت کا مفہوم خودبخود بدل جاتا ہے۔ ایسے میں رشوت نہ لینے والوں ہی پر
رشوت لینے کا الزام عائد کیا جاتا ہے تاکہ ان کی جگہ ضرورت مند افراد کو موقع دیا جاسکے۔
کفران نعمت کرنے والوں کے لئے ایسے محکموں میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ممکن ہے' لفظ نعمت
کی اس بے حرمتی پر آپ مجھ پر لعنت بھیجنے لگیں' لیکن میں بے حد حقیقت پسند آدمی ہوں۔ یہ
ایک تلخ حقیقت ہے کہ کسی معاشرے کی خرابی حد سے گزر جائے تو خدا کے قہر سے نعمت کا
مفہوم بدل کر رہ جاتا ہے۔

ذرا سوچئے.......... اپنے دور پر' اپنے گردوپیش پر ایک نگاہ ڈالیے۔ یقین نہیں آتا کہ
اس ماحول سے ایسے نوجوان بھی ابھر سکتے ہیں' جن کی آنکھوں میں اصلاح معاشرہ کے خواب
ہوتے ہیں' جو سمجھوتے کے قائل نہیں ہوتے۔ میرا خیال ہے' ایسے نوجوانوں کی محکمہ پولیس
میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راشد کے نکالے جانے پر مجھے ذرا بھی ملال نہیں ہوا۔
میرے خیال میں وہ اس محکمے کے لئے موزوں ہی نہیں تھا۔ بات اگر یہیں ختم ہو گئی ہوتی تو کچھ
بھی نہیں ہوتا لیکن ملازمت سے نکالے جانے کے ایک ہفتے بعد ایک گلی میں راشد کی لاش ملی'
اس حال میں کہ اس کے پیٹ میں پانچ گولیاں پیوست تھیں۔ اس کے ساتھ ہی صورت حال
یکسر تبدیل ہو گئی۔ میں اب اس کے بارے میں لاتعلقانہ انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ اگر یہ بابر
خان کی انتقامی کارروائی تھی تو احمقانہ حد تک بلاجواز اور غیر ضروری تھی۔ راشد کا قصور صرف
اتنا تھا کہ اس نے ایک ایماندار پولیس افسر کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کی تھی
اور یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ اس پر اسے سزائے موت دی جاتی۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مرنے والا راشد عزیز نہ ہوتا' تب بھی میرا ردعمل یہی

جس شخص نے پولیس کے محکمے میں چوبیس سال پوری طرح آلودہ ہو کر گزارے ہوں' وہ
جرم اور برائی کے خلاف جہاد شروع نہیں کر سکتا۔ نہ اس عمر میں انسان انقلابی ہو سکتا
مجھے اعتراف ہے کہ میں کوئی اچھا پولیس افسر نہیں ہوں۔ میں اپنے محکمے کی ہر برائی میں
رہا ہوں۔ میں بھی دوسرے پولیس والوں کی طرح بھتے وصول کرتا ہوں.......... میں نے
کے منظم گروہوں سے باقاعدہ تنخواہ بھی وصول کی ہے۔ اس شہر میں اپنے جسم پروردی
رکھنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے یہ کوئی عذر نہیں ہے' کیونکہ میں عذر گناہ بدتر از گناہ
قائل ہوں۔ میں تو محض ایک سیدھی سادی حقیقت بیان کر رہا ہوں' میں' انسپکٹر ریاض ہر ماہ
نہ کرنے کے عوض پچاس ہزار روپے وصول کرتا ہوں۔ اس کچھ نہ کرنے کا بھی ایک واضح
لب ہے۔ یہ بھی ایک کام ہے.......... کچھ کرنے کے موقع پر کچھ نہ کرنا۔ جب تنظیم چاہے
میں کچھ نہ کروں تو میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا۔

چوبیس سال پہلے جب میں اس محکمے میں آیا تھا تو میری عمر صرف بیس سال تھی۔ میرے
ن میں بڑے بڑے آئیڈیل تھے اور آنکھوں میں بہت کچھ کرنے کے خواب لیکن جلد ہی میں
خود کو ایک دوراہے پر کھڑے پایا۔ ایک طرف ایمانداری تھی' افسران کی جھڑکیاں تھیں'
وں کی دھمکیاں تھیں۔ عسرت تھی اور عمر بھر کانسٹیبل رہنے کا یقین.......... دوسری طرف
ائشات تھیں' ترقی کا امکان تھا اور افسران کی خوشنودی بھی تھی۔ میں آنکھوں میں سجے
ے خوابوں کے باوجود بنیادی طور پر حقیقت پسند آدمی تھا۔ یہ تجزیہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ
ب بے وقعت آدمی معاشرے کو نہیں سدھار سکتا۔ چنانچہ میں نے اپنی عاقبت اور سماج سدھار
ے احساس کو تھپک تھپک کر سلا دیا اور لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ دنیا میں برائی آج سے
ں ہمیشہ سے بے حد طاقتور رہی ہے۔ یہ فطرت کا بہاؤ ہے۔ ایک سڑا ہوا خربوزہ اپنے ساتھ
لے خربوزوں کو بھی خراب کر دیتا ہے۔ جبکہ بہت سارے اچھے خربوزے ایک خراب
ربوزے کو اچھا نہیں کر سکتے۔

میرے اس فیصلے نے مجھے بہت کچھ دیا۔ جب کبھی میں اس فیصلے پر پچھتاتا تھا تو اپنی کار
بیٹھ کر دولت آباد چلا جاتا تھا۔ غریبوں کے دولت آباد۔ وہاں اس تنگ اور کچے مکان کے
منے کار روک کر اترنے کی ہمت کرتا رہتا جہاں میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا تھا' لیکن
کار سے اترنے کی ہمت کبھی نہیں ہوتی تھی۔ مجھے اس جگہ سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ
اب بھی میری ملکیت تھی۔ مناسب آفرز کے باوجود میں نے اسے فروخت کرنے سے گریز
تھا۔ نہ ہی میں نے کبھی اسے تعمیر کرنے کے متعلق سوچا تھا۔ وہ اپنی پرانی شکل اور روپ ہی
میرے لئے زیادہ کار آمد تھا۔ جب بھی ضمیر پر بوجھ بڑھتا اور میں اپنے ابتدائی فیصلے پر پچھتاتا'
ں کا رخ کرتا۔ اس شکستہ کچے مکان کو دیکھ کر میرے دماغ سے اچھائی کے کیڑے جھڑ جاتے۔
مکان ایمانداری کی علامت تھا۔ میں وہاں سے واپس آتا تو پوری طرح تروتازہ ہوتا اپنے کام
طرز زندگی سے پوری طرح مطمئن اور آسودہ۔ وہ مکان میرے مرحوم باپ کی یادگار بھی تھا'

جو ایک دیانت دار پولیس مین تھا' اسی لئے ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے سے اسے میں بڑھ سکا تھا۔ میں نے پولیس کی ملازمت کے پہلے پانچ برسوں میں ساحلی علاقے میں پلاٹ خرید کر اس پر چھوٹا سا بنگلا بنوالیا تھا۔ اس بنگلے میں دس کمرے تھے وہ بنگلا میں نے نازنین کے لئے بنوایا تھا لیکن نازنین اس بنگلے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اسے اس سے بڑا بنگلا میسر آگیا تھا اور ایسا شوہر جو اس کے لئے لاکھوں خرچ کرسکتا تھا' جبکہ میری بساط چار پانچ ہندسوں سے زیادہ کی نہیں تھی۔ میں حقیقت پسند آدمی ہونے کی حیثیت سے جانتا تھا کہ حسن کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔ نازنین کو مجھ سے زیادہ قیمت دینے والا مل گیا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا فیصلہ اپنی جگہ درست تھا۔ اب میں اس بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ یعنی ملازمین کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے خیال میں وہ بنگلہ اس تنگ کچے مکان سے ہزار درجے بہتر تھا۔ جہاں تک اس تنگ کچے مکان کا تعلق ہے' اب سے پندرہ برس پہلے میں وہاں بکثرت جانے پر مجبور تھا۔ دس سال پہلے کبھی کبھار ہی یہ نوبت آتی تھی کہ میں وہاں جاؤں۔ اب میں گزشتہ تین سال سے وہاں نہیں گیا تھا۔ ضمیر کا معاملہ ہے ہی کچھ ایسا۔ ندامت اور پشیمانی اس کی غذا ہے۔ اور غذا نہ ملے تو ضمیر کمزور ہوتا جاتا ہے۔

جس روز راشد کی لاش ملی' اس دن بھی جس چیز نے مجھے جھنجوڑا وہ میرا ضمیر ہرگز نہیں تھا۔ اگر وہ لاش راشد کے بجائے کسی اور کی ہوتی تو شاید میرا ردعمل اتنا شدید نہ ہوتا لیکن راشد کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔

جس دن راشد عزیز اپنا پروانہ تقرری لے کر میرے دفتر میں داخل ہوا' میں اپنا کام مکمل کرچکا تھا اور گھر جانے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا۔ میں اسے دیکھ کر اچھا خاصا منتشر ہوگیا۔ اس انتشار کی دو وجوہات تھیں۔ خیر دوسری وجہ کا پوری طرح احساس تو مجھے اس کی ڈیوٹی جوائن کرنے کے تین چار دن بعد ہوا تھا۔ البتہ پہلی وجہ نے مجھے تعارف کے اس ابتدائی لمحے ہی میں دہلا کر رکھ دیا تھا جب اس نے پہلی بار اپنا نام بتانے کے بعد مجھے سیلوٹ کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے برسوں کے بعد مجھے شاہدہ کی شبیہہ کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ مجھے پہلی نظر میں اندازہ ہوگیا کہ وہ شاہدہ کا بیٹا ہے.......... اور یہ کہ وہ میرا بیٹا بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد مجھے زندگی میں پہلی بار زیاں کا شدید ترین احساس ہوا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں نے کیا کچھ گنوا دیا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے شاہدہ یاد آئی.......... اور اس طرح ٹوٹ کر یاد آئی کہ درمیان میں حائل چوبیس برس وہم ہوکر رہ گئے۔

چوبیس برس پہلے میں نے جو فیصلہ کیا تھا' اس کے نتیجے میں جہاں مجھے خوشحالی اور کامرانی میسر آئی تھی' وہیں میں نے شاہدہ کو بھی ہمیشہ کے لئے کھو دیا تھا۔ شاہدہ جو میری دلہن بننے والی تھی' اس نے مجھے مسترد کر دیا تھا۔ "آپ اب میرے لئے محترم نہیں رہے"۔ مجھے اس کے الفاظ آج بھی یاد ہیں۔ "اور یہ رشتہ احترام کا ہے۔ اگر کوئی شخص محبت کے باوجود محترم نہ رہے تو اس کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ مجھے عزت کی قیمت پر آپ کی خوشحالی کا سودا قبول

...ما ہے"۔

اس روز صرف میں نے ہی نہیں' شاہدہ نے بھی ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اپنے چچا زاد ...ائی عزیز کو مجھ پر فوقیت دینے کا فیصلہ کیا تھا' جو کلرک تھا اور کرائے کے ایک تنگ اور تاریک ...کان میں رہتا تھا۔ میں شاہدہ کے فیصلے پر حیران ہوا تھا۔ میرے خیال میں ایمان کے نور سے دل ...ر روح تو جگمگا سکتے ہیں لیکن گھر کا اندھیرا دور نہیں ہوتا۔ شاہدہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ ہر لحاظ ...ے اچھی تھی اور میں اس سے محبت بھی کرتا تھا لیکن میرے نزدیک میرا کیریئر اور مستقبل زیادہ ...ہم تھا اور اس سلسلے میں میں کسی اور کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم میں نے ...ے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنے نظریات میں بہت پختہ تھی۔ چنانچہ میں نازنین کی ...رف متوجہ ہوگیا.......... اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک تنہا ہوں۔ اس روز راشد کو روبرو ...یکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر میرے اور شاہدہ کے فیصلے متصادم نہ ہوتے تو آج راشد' راشد ...زیز نہیں' بلکہ راشد ریاض ہوتا۔ اس خیال نے میرے ذہن میں اتنے پچھتاوے جگائے کہ میں ...ل ہو کر رہ گیا۔ پچھتاوے ہوتے ہی اذیت ناک ہیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ انسان زندگی ...ں کچھ بھی کرے' کچھ بھی کمائے لیکن پچھتاووں سے محفوظ رہے۔ اس کے لئے قدم قدم پر' ...رمحرومی پر' ہر کامیابی پر خود کو پوری دیانت داری کے ساتھ ٹٹولنا بہت ضروری ہے۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور وہ احترام آمیز انداز میں میرے کچھ کہنے کا انتظار کرتا رہا۔ ...ں کے چہرے پر الجھن کا ہلکا سا سایہ لہرا رہا تھا۔ میری مسلسل خاموشی اس کا سبب تھی۔ پھر اس ...لیکن خاموشی نے مجھے بھی چونکا دیا.......... اور میں حال کی دنیا میں لوٹ آیا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی راشد!" میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور اس کی ...رف ہاتھ بڑھایا۔ "معاف کرنا' میں تمہیں دیکھ کر کچھ کھو سا گیا تھا۔ درحقیقت تم اپنی ماں کی ...سویر ہو"۔

وہ ایک لمحے کو چونکا۔ پھر اس نے سنبھل کر پوچھا۔ "آپ میری امی کو کیسے جانتے ...ں؟"

"ہم بچپن میں ساتھ کھیلے تھے"۔ میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"اوہ!" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ "امی نے کبھی آپ کا تذکرہ نہیں کیا"۔

اگرچہ اس نے وہ جملہ بڑی سادگی سے کہا تھا لیکن اس کے لفظ میرا دل چیر گئے۔ اسے تو ...دازہ بھی نہیں تھا کہ اسے اپنے روبرو دیکھ کر مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میں شاہدہ کو جانتا تھا۔ ...س نے فیصلے والے روز مجھے اپنی زندگی کے نصاب سے خارج کر دیا تھا۔ میں اس کی عزت کا ...حق نہیں رہا تھا.......... تو وہ میرا تذکرہ اپنے بیٹے سے کیوں کرتی۔ ویسے بھی اولاد سے اس ...طرح کے تعارف کہاں کرائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ جان کر میرا دل دکھا کہ وہ مجھ سے ...س حد تک لاتعلق ہوگئی تھی کہ شاید اسے کبھی میرا خیال بھی نہیں آتا ہوگا۔ اس وقت میں ...خود کو ایک ایسا حرف محسوس کر رہا تھا' جسے مٹا دیا گیا ہو۔

یہ سب کچھ سوچ کر میں خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتا رہا لیکن میں نے راشد کے سامنے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں دی۔ "بہت پرانی باتیں اور بہت پرانے لوگ اکثر صرف دیکھ کر ہی یاد آتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "تمہیں دیکھنے سے پہلے شاہدہ خود مجھے بھی یاد نہیں تھی"۔

وہ مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ میں بڑی معنویت تھی۔ "لیکن آپ کی یادداشت غضب کی ہے سر"۔ اس نے کہا۔ "آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا لیکن میری امی کے حوالے نے مجھے پہچان لیا۔ آپ امی سے آخری بار کب ملے تھے؟"

"چوبیس سال پہلے"۔ میں نے جواب دیا اور پھر جلدی سے موضوع تبدیل کر دیا۔

اس مختصر سی ملاقات ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ پولیس کے محکمے کے لئے غیر موزوں ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس سے اس موضوع پر کوئی بات ہوئی ہو۔ اس اندازے کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ وہ شاہدہ کا بیٹا ہے۔ اس شاہدہ کا جس نے بے پناہ محبت کے باوجود مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اسے دیانت پسند تھی۔ ایسی ماں کا بیٹا ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ سمجھوتا نہ کرنے والا' پھر اس کی آنکھیں.......... وہ بے حد سچی آنکھیں تھیں.......... شفاف آنکھیں.......... وہ آنکھیں بدی کی غبار آلود فضا میں رہنے کے باوجود صاف و شفاف اور پاکیزہ تھیں۔ وہ بددیانت ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی تربیت شاہدہ جیسی ماں نے کی تھی۔

میرا معمول ہے کہ میں فورس میں شامل ہونے والے نئے افراد سے پہلی بار دوستانہ ماحول میں گفتگو کرتا ہوں اور انہیں اپنے محکمے کے معمولات سے روشناس کرا دیتا ہوں تاکہ بعد میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ تین دن بعد میں نے راشد سے ایسی ہی ایک دوستانہ ملاقات کی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اے ایس آئی کی حیثیت سے اس کی تقرری پولیس حکام کی ایک سنگین غلطی ہے۔ اس سے دو منٹ کی گفتگو نے مجھے بتا دیا کہ اس کے لئے محفوظ ترین مقام ٹریفک ڈیپارٹمنٹ ہے۔

میں اس گفتگو کے لئے اسے پولیس اسٹیشن کے برابر والے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ ہم ایک پرائیویٹ کیبن میں جا بیٹھے۔ کسی رنگروٹ کے تربیتی لیکچر کے لئے مجھے وہی جگہ پسند تھی۔ انٹرویو معمول کے مطابق شروع ہوا۔

"تم اس محکمے میں کیسے آ گئے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "یہاں تمہیں سب کچھ ملے گا' سوائے عزت کے"۔

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "عزت اور ذلت تو خدا کے ہاتھ میں ہے سر! میرے نزدیک تو اتنا ہی کافی ہے کہ انسان اپنی نگاہوں میں سرخرو رہے.......... ایسا کوئی کام نہ کرے کہ خود اپنی نظروں میں حقیر ہو جائے"۔

میں اس پہلے جواب سے ہی لرز کر رہ گیا۔ تاہم میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "میرا مطلب ہے' تم نے کسی اور محکمے میں ٹرائی کیوں نہیں کی؟"

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں سر.........."

"یہ تکلفات پولیس اسٹیشن کی حدود تک ٹھیک ہیں"۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

یہاں تم مجھے انکل کہو"۔

"شکریہ انکل"۔ اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ "تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ پولیس کا محکمہ بہت بدنام ہے' لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دشواری یہ ہے کہ اچھے عزائم رکھنے والے نوجوان اس محکمے کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کیونکہ وردی کی عزت نہیں رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس محکمے کی طرف وہی لوگ متوجہ ہوتے ہیں جو مال بنانے کی نیت رکھتے ہیں۔ اب اس طرح تو سدھار کا کوئی امکان نہیں۔ اسی لئے میں نے اس محکمے کا رخ کیا ہے"۔

"لیکن بیٹے! سمندر کو اس طرح صاف نہیں کیا جا سکتا جیسے کنوؤں کو کر لیا جاتا ہے"۔

"آپ اسے اس انداز میں سوچیں کہ گھپ اندھیرے میں ایک ننھا سا چراغ بھی بہت بڑا کام کرتا ہے اور پھر چراغ سے چراغ جلتا ہے انکل"۔

میرے تمام خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ وہ لڑکا اپنی ماں سے قلب و روح کی تمام سچائیاں لے کر جھوٹ کے اس سمندر کو پاک کرنے کے ارادے سے اترا تھا۔ میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں بیٹے! لیکن میرا مشورہ ہے کہ قدم آہستہ آہستہ اور بہت سنبھال کر رکھنا"۔ میں نے کہا۔

"آپ کھل کر بات کریں انکل!"

"میں نے چند لمحے سوچا۔ لوہے کو لوہے سے کاٹا جا سکتا ہے' انسان کا کاز خطرے میں ہو' تو بھی کاز کی طرف اس کی پیش قدمی سست پڑتی ہے۔ "یہ محکمہ تمہارے تصور سے زیادہ گندا ہے بیٹے!" میں نے اسے سمجھایا۔ "تم اصلاح کے ارادے سے نکلے ہو۔ لیکن محکمے سے نکال دیئے گئے تو تمہارا ارادہ بیکار ہو جائے گا۔ خرابی اگر حد سے گزر جائے تو اصلاح کا عمل بے حد سست اور بتدریج ہونا چاہئے۔ بس' اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے کاز کے لئے تمہارا ملازمت پر برقرار رہنا بھی ضروری ہے"۔

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں انکل"۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور کام کیسا چل رہا ہے؟" میں نے بات کا رخ بدلا۔

"کام کے سلسلے میں مجھ سے کچھ پوچھنا ہے تمہیں؟"

"نہیں' میں جانتا ہوں کہ یہ روپ نگر کا علاقہ ہے۔ ادا فروش عورتوں کو پکڑنا میرا کام ہے.........."

"ایک منٹ راشد"۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں کچھ باتوں کی وضاحت ضروری ہے"۔

"میں سمجھا نہیں جناب.......... میرا مطلب ہے انکل! ہمارا کام کرپشن کو کچلنا ہے"۔

"کچلنا مناسب لفظ نہیں ہے بیٹے! محدود سے محدود تر کرنا کہو"۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا"۔ اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''اس فلسفے کی بنیاد اس حقیقت پر ہے بیٹے کہ ادا فروشی کا خاتمہ ناممکن ہے۔ ہم بازار
کرسکتے ہیں لیکن پھر یہ وبا شہر کے ہر حصے میں پھوٹ نکلے گی۔ ایسا پہلے بھی ہوچکا ہے۔ یہاں
لوگ اٹھائے جاتے ہیں تو وہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق شہر کی ہر بستی کو آباد کرلیتے ہیں۔ شرفا
بستیاں بھی ان کی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ پھوڑے کا آپریشن بہت نازک ہوتا ہے۔ پہلا کام ا
محدود سے محدود تر کرنا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم بازار پر پابندی نہیں لگاتے۔ البتہ انہیں
حد تک ضابطوں کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں۔ جب تک ضابطے کی خلاف ورزی نہ ہو' ہم ا
کے خلاف ایکشن نہیں لیتے......... میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟''

''کسی حد تک''۔ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''گویا ہم ا
عورتوں کے خلاف ایکشن لیتے ہیں جو کھلے عام دعوت گناہ دے رہی ہوں''۔

''زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن یہاں بھی ہم محدود سے محدود تر کرنے کے فارمولے
عمل کرتے ہیں''۔ میں نے جواب دیا۔ میں تمہیں ایک فہرست دوں گا۔ تم جب بھی ک
عورت کو گرفتار کرو' یہ چیک کرلینا کہ اس کا نام اس فہرست میں تو شامل نہیں ہے اگر ہو
اسے گرفتار نہ کرنا''۔

''آپ کا مطلب ہے' ہمارا محکمہ گناہ کرنے کے لئے لائسنس بھی جاری کرتا ہے؟'' ا
نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات نہیں۔ البتہ اب ہم نے ضابطوں کا احترام کرنے والوں کی فہرست بنائی ہے'
میں نے کہا' پھر میں نے اس سے وہ بات کہہ ڈالی' جو جلد یا بدیر کہنا تھی۔ میں نے زہر پر شکر
تہ چڑھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ''ایک تنظیم ہے' جو ایسی تمام عورتوں کو کنٹرول کرتی ہے
تنظیم ہمارے اس تعاون کو سراہتی بھی ہے۔ ہر مہینے پہلی تاریخ کو تمہیں اپنی دراز میں ایک لف
ملے گا''۔

اس کے چہرے پر تعجب اور برہمی کا ملا جلا تاثر نظر آیا۔ ''رشوت کی پیش کش اور ا
جلدی!'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''میں اس محکمے میں نیا سہی' لیکن اس شہر سے خوب وا
ہوں جناب۔ مجھے معلوم ہے کہ اس شہر پر ایک تنظیم کی حکمرانی ہے۔ وہ منشیات سے لے
ادا فروش عورتوں تک ہر چیز کو کنٹرول کرتی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی یہ بالاد
پولیس کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں لیکن جناب! مجھے معاف رکھیے۔ میں یہاں اپنی ر
فروخت کرنے نہیں آیا ہوں''۔

''یہ تو تمہارا خیال ہے راشد! میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ پولیس کے محکمے کا ا
شخص سسٹم کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ جو لوگ اس سلسلے میں کوشش کرتے ہیں' وہ ذلیل و خوار
کے محکمے سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تم سے اس طرح کھل کر با
کرسکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس سسٹم کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔ تم اس سلسلے میں کمشنر سے با
کر دیکھو۔ کارروائی میرے نہیں' تمہارے خلاف ہوگی۔ یہاں آوے کا آوا ہی خراب ہے

بہرحال تمہیں کرنا ہے' تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ شامل ہو جاؤ یا محکمہ چھوڑ دو''۔
اس نے شدت سے نفی میں سرہلایا۔ ''ایک تیسرا راستہ بھی ہے سر!'' اس نے سر کے
بالخصوص زور دیا۔ وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ مجھے کبھی انکل کہنا گوارا نہیں کرے گا۔
خاموش تماشائی کی حیثیت سے کام کروں گا۔ آپ نے درست کہا تھا کہ اصلاح کا عمل بے
ت اور بتدریج ہونا چاہیئے۔ سسٹم ضرور بدلے گا لیکن اس وقت جب اس محکمے میں میرے
الوں کی اکثریت ہوگی۔ میں یہ ملازمت چھوڑ کر اپنے کاز کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں
ی دی ہوئی فہرست کا خیال رکھوں گا لیکن میری دراز میں کوئی لفافہ نہ رکھا جائے۔ ورنہ
نظیمی نمائندوں کے سامنے اس لفافے کے سلسلے میں آپ سے استفسار کروں گا۔ میں آپ
ماتھ تعاون کروں گا لیکن یہ تعاون بلاقیمت ہوگا۔ شکریہ سر!'' اس نے کہا اور کیبن سے
یا۔ میں پرتشویش نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس کے بعد بھی ہر روز راشد سے میری ملاقات ہوتی رہی لیکن وہ مجھ سے کھنچ گیا تھا۔
ے درمیان صرف رسمی گفتگو ہوتی۔ تھانے کا اسٹاف اس کی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ اپنا کام
اسلوبی سے انجام دیتا اور ہر شخص سے اخلاق سے بات کرتا جبکہ پولیس کا محکمہ گالیاں دینے
لیاں کھانے کی تربیت گاہ کہلاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس کے وجود میں جہاد کی خواہش مچل
ہے لیکن سطح پر اس کے کوئی آثار نہیں تھے مگر پھر ایک رات اس نے دھماکہ کردیا۔

مجھے شروع ہی سے اندازہ تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ کرے گا۔ پہلے انٹرویو کے بعد اصولاً
پورٹ کردینا چاہیئے تھی کہ وہ اس محکمے کے لئے ناموزوں ہے لیکن وہ شاہدہ کا بیٹا تھا۔ اس
ادہ بھی ایک بات تھی۔ وہ مجھے میری یاد بھی تو دلاتا تھا۔ چھبیس سال پہلے والے ریاض کی'
رق صرف اتنا تھا کہ میری روح اور جذبہ انقلاب اتنا توانا نہیں تھا۔ ان دنوں میرے
نہ بھی ایسے ہی تھے لیکن پھر میں بک گیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں خود کو یاد کرتا تھا۔ اپنے فیصلے
ماتا تھا۔ ان دنوں میں تقریباً ہر روز دولت آباد جاکر اپنا نشان دیانت کچا مکان دیکھنے پر مجبور
ی ذہنی کیفیت ہی کی وجہ سے مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ میں اس کا ٹرانسفر نہ کرسکا' ورنہ
ہوا' وہ نہ ہوتا۔

وہ پیر کی رات تھی۔ راشد سے میری تفصیلی گفتگو کو ایک ماہ ہوچکا تھا۔ راشد کی رات
ٹی تھی۔ اس سے پہلے وہ صرف دن کی ڈیوٹی کرتا رہا تھا۔ رات کی ڈیوٹی کا نقصان یہ ہوا
ب اس نے وہ حماقت کی تو تھانے میں نہ میں موجود تھا اور نہ کوئی سینئر افسر۔ ہیڈ محرر بھی
ا تھا۔ نہ وہ راشد سے واقف تھا اور نہ ثریا سے۔ یہاں یہ بتا دوں کہ ثریا تنظیم کی روپ
لع کے باس جابر خان کی محبوبہ تھی۔ جابر خان اس کا دیوانہ تھا۔ جابر خان کی عمر بھی زیادہ
ر وجاہت کے اعتبار سے اسے مینڈک قرار دیا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیس سالہ ثریا
پوری طرح اس کے قابو میں نہیں رہی تھی۔ جابر خان اس پر نوازشات کی بارش کرتا تھا۔
کے باوجود ہر شخص جانتا تھا کہ ثریا کے کھیل کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہ بات جابر خان کے

علم میں بھی تھی لیکن وہ اسے نظرانداز کرنے پر مجبور تھا۔ کسی اور کی یہ مجال نہیں تھی کہ
ثریا کی بے وفائی کا افسانہ جابر خان کو سناتا۔

راشد بہت وجیہہ اور خوبرو تھا۔ اس رات ثریا سے اس کا ٹکراؤ ایک ریسٹورنٹ
ہوا۔ اور ثریا اسے دیکھتے ہی ریجھ گئی۔ راشد نے ثریا کی لگاوٹ کے جواب میں مثبت رد
ظاہر کیا اور کسی ترکیب سے سو کا دستخط شدہ نوٹ اس کے پرس میں ڈال دیا۔ پھر اس نے ثر
نام پوچھا' اور اسے میری دی ہوئی فہرست میں چیک کیا۔ ظاہر ہے' ثریا کا نام اس فہرست می
ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ادا فروش نہیں تھی۔ بہرحال راشد کو اس کا انداز بجا طور پر
فروشانہ لگا۔ فہرست کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے ثریا کا ہاتھ تھاما اور اسے گ
ہوا تھانے لے آیا۔ وہ گرفتاری ہر اعتبار سے مکمل' قانونی اور بے داغ تھی۔

ثریا نے بہت ہاتھ پیرے چلائے' غل غپاڑہ کیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر
خان کو فون پر مطلع کیا جائے۔ ہیڈ محرر نے اپنی فہرست چیک کی اور وہ بھی مطمئن ہوگیا۔ چ
اس نے پرچا کاٹا اور ثریا کو حوالات میں ڈال دیا۔ اگلی صبح اسے اس مجسٹریٹ کے سامنے پیش
گیا' جس کا دستخط کیا ہوا نوٹ ثریا کے پرس میں موجود تھا۔ اس نے ثریا کو پہچان لیا۔ اس کا
زرد پڑگیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جابر خان کو اطلاع دی گئی اور تھانے میں گویا حشر برپا ہو
مجسٹریٹ نے ثریا کو تھانے واپس بھیج دیا تھا۔

راشد کو اندازہ ہوگیا کہ اس کا کیریئر عملاً ختم ہونے والا ہے۔ چنانچہ وہ بالکل ہی بے
ہوگیا۔ جابر خان اپنے دو باڈی گارڈز اور وکیل کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا تو اس نے زبر
جابر خان کی تلاشی لی' اس کے پاس سے ایک ریوالور برآمد کیا اور غیرقانونی اسلحہ رکھنے کے ا
میں اسے بھی حوالات میں ڈال دیا۔ تھانے میں کئی رپورٹرز موجود تھے اس لئے ہیڈ محرر بھی
نہ کرسکا اور اس نے بلاچون و چرا پرچا کاٹ دیا۔

جابر خان نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں رپورٹرز م
ہیں۔ "تم جیسے حقیر لوگ مجھ پر ہاتھ ڈالیں گے؟" وہ راشد پر دہاڑا۔ "میں اس شہر کے ہر
والے کو خرید بھی سکتا ہوں اور فروخت بھی کرسکتا ہوں"۔ پھر وہ رپوٹرز کی طرف مڑا۔ "
رہو' میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں"۔

جابر خان نے جو کہا تھا' وہی کر دکھایا۔ ثریا نے بیان دیا کہ راشد خود ہی اس کے ا
آیا تھا اور اس نے کسی بہانے سے اس کا پرس بھی ٹٹولا تھا۔ جابر خان نے بھی اس بات
انکار کر دیا کہ تھانے میں اس کے پاس سے برآمد ہونے والا ریوالور اس کا ہے۔ اس نے
اس نے پہلے کبھی وہ ریوالور دیکھا ہی نہیں اور پھر باڈی گارڈز کے ہوتے ہوئے اسے ر
رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو لائسنس بنوانا کیا مشکل ہے۔ کیا وہ اتنا بے و
ہے کہ بغیر لائسنس کا ریوالور جیب میں ڈال کر تھانے ہی کا رخ کرے۔ ان دونوں نے را
یہ الزام بھی لگایا کہ اس نے ان سے رشوت طلب کی تھی اور ان کے انکار پر اس نے ا

ی کیس بنایا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راشد کو بیک بنی و دوگوش پولیس سے فارغ کر دیا گیا۔
ی تھا کہ اسے سزا بھی ہو جاتی لیکن حیرت انگیز طور پر جابر خان آڑے آیا۔ اس نے کہا کہ وہ
ی کو اس حد تک نہیں بڑھانا چاہتا۔ میری دانست میں راشد سستا چھوٹ گیا تھا۔

میرا خیال ہے' جو کچھ ہوا' راشد کے لئے بھی باعث اطمینان ہوگا۔ وہ اور کیا توقع کرسکتا
۔ اس نے ایک بہت بڑے آدمی کا تماشا بنایا تھا۔ اسے مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار کیا
۔ لوگ پیٹھ پیچھے اس پر ہنسنے لگے تھے۔ راشد نے ثریا کی بے وفائی کا پردہ ساری دنیا کے
نے چاک کیا تھا اور جابر خان کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ مجھے تو اس پر حیرت تھی کہ
نے راشد کو سزا سے کیوں بچایا۔ مجھے بہرحال راشد کے انجام پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔
۔ میں راشد کو اس کی جرآت پر سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ جو کچھ اس نے کیا' بڑے حوصلے کا کام
۔ اگر چھبیس سال پہلے میں بھی اس جیسا نہ رہا ہوتا تو یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آتی کہ وہ
ن سا جذبہ تھا' جس نے اسے اپنے کیریئر کو داؤ پر لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

جو کچھ ہوا' اس سلسلے میں' میں راشد کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا لیکن جب میں نے
شد کی لاش دیکھی تو صورت حال بالکل بدل گئی مجھے ایسا لگا جیسے میرے اکلوتے بیٹے کو قتل کر
گیا ہے۔ پہلے تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ پھر میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون جیسے لاوے میں
ل ہوگیا لیکن میں آپے سے باہر پھر بھی نہیں ہوا۔ حقیقت پسند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

غصے کی جو تند لہر میرے وجود میں دوڑ گئی تھی' اس نے مجھے خطرے کا احساس بھی دلا دیا
۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں جذبات سے بے قابو ہو کر کوئی احمقانہ قدم نہ اٹھا بیٹھوں چنانچہ دستور
ے مطابق میں نے اپنی کار نکالی اور دولت آباد کی طرف چل دیا لیکن اس بارہ بوسیدہ اور خستہ
ل مکان بھی میرے پچھتاوے کا مداوا نہ کرسکا۔ میں اپنے ساحلی بنگلے پر واپس آیا تھا تو خاصا
س تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی تھی' میں نے ہسپتال جا کر ایک بار پھر لاش کا
ئنہ کیا۔ اس بار میں بری طرح بھڑکا اور میرا حقیقت پسند ذہن بھی میرے جذبات کے سامنے
گیا۔ رات کے دو بجے میں نے جابر خان کو اس کے آرام دہ بستر سے نکالا اور ہسپتال لے
یا۔ جابر خان بے حد ناخوش تھا۔

جہاں تک تفتیش کا تعلق ہے' اس رسمی شناختی کارروائی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کجا
کہ جابر خان کو رات دو بجے سوتے سے اٹھانا۔ میں جانتا تھا کہ لاش کس کی ہے۔ عام حالات
یا تنظیم کے مقامی سربراہ کو اس شخص کی لاش کی شناخت کے لئے زحمت دینا' جسے اسی کے
م پر قتل کیا گیا ہو' ایک ناممکن کام تھا لیکن اس وقت میں بہت خراب موڈ میں تھا۔ شاید میں
بر خان کو چڑانا اور اسے غصہ دلانا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے ان حالات میں راشد بھی یہی قدم
تا۔ اس اعتبار سے میں راشد کی تقلید کر رہا تھا۔

جابر خان نے لاش کا جائزہ لیا۔ پھر میں اسے باہر کو ریڈور میں لے آیا۔ اس نے ایسی
نظروں سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ جن میں برہمی اور محتاط نگاہی کا امتزاج تھا۔ پھر وہ کچھ سوچتا رہا۔

"تمہیں علم ہے کہ اس عہدے پر تمہاری تقرری کی غیر سرکاری سفارش کس نے کی تھی؟" بالآخر وہ بولا۔
"مجھے علم نہیں تھا"۔ میں نے جواب دیا "لیکن مجھے اس پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی ہے"۔
"چلو' اب تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہے"۔ اس نے سخت لہجے میں کہا لیکن احتیاط کا عنصر اب بھی غالب تھا۔ "تم چکر کیا چلا رہے ہو۔ میں اس بے ہودگی کا مطلب نہیں سمجھا"۔
"میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ تمہارے آدمی نے کس خوب صورتی سے اپنا کام انجام دیا ہے"۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "چھ انچ قطر کا دائرہ پانچ گولیوں کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ میں نے سوچا' شاید یہ کارکردگی دیکھنے کے بعد تم اسے انعام دینا چاہو"۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ دھمکی آمیز انداز میں میری طرف بڑھا۔ وہ قوی الجثہ آدمی تھا لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں اس جیسے دو آدمیوں کو بیک وقت سنبھال سکتا تھا۔ یوں بھی میں محکمے میں ہتھ چھٹ مشہور تھا۔ غصے کے عالم میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
"یہ کیا بکواس ہے......... کیا چاہتے ہو تم؟" وہ غرایا۔
میرا لہجہ تو نہیں بدلا' البتہ چہرے کا تاثر یقیناً تبدیل ہو گیا ہوگا۔ "ذرا نرم لہجے میں خان!" میں نے کہا۔ "اور ذرا اپنے چہرے سے یہ خوفناک سا تاثر بھی اتار پھینکو......... ورنہ تم مجھے جانتے ہی ہو۔ ذرا سی دیر میں تم سامنے والی دیوار پر بکھرے ہوئے نظر آؤ گے"۔
وہ بری طرح ٹھٹکا......... ایک لمحہ وہ میرے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر گھبرائے ہوئے انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "کیا بات ہے ریاض! تم اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں ہو؟" اس بار اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔
"راشد عزیز' وہ یہاں میرا ماتحت تھا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ احمق تھا' بے وقوف تھا' کم از کم اس دنیا میں۔ اگر یہ دیانت کی دنیا ہوتی تو وہ یقیناً بہت بڑا آدمی ہوتا اور مجھے یقین ہے کہ ابدی زندگی میں اسے بڑا مقام ملے گا لیکن اس جرم کی اتنی سزا بہت تھی کہ وہ پولیس سے نکال دیا گیا' پیشانی پر رشوت ستانی کا ٹھپا لگا کر۔ یہ بہت کافی تھا اس کے لئے"۔
جابر خان مجھے گھورتا رہا۔ اب اس کی محتاط نگاہوں میں الجھن بھی تھی۔ "اس سے پہلے بھی دیانت دار لوگ قتل ہوتے رہے ہیں ریاض!" اس نے بے حد سادگی سے کہا۔ "لیکن تمہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوئی۔ اس لڑکے میں ایسی کون سی خاص بات تھی انسپکٹر؟"
میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ کیسے بتاتا کہ وہ میرا بیٹا تھا جو بددیانتی کی سزا کے طور پر مجھ سے چھین کر کسی اور کے خانۂ اولاد میں ڈال دیا گیا تھا۔ میں بتاتا بھی تو جابر خان یہ بات نہ سمجھتا' دولت کو سب کچھ سمجھنے والے لوگوں کے نزدیک تو کوئی بھی چیز جام سفال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ تو اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا' کے قائل ہوتے ہیں۔ اگر وہ

کچھ سمجھتا ہوتا' تب بھی میں اسے کچھ نہ بتاتا کہ یہ سب کچھ بے حد ذاتی تھا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ راشد کی لاش دیکھ کر پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ میرا پرآسائش بنگلہ کس قدر خالی اور ویران ہے۔ ہر خوشی کتنی کھوکھلی ہے اور وہ چھوٹا سا کرائے کا مکان کس قدر آباد پرآسائش ہوگا' جس میں شاہدہ' عزیز اور راشد بستے تھے۔ راشد کی لاش نے پہلی بار مجھے احساس دلایا تھا کہ میں نے کتنی خوب صورت جنت محض ایک غلط فیصلے کی وجہ سے گنوا دی تھی۔ میں نے جابر خان کو یہ سب نہیں بتایا۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا کہ میں شروع ہی سے راشد عزیز کو پسند کرنے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا آپ یاد آتا تھا' جب میں بیس سال کا پرجوش نوجوان تھا میں نے اسے بتایا۔ "بس ایک فرق تھا ہم میں۔ فیصلے کی گھڑی آئی تو اس نے مجھ سے مختلف فیصلہ کیا تھا"۔
جابر خان نے بہت برا منہ بنایا لیکن میرے تیور دیکھ کر فوراً ہی سنبھل گیا۔ "فیصلے تو تھے تو کمائی بھی مختلف ہوئی نا"۔ اس نے کہا۔ "تمہیں چھ سو گز کا بنگلہ ملا اور اسے قبر کے دو گز زمین لیکن میں اب بھی تمہارے اشتعال کا سبب نہیں سمجھ سکا۔ ہم پرانے دوست ریاض! لیکن میں دوستوں کو بھی حد سے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا"۔
"میں حد سے نہیں گزر رہا ہوں خان! اپنی اوقات پہچانتا ہوں میں"۔ میں نے نرم لہجے کہا۔ "مجھے یاد ہے' تم نے رپورٹرز کے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ تم اس شہر کے ہر پولیس لے کو خرید سکتے ہو اور فروخت کر سکتے ہو۔ میں بھی ایسا ہی ایک پولیس والا ہوں' جسے تم خرید ہو"۔
وہ الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھتا رہا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔
"اب کام کی بات ہو جائے"۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "ہمارا معاہدہ یہ ہے کہ ی معاملات میں ہونے والے قتل لاینحل رہیں گے لیکن قتل کی عام وارداتوں کی تفتیش میں طی سے کام لیا جائے گا۔ تاکہ محکمے کی افادیت برقرار رہے' یہی بات ہے نا؟"
"میرا خیال ہے' یہ باتیں ایسی نہیں جو سرعام کی جائیں"۔ اس نے احتجاج کیا۔
"لیکن میں کر رہا ہوں۔ میری بات کا جواب دو۔ مجھے ہر ماہ تنظیم کی طرف سے جو ی کی جاتی ہے' اس کا یہی مطلب ہے نا۔ میں تنظیم کے منشیات فروشوں پر' قاتلوں پر' ادا ؤں پر اور دلالوں پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالتا لیکن تنہا مچھلیاں ضرور پکڑتا ہوں تاکہ کارکردگی کا ف بھی متحرک رہے یہی بات ہے نا؟ اب اگر راشد کے قتل کا تنظیم سے تعلق نہیں ہے تو ق حاصل ہے کہ میں پوری سنجیدگی سے اس کیس کی تفتیش کروں۔ ٹھیک ہے نا؟"
"اگر تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا"۔
"تم مجھے بتاؤ کہ راشد عزیز کے قتل کا تنظیم کے معاملات سے تو کوئی تعلق نہیں ہے؟"
"مم......... مم......... میرا خیال ہے' یہ کیس حل ہوتا ہے یا نہیں' اس سے تنظیم کو دلچسپی نہیں ہوگی"۔ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

میں بڑی سفاکی سے مسکرایا۔ "کہو تو میں چیف سے اس بات کی تصدیق کرلوں"۔
"اس کی آنکھیں سکڑ سی گئیں۔ "اس بکواس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"میرا خیال ہے' راشد عزیز کا قتل ذاتی دشمنی کی بنا پر ہوا ہے۔ تم جانتے ہو کہ چیف غیر ضروری قتل کو کس قدر ناپسند کرتا ہے۔ تنظیم کا کوئی شخص ذاتی دشمنی کی بنا پر کسی کو قتل کرے تو معتوب ٹھہرتا ہے' اگر قتل کی اس واردات میں تنظیم کے افراد ملوث ہیں تو اس کا نتیجہ خراب نکلے گا' تمہیں معلوم ہے کہ کسی بھی شخص کو راستے سے ہٹانے کے سلسلے میں چیف کی اجازت ضروری ہے۔ اگر کل صبح تک چیف نے مجھے فون کرکے تفتیش سے ہاتھ اٹھانے کو نہیں کہا تو میں سمجھوں گا کہ اس واردات کا تنظیم سے کوئی باقاعدہ تعلق نہیں ہے۔ اس صورت میں تفتیش شروع کروں گا.......... اور یقین کرو' راشد عزیز کا قاتل پاتال میں بھی مجھ سے نہیں بچ سکے گا"۔

جابر خان کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی تھی اور اس کا سبب میری تفتیش کی دھمکی نہیں تھی بلکہ وہ چیف سے خوفزدہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ میرا اندازہ درست ہے۔ اب میں آزادانہ اس کیس کی تفتیش کرسکتا تھا۔ میں اس ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالنا چاہتا تھا' جو اب تک مجھے رشوت دیتا آیا تھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ اے ایس آئی کے قتل سے تنظیم کا تعلق ہے"۔ جابر خان نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ تنظیم کو اس کیس کے حل ہونے' نہ ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں رات ایک دعوت میں شریک تھا.........."

"ٹھیک ہے۔ اب مجھے کوئی پرواہ نہیں"۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں راشد عزیز کے قاتل کو نہیں بخشوں گا۔ ممکن ہے' پانچ گولیوں کا حساب بے باق کرنے کا موقع بھی مل ہی جائے"۔

O============☆============O

گناہ گاروں کی بھی درجہ بندی ہوتی ہے۔ کچھ شرمسار ہوتے ہیں۔ کچھ گناہ کرنے کے باوجود اپنا دفاع کرتے ہیں' پارسائی پر اصرار کرتے ہیں.......... اور کچھ احساس گناہ سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ راشی پولیس والوں میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں' جو رشوت لینے کے باوجود خود کو دیانت دار سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں' جو رشوت لیتے ہیں لیکن اندر سے واقعی دیانت دار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ رشوت دینے والے گروہوں سے خائف اور کھسیائے ہوئے رہتے ہیں۔ بدمعاش ایسے لوگوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ میرے نزدیک رشوت ایک طرح کا کاروباری معاہدہ ہے۔ میں خود کو کسی کا مقروض نہیں سمجھتا۔ اگر مجھے کچھ ملتا ہے تو میں اس کے عوض خدمات انجام دیتا ہوں۔ یعنی حساب برابر' یہی وجہ ہے کہ میں بدمعاشوں سے غیر ضروری نرمی نہیں برتتا۔ طبعاً غصہ ور بھی ہوں' اسی لئے بدمعاش مجھ سے محتاط رہتے ہیں۔ جابر

...ن کا بھی یہی حال ہے۔ میں منہ بگاڑ کر گفتگو کرنے پر جابر خان کا منہ توڑ بھی سکتا ہوں لیکن ...یم کے احکامات پر بڑی مستعدی سے عمل کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ...میری مجبوری ہے۔
...کہ راشد عزیز کے قتل کے بعد میرا غصہ بڑھ گیا۔ میں بات بے بات آپے سے باہر ہونے ...میرے ماتحتوں کی کم بختی ہی آگئی۔ مقررہ وقت تک چیف کا فون نہیں آیا تو مجھے اندازہ ...لیا کہ راشد عزیز کے قتل سے تنظیم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے تفتیش کا آغاز کر

سب سے پہلے میں نے جائے واردات کا معائنہ کیا۔ لاش ایک گلی میں پائی گئی تھی۔ ...ب ہی ایک ریسٹورنٹ تھا۔ ریسٹورنٹ میں آنے والے اپنی موٹرسائیکلیں اسی گلی ہی میں ...ڑی کرتے تھے۔ راشد کی موٹرسائیکل بھی وہاں موجود پائی گئی تھی۔
کیفے شہزاد ایک اچھا' معیاری لیکن عام سا ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں عموماً بہت زیادہ ہجوم رہتا ...ا۔ اس کی وجہ وہ دو حسین اور طرحدار ویٹریس تھیں جو وہاں سروکرتی تھیں۔ میں گلی کا معائنہ ...رنے کے بعد کیفے میں داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر ایک منحنی سا ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ اس نے بتایا ...کہ وہی اس کیفے کا مالک ہے۔ اس کا نام لقمان تھا۔ مجھ سے متعارف ہو کر وہ خاصا نروس نظر ...نے لگا۔ یہ بھی ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ پولیس کا سامنا کرنے سے معصوم لوگ گھبراتے ہیں ...بلکہ مجرموں پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔
میں نے لقمان سے راشد عزیز کے سلسلے میں استفسار کیا۔
"میں اس سلسلے میں زیادہ نہیں جانتا انسپکٹر!" اس نے کہا۔ رات گیارہ بجے کے قریب ...لاش میرے ایک گاہک نے دریافت کی تھی۔ وہ گلی میں کھڑی اپنی موٹرسائیکل کی طرف جا رہا تھا ...کہ اسے لاش نظر آئی۔ اس نے آکر مجھے بتایا اور میں نے تھانے فون کردیا.........."
"اس گاہک کا نام کیا ہے' جس نے لاش دریافت کی؟" میں نے پوچھا۔
"نصیر صاحب یہاں بہت زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی میں نے ...نہیں دیکھا تھا"۔

اس دوران ایک خوش لباس لڑکی ہماری طرف بڑھ آئی تھی۔ لقمان اس کی طرف متوجہ ہوگیا "شبانہ.......... تم نے نصیر صاحب کو دیکھا ہے؟" لڑکی نے مجھے بغور دیکھا۔ میں نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔ مجھے نصیر اور دوسرے گاہکوں سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ اگر یہاں وقت گزارتے تھے اور یہاں ہجوم رہتا تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ بہت حسین لڑکی تھی اور تیز و طرار بھی معلوم ہوتی تھی۔
"وہ ٹوائلٹ میں ہیں"۔ شبانہ نے جواب دیا اور ایک بار پھر نظریں اٹھا کر میرا جائزہ لیا۔ لقمان نے اس سے میرا تعارف کرایا تو وہ مؤدب نظر آنے لگی۔ پھر وہ مستانہ انداز میں چلتی ہوئی ریسٹورنٹ کے کچن کی طرف چلی گئی۔ لقمان عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "یہ لڑکی اس

بزنس میں بھی خود کو سنبھال کر رکھنا جانتی ہے"۔ اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد ٹوائلٹ سے ایک فارغ البال آدمی نمودار ہوا' جو اپنے لباس سے متمول نظر آ رہا تھا۔ "یہ نصیر صاحب ہیں"۔ لقمان نے مجھے بتایا۔

میں نے اشارے سے نصیر کو وہیں بلالیا۔ لقمان نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے اس سے سوالات کئے لیکن میری معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہوسکا۔ ریسٹورنٹ میں کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ عجیب بات تھی لیکن لقمان کی وضاحت کے بعد میری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ ریسٹورنٹ میں ایک جیوک باکس موجود تھا۔

"کل رات یہاں کچھ ایسے لوگ موجود تھے' جو کان پھاڑ موسیقی کے قائل معلوم ہوتے تھے"۔ لقمان نے مجھے بتایا۔ وقتاً فوقتاً وہ پوری آواز کھول دیتے تھے۔ مجھے بار بار جاکر آواز کم کرنا پڑتی تھی۔ کچھ دیر بعد تنگ آکر میں نے جیوک باکس کو بند کر دیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ جس وقت گولیاں چلائی گئی ہوں گی' اس وقت جیوک باکس پوری آواز میں چیخ رہا ہوگا"۔

"میرے نزدیک یہ بات بھی منظم واردات کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ وہ یقیناً تنظیم کے بدمعاش ہوں گے' جو جیوک باکس کی آواز بار بار بڑھا رہے تھے......... اور ان کا مقصد یہی ہوگا کہ فائرنگ کی آواز اس شور میں دب جائے۔

"وہ لوگ جانے پہچانے تھے۔ میرا مطلب ہے' ایسے لوگ تھے' جو یہاں آتے رہتے ہوں؟" میں نے لقمان سے پوچھا۔

"آپ کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے' جو موسیقی کی آواز بڑھا رہے تھے؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔

"جی نہیں' ان میں کوئی بھی میرے لئے جانا پہچانا نہیں تھا"۔ اس نے جواب دیا۔

"تم مقتول راشد عزیز کو جانتے ہو؟"

"چند ایک بار وہ یہاں آیا ضرور تھا لیکن مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا"۔

اس دوران شبانہ ایک میز پر سرو کرنے کے بعد ہمارے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے' اس کا نام راشد تھا۔ اس کے ساتھ جو خوب صورت لڑکی تھی' اس کے منہ سے میں نے اس کا نام سنا تھا"۔

"خوب صورت لڑکی! تو کیا وہ اکیلا نہیں تھا؟"

"واہ......... کیا خوب صورت لڑکی تھی"۔ نصیر نے چٹخارا لے کر کہا۔

"اگر گھٹیا پن کا شمار خوبصورتی میں ہوتا ہے تو وہ واقعی خوبصورت تھی"۔ شبانہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟" میں نے شبانہ سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا......... اور پھر کسی سوچ میں پڑگئی......... جیسے ذہن پر زور ڈال رہی ہو۔ "مجھے یاد آتا ہے' اس نوجوان نے اسے ثریا کے نام سے پکارا تھا"۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

"میں حیران رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ثریا' راشد کے ساتھ ہو۔ راشد وہ شخص تھا' جس نے اسے اس حد تک ذلیل کیا تھا کہ اسے ایک رات حوالات میں گزارنا پڑی تھی۔ وہ راشد کی قربت کیسے گوارا کرسکتی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ لڑکیوں کے بارے میں کبھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا......... خصوصاً ثریا کے متعلق "وہ انتہائی بگڑی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ مسترد کئے جانے کی عادی نہیں تھی۔ ویسے بھی لڑکیاں بے حد انا پرست ہوتی ہیں۔ ممکن ہے' ثریا نے راشد کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہو۔

اس دوران شبانہ اور نصیر کے درمیان ثریا کے سلسلے میں نوک جھونک ہوتی رہی تھی۔ نصیر اس کے حسن کے قصیدے سے پڑھ رہا تھا......... جبکہ شبانہ اس کے گھٹیا پن پر زور دے رہی تھی۔ اس سے یہ فائدہ بہرحال ہوا کہ لڑکی کا حلیہ سن کر مجھے حتمی طور پر علم ہوگیا کہ وہ ثریا ہی تھی۔

"تم نے ان کی گفتگو بھی سنی تھی؟" میں نے شبانہ سے پوچھا اس نے نفی میں سرہلایا۔ "لیکن انداز سے پتا چلتا تھا کہ رومانوی گفتگو ہو رہی ہے"۔ اس نے کہا۔ "اگرچہ میرا اندازہ ہے کہ رومانوی گفتگو یک طرفہ تھی۔ لڑکی کے انداز میں وارفتگی اور والہانہ پن تھا لیکن وہ نوجوان بے وقوف نہیں تھا۔ وہ تمام وقت لڑکی کو تمسخرانہ اور تضحیک آمیز نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔ میرا خیال ہے' وہ جانتا تھا کہ لڑکی اچھی نہیں ہے........."

"یہ زیادتی ہے شبانہ!" نصیر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے تو وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی"۔

کوئی اور وقت ہوتا تو میں نصیر کو اس مداخلت پر ڈانٹ دیتا لیکن یہاں سے مجھے جو معلومات بھی حاصل ہو رہی تھیں' وہ بالواسطہ گفتگو ہی کی مہربانی تھی۔

"آپ کا کیا ہے۔ آپ کو تو ہر وہ مخلوق اچھی لگے گی جو نسوانی لباس میں ہو......... خواہ لڑکی نہ ہو"۔ شبانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور نصیر کھسیا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد میں ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔

O ============ ☆ ============ O

ثریا بہت شاندار اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ دروازہ خود اس نے ہی کھولا تھا۔ میری نظریں چکاچوند ہو کر رہ گئیں۔ وہ بے لباس تو نہیں تھی لیکن لباس اس کے جسم پر منڈھا ہوا تھا۔ بند گلے کی سرخ جرسی اور نیلی جینز پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بال بہت گھنے اور لمبے تھے......... نہ جانے کیوں' اس قدر موڈرن ہونے کے باوجود اس نے عام لڑکیوں کی طرح بال نہیں کٹوائے تھے۔ اس وقت وہ جس لباس میں تھی' اس کے ساتھ لمبے بال کچھ اچھے نہیں لگتے لیکن یہ مسئلہ اس نے اپنے ہیئر اسٹائل کی مدد سے حل کرلیا تھا۔ وہ اپنے بال سمیٹ کر بائیں کان کے نیچے گردن تک لائی تھی اور وہاں سے انہیں موڑ کر اپنے سر کے عقبی حصے پر لپیٹتی

ہوئی دوسری طرف لے گئی تھی .... بے شمار کلپس کی مدد سے اس کے بال برکے پچھ
حصے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ کوئی خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ اس کے نقوش موٹے
لیکن آنکھیں خوب صورت تھی۔ البتہ اس کا اصل حسن اس کے جسمانی نقوش میں تھا۔

"اوہ............ انسپکٹر ریاض!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو ہمارا خیال کیسے
آگیا؟"

"کچھ مصروف ہو؟"

"نہیں تو............ آیئے' تشریف لایئے............ آپ کی آمد تو ہمارے لئے عزت افزائی
باعث ہے"۔ اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا لیکن اس نے میرے لئے زیادہ جگہ نہیں بنائی
تھی۔ میں اندر داخل ہو تو گیا لیکن اس سے مس ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ تیز خوشبو میرے
دماغ میں اترتی چلی گئی۔

"تشریف رکھئے"۔ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا' اور وہ بھی میرے
برابر ہی بیٹھ گئی۔

"میں عرصے سے تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی انسپکٹر کہ کبھی میں تمہیں نظر بھی
آؤں گی یا نہیں"۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

میں نے سر جھٹکا اور اپنی بھٹکتی' بہکتی نگاہوں کو سنبھالا۔ اس کا انداز میرے لئے او
زیادہ ہوش ربا تھا۔ "میں تمہارے پاس کام سے آیا ہوں۔ جا کر لباس تبدیل کر لو تاکہ مجھے یا
آسکے کہ کام کی نوعیت کیا ہے"۔

"کیا تمہاری یاداشت متاثر ہو رہی ہے؟" اس نے اٹھلا کر کہا اور دانستہ میری طرف
جھک آئی۔ اس کے وجود سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "ہاں .... کچھ کچھ یاد
رہا ہے"۔ میں نے کہا۔ "میں راشد عزیز کے قتل کے سلسلے میں آیا ہوں"۔

"میں نے سنا تھا"۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے............ دا
افسوس............"

"کیوں؟ میرا خیال ہے تم اسے پسند نہیں کرتی تھیں"۔

اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرت جھلکی ۔ "صرف اس لئے کہ اس نے میرے ساتھ
زیادتی کی تھی"۔ اس نے بتایا۔ "اس وقت تو واقعی مجھے بہت زیادہ غصہ آیا تھا لیکن جب م
اسے سمجھنے کے قابل ہوئی تو میری برہمی دور ہو گئی"۔

"اوہ............ اور تم اسے کسی حد تک سمجھنے میں کامیاب ہوئیں؟"

"کمال ہے انسپکٹر............ یہ تو عجیب سوال کیا تم نے"۔

"دیکھو ثریا! مجھ سے آڑنے کی کوشش مت کرو"۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے
معلوم ہے کہ تم راشد کے ساتھ باہر گھومتی رہی ہو۔ تم کم از کم دو بار اس کے ساتھ کیفے شہزا

ہی گئی تھیں اور یہی وہ جلہ ہے جہاں اسے قتل کیا گیا"۔

"کون کہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ وہاں گئی ہوں؟"

"میں کہتا ہوں............ اور اس سلسلے میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں............ مجھ سے
سیدھی سیدھی بات کرو"۔

چند لمحوں تک وہ مجھے بغور دیکھتی رہی۔ وہ فکر مند نظر آ رہی تھی۔ پھر شاید وہ کسی نتیجے
پر پہنچ گئی۔ "یہ درست ہے کہ میں راشد سے ملتی رہتی تھی لیکن انسپکٹر! پلیز............ یہ بات جابر
خان کو نہ بتانا"۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر ان ملاقاتوں کا قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے تو نہیں بتاؤں
گا"۔

"میری ملاقاتوں کا اس کے قتل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا............ ممکن ہے' کچھ تعلق ہو' بہرحال' تم کوئی فکر نہ کرو۔ تم
مجھ سے کھل کر بات کر سکتی ہو"۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولی "میری اور اس کی ملاقاتوں کا سلسلہ اس
کے پولیس سے نکالے جانے سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ راشد نے
مجھ پر جو الزام لگایا تھا' وہ واپس لے لیا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے معذرت بھی کی کہ اس کی وجہ
سے مجھے پریشانی ہوئی۔ اس نے وضاحت کی کہ وہ زیادتی اس نے مجھے نہیں بلکہ جابر خان کو
اذیت پہنچانے کے لئے کی تھی۔ اس وقت تک میرا غصہ یوں بھی دھیما پڑ چکا تھا۔ اس پر اس کا
معذرت کا انداز............ انسپکٹر! وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ کوئی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ
سکتا تھا۔ اس کے بعد ہم کبھی کبھی ملنے لگے"۔

وہ خاموش ہو گئی چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا "اس کے بعد؟"

"کچھ بھی نہیں............ ہم تین چار بار کیفے شہزاد میں گئے"۔

"کل رات جب اسے قتل کیا گیا' تم اس کے ساتھ تھیں"۔ میں نے اندھیرے میں تیر
چلایا۔

اس کی نگاہوں سے خوف جھلکنے لگا۔ "یہ سچ نہیں ہے"۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں
سرگوشی کی۔

"میرے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ تم اس گلی میں اس کے ساتھ دیکھی گئی ہو'
جہاں اس کی لاش ملی تھی"۔

اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ "ممکن ہے' وہ
کوئی اور لڑکی ہو"۔ اس نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"یہ ڈبل رول کا چکر فلموں ہی میں چل سکتا ہے"۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یوں تو
تم اس بات سے بھی انکار کر سکتی ہو کہ تم ثریا ہو"۔

"نظریں دھوکا بھی کھاسکتی ہیں"۔

"نہیں ثریا.......... وہ تم ہی تھیں"۔ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا"۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تم سے وعدہ کرچکا ہوں کہ جابر خان کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں تو صرف راشد کے قاتل کو گرفتار کرنا چاہتا ہوں.......... مجھے بتاؤ.......... راشد کو کس نے قتل کیا ہے"۔

اس بار اس کا خوف انتہا کو پہنچ گیا۔ "میں کچھ نہیں جانتی"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ اور پھر گلی تاریک تھی۔ وہ ہیولا اچانک ہی نمودار ہوا۔ پھر ریوالور سے شعلے نکلتے دکھائی دیئے اور راشد گرگیا' میں بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئی۔ ریسٹورنٹ میں بجنے والے جیوک باکس کے شور میں فائرنگ کی آواز دب گئی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ قاتل کب اور کہاں غائب ہوگیا۔ میں اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکی تھی۔ شروع میں تو کچھ دیر میں مفلوج سی رہی پھر میں نے جھک کر راشد کو دیکھا۔ وہ مرچکا تھا۔ میں ڈر گئی.......... میں نہیں چاہتی تھی کہ جابر خان کو میری اور راشد کی ملاقاتوں کا علم ہو۔ چنانچہ میں بھاگ کھڑی ہوئی.........."

"تم کچھ چھپا رہی ہو"۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"نہیں' میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں راشد کی موٹرسائیکل سے اتری۔ ہم دونوں ریسٹورنٹ کی طرف چلے ہی تھی کہ وہ موٹرسائیکل گلی میں داخل ہوئی۔ وہ شخص سیاہ جیکٹ اور سیاہ پتلون میں ملبوس تھا۔ اس نے کرش ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ وہ فل ہیلمٹ تھا۔ اس کا چہرہ پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے موٹرسائیکل روکی اور جیکٹ کی جیب سے ریوالور نکال کر فائرنگ شروع کر دی۔ میں اتنی خوفزدہ ہوگئی تھی کہ مجھے اس کی واپسی کا بھی پتا نہیں چلا"۔

"موٹرسائیکل کا نمبر.........."

"موٹرسائیکل پر نمبرپلیٹ نہیں تھی"۔

"اور ہیڈ لائٹ؟"

"ہاں.......... یہ حیرت انگیز بات ہے کہ موٹرسائیکل کی ہیڈ لائٹ روشن تھی"۔

"شاید اس لئے کہ قاتل اپنے شکار کو بہ آسانی دیکھ سکے"۔

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو' بہرحال' اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتاسکتی.......... مجھے راشد کی موت کا دکھ ہے"۔

"تمہیں یقین ہے کہ تمہاری اور راشد کی ملاقاتیں جابر خان کے علم میں نہیں تھیں؟"

اس کی آنکھیں فرط خوف سے پھیل گئیں۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا انسپکٹر.........." اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ جابر خان نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جابر خان نہیں تھا"۔

"جابر خان صفائی کے کام خود نہیں کرتا.......... ایسے کاموں کے لئے اس کے پاس بے شمار گرگے موجود ہیں۔ وہ تو صرف اشارہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کل رات بھی جو کچھ ہوا'

کے اشارے پر ہوا ہے۔ راشد کو مخصوص انداز میں قتل کیا گیا تھا"۔

کہتے کہتے میرا ذہن کچھ اور کھل گیا۔ یقیناً یہ جابر خان ہی کا کام تھا۔ راشد نے اسے ...نے سامنے ذلیل کیا تھا.......... اس کی محبوبہ کی بے وفائی کا پردہ چاک کیا تھا اور ایسے ...وں اپنی محبوبہ کی بے وفائی تو گوارا کرسکتے ہیں لیکن اس کا منظر عام پر آنا انہیں گوارا نہیں ...لہ اس سے ان کی مردانگی پر حرف آتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ جابر خان حد درجہ منتقم مزاج ... پھر اسے ثریا اور راشد کی خفیہ ملاقاتوں کا علم ہوا ہوگا تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہوگیا ... اس نے راشد کے قتل کا حکم صادر کر دیا ہوگا۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی تھی ...قتل کے وقت ثریا' راشد کے ساتھ تھی.......... اور قتل اس مقام پر ہوا تھا' جہاں راشد اور ...اکثر ملتے رہتے تھے۔

میں ثریا کو گھورتا رہا' پھر بولا۔ "تم تنظیم کے متعلق کیا جانتی ہو؟"

"تنظیم میری بہن کی سسرال ہے.......... میری بڑی بہن بگ چیف کی بیوی ہے"۔

"بگ چیف کی؟"

"ہاں.......... میری بہن اور بگ چیف مجھے پسند نہیں کرتے.......... بلکہ مجھ سے نالاں ...۔ اس کے باوجود رشتوں کی اہمیت تو ختم نہیں ہوتی۔ بہنوئی تو ہر حال میں بہنوئی ہی رہے گا ...اسے میری حرکتیں پسند ہوں یا نہ ہوں"۔

"کوئی پروا نہ کرو"۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اس کے بالوں کی طرف اشارہ ...۔ "میں تمہیں پسند کرتا ہوں"۔

"یہ ہیئر اسٹائل اچھا ہے نا؟" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "مغربی لباس کے ساتھ میں یہی اسٹائل اپناتی ہوں"۔

"ضرور اپناؤ.......... لیکن یہ یاد رکھو کہ ہیئر اسٹائل کے لئے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ...ا سر تمہارے کندھوں پر موجود رہے"۔

O============☆============O

اب میں پوری طرح مطمئن اور پریقین تھا کہ راشد کا قتل جابر خان کے ایما پر ہوا ہے۔ ...مجھے قاتل کو تلاش کرنا تھا۔ بلکہ وہ شخص جس نے راشد کو قتل کیا تھا میرے نزدیک جابر ...کے ریوالور کی حیثیت رکھتا تھا اور مجھے اس کی گردن ناپنا تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس سلسلے ...کیا قدم اٹھاؤں۔ جابر خان کی بے خبری بہت ضروری تھی۔ اگر اسے میرے ارادے کی بھنک ...ل جاتی تو وہ اپنے اس آلہ کار کو شہر سے باہر بھجوا دیتا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے بہت تیزی سے ...ت کرنا ہوگی"۔

مجھے جابر خان سے کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ کمشنر کو فون کر کے میری راہ میں روڑے اٹکا ...تھا۔ بلکہ وہ مجھے معطل بھی کراسکتا تھا۔ لیکن اگر راشد کا قتل اس کے ایما پر ہوا تھا تو وہ ایسا ...ا قدم نہیں اٹھاسکتا تھا' جس کی وجہ سے بگ چیف تک یہ اطلاع پہنچتی کہ اس نے ذاتی

دشمنی کی بناء پر کسی کو نہ صرف قتل کروایا ہے بلکہ اب ان کے قتل کے سلسلے میں تنظیم کا اثر ورسوخ بھی استعمال کر رہا ہے۔ بگ چیف کے لئے تو یہی بہت کافی تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر تنظیمی وسائل کو ایک غیر متعلق شخص کے قتل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات اس تک پہنچ جاتی تو دنیا کا کوئی بھی شخص جابر خان کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا اور جابر خان مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم میں اس بات سے ضرور خوفزدہ تھا کہ اگر راشد کے قاتل کی گرفتاری سے پہلے اسے میری سرگرمیوں کا علم ہو گیا' تو وہ قاتل کو شہر سے نکلوا دے گا........ اور پھر میں عمر بھر اسے نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔ اسی ایک نکتے کے پیش نظر مجھے جو کچھ کرنا تھا بہت تیزی سے کرنا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں کام شروع کیا اور چند ایسے افراد سے گفتگو کی' جن کے مجرموں سے روابط تھے اور جو ایسے حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ وہ لوگ ماضی میں کئی بار میرے کام آچکے تھے لیکن اس بار وہ میری کوئی مدد نہ کر سکے۔ یہ بات نہیں کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہوں۔ ان کے چہروں پر .... ان کی آنکھوں میں سچ تحریر تھا۔ ان کا رد عمل الجھن کا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ راشد کے قتل کے سلسلے میں پوری طرح بے خبر تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ راشد کے قتل کے لئے جابر خان نے تنظیم کے کسی آدمی کو استعمال نہیں کیا تھا۔ اس مرحلے پر مجھے اپنی تفتیش کا انداز تبدیل کرنا پڑا۔ یہ کیس کسی بھی اعتبار سے معمول کے مطابق تھا ہی نہیں۔

عموماً میں تفتیش کا آغاز چھوٹے موٹے لفنگوں سے کرتا ہوں جن کے لئے زبان کھولنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں بتدریج آگے بڑھتا جاتا ہوں' اور معلومات کا حصول میرے لئے دشوار سے دشوار ہوتا جاتا ہے۔ لیکن یہاں میرے پاس وقت کی کمی تھی۔ مہلت زیادہ نہیں تھی۔ چنانچہ میں اسی ایک گفتگو کے بعد کئی سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ میں نے اس شخص پر ہاتھ ڈالا' جو جابر خان کا دستِ راست تھا' راحیل........ عام حالات میں ہر جگہ سے ناکامی کے بعد میں اس کی طرف رخ کرتا........ اور اس سے پہلے کم از کم دو بار سوچتا لیکن راشد اور شاہدہ کے چہرے میری نگاہوں میں پھر رہے تھے........ اور میرے وجود میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار رگوں میں دوڑنے والے خون نے مجھے قاتل کی طلب پر اس بری طرح اکسایا تھا کہ میرے لئے سوچنا سمجھنا دوبھر ہو گیا تھا۔ میں راشد کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لینے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

راحیل اپنے گھر پر تنہا ملا۔ جثے اور قد کاٹھ کے سلسلے میں وہ میرا ہم پلہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چوکنا نظر آنے لگا۔ تاہم اس نے بڑے احترام سے مجھے اپنے گھر میں بلا کر بٹھایا۔ وہ اور اس جیسے تمام بدمعاش میرے سامنے بہت محتاط ہو جاتے تھے' کیونکہ میں صرف تنظیم کے حوالے ہی کسی سے دبتا تھا اور تنظیم کا حوالہ ایسا حوالہ تھا' جو بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ راحیل خاموشی سے میرے کچھ کہنے کا منتظر رہا۔

"میں مختصر اور سیدھی سیدھی بات کروں گا' راحیل"۔ میں نے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ں کہ راشد عزیز کو کس نے قتل کیا ہے اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ جتنی جلدی یہ بات اگل ے' اتنا ہی فائدے میں رہو گے۔ تم جانتے ہو کہ میں تیزی سے کام کرنے کا قائل ہوں"۔

اس کی نگاہوں سے الجھن جھانکنے لگی۔ "تب تو تم غلط جگہ آ گئے ہو انسپکٹر"۔ اس نے ا۔ "مجھے راشد عزیز کے سفاکانہ قتل کے سلسلے میں وہی کچھ معلوم ہے' جو اخبار میں چھپا ۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا"۔

"پانچ گولیوں کی مدد سے بنایا گیا چھ انچ قطر کا دائرہ"۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ کسی ور قاتل کا کام ہے راحیل۔ عام لوگ قتل کرتے وقت اپنا ٹریڈ مارک نہیں چھوڑتے اور اس تے میں کوئی پیشہ ور قاتل تنظیم کی اجازت کے بغیر حرکت میں نہیں آتا۔ سمجھ رہے ہونا' ی بات؟ اس قتل کے سلسلے میں اوپر سے احکامات بھی نہیں آئے ہیں' اس کا مطلب ہے کہ تو پیشہ ور قاتل کا ہے لیکن معاملہ نجی ہے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ ف دو آدمیوں کے درمیان ہے۔ ایک وہ جس نے قتل کا حکم دیا۔ دوسرا وہ جس نے راشد کو نہ بنایا۔ تم جابر خان کے دست راست ہو۔ اس لئے اس بات کا امکان بھی ہے کہ قتل کا حکم خان نے براہ راست نہیں دیا ہو گا بلکہ تم نے اس کی زبان کی حیثیت سے کام کیا ہو گا۔ ب یہی ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو"۔

اس کے چہرے پر موجود الجھن کا تاثر استعجاب میں تبدیل ہو گیا۔ "اگر جابر خان اس لے میں ملوث ہوتا تو کیا تمہارا خیال ہے' میں زبان کھول دیتا۔ اس صورت میں تو میں تم سے ات بھی نہ کرتا انسپکٹر۔ تم جانتے ہو کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں"۔

"میں تو صرف راشد کے قاتل کا نام جاننا چاہتا ہوں۔ اپنے لئے مشکلات نہ کھڑی کرو یل........ اگر تم آسانی سے نہیں اگلو گے تو میں اگلوانے پر مجبور ہو جاؤں گا"۔

اس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے گھورا۔ "تم اپنے قد سے بڑی بات کر رہے ہو ٹلے۔ میں ک پر خواتین کے پرس چھین کر بھاگنے والا لفنگا نہیں ہوں جسے تم ذرا دھمکا کر اپنی مرضی کا الے سکو۔ اگلوانے کی کوشش کر دیکھو۔ تمہاری سمجھ میں یہاں کے ہسپتالوں کا نظام آ جائے قسمت آزمائی کرو"۔

چنانچہ میں نے قسمت آزمائی کی۔ اس پر باقاعدہ کام کرنے سے پہلے کچھ ابتدائی مرحلوں گزرنا پڑا۔ اس نے ریوالور نکالا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے اسے ریوالور سے محروم کرنا پڑا۔ اس نے چاقو نکالا۔ میں نے اس کی کلائی مروڑی اور اس وقت تک مروڑتا رہا' جب تک چاقو ے نہ نکل گیا۔ وہ میرے لئے اتنا دشوار ثابت نہیں ہوا' جتنی میں توقع کر رہا تھا۔ مقابلے کچھ نہ کرنے کے گھن نے اس کی قوت کو چاٹ لیا تھا۔ پیٹ پر پڑنے والے ایک ہی گھونسے اس کی ساری ہوا نکال دی........ دوسرے گھونسے کے بعد وہ قالین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اس باوجود وہ اٹھا لیکن اس کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ میں نے جی بھر کر اس کی مرمت

کی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ سے رحم کی التجائیں کرنے لگا۔

"میں زیادہ دیر انتظار نہیں کروں گا"۔ میں نے اسے تنبیہہ کی۔ "تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینا ہیں۔ اگر شرافت سے زبان نہیں کھولو گے تو اب میں تمہارے چہرے کو نشانہ بناؤں گا۔ تم انداز بھی نہیں کرسکتے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں"۔

"نہیں.......... خدا کے لئے ریاض، مجھے کچھ معلوم نہیں"۔ وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے گڑگڑایا۔ یقین.......... کرو۔ "میں کچھ نہیں جانتا"۔

"یہ تو تمہارے حق میں بہت برا ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے"۔ میں نے کہا اور اس کے جبڑے پر زور دار گھونسا رسید کردیا۔

لیکن پانچ منٹ بعد مجھے ہاتھ روکنا پڑا۔ اس کے چہرے کا حلیہ بگڑ چکا تھا اور اسے مزید نہیں مارا جاسکتا تھا۔ اس کی ناک سوج کر کپا ہوچکی تھی۔ دونوں آنکھیں سوجن کی وجہ سے تقریباً بند ہوچکی تھیں۔ کئی دانت ہل چکے تھے اور وہ مسلسل خون تھوک رہا تھا۔ اب اس میں مدافعت کی تاب بھی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی حقیر کیچوے کی طرح فرش پر بے بس پڑا تھا۔

"اب بھی تمہیں راشد کے قاتل کا نام یاد نہیں آیا؟" میں نے غرا کر کہا۔

اس نے بڑی شدت سے نفی میں سرہلایا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ اتنی مرمت کے باوجود زبان بند رکھنے پر جابر خان تمہیں یقیناً انعام سے نوازے گا۔ کہو تو ڈاکٹر کو بھجوا دوں؟"

اس نے پھر نفی میں سرہلا دیا۔

میں اسے اسی حال میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

○==========☆==========○

پولیس اسٹیشن واپس آتے ہوئے میں صورت حال کا تجزیہ کرتا رہا۔ میں نے اپنے محرکات کا تجزیہ کیا.......... اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے اس تفتیش کے ذریعے خود کو انتہائی نازک صورت حال سے دوچار کرلیا ہے۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میرا رویہ احمق آئیڈیلسٹ نوجوان کا سا ہے۔ میں بھی وہی کچھ کر رہا تھا، جو راشد نے کیا تھا اور راشد کا انجام میرے سامنے تھا۔ اسی انداز میں مزید آگے بڑھنے کا مطلب مکمل تباہی تھا۔ اس وقت تک میں بدمعاشوں کے دو بارسوخ سرغناؤں کی بلیک لسٹ میں آچکا تھا۔ راشد زندہ ہوتا تو لفظ بلیک لسٹ پر اعتراض کرتا اور اسے وہائٹ لسٹ قرار دیتا۔ بہرحال، ایک بات میرے حق میں تھی۔ میں تنظیم کے لئے اب بھی ایک اہم آدمی تھا۔ جابر خان اور راحیل کی مجھ سے دشمنی اپنی جگہ لیکن جب تک میں تنظیم کے ساتھ تعاون کر رہا تھا، وہ میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن یہ بات بھی طے تھی کہ میں نے جب بھی انہیں موقع دیا، وہ مجھ پر وار کرنے سے نہیں چوکیں گے۔

ایک بات اور بھی تھی، جابر خان اب تک میری سرگرمیوں سے بے خبر تھا لیکن اب راحیل کے ذریعے اسے یقینی طور پر پتا چل جائے گا کہ میں راشد کے قاتل کو کس شدو مد سے

ئی کر رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب میں قاتل کو کبھی تلاش نہیں کرسکوں گا۔ مجھے
ازہ ہوگیا کہ میری تفتیش کی گاڑی ٹھپ ہوچکی ہے.......... اور اب مزید آگے نہیں بڑھے
۔ ایسے میں عزت اسی میں تھی کہ میں مزید پیش قدمی نہ کروں۔

تھانے پہنچ کر میں نے اب تک کی تمام معلومات کیس فائل میں درج کیں لیکن ان سے
ئی بات نہیں بنتی تھی۔ اس فائل میں ایک کمی تھی۔ بہت بڑی کمی.......... اور وہ کمی صرف
صورت میں پوری ہوسکتی تھی کہ قاتل خود تھانے آکر اعتراف جرم کرلے۔

اگلی صبح جابر خان مجھ سے ملنے کے لئے تھانے آیا۔ اس نے اپنے دونوں باڈی گارڈز کو
وازے پر چھوڑا اور میرے دفتر چلا آیا۔ وہ دروازے پر کھڑا چند لمحے مجھے بغور دیکھتا رہا۔ اس
لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ پھر وہ آگے بڑھ آیا۔ میں نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف
ارہ کیا اور بیٹھنے کے بعد سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نفی میں سرہلا دیا۔
کی نگاہیں اب بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے کچھ
لنے کا انتظار کرتا رہا۔

"ریاض! تم نے میرے دوست کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ میرے لئے بے حد
لیف دہ ہے"۔ بالآخر اس نے کہا۔

"تم نے میرے دوست راشد عزیز کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ میرے لئے اس سے بھی
یادہ اذیت ناک تھا"۔

وہ آنکھیں سکوڑ کر بولا۔ "میری یہاں آمد کا سبب یہی مسئلہ ہے۔ اوپر سے حکم آگیا ہے
۔ تم اس کیس سے ہاتھ اٹھالو"۔

"تم اس طرح خود کو دلدل میں پھنسا لوگے۔ بہتر ہوگا کہ اپنے اختیارات سے تجاوز نہ
رو"۔

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "تم جانتے ہو کہ میں ذاتی معاملات میں تنظیم کا نام استعمال
رنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ انسپکٹر ریاض.......... میں تم سے اس کیس سے ہاتھ اٹھانے
نہیں کہہ رہا ہوں.......... یہ چیف کا حکم ہے"۔

میں بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ "اچانک یہ تبدیلی کیوں؟ کل تو تم نے مجھ سے کہا تھا
تنظیم کو اس کیس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حل ہو یا نہ ہو اور آج تم مجھے تفتیش سے
رکنے کے لئے آئے ہو"۔

"کل صبح تک مجھے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں ملی تھی"۔

"اور اب تمہیں کس سے ہدایت مل گئی؟"

"مجھے کون ہدایت دے سکتا ہے؟" وہ برا مان گیا۔

"تمہارا مطلب ہے، بگ چیف نے اس سلسلے میں تمہیں فون کیا ہے؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا۔ ہاں.......... ابھی ایک گھنٹہ پہلے کال آئی تھی"۔

"لعنت ہے۔ یہ تماشا میری سمجھ سے باہر ہے"۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بگ چیف ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں کب سے دخل دینے لگا.......... یہ ہو کیا رہا ہے؟"

اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں چیف سے اس کی وجہ تو نہیں پوچھ سکتا تھا۔ تمہیں مطلع کرنا میرا فرض تھا۔ اور میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اگر تمہیں اتنا ہی تجسس ہے تو خود چیف کو فون کر کے پوچھ لو"۔ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"نہیں.......... اس کی ضرورت نہیں"۔ میں نے جواب دیا۔ "میں تو پہلے ہی اس کیس کی تفتیش سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ کیس حل نہیں کر سکتا"۔

"تب تو پریشانی کی کوئی بات نہیں"۔ وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے وہ مجھے گھورتا رہا' پھر بولا۔ "ایک بات اور ہے انسپکٹر.......... میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ آئندہ میرے کسی آدمی پر ہاتھ نہ اٹھانا.......... ہاں' وہ تم پر ہاتھ اٹھائیں.......... بلکہ معمولی سی بدتمیزی بھی کریں تو تم ان کی کھال گرا سکتے ہو.......... اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے تمہیں؟"

"نہیں.........." میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں"۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا اور الجھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بگ چیف اس معاملے میں کیسے دلچسپی لے سکتا ہے۔ دلچسپی لی ہے تو اس کا کوئی سبب بھی ہو گا۔ میں نے اس پہلو پر بھی سوچا کہ ممکن ہے جابر خان' چیف کا نام لے کر اپنا کام چلا رہا ہو لیکن میں جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ جابر خان اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کم از کم دس بار سوچتا۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ کیونکہ میں کسی بھی وقت بگ چیف سے فون پر بات کر سکتا تھا۔ تاہم اس بات کا امکان تھا کہ میری تفتیش سے خوفزدہ ہو کر جابر خان نے بگ چیف سے خود فون پر بات کی ہو.......... اور کسی نہ کسی طرح اسے یقین دلا دیا ہو کہ راشد عزیز تنظیم کے لئے خطرہ بن گیا تھا اس لئے اسے راستے سے ہٹانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ یوں اس نے چیف سے التجا کی ہو کہ مجھے اس کیس کی تفتیش سے باز رکھا جائے۔ لیکن کچھ دیر غور کرنے کے بعد میں نے اس نظریے کو بھی مسترد کر دیا۔ جابر خان کے لئے یہ بھی بہت بڑا خطرہ تھا۔ اگر اس نے راشد کو قتل کروایا تھا' تب بھی اس کے پاس یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ اپنے طور پر راشد کے قتل کا فیصلہ صادر کر دے۔ چیف کے سامنے پورا کیس پیش کیا جاتا اور اس کے بعد فیصلہ بھی وہی صادر کرتا۔ تنظیم کا یہ اصول نہیں تھا کہ پہلے قتل کر دیا.......... اور بعد میں اس کی توثیق کرا لی۔ تنظیم ایک فعال ادارہ تھی۔

بے حد غور و فکر کرنے کے بعد میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ راشد کے قتل میں جا[بر] خان کا ہاتھ ہرگز نہیں ہے۔

راشد کے قتل کا کیس لاینحل ثابت ہو رہا تھا۔ دشواری یہ تھی کہ میں پوری طر[ح] اندھیرے میں تھا۔ مجھے تو اس قتل کے محرک کے بارے میں بھی اندازہ نہیں تھا۔ ایسے م[یں]

قاتل کو گرفتار کرنا محض دیوانے کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ اسی جھنجلاہٹ میں میں دفتر سے نکلا اور کیفے شہزاد کی طرف چل دیا۔ کیفے شہزاد کے کارنر' پر گلی کے نکڑ پر مجھے ایک لنگڑا فقیر نظر آیا۔ میں کچھ سوچ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے دو چار سوال جواب کرنے کے بعد میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے پتا چل گیا کہ راشد کو کس نے.......... اور کیوں قتل کیا ہے لیکن میں نے فوری طور پر کچھ نہ کیا.......... اور شاید میں اس معاملے کو پی جاتا لیکن اس رات میرے گھر آنے والے ملاقاتی نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس سے ملنے کے بعد میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں راشد کے قاتل کو گرفتار کرنے کی کوشش ضرور کروں۔

اس ملاقاتی کی آمد سے پہلے میں خود کو سمجھاتا رہا تھا کہ میرا طرز عمل بچگانہ ہے۔ میں بھی وہی کچھ کر رہا ہوں' جو مرحوم راشد نے کیا تھا.......... اور میرا انجام بھی وہی ہو گا۔ چنانچہ میں نے اس سے پہلے ہی خود کو سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تو میں نے جان لیا تھا کہ راشد ذاتی مخاصمت کی بنا پر قتل ہوا ہے لیکن اب قاتل کی طرف ہاتھ بڑھانا تنظیم سے ٹکرانے کے مترادف تھا۔ بہتر یہی تھا کہ تنظیم کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس کیس کو لاینحل قرار دے کر فائل بند کر دوں۔

اس رات میں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ ملازمہ نے مجھے بتایا کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو عزیز کو وہاں بیٹھے پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ میری دانست میں تو وہ مر چکا تھا شاید اس لئے کہ شاہدہ واقعی مر چکی تھی لیکن عزیز زندہ تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ مردوں سے بدتر تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا لیکن اس کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ جسم کو ہڈیوں کا پنجر ہی کہا جا سکتا تھا۔ میں اسے مردہ فرض کر چکا تھا۔ اسی لئے میں نے راشد سے کبھی اس کے بارے میں استفسار نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی راشد صرف دوسری ملاقات ہی میں ذہنی طور پر مجھ سے دور ہو چکا تھا۔

اس تباہ حالی کے باوجود میں نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بے حد متاسف ہوا۔ اگر آج شاہدہ زندہ ہوتی تو شاید میں اسے بھی اس حال میں دیکھتا۔ اس دنیا میں دیانت کا یہی انجام ہوتا ہے لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز اور لہجے میں روح کی تمام توانائی اور زندگی موجود تھی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ وہ مجھ سے زیادہ زندہ آدمی ہے۔ اس لمحے مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ دنیا تو محض ایک سرائے ہے' جہاں چند روز گزار کر رخصت ہو جانا ہے۔ اصل چیز تو ابدی زندگی ہے۔ یہاں کی آسائش اور تکالیف' دونوں بے معنی ہیں۔ اصل مسئلہ تو ابدی زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں دیانت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی اذیتیں مبارک ہیں کہ ابدی زندگی میں خوشحالی کی نوید ہوتی ہیں۔ مجھے خود پر شرم آنے لگی۔ میں نے اپنا اور اس کا موازنہ کیا تو پتا چلا کہ اس دنیا میں ہم دونوں کا حال ایک جیسا ہے لیکن وہ عاقبت سنوار چکا ہے اور ابدی زندگی میں سرخرو ہو گا' جبکہ میں.......... ہم دونوں کی عمر چوالیس سال تھی۔ ہم دونوں ہی تنہا تھے۔ پہلی بار مجھے اپنا بنگلہ حقیر لگا۔ میں کن چیزوں کے لئے اپنی روح کو فروخت کر رہا تھا

جو یہیں دھری رہ جائیں گی۔ میری بیوی نہیں۔ بچے نہیں کہ یہ سب کچھ ان کے کام آتا۔ اُف ....سب بے کار تھا۔ گزرے ہوئے برس رائیگاں تھے اور ان کی تلافی ممکن نہیں تھی۔

"ہیلو عزیز.......... کہو کیسے آئے؟" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اتنے عرصے کے بعد تم سے مل کر خوشی ہوئی"۔

وہ اس بات پر خاصا خوش ہوا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ بڑی معصوم سی خوشی تھی۔ میں نے اسے بٹھایا اور ملازمہ کو چائے لانے کی ہدایت دی۔ چائے پینے تک ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی اور بے حد سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے آپ کو دفتر میں زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا۔ درحقیقت میں آپ کے پاس ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں"۔

"کہو.......... کہو میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں"۔

"میں راشد کے سلسلے میں آیا ہوں"۔

"یعنی تمہیں ایسی کوئی بات معلوم ہے' جو ہمارے علم میں نہیں ہے؟"

"راشد ہی کی کہی ہوئی ایک بات ہے"۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "پولیس سے نکالے جانے کے دو دن بعد اس نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ صرف اس کا کیریئر ختم ہونے سے جابر خان کی تشفی نہیں ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ اسے اگر کچھ ہو جائے تو اس کا ذمے دار جابر خان کو سمجھا جائے"۔

"میں اس سلسلے میں پہلے ہی ہر ممکن قدم اٹھا چکا ہوں"۔ میں نے جواب دیا "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جابر خان کے ہاتھ صاف ہیں"۔

"بہرحال' میں نے مناسب یہی سمجھا کہ آپ کو بتا دوں"۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہم کچھ دیر رسمی سی گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نفرت اور غصے کی آگ میں پھنکتا رہا۔ اس تباہ حال آدمی کو اتنے برے حال میں اور وقت سے پہلے اتنا بوڑھا دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ اس کے وجود کو ہمارے سسٹم نے چاٹ لیا تھا.......... اور وہ کوئی اکیلا نہیں تھا۔ ایسے کروڑوں انسان ہوں گے جو سسٹم کی اس چکی میں پس رہے ہوں گے۔ پہلے کبھی میں نے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔

میں نے جو کچھ کیا' اس کا سبب عزیز سے ہمدردی نہیں تھا۔ اس رات مجھے شاہدہ ٹوٹ کر یاد آئی تھی۔ میں تصور کرتا رہا کہ اس نے کس قدر تنگ دستی کی زندگی گزاری ہوگی۔ اسے غربت نے کس طرح وقت سے پہلے' موت سے بھی پہلے مار دیا ہوگا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ دیانت پر یقین رکھتی تھی۔

اس رات میں اپنے بنگلے کے ایک ایک کمرے میں گیا۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا' میں

ں کا تخمینہ لگا رہا تھا۔ میں لاکھوں کا آدمی تھا لیکن ابدی زندگی میں یہ لاکھوں میرے لئے بے ار تھے۔ بلکہ وہ اس زندگی میں عذاب بن کر مجھ سے چمٹے رہتے۔ میں نے ٹیرس سے ساحل مندر کا جائزہ لیا۔ وہ بے حد خوب صورت منظر تھا لیکن وہ منظر غریب اور دیانت دار لوگوں کے لئے نہیں تھا۔ سمندر کی بپھرتی موجوں میں مجھے راشد کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ پھر اس کے عقب ے شاہدہ جھانکنے لگی۔ اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آیا اور الماری کھول کر اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔

O============☆============O

اپارٹمنٹ بلڈنگ کے نیچے جابر خان کی جانی پہچانی کار موجود تھی۔ اس کے دونوں باڈی گارڈ بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے مؤدبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔

"خان اندر موجود ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"موجود تو ہے لیکن میرا خیال ہے' وہ اس وقت تم سے ملنا پسند نہیں کرے گا"۔

"نہ کرے.......... لیکن معاملہ سنگین ہے میں صبح تک انتظار نہیں کر سکتا"۔ میں نے کہا اور پلٹ کر اندر کی طرف چل دیا۔ ان دونوں کی تیز نگاہیں مجھے اپنی پشت میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا' ورنہ وہ مجھے اندر جانے سے روک دیتے۔

میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ کوئی ایک منٹ کے بعد ثریا نے دروازہ کھولا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ "انسپکٹر' اس وقت؟" اس کے لہجے میں بھی خوف تھا۔ "جابر خان موجود ہے۔ تم غلط وقت پر آئے ہو"۔

"مجھے معلوم ہے لیکن میں نجی ملاقات کے لئے نہیں آیا ہوں"۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اسے ایک طرف ہٹایا اور فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت مجھے جابر خان بیڈ روم سے نکلتا دکھائی دیا۔ وہ بھی شب خوابی کے لباس میں تھا۔

"اے انسپکٹر.......... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔

"میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں.......... راشد عزیز کے قاتل کو گرفتار کرنے"۔

"اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور نتھنے پھڑکنے لگے۔ "میں تم سے تنگ آ چکا ہوں انسپکٹر.......... اور تم شاید زندگی سے بیزار ہو گئے ہو"۔

"تمہارا اندازہ درست ہے خان"۔

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ "اول تو تمہیں حکم مل چکا ہے کہ تفتیش سے ہاتھ اٹھا لو"۔ وہ غرایا۔ "اور پھر تم چور کے بجائے راہ گیر پر بھونک رہے ہو۔ میرے نزدیک اس دیانتدار نوجوان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے قتل میں میرا ہاتھ ہرگز نہیں ہے"۔

"میں جانتا ہوں"۔ میں نے کہا اور ثریا کی طرف دیکھا' جو کمرے کے وسط میں آکھڑی ہوئی تھی۔ "میں تمہاری محبوبہ کو گرفتار کرنے آیا ہوں"۔

جابر خان نے پہلے ثریا کو اور پھر مجھے بغور دیکھا۔ "تم شاید ہوش میں نہیں ہو ٹلے"۔

"میں زندگی میں کبھی اتنا ہوش مند نہیں رہا' جتنا اس وقت ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا۔ اگر مجرم تم ہوتے تو بگ چیف تمہیں بچانے کی کوشش کبھی نہ کرتا۔ یہ کام صرف ثریا ہی کا ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی اور ذاتی بنیاد پر کسی کو قتل کرے تو چیف اسے ہرگز نہیں بخشے گا۔ ثریا کی بات اور ہے۔ وہ بگ چیف کی سالی ہے۔ ناپسند کرنے کے باوجود وہ اپنی بیوی کے حوالے کی وجہ سے اسے کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا یہ حکم اس کے اپنے اصول کے خلاف تھا۔ اسی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ثریا مجھ سے گفتگو کے بعد ڈر گئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی بہن سے رابطہ قائم کیا اور یوں چیف نے تمہیں فون پر حکم دیا کہ مجھے تفتیش سے روک دیا جائے' ثریا اعتراف کرچکی ہے کہ قتل کے وقت یہ راشد کے ساتھ تھی"۔

جابر خان ثریا کو گھورتا رہا۔ "کیا یہ درست ہے کہ قتل کے وقت تم راشد کے ساتھ تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"صرف ساتھ نہیں تھی بلکہ راشد کے پیٹ میں پانچ گولیاں بھی اسی نے اتاری تھیں"۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور پھر براہ راست ثریا سے مخاطب ہوگیا۔ "کیوں حسینہ' اب بھی وجہ نہیں بتاؤ گی اس قتل کی۔ اگر وجہ انتقام تھی تو تمہیں بہت دیر میں خیال آیا۔ اس نے تمہیں گرفتار کرکے ذلیل کیا تھا نا؟"

ثریا کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ہسٹریائی تاثر تھا۔ "وہ ذلیل شخص......... وہ مجھے حقیر سمجھتا تھا......... سمجھتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں"۔ اس نے چیخ کر کہا۔ پھر وہ میری طرف بڑھی۔ "اس نے مجھ پر قہقہے لگائے......... میرا مضحکہ اڑایا......... میرا......... میں......... جس مرد کو اشارہ کردوں وہ میرے قدموں میں لوٹنے لگے لیکن اس نے میرا مذاق اڑایا' مجھے ذلیل کیا......... میں اس کی خاطر سب کچھ کرسکتی تھی لیکن وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں نے اس سے یہاں تک کہا کہ میں جابر خان کو چھوڑ دوں گی۔ میں صرف اسی کی ہو کر رہوں گی......... کبھی اس سے بے وفائی نہیں کروں گی مگر' معلوم ہے' اس نے جواب میں کیا کہا......... اس نے کہا' مجھے تم سے کیا لینا......... تم تو ساری دنیا کی ہو۔ مجھے عوامی چیزیں اچھی نہیں لگتیں"۔ پھر ثریا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بری طرح سسکنے لگی"۔ اوہ......... اوہ......... میں اس سے کتنی محبت کرتی تھی"۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

جابر خان کا چہرہ سپید پڑ چکا تھا۔ وہ بڑی نفرت سے ثریا کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "انسپکٹر' اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا......... اب بھی چیف کے حکم پر عمل کرنا ہے......... تم اسے گرفتار نہیں کرسکو گے"۔

میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ثریا سے کہا۔ "میں تمہیں لباس تبدیل کرنے کے لئے صرف پانچ منٹ دے سکتا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہے"۔

"پہلے مجھے ایک بات بتاؤ......... تمہیں کیسے پتا چلا؟" ثریا نے مجھ سے پوچھا۔

"کیفے شہزاد کی گلی والے نکڑ پر ایک لنگڑا فقیر بیٹھتا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ ے تم اور راشد یاد نہیں تھے کیونکہ وہاں سے گاڑیاں گزرتی ہی رہتی ہیں۔ اس نے فائروں کی آوازیں بھی نہیں سنی تھیں لیکن اس نے پورے یقین سے کہا کہ اس نے کسی سیاہ پوش موٹرسائیکل سوار کو گلی میں داخل ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسے کسی شخص کو اس نے دیکھا ہوتا تو نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس موٹرسائیکل سوار کا کہیں وجود نہیں تھا۔ وہ تمہارا گھڑا ہوا افسانہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں تم نے فرضی قاتل کا نقشہ بتا کر یہ اعتراف کرلیا کہ راشد کو تمہی نے قتل کیا ہے"۔

"میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم اسے گرفتار نہیں کرسکو گے"۔ جابر خان نے کہا۔

"کہتے رہو......... میں اسے تھانے لے جا رہا ہوں"۔ میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"چیف کی ہدایت کے باوجود تم اس سلسلے مجھ سے الجھو گے؟" وہ بولا۔ اس کا ہاتھ شب خوابی کے لبادے کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں تیزی سے ایک طرف ہوا۔ میرا ہاتھ بھی اپنے ریوالور کی طرف لپکا۔ اسی وقت جابر خان نے گولی چلائی جو تقریباً میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے دوسرا فائر کیا ضرور......... لیکن اس سے ایک ثانیہ پہلے میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ اس کے جسم کو شدید جھٹکا لگا......... اور اس کا نشانہ خطا ہوگیا۔ وہ دیوار اور فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

اسی وقت مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں گھٹنوں کے بل جھک کر داخلی دروازے کی طرف مڑ گیا۔ جابر خان کے دونوں باڈی گارڈ فلیٹ میں داخل ہوئے۔ دونوں کے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ میں نے آگے والے کو نشانہ بنایا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور اپنے ساتھی سے ٹکرایا۔ اس تصادم کی وجہ سے دوسرے باڈی گارڈ کا ہاتھ بہک گیا اور ثریا کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ریوالور گرجا اور دوسری باڈی گارڈ بھی ڈھیر ہوگیا۔ کھیل ختم ہوچکا تھا۔ میں چار لاشوں کے درمیان اکیلا تھا۔

میں نے تھانے فون کیا اور وقوعے کی باقاعدہ رپورٹ تیار کی۔ لاشیں بھجوانے کے بعد میں نے گھر کا رخ کیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن صبح ابھی دور تھی۔ میں ٹیرس پر بیٹھا ساحل کو گھورتا رہا۔ وہ چاندنی رات نہیں تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا......... صرف موجوں کے ساحل پر سر پٹکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری کوشش تھی کہ میں زیادہ نہ سوچوں۔ بھاگنا بے سود تھا کیونکہ آدمی معاشرے سے کبھی نہیں بھاگ سکتا۔ میں اس عمل کے بارے میں سوچتا رہا' جس سے مجھے گزرنا تھا۔ سب سے پہلے تو دفتری کارروائی ہونا تھی' جس کے نتیجے میں میری پیٹی اترنا تھی۔ اس کے ایک دو ہفتے بعد تنظیم کے پیشہ ور قاتلوں سے ملاقات یقینی تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ میں تنہا ملک عدم کا سفر نہیں کروں گا۔ ان قاتلوں میں سے بھی دو ایک یقینی طور پر میرے ساتھ ہوں گے۔

میں ساحل کو گھورتا رہا۔ بپھری ہوئی موجوں کی آوازیں سنتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار اپنا بنگلہ مجھے اچھا لگا تھا۔ میں خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ یہ بات نہیں کہ میرے گناہ دھل گئے ہوں.......... ضمیر پر سے بوجھ اٹھ گیا ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ میں توبہ کے قابل ہوگیا تھا۔ اور جانتا تھا کہ خدا کی رحمت بیکراں ہے۔ توبہ میں خلوص ہو تو وہ بڑے بڑے گناہ گاروں کو بخش دیتا ہے۔ یہ احساس بے حد طمانیت خیز تھا کہ میرے پاس توبہ کے لئے خاصی طویل مہلت موجود ہے۔

گھروندا

ماجد نے جھپٹ کر سڑک کراس کی۔ اس دوران سگنل کی روشنی تبدیل ہوچکی تھی۔ وہ ایک منی بس کی لپیٹ میں آتے آتے بچا' لیکن اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ منی بس والے نے گاڑی روک لی ہے اور بڑی روانی سے اسے گالیاں دے رہا ہے۔ راہگیر بھی رک کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے' مگر وہ ان سب سے بے نیاز تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا وہ لیٹ ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے ۲۱ نمبر کے بس اسٹاپ کی طرف بڑھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ چلی نہ گئی ہو۔

بس اسٹاپ کی طرف مڑتے ہی اسے ۲۱ نمبر کی دو بسیں نظر آئیں۔ ایک بس اسٹاپ پر کھڑی تھی' جس کی بیشتر نشستیں ابھی خالی تھیں۔ دوسری اسٹارٹ ہوچکی تھی اور بس اسٹاپ چھوڑ رہی تھی۔ اس نے جاتی ہوئی بس کو دیکھا اور اس کا ذہن امید و بیم کی کیفیت میں معلق ہوگیا۔ بس اسٹاپ پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بس کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے دروازے سے اس نے بے حد سرسری انداز میں لیڈیز کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ وہاں دو بوڑھی خواتین بیٹھی تھیں لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ اس کی پابندی وقت کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ وہ جاچکی ہے مگر اس کا ذہن یہ بات تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ آج وہ بھی لیٹ ہوگئی ہو۔ محبت میں یہ ایک بات عجیب ہوتی ہے۔ ذہن اور دل مل کر امید کی رائی کو بھی پہاڑ بنا دیتے ہیں۔

اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور وہیں کھڑا ہوگیا۔ پھر اسے ایک خیال نے چونکا دیا۔ اگر وہ آئی اور بس میں بیٹھی تو خود اس کا بس میں اچانک بیٹھنا کس قدر معیوب ہوگا۔ بس میں بیٹھے ہوئے لوگ' نکڑ پر پان کی دکان والا اور وہاں کھڑے ہوئے لوگ اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھیں گے' سوچیں گے کہ وہ اتنی دیر کھڑا رہا اور لڑکی کے آتے ہی بس میں بیٹھ گیا کیوں؟ وہ بھانپ لیں گے' سمجھ جائیں گے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ مضطرب ہوگیا۔

اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور نکڑ والے ریستوران کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ وہاں کھڑا ہو کر بس اسٹاپ پر نظر رکھ سکتا ہے۔ اور اس کے آتے ہی جھپٹ کر بس میں سوار ہوسکتا ہے۔ تب شاید کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوسکے گا......... شاید۔

طبعاً" وہ بہت شرمیلا تھا۔ اس کے قریب ہی کہیں کوئی لڑکی موجود ہوتی تو اسے محسوس ہوتا کہ ہر شخص اسے شک آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں اس کی ایک ایک حرکت اس کے اندرونی اضطراب کی غمازی کرتی۔ دراصل اسے خواتین کی قربت کبھی میسر ہی نہیں آئی تھی۔ پاس پڑوس کی خواتین اور لڑکیاں کبھی اس کے گھر آتیں تو وہ اِدھر اُدھر ٹہل جاتا۔ کبھی کسی نے کچھ پوچھا تو نگاہیں جھکا کر جواب دے دیا۔ محلے کی معمر خواتین کے نزدیک وہ شرافت کا نمونہ تھا۔ جب کہ محلے کی تمام لڑکیاں اسے نرا الو سمجھتی تھیں۔ اس بات کا احساس اسے خود بھی تھا اور اسی احساس نے اسے لڑکیوں کے معاملے میں اور زیادہ الو بنا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بیکری والی گلی کی طرف دیکھتا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا پھر پیچھے سے ایک اور بس آئی' اور پہلے والی بس چلی گئی۔ اس کی امید اب بھی باقی تھی۔ تیسری بس کے جانے کے بعد اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا نو بج چکے تھے۔ اس کی امید دم توڑنے لگی اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اب اس کے آنے کا امکان نہیں رہا ہے' وہ یقیناً جاچکی ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی خوش امیدی درحقیقت بہت بڑی حماقت تھی۔ وہ جھنجلا کر رہ گیا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا' پھر وہ بلاارادہ ریستوران میں داخل ہوا اور ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ بیرے نے بغیر کچھ کہے سنے اس کے سامنے چائے کی پیالی لاکر رکھ دی۔

اچانک اسے دفتر کا خیال آگیا۔ عجیب بات تھی۔ وہ دفتر جانے کے ارادے سے گھر سے چلا تھا یا اس لڑکی کی ہم سفری کے لیے' جس کا نام بھی اسے اتفاقاً" معلوم ہوا تھا' جس سے کبھی اس نے بات بھی نہیں کی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ گزشتہ تین ماہ سے دفتر جانا بھی اس کے لیے ایک خوشی کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ ہیڈ کلرک صاحب اور اس کے ساتھی' دفتر میں سبھی حیران تھے کہ اب وہ چھٹی نہیں کرتا اور نہ ہی زیادہ لیٹ ہوتا ہے' بلکہ ایک معمول کے مطابق ایک مخصوص وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ لیٹ تو وہ اب بھی ہوتا تھا۔ لیکن سرکاری دفتروں میں اتنی معمولی تاخیر کو لیٹ ہونے میں شمار نہیں کیا جاتا' وہ سب حیران تھے لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ محبت کی کرشمہ سازی ہے' یہ انقلاب تین ماہ پہلے ہی تو آیا تھا۔

اس نے سامنے رکھی ہوئی پیالی سے چائے کا گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر پیالی ایک طرف کھسکا دی۔ اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ ایرانی ہوٹلوں میں سادہ چائے بہت خراب ہوتی ہے۔ اسے اسپیشل چائے کا آرڈر دینا چاہیے تھا۔ چائے پر فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگایا۔ اس بدذائقہ چائے کی یہ افادیت اپنی جگہ تھی کہ وہ اس کے زور پر ریستوران میں کافی دیر تک بیٹھ سکتا تھا۔ اس وقت وہ خاصا مایوس تھا۔ تین مہینے کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ وہ

اس کی ہم سفری سے محروم رہا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ احمقانہ محبت کا وہ بیج اس کے دل میں جگہ بنا چکا ہے۔ اسے اس دن کے رائیگاں ہونے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اجنبی لوگ اس طرح بغیر تعارف کے، بغیر کسی حرف مدعا کے، یوں جزوِ رگِ جاں بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کے بغیر بھری پری دنیا سونی سونی اور زندگی بے مقصد لگنے لگتی ہے۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ لڑکی کا نام ہیلن ہے۔ نام بھی اسے اتفاقاً ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون نے ایک بار اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچنے کو بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ بس کے عقب نما آئینے میں ایک چہرے کا عکس تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اس کے پاس اس لڑکی کے یہی چند حوالے تھے۔ یہ عجیب جذبہ تھا۔ شاید اسی کو پہلی نظر کی محبت کہتے ہیں۔ تین ماہ پہلے تک وہ پہلی نظر کی محبت کا شدت سے مذاق اڑاتا رہا تھا، اسے حماقت قرار دیتا رہا تھا، اور اب وہ خود اسی حماقت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

یہ سوچ کر اسے خود پر غصہ نہیں آیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اتفاقات انسان کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ اس کا ہانکا ہو رہا ہے، اسے کسی مخصوص سمت میں دھکیلا جا رہا ہے۔ خود اسے بھی تو پتا نہیں چلا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کی بنیاد محض اتفاق ہی تو تھا۔

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا، بلکہ وہ اس دن کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس روز وہ دفتر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر پہنچا تو اس کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی۔ اسے ٹاور جانا ہوتا تھا اور بسیں بھری ہوئی آتی تھیں۔ اسے ہر روز کھڑے ہو کر جانا پڑتا تھا لیکن اس روز اس کا کھڑے ہو کر جانے کا موڈ نہیں تھا۔ پھر اسے ۲۱ نمبر کی خالی بس آتی نظر آئی۔ وہ بلا ارادہ اس میں بیٹھ گیا۔ بس بالکل خالی تھی۔ وہ لیڈیز کمپارٹمنٹ سے ملحق سیٹ پر جا بیٹھا۔

۲۱ نمبر بس صدر سے ٹاور جاتی تھی، لیکن اس کا روٹ مختلف تھا۔ وہ کینٹ اسٹیشن، سول لائنز، مولوی تمیزالدین روڈ اور نیٹی جیٹی ہوتی ہوئی ٹاور پہنچتی تھی۔ اسی لیے صدر سے ٹاور جانے والی عام بسوں کے مقابلے میں زیادہ وقت لیتی تھی، لیکن ماجد کو وقت کی پروا نہیں تھی۔ سرکاری ملازمت میں یہی تو ایک سہولت ہے کہ جب جی چاہا، دفتر پہنچے اور جب جی چاہا گھر لوٹ آئے۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور دھواں کھڑکی سے باہر چھوڑ دیا۔ اب بس میں لوگ بیٹھنے لگے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم......... سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اچانک خوشبو کے ایک جھونکے نے اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر کردیا۔ وہ بھینی بھینی مدھر خوشبو تھی......... ہلکی ہلکی......... ورنہ تیز خوشبو تو اس کے سر میں درد کر دیتی تھی۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اس کے آگے والی سیٹ پر کوئی لڑکی آبیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور کمر تک آرہے تھے۔

ماجد کو خوامخواہ تجسس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ لڑکی کا چہرہ دیکھے لیکن اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اس نے سگریٹ بجھایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا لیکن اس کا دھیان بدستور لڑکی میں الجھا ہوا تھا۔ یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کسی لڑکی کو بار بار دیکھنا چاہا ہو۔ کوئی انجانی سی کشش تھی، جو اسے اس لڑکی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ بس اب بھر چکی تھی۔ اس کے برابر والی نشست پر بھی کوئی آبیٹھا تھا، چنانچہ وہ خود پر جبر کرکے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ اس نے شدید خواہش کے باوجود لڑکی کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ وہی پرانا خوف عود کر آیا تھا کہ اگر اس لڑکی پر توجہ دی تو بس میں موجود ہر شخص کو اس بات کا احساس ہو جائے گا۔

بس اب چل دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں پھیلائے بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنی عادت کے مطابق تصور میں کھو گیا۔ وہ بے حد تصوراتی آدمی تھا، خوابوں میں گم رہنے والا۔ شرمیلے لوگوں کے تصور ہمیشہ بے حد زرخیز ہوتے ہیں۔ سو کسی تصور میں گم ہونا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ البتہ ایک غیر معمولی بات ہوئی تھی، جس کا اسے شروع میں احساس ہی نہیں ہوسکا تھا۔ پہلے وہ تصور میں گم ہوتا تھا تو ہر غیر عملی آدمی کی طرح تصور میں اپنی محرومیوں کی تلافی کرتا تھا۔ اپنا بنگلہ، اپنی کار، اپنا طمطراق دیکھتا تھا لیکن جاگتی آنکھوں دیکھا جانے والا اس دن کا خواب یکسر مختلف تھا۔ وہ رنگارنگ پھولوں سے آراستہ ایک حسین باغ میں نرم گھاس پر بیٹھا تھا۔ گردوپیش میں رنگوں اور خوشبوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جدھر نظر اٹھتی، رنگ ہی رنگ دکھائی دیتے......... ہوا کے خوشبوؤں سے بوجھل جھونکے اس کے جسم سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اس کے ذہن کو معطر کیے دے رہے تھے، لیکن اس منظر کی جان ایک نرم و نازک وجود تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی، جو اس کے سامنے دوزانو بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر اس طرح جھکا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا اور وہ خود اس سے بار بار سر اٹھانے کی التجا کر رہا تھا تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے لیکن لڑکی کسی مورت کی طرح ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

پھر وہ بری طرح چونکا۔ کسی نے اس کے گود میں رکھے ہوئے ہاتھ کو بڑی نرمی اور ریشم جیسی ملائمت سے سہلادیا تھا۔ وہ لمس ایسا تھا، جیسے کوئی ہوا کا جھونکا اسے چھو کر گزر گیا ہو، اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھا۔ وہ بے حد کرخت آدمی تھا۔ اس کے لمس میں اتنی ملائمت کیسے ہوسکتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا ذہ وہم تھا لیکن اسی وقت اسے اپنے ہاتھ پر وہ اترا ہوا لمس پھر محسوس ہوا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ آنچل تھا، نیلا آنچل، اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا آنچل۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مسحور بھی ہوگیا۔ شریر آنچل کے اس لمس میں نہ جانے کیا تھا کہ اسے اپنی رگوں میں سرشاری دوڑتی محسوس ہونے

لگی۔ اس سے پہلے کسی لمس نے اسے اس طرح بے خود نہیں کیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آنچل اسی طرح لمس کی زبان میں اس کے ہاتھوں سے ہمیشہ سرگوشیاں کرتا رہے لیکن دوسری طرف برسوں سے خوف کا عادی ذہن آڑے آرہا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے......... اسے کچھ کہہ نہ دے۔ شوق بھی شدید تھا۔ ایسے میں مفاہمت کی ایک ہی صورت تھی اور اس نے اسی پر عمل کیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو بالکل ساکت کرلیا اور برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف متوجہ ہوگیا جو بڑی لاتعلقی سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

ماجد اس شخص کو دیکھتا رہا لیکن وہ کن انکھیوں سے اپنے ہاتھوں اور اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو بھی دیکھتا رہا۔ شاید لڑکی کو بھی اپنے آنچل کی شرارت کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے آنچل کو کھینچا۔ ماجد پوری طرح اس طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ آنچل کا الوداعی لمس اسے خداحافظ کہتا محسوس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ اسی وقت اس کی نظریں ڈرائیور کے سامنے نصب آئینے پر پڑیں۔ یوں اس نے پہلی بار اس لڑکی کا چہرہ دیکھا......... چہرہ نہیں، عکس۔

وہ بیضوی چہرہ تھا، اور اس پر بلا کی ملاحت تھی۔ سانولی سلونی رنگت، چپٹے نقوش، بھرے بھرے ہونٹ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ وہ بے حد حسین اور بولتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اس نے خود کو براہ راست ان آنکھوں میں دیکھتے پایا۔

لڑکی نے بھی آنچل کھینچتے ہی آئینے کی طرف دیکھا تھا۔

ماجد دیکھتا رہا۔ اسے گردوپیش کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اس وقت ساری کائنات میں اس چہرے کے عکس اور ان آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں خفگی اور جھنجلاہٹ کی کیفیت تھی، جیسے اسے اپنے آنچل کی شرارت اور گستاخی ہی پر نہیں بلکہ اس پر بھی غصہ تھا، جس کی طرف وہ آنچل لہرا کر لپکا تھا۔ وہ بہت غور سے آئینے میں اس کا عکس دیکھ رہی تھی۔ پھر ماجد نے ان آنکھوں کا موسم بدلتے دیکھا۔ خفگی اور جھنجلاہٹ معدوم ہوئی اور اس کی جگہ ایک پاکیزہ سی نرماہٹ نے لے لی۔ ماجد کو ایسا لگا جیسے لڑکی کے آنچل نے اس بار بے حد نرمی سے، ریشم جیسی ملائمت سے اور پاکیزہ لطافت سے خود اس لڑکی کے دل کو چھولیا ہے۔ آنکھوں میں ہر کیفیت، ہر موسم دل ہی کا تو ہوتا ہے۔ وہ تو محض آئینہ ہوتی ہیں۔

ان آنکھوں کا موسم ایک بار پھر بدلا۔ پاکیزہ نرماہٹ کی جگہ حیرت میں لپٹی ہوئی حیاآمیز پسندیدگی جھلکنے لگی۔ یا یہ اس کا وہم تھا، خواہش تھی اسکی۔ ماجد فیصلہ نہ کرسکا۔ پھر لڑکی نے آنکھوں کے دریچوں پر پلکوں کی چلمنیں گرادیں لیکن اس نے سر نہیں جھکایا تھا۔ ماجد کو ایسا لگا جیسے وہ سوگئی ہو۔ وہ بہرحال آئینے میں اس کے عکس کو تکتا رہا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ لڑکی کی پلکیں اٹھیں، ایک ثانیے کے لیے۔ شاید وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں یا شاید وہ چوری چوری چپکے سے اسے دیکھنا چاہتی ہوگی۔ لیکن اسے آئینے کی

طرف متوجہ پاکر اس نے پہلے پلکیں جھکائیں، پھر سر جھکایا اور پھر مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اب آئینے میں اس کے چہرے کا ایک رخ دکھائی دے رہا تھا، وہ بھی نامکمل۔ اس کے باوجود ماجد آئینے سے اپنی نظر نہ ہٹا سکا۔

"ٹکٹ بابوجی"۔ کنڈکٹر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور ٹاور کا ٹکٹ لے لیا۔ پھر وہ حسب سابق کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ لڑکی بھی باہر دیکھ رہی تھی۔ پھر کنڈکٹر لڑکی کی طرف پہنچا۔ لڑکی نے کنڈکٹر کی طرف نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کوئنس روڈ" اس کی آواز میں بلا کا لوچ تھا۔

سفر کے دوران وہ دونوں آئینے کے ذریعے ایک دوسرے سے ملتے رہے، ماجد کے لیے یہ بات باعث طمانیت تھی کہ یہ ملن یک طرفہ نہیں تھا۔ لڑکی بھی بار بار اسے دیکھتی رہی لیکن اس کے انداز میں ایک حجاب تھا، دلکش سا شرمیلا پن تھا۔ ماجد کا اپنا حال بھی ایسا ہی تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اس کوشش میں کئی بار ان کی نظریں ملیں اور ہر بار وہ دونوں ہی جھینپ گئے۔ وہ آئینہ ان کے لیے ایک ایسا راستہ بن گیا، جس پر وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے کی آس میں چلتے تھے اور ملنے پر نظریں چرا لیتے تھے۔

وہ مختصر سا سفر تھا یا کوئی خواب، جو اتنی جلدی ختم ہوگیا۔ لڑکی مولوی تمیزالدین روڈ پر ٹائر کمپنی کے اسٹاپ پر اتر گئی۔ اس کے اترنے کے بعد ماجد کو خلا کا احساس ہوا۔ اس کا سینہ خالی خالی سا تھا، بس خالی خالی سی تھی اور بس ہی کیا، جیسے ساری کائنات بے روح ہوکر رہ گئی تھی۔ پانچ منٹ بعد اس کا اسٹاپ بھی آگیا اور وہ بس سے اتر گیا۔

اس روز اپنے دفتر کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی لے مختلف تھی۔ اندر کا موسم جو بدلا ہوا تھا۔ ہوا کا کوئی جھونکا نرمی سے اسے چھوتا تو اسے اس آنچل کا لمس یاد آجاتا۔ اس روز دفتر میں بھی اس کا عجب حال رہا۔ بے خودی کی اس کیفیت میں اس نے کام بھی معمول سے زیادہ کیا۔ گھر پہنچ کر بھی وہ کھویا کھویا سا رہا۔ اس رات اس کی آنکھوں میں موسم جوانی کا پہلا خواب اترا تھا۔

اگلے روز اس کے قدم خود بخود ۲۱ نمبر کے اسٹاپ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ سوا آٹھ بجے وہاں پہنچا اور بس میں بیٹھ گیا......... اگلی سیٹ پر۔ پھر بس چلنے لگی۔ وہ اداس ہوگیا کہ شاید وہ ایک دن کی ہم سفری کسی سہانے خواب کی مانند تھی، آنکھ کھلی اور کھیل ختم۔ وہ بائیں سمت کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسی وقت بیکری والی گلی میں وہ آتی دکھائی دی لیکن وہ خاصی دور تھی۔ اس کے باوجود اس کا جی چاہا کہ اسے پکارے لیکن وہ اسے کس نام سے پکارتا......... کس رشتے کے حوالے سے پکارتا؟

بس گزرگئی وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بجے

تھے۔ اس کا جی چاہا کہ پہلے ہی اسٹاپ پر اتر جائے اور ایمپریس مارکیٹ واپس جائے لیکن اس میں
ایک خدشہ تو یہ تھا کہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بس چل دی تو کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ
ازلی خوف بھی تھا کہ لوگ کیا کہیں گے' اسے کن نظروں سے دیکھیں گے۔ چنانچہ وہ بیٹھا پہلو
بدلتا رہا۔

وہ سفر ہی نہیں بلکہ وہ دن بھی بے کیفی سے عبارت تھا۔ دفتر میں وہ اکھڑا اکھڑا اور وقتاً
فوقتاً چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا رہا۔ شام کو گھر پر بھی اس کی یہی کیفیت رہی۔ البتہ رات کچھ
بہتر ثابت ہوئی۔ بستر پر لیٹا ہوا آدمی حکمران ہوتا ہے' سب کچھ اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔
تصور اور خواب' دونوں مملکت ہی تو ہوتے ہیں' جن میں آدمی مطلق العنان ہوتا ہے۔ اب پھر
وہی بس تھی' وہ دونوں تھے' وہی آئینہ تھا اور وہی نظروں کی آنکھ مچولی۔ صرف ایک فرق تھا۔
بس بالکل خالی تھی' حتیٰ کہ اس میں ڈرائیور بھی نہیں تھا' پھر بھی وہ چل رہی تھی۔ ہر طرف
کیف ہی کیف تھا۔

تیسری صبح وہ مناسب وقت پر گھر سے نکلا اور آٹھ بج کر ۲۵ منٹ پر بس اسٹاپ پر پہنچا۔
جو بس کھڑی تھی' اس کی اگلی نشستیں بھر چکی تھیں' پیچھے کچھ سیٹیں خالی تھیں لیکن وہ ان پر
بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نکڑ والی پان کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے اس نے سگریٹ کا
پیکٹ خریدا اور پھر بس کی طرف آیا۔ اس دوران باقی سیٹیں بھی بھر چکی تھیں۔ وہ بس میں چڑھ
گیا اور لیڈیز کمپارٹمنٹ والے پارٹیشن سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے لیڈیز کمپارٹمنٹ کا
جائزہ لیا' لڑکی موجود نہیں تھی۔ ڈرائیور کے پیچھے والی تین کی سیٹ بھر چکی تھی۔ البتہ ڈرائیور
کی سائیڈ والی سیٹ پر صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے ونڈ شیلڈ کے پار دیکھا۔ اسی وقت
وہ اسے بیکری والی گلی سے بس کی سمت مڑتی دکھائی دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل جیسے
دھڑکنا بھول گیا۔ پھر جسم میں ایسی لطیف سنسنی سی دوڑی کہ وہ اندر ہی اندر بھیگ کر رہ گیا۔
اس کی چال میں بڑی نزاکت تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔
ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔ وہ ڈرائیور کو روکنا چاہتا تھا' اسے بتانا چاہتا تھا کہ
تمہارا ایک پسنجر آرہا ہے' لیکن پھر وہی ازلی خوف۔ اس کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔
وہ آج بھی اس کی ہم سفری سے محروم ہو جائے گا۔ یہ خیال ہی اسے سوہانِ روح معلوم ہوا
تھا۔

بس نے ابھی رفتار نہیں پکڑی تھی۔ لڑکی نے بس رکوانے کے لیے ہاتھ لہرا کر اشارہ
کیا۔ ڈرائیور نے بریک لگادیے۔ لڑکی بس میں سوار ہوئی اور ڈرائیور کی سائیڈ والی سیٹ پر بیٹھ
گئی۔ ماجد کو اپنی خوش نصیبی پر رشک آنے لگا۔ اگر لڑکی آج بھی اسی سیٹ پر بیٹھتی تو وہ ا
بھی طرح اسے نہ دیکھ پاتا' نہ آئینے میں نہ براہ راست۔ لیکن وہ اس کے روبرو تھی۔
درمیان میں آئینے کا پردہ بھی حائل نہیں تھا۔

وہ پر اشتیاق نگاہوں سے لڑکی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ شاید اس کی نگاہوں کی چبھن
لڑکی کو چونکا دیا تھا' تبھی تو اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں
' لڑکی کی نظروں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ لیکن لمحے بھر بعد اس نے منہ پھیر لیا۔ ماجد
یت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس روز اسے بس میں کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔
گزشتہ کے تصور کی طرح کبھی کبھی تصور حقیقت پر اس طرح حاوی آجاتا ہے کہ حقیقت
حقیقت کھو بیٹھتی ہے۔

لڑکی نے اس کی طرف سر گھمایا تو وہ جلدی سے دوسری طرف دیکھنے لگا' لیکن لڑکی کی
وں کی تپش اسے اپنے چہرے پر محسوس ہورہی تھی۔ گدگدی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا جی
کہ کھلکھلا کر ہنس دے۔ پھر جیسے گدگدی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے' لڑکی کی نظروں کی
اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ وہ لڑکی کی طرف مڑا۔ لڑکی نے تیزی سے اپنی
وں کا زاویہ تبدیل کیا لیکن اتنی دیر میں ماجد دیکھ چکا تھا کہ لڑکی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
نگاہوں کی وہ آنکھ مچولی اس وقت تک جاری رہی' جب تک ٹائر کمپنی کا اسٹاپ نہیں
۔ ٹائر کمپنی پر لڑکی اتری۔ ماجد کو توقع تھی کہ وہ اترتے ہوئے اس کی طرف ضرور دیکھے گی
وہ اسے آنکھوں کی زبانی الوداع کہہ سکے گا' لیکن لڑکی نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ
ے اتری...... اس نے سڑک کراس کی اور اپنے راستے پر چل دی۔ اس کی اس بے رخی
باوجود ماجد کے رگ وپے میں دوڑتا ہوا خوشگواریت کا احساس کم نہیں ہوا۔ اس بے رخی
بھی ایک اپنائیت تھی۔ جیسے لڑکی بھی اس تعلق کو ساری دنیا سے مخفی رکھنا چاہتی ہو۔ صرف
بنیاد پر وہ کہہ سکتا تھا کہ لڑکی اس کی ہم مزاج ہے۔

دن گزرتے گئے۔ ہم سفری کا وہ حسین سلسلہ جاری رہا۔ وہ ایک دوسرے کے عادی
تے گئے۔ آئینے کے واسطے سے ہوں یا براہ راست' ان کی نگاہیں ملنے کے وقفے طویل ہونے
۔اب نگاہیں ملتیں تو فوراً" ہی چرا نہیں لی جاتیں۔ بلکہ اب تو نگاہوں کے ذریعے گفتگو ہونے
تھی' لیکن ماجد خوف زدہ رہتا تھا کہ کہیں یہ اس کی خوش گمانی نہ ہو' ممکن ہے کہ وہ رائی کو
بنا رہا ہو' اور ممکن ہے کہ وہ رائی بھی نہ ہو۔

ایک روز ماجد بس میں اسی مخصوص نشست پر بیٹھا تھا۔ اگلی سیٹ پر لڑکی بیٹھی تھی۔
ی مصحف کا سلسلہ جاری تھا کہ کینٹ سے ایک خاتون بس میں سوار ہوئیں۔ وضع قطع سے
ی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اسکرٹ اور بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ ان کی نظر جیسے ہی لڑکی پر پڑی'
لانے لہک کر اسے مخاطب کیا۔ "ہیلو ہیلن!"
لڑکی نے چونک کر خاتون کو دیکھا اور پُرتپاک لہجے میں بولی۔ "ہیلو آنٹی! ہاؤ آر یو۔"
ماجد کے لیے وہ لمحہ دھماکہ خیز تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی
ی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے لڑکی کا نام سننے کے باوجود اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ لڑکی

کے انداز' اس کی وضع قطع' اس کا لباس اور سب سے بڑھ کر اس کی حیا اسے ایک مشرقی لڑکی ثابت کرتی تھی۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔

لڑکی نے اس عورت کے لیے جگہ خالی کردی تھی۔ وہ دونوں انگریزی میں گفتگو کر رہی تھیں۔ لڑکی بھی بہت روانی سے انگریزی بول رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب کیفیت تھی' جسے وہ سمجھ نہیں پارہا تھا۔ پی آئی ڈی سی کے اسٹاپ پر خاتون اتر گئیں اور لڑکی پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ ماجد آئینے میں اس کے عکس کو تک رہا تھا لیکن اب وہ اسے ایک نئے زاویے سے' ایک نئے امکان کو سامنے رکھ کر دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف لڑکی نظریں اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس کی نگاہیں محسوس کر رہی ہے لیکن عکس کی حد تک بھی اس سے گریزاں ہے۔

وہ مسلسل لڑکی کے عکس کو گھورتا رہا۔ دل ہی دل میں ان سے نظریں اٹھانے کی التجا کرتا رہا کیونکہ اب ٹائر کمپنی کا اسٹاپ قریب آرہا تھا۔ پھر جیسے لڑکی نے اس کی خاموش التجا سن لی۔ اس نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اس کے عکس کو دیکھا۔ اس بار بھی اس کی آنکھوں میں وہ عجیب کیفیت تھی۔ ماجد پھر الجھنے لگا۔ وہ اس کیفیت کو سمجھ نہیں پارہا تھا۔ پھر لڑکی نے نظریں جھکالیں۔

ٹائر کمپنی کے اسٹاپ پر اترتے وقت لڑکی نے خلاف معمول اسے پلٹ کر دیکھا' صرف ایک ثانیے کے لیے۔ پھر وہ تیزی سے اتر گئی۔ اور سڑک کراس کی اور اپنے مخصوص راستے پر بڑھ گئی۔ چلتے چلتے اس نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ ماجد کھڑکی سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے بس چل دی لیکن لڑکی بدستور اس کی طرف دیکھتی رہی اس کا سر بس کے ساتھ ساتھ متحرک تھا۔

ماجد کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے وہ نظریں الوداع کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ان میں عجیب سی سوگواری اور اداسی بھی تھی' جو آدمی کی آنکھوں میں اسی وقت جھلکتی ہے' جب وہ اپنی کسی پسندیدہ چیز کو ہمیشہ کے لیے کھو رہا ہو۔ ماجد کی طبیعت بوجھل ہو گئی۔ دفتر میں بھی وہ اداس اداس رہا۔

اس کے بعد اگلے دو روز تک صورت حال بدستور رہی۔ لڑکی کی نظریں گریزاں رہیں۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر ماجد کو نہیں دیکھا۔ بس سے اترنے کے بعد بھی اس نے اسے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ماجد پر وہ دونوں دن بہت سخت گزرے۔ وہ مسلسل اس بارے میں سوچتا رہا۔ شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی' شاید اس کی کوئی بات ہیلن کو بری لگی تھی' تبھی تو وہ اس سے گریزاں ہو گئی تھی لیکن بات کیا تھی' وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ہیلن سے پوچھا کیسے جائے۔ اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ٹائر کمپنی کے اسٹاپ پر اتر کر اس سے بات کی جا سکتی تھی

اس کا ازلی خوف!

تیسرے دن بھی وہ آئینے میں اس کے عکس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس روز اسے بس ہیلن کے علاوہ کسی کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں التجائیں کرتا رہا۔ نہ نے کیوں اسے یہ یقین تھا کہ اس کی خاموش التجائیں ہیلن کی سماعت تک پہنچتی ہیں۔

پھر اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ہیلن نے نظریں اٹھائی تھیں۔ وہ جھٹ مسکرا دیا۔ نے کوشش کی تھی کہ اس مسکراہٹ میں معذرت ہو' پشیمانی ہو' پچھتاوا ہو' اس غلطی پر' دانستگی میں اس سے سرزد ہو کر ہیلن کی ناراضی کا سبب بنی ہوگی' جس سے وہ خود لاعلم تھا۔ مسکراہٹ کا ردعمل بہت خوش کن اور حسین تھا۔ آئینہ جگمگا اٹھا تھا۔ ہیلن بھی مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ آنکھوں تک محدود رہی تھی۔ اس لمحے کے بعد اس کے معمولات وٹ آئے تھے۔ یہاں تک کہ آج........

ماجد نے چونک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ سامنے رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ انگلیوں دبا ہوا سگریٹ اس کی بے التفاتی کا شکوہ کرتے کرتے بجھ چکا تھا۔ اس نے سگریٹ کو نیچے ک کر جوتے سے مسلا۔ پھر وہ اٹھا اور کاؤنٹر پر چائے کے پیسے دے کر ریستوران سے نکل ۔ وہ بہت زیادہ بے کیفی محسوس کر رہا تھا۔ دفتر جانے کا موڈ نہیں تھا' چنانچہ وہ گھر کی طرف دیا۔ اس کا گھر ایمپریس مارکیٹ سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔

O=========== ☆ ===========O

وہ کچے پکے مکانوں کی ترقی پذیر بستی تھی' جس میں کہیں کہیں جھونپڑیاں بھی تھیں۔ پذیر اس لحاظ سے کہ گزشتہ کئی برس میں متعدد جھونپڑیاں' کچے مکانوں میں اور متعدد کچے ن پکے مکانوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہاں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ رہتے تھے لیکن بستی کی ترتیب سے مطلق العنانی ظاہر ہوتی تھی۔ کوئی گلی بہت چوڑی تھی تو کوئی بہت زیادہ تنگ ۔ کہیں کہیں چائے خانے اور پان کی دکانیں سڑکوں کے وسط تک پھیل آئی تھیں۔ سڑک پر دہ ٹریفک تانگوں اور سائیکلوں کا تھا اور اس پر گھوڑوں کی سوکھی لید نے بکھر کر فرش سا بچھا دیا ۔ دھول میں اٹے ہوئے جسموں والے نیم برہنہ بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ گلیوں سے لوں اور سڑکوں سے گلیوں تک انہی کی حکمرانی تھی۔ گھروں کے دروازوں پر کبھی کبھی کوئی ت نمودار ہوتی اور اپنے بچے کو بے سود پکارتی۔ کسی جھونپڑی کا ٹاٹ کا پردہ سرکتا اور کوئی ن سر باہر نکال کر چیختی۔ او فجو' خبیث کہاں مرگیا ہے۔ تجھے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے۔ آجا۔ ل کہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ فجو اس کی اور اس کی چیخ کی پہنچ سے دور کسی گلی یا کسی سڑک پر ڑ رہا ہوگا۔ پکڑم پکڑی کھیل رہا ہوگا۔ پھر وہ مایوس ہو کر بڑبڑاتی۔ کم بخت نے زندگی حرام کر ہے میری تو' بخت کہتے ہوئے وہ "ب" کو ایک زبر کے ساتھ متحرک کرتی اور "خ" کو مزید زبر کے ذریعے "ت" سے ملا دیتی۔ اس کے بعد اس کا سر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے غروب

ہو جاتا اور ٹاٹ کا پردہ برابر ہو جاتا۔ یہ سب کچھ وہاں کے معمولات میں شامل تھا۔

ماجد کو اپنی اس بستی اور اس کے باسیوں سے بہت پیار تھا۔ وہ انہی تنگ و تاریک گلیوں میں پلا بڑھا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ اس کے گھر کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ اس کے والد کا شمار علاقے کے چند گنے چنے پڑھکوں میں ہوتا تھا' جو تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے علاقے کے سب سے زیادہ قابل احترام لوگ تھے۔ بستی کے تمام لوگ انہیں دانشور سمجھتے تھے اور اپنا ہر مسئلہ ان لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور ان لوگوں کو بابوجی کہہ کر پکارتے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن وہ اپنے بچوں کو تعلیم سے دور رکھتے یا دور رکھنے پر مجبور ہوتے۔ اس لیے کہ وہ غربت کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی زندگی کا فلسفہ نہایت سادہ تھا۔ تعلیم پر ہنر کو فوقیت حاصل تھی' کیوں کہ تعلیم میں پلے سے جاتا تھا جب کہ ہنر سے ان کی غربت میں کمی واقع ہوتی۔ بچہ ویلڈنگ یا لیتھ کا کام سیکھتا تو گھر میں چار پیسے آتے اور مستقبل میں اچھی آمدنی کا امکان نظر آتا۔ وہ سب بے حد عملی لوگ تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں تھا کہ زندگی نے انہیں برت برت کر کتنی اہم تعلیم دی ہے۔ تعلیم اسناد سے مشروط کہاں ہوتی ہے۔

وہ بستی صرف رہن سہن کے اعتبار سے ترقی پذیر نہیں تھی۔ ماجد کو خوب یاد تھا کہ بچپن میں جب وہ اسکول جاتا تھا تو وہ علاقے کے دس بیس بچوں میں سے ایک تھا۔ اپنی گلی کے اٹھارہ گھروں میں سے وہ اسکول جانے والا واحد لڑکا تھا' لیکن اب صبح اور دوپہر کو لڑکے اور لڑکیاں یونیفارم پہنے جوق در جوق اسکول جاتے نظر آتے۔ تاہم کام پر جانے والے لڑکوں کی تعداد اس سے زیادہ ہوتی اور دن بھر گلیوں اور سڑکوں پر غل غپاڑا کرنے والے بچوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔

وہ سر جھکائے سڑک پر چلتا رہا۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف ہیلن کا خیال تھا۔ وہ اپنی گلی میں مڑ ہی رہا تھا کہ نکڑ کے پان والے نے آواز لگائی۔ "اوہو' مجید بابو ہیں۔ دفتر نہیں گئے آج؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ ہمیشہ اسے مجید ہی کہتا تھا۔

"سب ٹھیک ہے رحیمو چاچا!" اس نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا" بس...... جی ہی نہیں چاہا جانے کو۔"

"یہی تو مزے ہوتے ہیں بابو لوگوں کے۔ جب جی چاہا چلے گئے' جب جی چاہا آگئے۔" پان والے نے خوش دلی سے کہا۔

پان والے کے لہجے میں طنز نام کی کوئی چیز نہیں تھی' پھر بھی ماجد خفیف ہو کر رہ گیا۔ وہ سر جھکائے گلی میں داخل ہوا۔ گلی سنسان تھی۔ کہیں کوئی بچہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر اس نے تالا دیکھا۔ شاہد تو اس کے سامنے ہی اسکول چلا گیا تھا۔ تالے کا مطلب تھا کہ امی' ثمینہ اور زرینہ کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں اور گیارہ بجے تک یقیناً واپس آجائیں گی' کیوں کہ ثمینہ اور زرینہ کو اسکول جانا ہوگا۔ اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ وہ پڑوس

ا چابی دے گئی ہوں۔ کیوں کہ یہ تو ان کے وہم گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ اتنی جلدی ں آجائے گا۔ شاہد کی واپسی ویسے بھی ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔ ابا کی واپسی کا بھی کوئی ل نہیں تھا' کیوں کہ وہ دفتری معاملات میں پابندی وقت کا خیال رکھتے تھے۔

امکان نہ ہونے کے باوجود چابی کے متعلق پوچھ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ چابی مل ا تو خیر' ورنہ چائے خانہ تو ہے ہی۔ یہ سوچ کر اس نے شموخالہ کے دروازے کی کنڈی دی۔ دروازہ خالہ کی بڑی لڑکی نمی نے کھولا۔ نام تو اس کا نعیمہ تھا لیکن سب اسے نمی کہتے ے۔

"آہا...... ماجد بھائی ہیں۔ جلدی گھر آگئے آج؟" نمی نے لہک کر کہا۔ لیکن اس کی نکھوں کی گفتگو اور طویل تھی۔ ماجد نے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔ نمی کوئی حسین لڑکی نہیں تھی ن ہر لڑکی پر ایک ایسا موسم ضرور آتا ہے' جب وہ حسین نہ ہوتے ہوئے بھی حسین لگتی ہے۔ دل میں اتار لینے کے قابل۔ نمی بھی اسی موسم بہار سے گزر رہی تھی۔

"شش...... شموخالہ کہاں ہیں؟" ماجد نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"وہ تو خالہ' ثمینہ اور زرینہ کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ میں گھر میں اکیلی ہوں۔" نمی نے سرے جملے پر خاص طور پر زور دیا۔

"امی چابی دے کر گئی ہیں؟" ماجد نے پوچھا۔ اسے نمی کی نظروں کی چبھن کا شدید ساس تھا۔ اسی لیے وہ جلدی سے کھسک لینا چاہتا تھا۔

"جی...... چابی تو وہ دے کر گئی ہیں۔" نمی نے جواب دیا لیکن دروازے سے نہیں ٹی۔

"تو چابی لادو مجھے!" ماجد نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ بدستور کھڑی رہی۔ "وہ...... ماجد بھائی! آپ بڑے موقع سے آئے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

ماجد خاموش کھڑا مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"وہ مجھے اوپر بریکٹ پر سے صندوقچی اتارنا تھی۔ بریکٹ بہت اوپر ہے اور اسٹول ہل رہا ہے۔"

ماجد کو اس کی آواز میں خفیف سی لرزش محسوس ہوئی لیکن وہ اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ "تو میں کیا کروں؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"میری مدد کردیں نا...... پلیز...... اچھے بھائی!"

ماجد پگھل گیا۔ یہ وہی لہجہ تھا' جس میں ثمینہ اور زرینہ اس سے التجا کرتی تھیں۔ "چلو م بھی کیا یاد کرو گی۔" اس نے کہا۔ نمی جھپاک سے اندر بھاگ گئی وہ بھی اس کے پیچھے اندر اخل ہوگیا۔ نمی مکان کے اکلوتے کمرے میں کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ وہ کمرے کی طرف بڑھ

گیا۔ نمی بریکٹ کے قریب اسٹول رکھ رہی تھی۔ بریکٹ ایک فٹ چوڑا ہوگا اور خاصی بلندی پر تھا۔

"ٹھہرو' میں دیکھتا ہوں۔ شاید اسٹول پر چڑھے بغیر ہی کام بن جائے۔ کہاں ہے تمہاری صندوقچی؟"

"وہ......... وہ بالکل پیچھے ہے۔ اسٹول پر تو چڑھنا پڑے گا۔" نمی نے کہا۔

"اچھا تو میں چڑھوں؟" ماجد نے پوچھا۔

"نہیں' یہ اسٹول آپ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ آپ گر جائیں گے۔"

ماجد نے اسٹول کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ واقعی بری طرح ہل رہا تھا۔ "یہ تو واقعی مخدوش ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ تم بھی گر جاؤ گی۔"

"آپ مجھے گرادیں گے۔"

"میں نہیں گراؤں گا' اگر تمہیں گرنا ہے تو تم خود گرو گی' اپنی وجہ سے۔"

نمی جھنجلا کر کچھ کہنے کے لیے پلٹی......... ڈگمگائی اور سیدھی ماجد کے اوپر آئی۔ ماجد نے جبلی طور پر ہاتھ اوپر کرکے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ نمی کی بانہیں اس کی گردن سے لپٹیں۔ اس کے باوجود وہ سنبھلی نہیں بلکہ ماجد سمیت دری اور چاندنی کے فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ ماجد کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ اس نے بوکھلا کر نمی کو ایک طرف دھکیل دیا اور تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ غرایا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" نمی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ماجد جانتا تھا کہ نمی کی عمر بمشکل چودہ سال ہوگی۔ وہ کبھی اسکول نہیں گئی تھی۔ ان کے گھر میں ٹیلی وژن تو کجا ریڈیو بھی نہیں تھا۔ عام طور پر وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکلتی تھی۔ قد کاٹھ کی وہ اچھی تھی اور اس پر شاید بہار بھی قبل ازوقت آئی تھی لیکن پھر بھی وہ بچی ہی تھی۔ پھر یہ سب کچھ اس نے کہاں سے سیکھا۔

ماجد کو بڑے زور کا غصہ آیا۔ "کیسے پتا ہے تمہیں؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"بس پتا ہے مجھے' بہت دنوں سے بلکہ کئی سال سے۔" نمی نے جواب دیا۔ لیکن وہ سہم گئی تھی۔ اس نے نظریں جھکالی تھیں۔

"مجھے بتاؤ' کیسے پتا چلا تمہیں' یہ بتاؤ؟ ورنہ میں تمہاری پٹائی کردوں گا۔" ماجد غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔

نمی اور سہم گئی۔ اس نے ماجد کو بہت دیکھا تھا لیکن اس سے پہلے اسے کسی سے بھی اس انداز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ تو بچوں سے بھی بڑی محبت سے بات کرتا تھا۔ اس کی نرم اور مہربان طبیعت کی تو محلے میں مثالیں دی جاتی تھیں۔ اپنے گھر میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود وہ کبھی اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔

"بولتیں کیوں نہیں۔ جواب دو" وہ پھر دہاڑا۔

"وہ......... ابا......... امی........." وہ بری طرح ہکلا کر رہ گئی۔

اس کے شرم سے تمتماتے چہرے اور لرزیدہ آواز نے ماجد کو اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا لہجہ' اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ ابھی معصوم ہے' لیکن وہ معصومیت تھی کہ کسی بھی وقت پامال ہوسکتی تھی۔ وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ ایک کمرے کے ...ں' یہ تنگ جھونپڑیاں' یہ غربت کی مجبوریاں انسانی فطرت کے سامنے بند تو نہیں باندھ ...تیں۔ وہ سوچتا اور لرزتا رہا۔ یہ سب کیا ہے' کیوں ہے اور دور تک......... بہت دور تک اس ...ے نتائج کیا ہوں گے؟ لیکن اس کے پاس سوال ہی سوال تھے' جواب ایک بھی نہ تھا۔ ایک ...ال یہ بھی تھا کہ ان سوالوں کے جواب کون دے گا۔

زندگی میں پہلی بار اسے علاقے سے وحشت ہوئی۔ اس کی بھی دو بہنیں تھیں۔ ثمینہ تو ...ی کی ہم عمر تھی۔ یہ بات اطمینان بخش تھی کہ اس کا گھر مضبوط بنیادوں پر قائم تھا' کشادہ ...۔ اس اعتبار سے نمی پرائی آگ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ آگ کی فطرت میں پھیلنا بھی ہے۔ ...ے بجھایا نہ جائے تو وہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو بھی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ انسان معاشرے ...ے کٹ کر تو نہیں رہ سکتا۔ نمی کی اس کی دونوں بہنوں سے دوستی تھی۔ وہ بے تکلفی سے اس ...ے گھر میں آتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی ثمینہ اور زرینہ نمی کے گھر میں چلی جاتیں لیکن ایسا کم ہی ...ہوتا تھا۔ امی کی سختی کی وجہ سے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب یہ سلسلہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ وہ ...نمی سے کہنے ہی والا تھا کہ وہ آئندہ کبھی اس کے گھر بھی نہ آئے' لیکن اس نے بروقت خود کو ...روک لیا۔ کیا اس کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے گا؟ اس نے خود سے پوچھا۔ کیا اس طرح نمی کی تباہی ...یقینی نہیں ہو جائے گی اور اس تباہی کے ذمے داروں میں وہ بھی شامل ہوگا۔ معصوم بچوں پر ...وقت سے پہلے آگہی کا عذاب اتر رہا تھا۔ اس میں قصوروار کون ہے؟ بچے؟ والدین؟ معاشرہ؟ ...کون ہے قصوروار؟ مزید سوالات......... اور جواب ندارد۔ وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

نمی اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "آپ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟" اس ...نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"آں........." ماجد بری طرح چونکا۔ "نہیں ہونا چاہیے ناراض؟ تمہیں ایسا نہیں کرنا ...چاہیے تھا۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ........." نمی نے پھر نظریں جھکالیں۔

"نہیں گڑیا......... دل کی ہر خواہش تو درست نہیں ہوتی۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے ...اور کچھ شرطیں بھی پوری کرنا ہوتی ہیں۔" ماجد نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "تمہیں پتا ہے' ...آج اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا......... مجھ سے بھی خراب آدمی' تو پتا ہے' تمہیں کتنا بڑا نقصان ...ہوتا۔ تم کہیں کی بھی نہیں رہتیں پگلی........."

"کیسے ہوتا کوئی اور؟" نمی یکلخت بپھر گئی۔ مجھے تو بس آپ اچھے لگتے ہیں...... صرف آپ۔ اگر آپ کو برا لگا ہے تو خدا کی قسم آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گی۔"

"ہاں' مجھے بہت برا لگا ہے۔"

"قسم سے' آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔ بس آپ اتنا کہہ دیں کہ آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔"

"ایسی باتیں بھی نہیں کرتے"

"اب نہیں کروں گی لیکن میں آپ کا انتظار کروں گی ہمیشہ۔"

"میں تمہیں اپنی ثمینہ کی طرح سمجھتا ہوں۔ اچھا لاؤ اب چابی دو۔" ماجد نے کہا۔

نمی نے اسے چابی دی۔ وہ چابی لے کر نکل آیا۔ اپنے دروازے کا تالا کھول کر وہ گھر میں داخل ہوا اور اندر سے کنڈی لگادی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا' جسے بطور بیٹھک استعمال کیا جاتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ پھر اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایش ٹرے اپنے قریب کھینچ لی۔

اسے بیڈ پر دراز ہوئے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے سوچا' کون گھوم کر دروازے تک جائے بیٹھک کا بیرونی دروازہ بھی گلی میں کھلتا تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ آنگن والے دروازے پر ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ عورت کی پیٹھ اس کی طرف تھی البتہ مرد کا چہرہ ایک رخ سے نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی کتابیں تھیں۔ عورت کے ہاتھ میں صرف ایک پرس تھا۔

"جی فرمائیے" ماجد نے وہیں سے انہیں پکارا۔

مرد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسی وقت عورت بھی اس کی طرف مڑی' لیکن وہ عورت نہیں لڑکی تھی...... اور لڑکی بھی کون! وہ ہیلن تھی۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ہیلن کو دیکھتا رہا۔ ہیلن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور نہ جانے کیوں اس کے شاداب چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ہیلن کی نگاہوں میں اس لمحے وہی کیفیت تھی' جو ماجد کو اس دن نظر آئی تھی' جب اتفاقاً اسے ہیلن کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس روز وہ اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکا تھا' لیکن اس لمحے اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ ہیلن کی نگاہوں میں جو کیفیت تھی' اسے صرف خوف کہا جاسکتا تھا اور وہ یقیناً" اسے کھونے کا خوف تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ گویا اس کی محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ ہیلن بھی اس میں مبتلا تھی۔ پھر اس نے غور کیا کہ اس خوف کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں یہ خوف اس وقت دیکھا تھا' جب اسے اس کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ پھر اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ نام معلوم ہونے کا مطلب یہ معلوم ہونا تھا کہ ہیلن عیسائی ہے' یوں ہیلن کو خوف ہوا ہوگا کہ اب وہ اس سے دور ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ اس دن کے بعد کئی روز تک اس سے آنکھیں ملانے سے بچتی رہی تھی' لیکن آج کے خوف کی وجہ؟ وہ ایک لمحے میں سب کچھ سوچ گیا۔

ہیلن بھی سحرزدہ سی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا ساتھی مرد کچھ نروس سا تھا۔ شاید اسی لیے وہ ان دونوں کی بصری گفتگو سے بے خبر رہا۔ پھر وہ ماجد کی طرف بڑھا۔ یوں نظروں کا وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ ہیلن بھی اپنے ساتھی کے پیچھے چلتی بیٹھک کے دروازے تک آگئی۔ ماجد اب پوری طرح مرد کی طرف متوجہ تھا۔ اسے اپنی ازخودرفتگی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر اسے کچھ سکون ہوا کہ ہیلن کے ساتھی نے یہ بات محسوس نہیں کی ہے۔

"فرمائیے؟" اس نے رسماً" دہرایا۔

"کیا آپ ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے؟" مرد نے بڑی شائستگی سے کہا۔

عام حالات میں شاید ماجد بڑی رکھائی سے پہلے تعارف کا مطالبہ کرتا...... لیکن ہیلن کی اپنے گھر آمد تو اسے اعزاز محسوس ہورہی تھی۔ ویسے وہ اس آمد کی وجہ اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اگر مرد کے انداز میں ذرا بھی برہمی یا کشیدگی ہوتی تو وہ اسے آمد برائے گوشمالی تصور کرتا' اس یقین کے ساتھ کہ ہیلن اسے اس کی خوش فہمی کی سزا دینے آئی ہے' لیکن یہاں تو انداز بے حد پُرتپاک تھا۔ "ضرور' تشریف لائیے" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ مرد نے آہستہ سے شکریہ کہا۔

"اب فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ماجد نے مرد سے پوچھا لیکن اس کی نگاہوں کا مرکز ہیلن ہی تھی۔

"دیکھئے' ہم ایک کارِخیر کے سلسلے میں آپ سے مدد کی درخواست کرنے آئے ہیں۔" مرد نے کہا۔ ہمارا مشن دکھی انسانیت کی خدمت ہے اس سلسلے میں ہمیں فنڈز درکار ہوتے ہیں۔ یہ جو کتابیں میرے ہاتھ میں ہیں' یہ راہ بھٹکے ہوؤں کے لیے رہنمائی کی روشنیاں ہیں۔ یہ ہماری مطبوعات ہیں۔ آپ اپنی حیثیت کے مطابق ان کا جو ہدیہ دیں گے' وہ انسانیت کے کام آئے گا۔ آپ کچھ نہیں دیں گے' تب بھی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ روشنی کبھی بیچی نہیں جاتی۔ سب کچھ آپ کی خوشی پر ہے۔"

ماجد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہیلن کا چہرہ اب سفید پڑگیا تھا' اس نے اپنا چھوٹا سا پرس صوفے کے ساتھ رکھی تپائی پر رکھنا چاہا لیکن وہ نیچے گر گیا۔ ہیلن نے پرس اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اضطراب کے عالم میں انگلیاں چٹخاتی رہی۔ اب وہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا رہی تھی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" ماجد نے کہا۔

مرد نے چار کتابیں منتخب کیں اور اس کی طرف بڑھادیں۔ "آپ انہیں دیکھیے تو سہی۔" اس نے التجا کی۔

ماجد نے اس کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ان کا جائزہ لیا۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ مشنریز لٹریچر تھا' تبلیغ و ترویج مسیحیت کے سلسلے میں پھیلایا جانے والا لٹریچر۔ "میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ یہ کتابیں روشنی ہیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "یقیناً ہوں گی لیکن ان کے لیے' جو خورشیدِ ہدایت سے محروم ہیں۔ جن کے دل و دماغ اور آنکھیں بصیرت سے عاری ہیں۔ میری رہنمائی کے لیے وہ کتابِ الٰہی کافی ہے۔" اس نے اپنی الماری میں رکھے کلام پاک کی طرف اشارہ کیا۔ "اور خدا کے آخری پیغمبر کی سیرتِ پاک مجھے ہمیشہ روشنی دکھاتی رہے گی۔" وہ بے حد جذباتی ہوگیا تھا۔ اپنا یہ ردعمل خود اس کے لیے بھی حیرت انگیز تھا۔ وہ تو پیدائشی مسلمان تھا اور بس۔ مذہب کی طرف اس کا رجحان کبھی نہیں رہا تھا۔ آج جذباتیت نہ جانے کتنی تہیں چیر کر باہر نکل آئی تھی۔ اس نے ہیلن کی طرف برہمی سے دیکھا۔ ہیلن کی حالت غیر ہورہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ نہ جانے کیوں اسے ہیلن پر ترس سا آگیا۔ وہ بہت پشیمان نظر آرہی تھی لیکن مرد پر اس کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اب تو وہ مسکرا رہا تھا۔

"جذباتیت کمزوری کا ثبوت ہوتی ہے جناب!" مرد نے کہا۔ "آدمی کو ہمہ وقت حق کی جستجو کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے لیے مطالعہ اور موازنہ ضروری ہے۔ آپ بے شک ہدیہ نہ دیں لیکن ان کتابوں کو پڑھ کر تو دیکھیں۔"

"حق کی جستجو وہ کرے' جو اوہام میں الجھا ہوا ہو۔" ماجد نے تند لہجے میں کہا اور کتابیں واپس کردیں۔ "میرا مذہب دنیا کا کامل ترین مذہب ہے سورج کے بدلے وہ چراغ کیوں لوں' جو کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔"

"آپ میری بات........"

"بس جناب!" ماجد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ اس وقت میرے گھر میں' اس لیے قابلِ احترام ہیں' لیکن اب میں اس سلسلے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اس وقت گھر والے موجود نہیں ہیں ورنہ میں یقیناً چائے پلواتا آپ کو' لیکن پلیز........ آپ مجھے کسی کڑے امتحان میں نہ ڈالیں' اور اگر یہ گفتگو آپ کے لیے ضروری ہے تو ازراہِ مہربانی یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

"بہت بہتر۔" مرد اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن ہم کبھی مایوس نہیں ہوتے' اس لیے میں آپ سے بداخلاقی کی شکایت بھی نہیں کروں گا۔"

ہیلن بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماجد نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔ ہیلن نے فوراً نظریں جھکالیں۔

"میں نے آپ سے بداخلاقی کی بھی نہیں ہے" ماجد نے کہا۔ "لیکن ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ آئندہ اس مکروہ ارادے کے ساتھ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کیجیے گا۔"

اس بار مرد کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ تاہم وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔ ہیلن بھی اس ے پیچھے تھی۔ ان کے باہر نکلتے ہی ماجد نے دروازہ بند کرلیا۔ وہ پھر بستر پر دراز ہوگیا' لیکن اس اس کا ذہن بہت زیادہ منتشر تھا۔ ہیلن سے ملاقات ہوئی بھی تو کس ماحول میں۔ اسے افسوس ی تھا اور ہیلن پر غصہ بھی آرہا تھا' لیکن ہیلن کی کیفیت اور اس کے تاثرات یاد آتے تو اس کا ہ زائل ہو جاتا۔ اسے سر میں بھاری پن کا احساس ہونے لگا۔ یہ چائے کی طلب کی علامت ی لیکن اس وقت اس پر سستی بھی سوار تھی۔ وہ کچن میں جاکر خود چائے بنانے کے موڈ میں ہیں تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور اس صوفے کی طرف بڑھ گیا جس پر ہیلن بیٹھی تھی۔ انک اسے صوفے پر تپائی کے درمیان ہیلن کا پرس نظر آیا۔ اس نے پرس کی طرف ہاتھ ھایا اور کچھ سوچ کر رک گیا۔ جی چاہتا تھا کہ پرس کھول کر اس کا جائزہ لے' لیکن یہ بددیانتی تی اور وہ کم از کم مشنری کی کسی مبلغہ کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دوبارہ بیڈ پر آلیٹا۔ اس ے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا دس بجے تھے امی بھی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا اور راکھ ایش ٹرے میں جھٹکتا رہا۔ اچانک ایک خیال ے اسے چونک کر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ ہیلن یقیناً واپس آئے گی اپنا پرس لینے۔ یہ خیال آتے اس کا دل ایسی تیزی سے دھڑکا گویا تڑپ کر باہر نکل آئے گا۔ جسم میں خوشگوار سی سنسنی ی دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے سارا ہیجان سرد ہوگیا۔ وہ مسیحیت کی تبلیغ کرنے اس کے گھر ئی تھی۔ اسے غصہ آنے لگا۔ پھر اس نے سوچا کہ ہیلن نے تو اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ عجیب کشمکش میں گرفتار ہوگیا۔ وہ ہیلن سے چڑ بھی رہا تھا اور اس کا منتظر بھی تھا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی' بیٹھک کے دروازے پر۔ وہ اٹھا اور انے دروازہ کھول دیا۔ حسبِ توقع وہاں ہیلن موجود تھی۔ زرد چہرہ' جھکی ہوئی آنکھیں۔

"معاف کیجیے گا........ میرا پرس شاید یہیں کہیں رہ گیا ہے۔" ہیلن نے نظریں جھکائے ائے کہا۔

"آیئے' خود ہی دیکھ لیجیے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ خود کو فریب دے رہا تھا کہ اسے زحمت دے کر اس سے بدلہ لے رہا ہے۔ حالانکہ وہ دل کی خواہش پوری کر رہا تھا کہ اندر آجائے۔ ورنہ وہ اس سے یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ آپ یہیں ٹھہریے میں ابھی آپ کا ل لادیتا ہوں۔

ہیلن صوفے کی طرف گئی اور اس نے اپنا پرس اٹھالیا۔ پھر وہ ہچکچاتے ہوئے دروازے طرف بڑھی' لیکن درمیان میں ہی رک گئی۔ اسی وقت آنگن والے دروازے پر دستک ئی۔ ماجد نے آگے بڑھ کر دروازے سے جھانکا۔ ئی ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ماجد نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس کا سوال فضول تھا کیوں کہ جواب ے معلوم تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید نمی کی تازہ ترین حرکت کی وجہ سے ماجد وہ چائے قبول نہ کرتا، لیکن اس وقت تو وہ عجیب نفاق سے دوچار تھا۔ ایک طرف ہیلن سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا، دوسری طرف وہ اسے سزا بھی دینا چاہتا تھا۔ اسے ہیلن کا تبلیغ کے لیے آجانا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"یہیں لے آؤ" اس نے نمی کو پکارا۔

نمی بیٹھک کی طرف چلی آئی، لیکن دروازے ہی پر ٹھٹک گئی۔

"اوہ......... تو یہ بھی ہیں یہاں!" اس نے حیرت سے کہا۔

"تم انہیں جانتی ہو کیا؟" ماجد نے ہیلن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نمی سے پوچھا۔

"ابھی دس منٹ پہلے دیکھا تھا۔ یہ ایک صاحب کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ صاحب بولتے تھے، کچھ باتیں کرنا ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ اس وقت گھر پر کوئی نہیں ہے، بعد میں آنا، ٹھیک کیا نا؟"

"بہت اچھا کیا" ماجد نے بڑی محبت سے کہا۔ "لیکن مجھ سے حماقت ہو گئی کہ میں نے انہیں اندر بلالیا۔"

خفت کے مارے ہیلن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ خاموش رہی۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے؟" نمی نے ہیلن سے پوچھا۔

"نہیں شکریہ۔"

ماجد، ہیلن کی طرف مڑا۔ "یہ نعیمہ ہے۔" اس نے نمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسے پیار سے نمی کہتا ہوں۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔" اس وقت وہ صرف ہیلن کو تکلیف پہنچانا چاہتا تھا۔

نمی نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر شرما کر نظریں جھکا لیں۔

"اب میں چلتی ہوں۔ گھر اکیلا ہے" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بھاگ گئی۔

نمی کے جانے کے بعد ہیلن نے ماجد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "پرسوں کا تو بہانہ تھا، درحقیقت میں آپ سے معذرت کرنے آئی تھی۔" وہ بہت صاف اردو بول رہی تھی۔ ماجد کو بے حد حیرت ہوئی۔

"معذرت! کس بات کی معذرت؟" ماجد نے ترش روئی سے پوچھا۔

"جو کچھ ہوا، اس پر معذرت۔ میں تو یوں بھی مائیکل کے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھی لیکن پاپا نے زبردستی مجھے بھیج دیا اس لیے مجھے آفس سے بھی چھٹی کرنا پڑی۔"

ماجد کو اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اور لہجے میں سچی معذرت محسوس ہوئی اور اس کا دل یک لخت موم ہو گیا۔ "میں اب بھی نہیں سمجھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں تبلیغ کے چکر میں کبھی نہیں پڑتی۔ میں تو خود حق کی جستجو میں ہوں۔ میں کسی کو کیا

راستہ دکھاؤں گی، اور پھر آپ کے سامنے اس انداز میں آنا، مسٹر.........؟"

ماجد کو پہلی بار خیال آیا کہ لڑکی تو اس کا نام بھی نہیں جانتی۔

"اوہ......... میرا نام ماجد ہے......... ماجد رشید" اس نے جلدی سے کہا۔

"ماجد" لڑکی نے خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا۔ "ماجد" ایسا لگتا تھا کہ وہ اس نام کو اپنے وجود میں اتار رہی ہے......... سانسوں کے ذریعے......... دھڑکنوں میں بسا رہی ہے۔

ماجد کو اس کے منہ سے اپنا نام سننا بہت اچھا لگا۔

"ماجد.........! میں پہلے ہی جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن میں آپ کی نظروں سے گر جاؤں گی۔ اب اس انداز سے آپ کے سامنے آنے کے بعد......... خیر چھوڑیے۔ آئی ایم سوری......... ایکسٹریملی سوری۔"

ماجد کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ ہیلن جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کا صریحاً ایک ہی مطلب تھا اور وہ مطلب اس کے لیے بے حد خوش آئند تھا۔ خوشی کا وہ لمحہ تتلی کی طرح اس کی انگلیوں پر رنگ چھوڑ کر اڑنے والا تھا۔ اسے اس لمحے کو گرفت میں لینا تھا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میری نظروں میں تو آپ اب بھی ویسی ہی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں، میں آپ سے کتنی........." اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

ہیلن نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پہلے وہ نظریں حقیقت کو ٹٹولتی محسوس ہوئیں، بڑی بے یقینی کے ساتھ، پھر ان میں حیرانی جھلکی اور اس کے بعد ان میں ایک بے نام سی مسرت چمکی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور کمرہ جیسے جگمگا اٹھا۔ وہ چند لمحے انتظار کرتی رہی، پھر بولی۔ "آپ اپنا جملہ مکمل نہیں کریں گے۔"

ماجد بوکھلا گیا۔ "آ......... آپ تشریف رکھیے نا......... پلیز......... تھوڑی دیر بیٹھ جائیے، میری خاطر۔"

ہیلن بیٹھ گئی۔ "اچھا، تو جو میں سننا چاہتی ہوں، وہ آپ کہنا نہیں چاہتے۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں۔" ماجد نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"کہنے سے آدمی کمٹ ہو جاتا ہے۔ اس کمٹمنٹ سے دوسرے آدمی کو سیکیورٹی ملتی ہے۔ پلیز......... آپ اسے اصرار نہ سمجھیں۔ میں جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر آدمی اپنی طبیعت سے مجبور ہوتا ہے، جیسے میں ہوں۔ میں دل کی بات دل میں نہیں رکھتی۔ ہر حال میں متعلقہ شخص تک پہنچاتی ہوں۔ اب چاہے آپ برا سمجھیں، میں کہے بغیر نہیں رہوں گی۔ آئی ایم ان لو ودھ یو۔ آئی ہیو نو کنٹرول اوور مائی سیلف، سنس آئی ہیو سین یو دی فرسٹ ٹائم بٹ......... میں ڈرتی ہوں۔"

ماجد سناٹے میں آگیا۔ انگریزی میں اظہار محبت کتنا آسان تھا۔ ہیلن نے اپنے دل کا بوجھ کتنی آسانی سے اتار دیا۔ تھا اسے ہیلن پر رشک آنے لگا۔ وہ تو یہ سب کچھ بن کر دہرانے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ "آپ ڈرتی ہیں' کس سے؟" اس نے پوچھا۔

"خود سے' آپ سے' اردگرد کے سارے لوگوں سے' آپ کے لوگوں سے' اپنے لوگوں سے' اپنے اور آپ کے مشترک جذبے سے۔" ہیلن نے کہا۔

"کیوں؟ ڈرنے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ آپ جذباتی ہیں۔ اب آپ کا یہ سوال یہ بات ثابت کر رہا ہے۔ جذباتی لوگوں میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔"

"تو آپ جذباتی نہیں ہیں؟"

"نہیں' میں اینالائیٹیکل ہوں۔ آپ جذباتی ہیں۔ اسی لیے میرا ڈر اور بڑھ گیا ہے۔"

"لیکن میں اس کی وجہ اب بھی نہیں سمجھا۔"

"دیکھیے' میرے اور آپ کے درمیان ایک بُعد بھی ہے........ اور آپ کی جذباتیت اسے کسی بھی لمحے بڑھا سکتی ہے۔ سو آئی فیل اَن پروٹیکٹڈ اینڈ ولنریبل۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ماجد نے جلدی سے کہا۔ قریب سے دیکھنے اور باتیں کرنے پر وہ اور پیاری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"حالاں کہ کچھ دیر پہلے آپ اپنے رویے سے یہ بات ثابت کر چکے ہیں۔"

"تو کیا میں اپنے گھر میں مسیحیت کی تبلیغ کی اجازت دے دوں؟" ماجد بھڑک گیا۔

"دیکھ لیں' آپ پھر جذباتی ہوگئے" ہیلن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے زندگی میں کبھی مسیحیت کی تبلیغ نہیں کی' کر بھی نہیں سکتی۔ میں نے تو آپ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن آپ نے مائیکل کے ساتھ مجھے بھی ذلیل کیا۔ دوسری طرف میں جذباتی نہیں ہوں اور آپ سے تعلق بھی محسوس کرتی ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی لیکن میں نے تعلق خاطر کی اہمیت کے پیش نظر نہ صرف اسے نظرانداز کردیا بلکہ آپ سے معذرت کرنے کے لیے دوبارہ چلی آئی۔ سچ کہیں' آپ میری جگہ ہوتے تو ایسا کرسکتے تھے؟"

سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ماجد کو ایک لمحے میں اندازہ ہوگیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ شرمندہ ہوگیا۔ "آئی ایم سوری" اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ نے ناول لو اسٹوری پڑھا ہے؟" ہیلن نے اس کی معذرت کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پڑھیے گا۔ اس میں ایرک سیگل نے ایک آفاقی مکالمہ دیا ہے۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "اگر آپ اسے ہمیشہ یاد رکھنے کا وعدہ کریں تو سناؤں۔"

ماجد نے اثبات میں سرہلادیا۔

"وہ مکالمہ ہے' لو مینز نیور ہیونگ ٹو سے' یو آر سوری۔"

ماجد کو اس مکالمے کی معنویت نے دہلادیا۔ "لیکن آپ خود مجھ سے معذرت کرنے آئی ں۔" اس نے اعتراض کیا۔

"صرف اس لیے کہ آپ سے ملنے کی یہی ایک صورت تھی" ہیلن نے بے حد سادگی ے کہا۔

ماجد گنگ ہو کر رہ گیا۔

"اچھا' اب میں چلتی ہوں۔" ہیلن اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماجد بھی مضطربانہ اٹھ گیا۔ "پھر کب ملیں گی؟" اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

ہیلن نے نظریں اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔ "مجھ سے ملنا چاہتے ہیں آپ؟"

"جی ہاں' ہر روز۔"

"جس وقت اور جہاں کہیں گے' مل جاؤں گی۔ میں آپ کے ماحول کی لڑکی تو نہیں ہوں ۔چھپ چھپ کر ملوں۔"

ہیلن کے لہجے میں شاید خفیف سا طنز تھا' لیکن ماجد کو اب کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ ا شام چھ بجے کیفے اوڈین کے سامنے میں آپ کا انتظار کروں گا۔" اس نے کہا۔

"اوکے سی یو دین۔" ہیلن نے کہا۔ پھر اس کی نظر چائے کی پیالی پر پڑی' جو اب بھی ر کی ہاتھ میں تھی۔ "چچ چچ........ اتنی محبت سے بنائی گئی چائے آپ نے ٹھنڈی کردی۔" انے سادگی سے کہا۔

ماجد نے پیالی کو دیکھا۔ چائے واقعی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ "میں تو یہ چائے قبول بھی نہ ا" اس نے کہا۔ "بس ذرا آپ........"

"میں جانتی ہوں۔ آپ نے انتقاماً یہ چائے قبول کی تھی۔" ہیلن نے ہنستے ہوئے کہا کے........ بائی۔" پھر وہ ماجد کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہوا کے جھونکے کی طرح بیٹھک سے ا گئی۔

O=============☆=============O
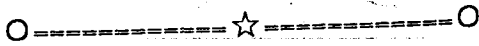
اس رات ماجد بہت دیر تک سو نہیں سکا۔ ہیلن کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی ا۔ اس کی باتیں اس کی سماعت میں رس گھولتی رہیں۔ درحقیقت وہ تھی بھی ایسی ہی کہ اس بارے میں عمر بھر سوچا جاسکتا تھا۔ ماجد اس کی صاف اور رواں اردو پر حیران تھا دوسری ۔اس کا انگریزی کا مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ تبلیغ کے ذکر پر ہیلن ہ عجیب سا ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا' میں نے کبھی تبلیغ نہیں کی' کر بھی نہیں سکتی۔ میں تو ن کی جستجو میں ہوں' میں کسی کو کیا روشنی دکھاؤں گی۔ آخر اس بات کا کیا مطلب تھا؟ کیا

کہنا چاہتی تھی وہ؟ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ تنگ آکر اس نے اس کے جلووں میں پناہ لی۔ پھر اچانک اس کے سامنے نمی آکھڑی ہوئی۔ نمی جس کی معصومیت زبردستی کی آگہی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بھی اظہار محبت کیا تھا۔ وہ اس کی پیار بھری ڈانٹ سے بہت مرعوب ہوگئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ صرف اسی کے ساتھ ایسا کرسکتی تھی' کیوں کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ ماجد جانتا تھا کہ نمی کا وعدہ مشروط ہے' اس کے التفات سے۔ اس کا التفات ہی نمی کو بچا سکتا تھا۔ علاقے کے ماحول سے بھی وہ بخوبی واقف تھا' اور یہ بھی جانتا تھا کہ پکے ہوئے پھل کے لیے بعض اوقات شاخ ہلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اسے تو ہوا کے ایک جھونکے کا بہانہ درکار ہوتا ہے اور ایسے میں وہ کسی بھی راہ گیر کی جھولی میں جاگرتا ہے۔ یوں کسی اونچ نیچ کی صورت میں ماجد کا کچھ بگڑتا بھی نہیں تھا' لیکن طبعاً" وہ اپنے گردوپیش سے لاتعلق رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ نمی ابھی بچی تھی۔ اسے برے بھلے کی تمیز نہیں تھی۔ دوچار سال بعد وہ ذہنی طور پر پختہ ہوجائے گی۔ اس دوران وہ اسے بے ضرر التفات کی مدد سے بہلا کر خوف ناک انجام سے بچا سکتا تھا۔ دن میں دو ایک بار نرمی سے بات کرلینے میں اس کا جاتا بھی کیا تھا۔ صرف اسی صورت میں وہ آگہی کی ترغیب سے بچ سکتی تھی۔ دوچار سال بعد نمی خود اس بارے میں سوچے گی تو اسے اپنی حماقت قرار دے کر اس پر ہنسے گی۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوگیا۔

اس کے خیالات کی رو پھر ہیلن کی طرف مڑگئی۔ وہ آنے والی شام ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا اور خوشگواریت کا احساس لیے بالآخر سوگیا۔

O============☆============O
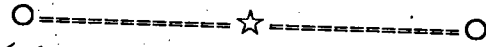
صبح وہ معمول کے مطابق دفتر کے لیے نکلا۔ اس روز بس میں آئینے کو تکتے ہوئے اس کے انداز میں ہمیشہ سے زیادہ بے تابی تھی' لیکن ہیلن نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔ وہ زبانِ خامشی میں اسے پکارتا رہا۔ اس کی کوئی پکار ہیلن کی سماعت تک نہیں پہنچی! شاید اس نے دانستہ اسے نظرانداز کر دیا۔ البتہ اپنے اسٹاپ پر اترتے وقت اس نے ایک بار اسے دیکھا اور پھر بس سے اتر گئی۔ اس کے اترنے کے بعد وہ مسلسل سوچتا رہا کہ آج ہیلن کی بے رخی اور بے نیازی کا کیا سبب تھا۔ انہی سوچوں میں گم وہ آفس میں پہنچا۔ کچھ دیر کام کیا........ لیکن اس روز کام میں دل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ پھر ہیلن کی بے رخی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی ناراضگی تھی؟ ممکن ہے' کہ کوئی بات اسے بری لگی ہو' لیکن اترتے وقت اس کا دیکھنا اس بات کی نفی کر رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہوں میں بھی خفگی نہیں بلکہ پیار تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا شاید پہلے کی بات اور تھی۔ تب انکے درمیان گفتگو نہیں ہوئی تھی لیکن کل کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا صورت حال اس کے لیے کیوں نہ بدلی۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو' بہرحال یہ حقیقت تھی کہ صورت حال ہیلن کے لیے بدلی

تھی۔ شاید اس لیے کہ اس نے اظہار کے ذریعے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا تھا۔ وہ خود اب بھی آئینے میں اس سے آنکھوں آنکھوں میں بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ بات جو وہ کل موقع ملنے کے باوجود زبان سے نہیں کہہ سکا تھا۔ ہاں' شاید یہی بات تھی۔

وہ شام کے انتظار میں شام کے بارے میں سوچتا اور خواب دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی انسان کو تعبیر کے انتظار میں تعبیر کے خواب بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ اس کا اندازہ اسے پہلی بار ہوا تھا۔ اس روز اس نے اپنے کسی ساتھی سے بات کی نہ کوئی شرارت۔ حالاں کہ وہ آفس میں شرارتی اور چلبلا مشہور تھا۔ دو ایک ساتھیوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ دفتر سے نکلا' بس پکڑی اور اوڈین کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہاں اتر کر وہ کیفے اوڈین کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ گویا ہیلن کی آمد میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اب وہ خوف محسوس کرنے لگا۔ اس نے ہیلن کو مدعو تو کرلیا تھا لیکن یہ اس کے لیے پہلا موقع تھا' کسی لڑکی کو کسی ریسٹورنٹ میں لے جانے کا۔ یوں کیفے اوڈین اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ عموماً" اپنے دوستوں اور آفس کے ساتھیوں کے ساتھ آتا رہتا تھا۔ اوپر فیملی کیبن تھے اس کے لیے دروازہ لگ تھا۔ سامنے ہی سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ اوپر جا کر فیملی کیبنز کا جائزہ لے لیکن اسے ڈر تھا کہ کوئی ویٹر اسے روک دے گا۔ یہ کہہ کر کہ اوپر صرف فیملی والے جاسکتے ہیں۔

ہیلن مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ گئی۔ وہ اوڈین ہی کے اسٹاپ پر چھ نمبر بس سے اتری تھی۔ ماجد کو حیرت ہوئی کہ وہ 21 نمبر سے نہیں آئی ہے۔

"ہیلو" ہیلن نے بے حد شگفتگی سے کہا۔ "کیسے ہو ماجد؟" اس کے انداز میں ایسی بے تکلفی تھی' جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

ماجد نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی شناسا اسے ہیلن کے ساتھ دیکھ لے گا۔

ہیلن نے بھی یہ بات بھانپ لی۔ "ڈر رہے ہو' ہے نا؟ واپس چلی جاؤں میں؟"

"نہیں' یہ بات نہیں۔ میں تو بس یونہی" ماجد نے جھینپ کر کہا۔ "آیئے چلیں"۔

وہ کیفے اوڈین کے اوپری منزل پر پہنچے۔ وہاں علیحدہ کیبن بھی تھے جن پر پردے لہرا رہے تھے۔ اس کے علاوہ باہر بھی میزیں لگی تھیں۔ پوری منزل سنسان پڑی تھی۔ ماجد نے باہر والی میزوں کی طرف بڑھنا چاہا لیکن ہیلن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہاں نہیں' ہم اندر بیٹھیں گے"۔ اس نے اسے ایک کیبن کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ماجد نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ کیبن میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "آدمی کو پرائیوسی کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے........ اپنے لیے

بھی اور دوسروں کے لیے بھی"۔ ہیلن نے کہا۔

ماجد کہنا چاہتا تھا کہ پرائیویسی کی حدود گھر سے شروع ہو کر گھر پر ہی ختم ہو جاتی ہیں، لیکن چاہنے کے باوجود وہ یہ بات نہ کہہ سکا۔ "آپ اس راستے ...."

"میرا خیال ہے، اب ہمیں یہ آپ جناب کا تکلف برطرف کر دینا چاہیے"۔ ہیلن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جی، جی ہاں۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تم ایکس نمبر کی بجائے چھ نمبر میں کیسے آئیں؟" ماجد نے پوچھا اسے ہیلن کو تم کہہ کر مخاطب کرنا عجیب بھی لگا تھا اور اچھا بھی۔

"ایکس نمبر دیر سے پہنچاتی اور وہ بھی ایمپریس مارکیٹ۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں لیٹ بھی ہو سکتی تھی۔ اسی لیے میں آفس سے میکلوڈ روڈ اور وہاں سے بولٹن مارکیٹ کی طرف نکل آئی"۔

ماجد کو افسوس ہوا کہ اس نے ملاقات کا وقت طے کرتے ہوئے اس سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ اس کی چھٹی کس وقت ہوتی ہے۔ یہ اس کی خودغرضی کا ثبوت تھا۔ "تو تم مجھے بتادیتیں ہم بعد کا کوئی وقت رکھ لیتے"۔ اس نے کہا۔

"جب کہ میں تم سے کہہ چکی تھی کہ جس وقت اور جہاں کہو گے، مل جاؤں گی۔ اس کے بعد کسی بات کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے" اس نے ماجد کو یاد دلایا۔

"اوہ، تو اتنا پاس ہے، اپنے لفظوں کا؟"

"اس سے بھی زیادہ۔ کبھی آزما لینا۔ میں نہ کبھی جھوٹ بولتی ہوں اور نہ مصلحت سے کام لیتی ہوں" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

اسی وقت ویٹر آگیا۔ "کیا پیو گی؟" ماجد نے اس سے پوچھا۔

"جو جی چاہے، منگوالو"۔

ماجد نے ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا........ اور ہیلن کو بغور دیکھنے لگا۔ ہیلن کو اس کی نگاہوں کا احساس تھا لیکن وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اپنی خوش قسمتی کا ثبوت دیکھ رہا ہوں"۔

"خوش قسمتی کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی ماجد!"

اس کے لہجے میں حجاب تھا۔ ماجد نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی، تضادات سے عبارت، نہایت سادگی سے گہری بات کہہ جاتی تھی۔ اس وقت اس نے کتنی سادگی سے، بغیر کہے اس کے وجود کو اپنی خوش قسمتی کا ثبوت کہہ دیا تھا۔ ایک طرف تو وہ اتنی بولڈ تھی کہ اس نے بغیر ہچکچائے پہلی ہی گفتگو میں اظہار محبت کر دیا تھا۔ دوسری طرف یہ اشارے کنائے کا انداز، یہ حجاب۔ ماجد اسے دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ تازگی نہیں تھی

جو صبح نظر آتی تھی۔ پھر ہیلن نے نظریں اٹھائیں۔ ماجد کو اس کی آنکھوں میں تھکن اور اضمحلال کا تاثر نظر آیا۔

"تم کام کیا کرتی ہو ہیلن؟" اس نے پوچھا

"ایک امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم میں اسٹینو ہوں۔ دن بھر شارٹ ہینڈ اور ٹائپ۔ آج کام بھی زیادہ ہی تھا"۔ اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھی۔ "تم کہاں سروس کرتے ہو؟"

"میں کے پی ٹی میں ہوں"۔

"سرکاری ملازمت؟ تب تو مزے ہوں گے تمہارے؟"

"ہاں، یہ تو ہے لیکن تنخواہ کم ہے"۔

ویٹر چائے لے آیا۔ ہیلن نے چائے بنائی اور پیالی اس کی طرف بڑھادی۔ "اب بتاؤ، مجھے کیوں بلایا ہے" اس نے کہا۔ پھر خود ہی صفائی پیش کی۔ "اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے صرف اسی صورت میں بلا سکتے ہو، جب کوئی بات ہو۔ یہ بات نہیں ہے، تم جب اور جہاں بلاؤ گے میں ضرور پہنچوں گی"۔

"کچھ بھی نہیں، بس تمہیں قریب سے دیکھنا، تمہیں سمجھنا چاہتا ہوں میں"۔ ماجد نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "اگر میں سگریٹ جلالوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"یہ بات تم نے پہلے کبھی سوچی؟ تم میرے عین پیچھے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے ہو"۔

"تب کی بات اور تھی"۔

"یہاں مجھے تم سے اختلاف ہے۔ محبت کا انحصار اظہار پر تو نہیں ہوتا۔ میں تو شروع ہی سے تمہارے بارے میں اپنائیت سے سوچتی رہی ہوں"۔

ماجد جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ وہ شرمندہ ہوگیا۔ یہ دوسری ہی ملاقات تھی لیکن اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس لڑکی کی سچائی اسے آئندہ بھی شرمندہ کرتی رہے گی۔ "تم عجیب لڑکی ہو"۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "ویسے تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا"۔

"یہ لہجہ تم پر بہت اچھا لگتا ہے، بہت سوٹ کرتا ہے تمہیں"۔ ہیلن نے آنکھیں موندتے ہوئے، خواب ناک لہجے میں کہا۔ "کاش، تم مجھ سے ہمیشہ اسی لہجے میں گفتگو کرتے رہو اور ہاں، پہلے مجھے سگریٹ کا دھواں بہت برا لگتا تھا، لیکن جب سے تم ملے ہو، یہ بات نہیں رہی، بلکہ تمہارے سگریٹ کا دھواں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے"۔

اس کی نگاہوں میں، اس کی باتوں میں، لہجے، ہر انداز میں ایسی محبت تھی کہ ماجد سرشار ہو کر رہ گیا۔ اس نے بڑی ممنونیت سے ہیلن کو دیکھا اور سگریٹ سلگالیا۔

"ہاں، تو تم میرے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔ ایسا کرو، پہلے تم سوال پوچھو۔ جب تمہارے پاس سوال ختم ہو جائیں گے تو میں تمہیں خود اپنے بارے میں بتاؤں گی۔ سب کچھ

بتاؤں گی ' کچھ نہیں چھپاؤں گی ' سوائے ایک بہت بڑے سچ کے ' جو مجھ پر میری روح کا قرض ہے"۔

"تم رہتی کہاں ہو؟"

"اس کا جواب میں عملاً" دوں گی۔ آج میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں گی ' اپنی مما اور پاپا سے ملاؤں گی تمہیں"۔

"تم اتنی اچھی اردو کیسے بولتی ہو۔"

"اردو ہی کیا میں تو........" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "دراصل مجھے ابتدا ہی سے ادب سے لگاؤ رہا ہے۔ پھر میری اردو کی ٹیچر بھی مجھ پر بہت توجہ دیتی تھیں۔ اردو ادب میں نے گھول کر پی ڈالا ہے ' تلفظ کے سلسلے میں میری ٹیچر نے میری رہنمائی کی۔ وہ تو شکر کرو ' میں نے تمہیں اب تک شعر نہیں سنائے۔ فراز اور ناصر کے سیکڑوں شعر یاد ہیں مجھے"۔ اس کے لہجے میں انکسار ہی انکسار تھا۔ "انگریزی ناول بھی بہت پڑھے ہیں میں نے ' لیکن وہاں تخصیص نہیں ہے کوئی۔ بس ' جو ناول مل گیا ' پڑھ ڈالا۔ اگر موقع ملا ہوتا تو شاید میں بھی لکھتی۔ شروع ہی سے میرا رجحان لکھنے کی طرف تھا"۔ اس کا لہجہ اداس ہوگیا۔

"مجھ سے........ مجھ سے تعلق کا احساس تمہیں کب ہوا؟"

"اس سوال کا جواب پہلے تم دو گے؟"

"مجھے تم پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھیں۔ تمہارے آنچل کا وہ پہلا لمس ' اس سے پہلے کسی لمس نے مجھے اس طرح نہیں جھنجھوڑا تھا۔ پھر میں نے آئینے میں تمہارا عکس دیکھا اور بس۔ مجھے پتا چل گیا کہ میں خود کو ہار گیا ہوں۔ میں ہمیشہ پہلی نظر کی محبت کا مذاق اڑاتا تھا۔ شاید اسی لیے کہ مجھے خود اس کا شکار ہونا تھا"۔ ماجد نے پوری سچائی سے جواب دیا۔ اب اس کی جھجک ختم ہوگئی تھی۔ "اب تم بتاؤ"۔ اس نے کہا۔

"مجھے تم سے تعلق کا پہلا احساس اس وقت ہوا تھا جب میں نے ہوش سنبھالا تھا"۔ ہیلن نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "اس وقت تم ' تم نہیں تھے ' بلکہ یوں کہو کہ تمہارا کوئی نام نہیں تھا۔ اس روز بس میں مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میرا آنچل پیچھے جا گرا ہے۔ میں نے آئینے میں تمہیں دیکھا۔ تم اس وقت آئینے کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ میں تمہارے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی۔ تمہیں اچھا لگا تھا لیکن تم ڈر رہے تھے۔ تم بظاہر دوسری طرف متوجہ ہوگئے لیکن کن انکھیوں سے میرے آنچل کو دیکھتے رہے۔ بس اسی لمحے میں تمہیں پہچان گئی کہ تم وہی ہو ' جس کی میں برسوں سے آرزو کرتی رہی ہوں........"

"لیکن تم نے مجھ میں کیا دیکھا؟ میں کیوں بھایا تمہیں؟" ماجد نے پوچھا۔

"تو کومت میں یہی بتانے والی تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ماحول میں کتنی آزادی ہے ' لیکن نہ جانے کیوں ' میں شروع ہی سے مختلف ہوں۔ میں نے اس آزادی کا کبھی غلط

ستعمال نہیں کیا۔ میں نے خود اپنے آپ پر پابندیاں لگائیں۔ ہمارے ہاں محبت کھیل ہے لیکن یں شروع ہی سے محبت کا کچھ اور تصور رکھتی ہوں۔ مجھے اب تک بیسیوں مردوں کے ظہار محبت سے واسطہ پڑچکا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ کبھی اچھا نہیں لگا۔ یوں میرے ذہن میں تمہارا تصور جمتا گیا۔ اس روز میں نے تمہیں گھبراتے دیکھا اور تمہیں پہچان گئی۔ پھر تم نے آئینے یں مجھے دیکھا۔ تم نظریں چرا رہے تھے ' چپکے چپکے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس روز صحیح معنوں میں پہلی بار مجھے پتا چلا کہ محبت کتنا حسین جذبہ ہے لیکن ساتھ ساتھ میں بھی ڈرنے لگی کہ تمہیں میرے کرسچن ہونے کا پتا چلے گا تو تم مجھ سے دور ہو جاؤ گے"۔

ماجد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت انگیز لڑکی تھی ' اس کی باتیں اور اس کی محبت بھی حیرت انگیز تھی۔

"اب تھوڑی دیر بعد میں تمہیں اپنے گھر لے کر چلوں گی" ہیلن نے مزید کہا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے لواحقین کے متعلق بتادوں۔ مما بہت اچھی ہیں ' مہربان اور محبت کرنے والی۔ پاپا بہت اچھے تھے ' اب ذرا چڑچڑے ہوگئے ہیں ' میرے علاوہ دو بہنیں ہیں۔ میری مجھ سے بڑی ہے۔ وہ بھی سروس کرتی ہے۔ شیلا مجھ سے چھوٹی ہے اور کالج میں پڑھ رہی ہے۔ پاپا کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میں اور میری کالج نہیں جاسکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ شیلا کو یہ محرومی نہ ملے۔ میرے پاپا بہت شراب پیتے ہیں لیکن وہ کیا کریں۔ وہ بہت زندہ دل آدمی تھے ' بے حد فعال۔ حادثے میں ان کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ اب وہ بستر تک محدود ہیں۔ سوائے پینے کے اور کیا کرسکتے ہیں؟"

بیرا بل رکھ گیا۔ ماجد نے دس کا نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میرا جی چاہ رہا تھا بل دینے کو لیکن میں جانتی ہوں کہ تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔ ویسے بھی میرا دل تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے"۔

"تم مجھے گھر پر چائے پلا دینا۔ اب چلیں؟"

ہیلن نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اٹھے اور باہر نکل آئے۔

O============☆============O
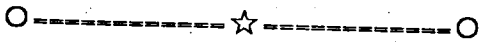
وہ ماجد کے لیے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ صدر کا علاقہ اس کا دیکھا بھالا ہے لیکن آج وہ جس صدر کو دیکھ رہا تھا ' وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ گلیوں میں قدیم عمارتیں تھیں ' جن میں سے بہت سی خطرناک حد تک بوسیدہ تھیں۔ گلیوں میں متعدد جوڑے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کوئی کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کبھی کوئی سر اٹھا کر دیکھتا اور ہائے ہیلن........ ہیلو ہیلن کہتا اور پھر مصروف ہو جاتا۔ گلی سے گزر کر وہ مین روڈ پر پہنچے اور اسے کراس کرکے دوسری گلی میں پہنچ جاتے۔ تمام گلیاں ' ان میں ایستادہ عمارتیں اور وہاں کا ماحول ' سب کچھ ایک جیسا تھا۔ انہیں علیحدہ سے شناخت کرنا آسان

نہیں تھا۔ پھر انہوں نے مینس فیلڈ اسٹریٹ کراس کی اور ایک گلی میں داخل ہوئے۔ گلی میں چار لڑکے کھڑے تھے۔ آدھی آستین والی بشرٹیں اور جینز پہنے۔ ان میں ایک لڑکا ہیلن کو دیکھ کر آگے بڑھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے' بڑی بڑی قلمیں اور گھنی مونچھیں تھیں۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا کڑا تھا۔ گریبان کھلا ہوا تھا اور گلے میں پڑی ہوئی پتلی سی زنجیر نظر آرہی تھی۔

"ہائے ہیلن!" اس نے بے حد تپاک سے کہا۔ "آج تم دیر سے آئی ہو۔ یہ ساتھ میں کون ہے؟"

"ہی از مائی فرینڈ"۔ ہیلن نے خشک لہجے میں کہا اور ماجد کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔

"تو تم کو دوستی کرنا آگیا ہیلن۔!" لڑکا عقب سے چیخا۔ "قسم توڑنا تھا تو ہم سے کہتی' ہم حاضر........"

"اوہ شٹ اپ ولسن!" ہیلن نے پلٹ کر دیکھے بغیر سخت لہجے میں کہا"۔ مائنڈ یور اون بزنس"۔

ہیلن کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ دروازے کے عین اوپر ایک چھوٹی سی صلیب گڑی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلے گئے۔ فلیٹ میں دو کمرے تھے۔ پہلا بطور سٹنگ روم استعمال ہوتا تھا۔ ہیلن ماجد کو اسی کمرے میں لے گئی۔ آہٹ سن کر ایک عورت کچن سے نمودار ہوئی۔ وہ ایپرن باندھے ہوئے تھی۔ اس کی عمر پچاس سے کم نہیں تھی۔ "گڈ ایوننگ مما!" ہیلن نے اسے مخاطب کیا۔

"گڈ ایوننگ مائی ڈارلنگ!" عورت نے کہا اور سوالیہ نظروں سے ماجد کو دیکھا۔

"ہی از مائی فرینڈ مما! ماجد رشید میں اسے آپ سے ملوانے لائی ہوں۔ ماجد یہ میری سوئیٹ مما"۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر"۔ ماجد نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

"ہم کو بھی خوشی ہوا ماجد"۔ مما نے کہا۔ بی لیو می' یو آر آنرڈ مائی بوائے۔ یو آر دی فرسٹ بوائے فرینڈ' شی ہیز میڈ"۔ اس کے لہجے میں محبت کے ساتھ ہلکی سی تلخی بھی تھی۔

"او مما!" ہیلن نے احتجاج کیا۔ پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔ "میری کہاں ہے........ شیلا کہاں ہے؟؟"

"میری جارج کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ شیلا تمہارا پاپا کے کمرے میں پڑھ رہا ہے"۔

"آؤ ماجد! تمہیں پاپا اور شیلا سے ملاؤں"۔ ہیلن نے ماجد کا ہاتھ تھاما اور دوسرے کمرے کی طرف چل دی۔ ماجد نروس ہو رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

ہیلن کا باپ کم از کم دیکھنے میں تو بہت بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سارے بال سفید تھے۔ چہرے پر لکیروں کا جال تھا اور بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی سرخی تھی۔ بڑھے ہوئے شیو کی

...ے وہ خاصا خوف ناک معلوم ہوتا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تھا' دیوار سے ٹیک لگائے اس کی ...وں میں گھٹنوں تک کمبل پڑا ہوا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک رائٹنگ ٹیبل پر ٹیبل لیمپ روشن ... اور ایک لڑکی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں کے کمرے میں داخل ہونے پر وہ دونوں ...کے۔

"گڈ ایوننگ پاپا! ایوننگ شیلا!" ہیلن نے چہک کر کہا اور انہیں جواب دینے کا موقع دیے ...ر ماجد سے انکا تعاف کرا ڈالا۔

...بڈھے نے بڑی بے دلی سے ماجد سے ہاتھ ملایا۔ اسکی سانسوں سے شراب کی بُو آرہی ...ی۔ ماجد کا جی متلانے لگا۔ اس نے بڈھے سے کچھ رسمی گفتگو کی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ لڑکی ...ے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ ...ی تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے بڑی دلچسپی سے ماجد کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہیلن ...ے کہا۔ "چلو سٹنگ روم میں چلتے ہیں"۔

ماجد کی سمجھ میں اس کی وجہ بھی آگئی۔ ہیلن کے پاپا نے سائیڈ ٹیبل سے جام اٹھایا تھا۔ ...تینوں کمرے سے نکل آئے۔ ہیلن کی مما وہیں رہ گئی تھی۔ سٹنگ روم میں ہیلن نے ماجد کو ...وفے پر بٹھایا۔ شیلا کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "میں ابھی آتی ہوں" جب تک تم ...یلا سے باتیں کرو"۔ ہیلن نے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

ماجد اور شیلا نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ شیلا بڑی نرم و نازک سی لڑکی تھی۔ عمر سترہ ...ال کے لگ بھگ ہوگی۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شیلا کی نگاہوں میں ماجد کے ...لیے پسندیدگی تھی۔ "آپ اچھے ہیں" اس نے آہستہ سے کہا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ بہت ...چھے ہوں گے' بہت زیادہ اچھے"۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" ماجد نے کہا۔ "ویسے تم بھی مجھے بہت اچھی لگی ہو"۔

"آپ نے ہیلن سے دوستی کی ہے تو یقیناً" آپ بہت اچھے ہوں گے"۔ شیلا نے جواب ...یا۔ "بی یو ڈونٹ نو' بٹ شی ہیز اے ویری ڈیفکلٹ اینڈ ان ارتھلی اسٹینڈرڈ آف ججنگ دی ...ن"۔

ماجد جھینپ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"بہت سے لوگوں نے ہیلن سے دوستی کرنے کی کوشش کی لیکن ہیلن نے کبھی کسی کو ...ول نہیں کیا۔ آپ پہلے آدمی ہیں اور سنیں ہیلن بہت اچھی ہے' بہت ہی اچھی" بہت ہی اچھی ...تے ہوئے شیلا نے آنکھیں میچ لیں۔ اس لمحے وہ ماجد کو بہت کم سن' بہت پیاری لگی۔ "یہ میں ...لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ وہ میری بہن ہے۔ وہ سچ مچ بہت اچھی ہے۔ ہم سب اس کے ...لیے دعا کرتے ہیں........ اسے خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک بات کہوں۔ مجھے ...آپ سے مل کر سچ مچ بہت خوشی ہوئی ہے"۔

ماجد کا سینہ اس لڑکی کے سچے جذبے سے بھر سا گیا لیکن ایک بات اسے عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ وہ مسلمان ہے' پھر بھی اس کی پذیرائی کر رہے تھے' ہیلن کی پسندیدگی کے حوالے سے۔ آزاد خیالی اپنی جگہ لیکن ایسے معاملات میں تو سبھی لوگ تنگ نظر ہو جاتے ہیں۔ "تم سب لوگ مجھے اچھے لگے ہو" اس نے کہا "اور ہیلن تو واقعی بہت ہی اچھی ہے"۔

اسی وقت ہیلن چائے کا مگ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے مگ ماجد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"یہ کیا!" ماجد نے حیرت سے پوچھا۔

"چائے' جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ میں خود بنا کر لائی ہوں۔ مما کو ہاتھ نہیں لگانے دیا میں نے"۔

"لیکن......"

"ہیلن وعدہ ہمیشہ اور ہر حال میں پورا کرتی ہے"۔ شیلا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ تینوں باتیں کرتے رہے۔ ماجد چائے ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب نے اسے بڑی گرم جوشی سے الوداع کہا تھا۔ اس بار پاپا نے بھی اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا' البتہ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ مما نے بڑی محبت سے اسے دوبارہ آنے کو کہا تھا۔ ہیلن اور شیلا اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں۔

گلی میں وہ تھوڑی دور ہی چلا ہو گا کہ کسی نے اسے پکارا۔ "اے مسٹر!" اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ولسن تھا' جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور سلگتا ہوا سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ ماجد رک گیا۔

"نام کیا اے تمارا؟"

"ماجد"

"ویل مسٹر ماجد! کیپ اٹ ان مائنڈ دیٹ ہیلن از مائی گرل"۔

"دین گو اینڈ ٹیل ہر۔ آئی ایم ناٹ ہیلن"۔

ولسن نے بہت زور کا قہقہہ لگایا۔ "گھوب...... تم کھُش مزاج آدمی ہے' لیکن تم اپن کو نئیں جانتا۔ اپن ایسا جواب دینے والے کا دانت حلک میں اتار دیتا ہے"۔

"میں تمہیں جاننا بھی نہیں چاہتا" ماجد نے بے حد رسان سے کہا۔ "لیکن تم بھی مجھے نہیں جانتے ہو۔ میرے والد یہاں فائیو فائیو پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر ہیں' انسپکٹر رشید نام ہے ان کا"۔ ماجد نے پولیس اسٹیشن کی سمت اشارہ کیا۔ اور جو کام تم نے بتایا ہے' میرے والد اس کے اسپیشلسٹ ہیں۔ وہ آدمی کی کھال بھی اتنی صفائی سے اتارتے ہیں کہ اس کے ساتھ گوشت کا ایک ذرہ بھی نہیں آتا"۔

"تم سمجھے گا ہم ڈر گیا ہے"۔ ولسن نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "لیکن یہ بات نہیں ہے۔ ہم کسی سے نئیں ڈرتا۔ پر ہم جانتا ہے کہ گلطی تمہارا نئیں ہے۔ وہ اپنا ہیلن ہی کالا بھیڑ ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔ "پر اس کا بھی کیا کھسور' اپن آدمی ای کھراب ہے۔ اس کا لائک نئیں ہے۔ پر تم ذرہ سوچو' تمہارا اس کا ریلیجن الگ اے......"

"تم اس کی فکر مت کرو یہ میرا دردِ سر ہے"۔ ماجد نے سرد لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"ایک بات مائنڈ میں رکھنا۔ کوئی اونچ نیچ ہوا تو یہ نہ سمجھنا کہ ہیلن کا کوئی آگے پیچھے نئیں اے۔ کھدا کسم' اپن کسی سی آئی ڈی انسپکٹر سے نئیں ڈرتا"۔ ولسن نے چیخ کر کہا۔

ماجد خاموشی سے بڑھتا رہا۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف ہیلن کا خیال تھا۔

O============☆============O

اس دن کے بعد ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ماجد کئی بار ہیلن کے گھر گیا۔ بس کے تعلق کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ ہیلن کے گھر کئی بار جانے کے بعد یہ ہوا کہ وہ اس کے پاپا کو پسند کرنے لگا۔ حالاں کہ ان کے بارے میں اس کا پہلا تاثر اچھا نہیں تھا' لیکن قریب سے دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ بوڑھا البرٹ درحقیقت بہت نفیس اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ وہ صرف معذوری کی محرومی ہی سے دوچار نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ماحول سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ بیوی عموماً گھر کے کاموں میں جتی رہتی تھی۔ بچیاں سروس اور تعلیم کے سلسلے میں مصروف رہتیں۔ اسے کوئی بھی وقت نہیں دے پاتا تھا۔ مطالعے سے شغف نہیں تھا۔ ایسے میں آدمی پینے کے سوا کیا کرے۔ پھر پیتے ہوئے اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بچیوں پر بوجھ ہے۔ ماجد نے اسے ذرا سا وقت دیا تو وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ ماجد سے دنیا جہان کی باتیں کرتا...... اسے اپنے تجربات سناتا۔ ہیلن کبھی کبھی اس بات پر احتجاج کرتی کہ ماجد آتا ہے تو پاپا ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اندر ہی اندر اس بات پر خوش ہوتی اور ماجد کے لیے ممنونیت محسوس کرتی۔

"ہی از اے ویری نائس بوائے"۔ بوڑھا البرٹ خوش ہو کر کہتا۔ "کاش......" لیکن اس کا جملہ کبھی پورا نہ ہوتا۔

ہیلن کی مما بھی ماجد سے بہت پیار کرتیں' اور شیلا تو اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ شاید بھائی سے محرومی کے بعد ماجد کا وجود اسے کسی سایہ دار درخت کی مانند محسوس ہوتا تھا۔ ماجد بھی بڑے بھائی ہی کی طرح اس کے ناز اٹھاتا۔ وہ اس گھر کا فرد بن گیا تھا۔

ایک دن دفتر سے گھر لوٹا تو امی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ پہلے تو انہوں نے اس سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ پھر اچانک بولیں۔ "یہ تم نے لڑکیوں سے دوستی کا سلسلہ کب سے شروع کر دیا ہے؟"

ماجد بری طرح گڑ بڑا گیا......" کیا مطلب؟"

"ایک لڑکی آئی تھی آج۔ کہتی تھی' میں ماجد کی دوست ہوں"۔

"میری دوست!"

"ہاں...... ہیلن نام تھا اس کا"۔

"اوہ ہیلن" اس نے گہری سانس لی اور جلدی سے بات بنائی۔ "وہ بہت اچھی لڑکی ہے امی! دفتری کام کے سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی"۔

"اچھی تو ہے وہ"۔ امی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن عیسائی ہے"۔

"صرف اچھی نہیں' وہ بہت اچھی ہیں"۔ ثمینہ نے مداخلت کی۔

"میرا تو جی چاہتا تھا کہ انہیں واپس ہی نہ جانے دوں"۔ زرینہ بولی۔

"تو ٹھیک ہے' نہ جانے دیتیں اسے"۔ ماجد نے بہنوں کی حمایت کا فائدہ اٹھایا۔

"چلو تم دونوں یہاں سے"۔ امی نے ثمینہ اور زرینہ کو ڈانٹا۔ "ہر بات میں ٹانگ مت اڑایا کرو"۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں امی! وہ اتنی اچھی ہیں کہ........" زرینہ نے ماں کے تیور دیکھے تو ثمینہ کے ساتھ وہاں سے کھسک لی۔

"اب تم بتاؤ' یہ کیا سلسلہ ہے؟" امی نے ماجد سے پوچھا۔

"آپ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔ بات تو میں آپ کو بتا چکا ہوں"۔

امی چند لمحے اسے بغور دیکھتی رہیں۔ وہ پوری طرح مطمئن معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ تاہم بات آئی گئی ہو گئی۔

ہیلن ماجد سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ اس کی امی اور بہنوں سے ملنا چاہتی ہے۔ ماجد ڈرتا تھا۔ اس پر ہیلن نے کہا تھا وہ انہیں یہ بتائے گی کہ کام کے سلسلے میں وہ ماجد سے ملی تھی۔ وہ برسوں سے کسی مسلمان فیملی کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی' اسی لیے چلی آئی۔ اس لیے ہیلن کے تذکرے پر ماجد کو یہ بات سوجھ گئی اور شاید ہیلن نے امی سے یہی کہا تھا' ورنہ وہ کبھی مطمئن نہ ہوتیں۔

اگلے روز وہ دونوں پھر کیفے اوڈین میں ملے "تم نے تو کل مجھے مروا ہی دیا تھا"۔ ماجد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں........ کیا ہوا؟"

"امی نے مجھے گھیر لیا تھا تمہارے بارے میں۔ وہ تو شکر ہے کہ مجھے تمہاری بات بروقت یاد آ گئی' دفتری کام کے سلسلے میں ملاقات والی"۔

ہیلن کھلکھلا کر ہنس دی' لیکن فوراً ہی سنجیدہ بھی ہو گئی۔ "مجّو! کل مجھے تمہاری وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا' لیکن مجھے اچھا نہیں لگا"۔

"میری وجہ سے کیوں؟" ماجد نے پوچھا۔

"تم ڈرتے جو ہو۔ تم ہمیشہ منع کر دیتے تھے مجھے اپنے گھر جانے سے"۔

"امی تو اس پر بھی خاصی برہم تھیں اور پھر تمہارا مطلب کیا ہے۔ کیا تم امی کو اپنی سٹوری سناتیں؟" ماجد نے آنکھیں نکالیں۔

ہیلن کو پھر ہنسی آ گئی۔ "نہیں' یہ تو ممکن نہیں تھا لیکن بہرحال میں جھوٹ نہیں بولتی یہ بھی جانتی ہوں کہ سچ لفظوں کے بغیر بھی بولا جا سکتا ہے"۔

"ہاں بھئی' اس معاملے میں تم بہت تیز ہو"۔ ماجد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ئے کہا۔ "ویسے تم نے یہ جھوٹ میرے لیے نہیں اپنے لیے بولا ہے"۔

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اس طرح ان پر تمہارا اچھا تاثر نہیں پڑتا اور ان دی لانگ رن یہ بات مان وہ ثابت ہوتی"۔

"یہ بات ہے تو میں کل ہی جا کر تمہاری امی کو حقیقت بتا دیتی ہوں۔ جھوٹ ویسے بھی نہ ذلیل کراتا ہے"۔

"ارے نا'نا........ ایسا غضب نہ کرنا۔ پلیز........ میری خاطر"۔

"تمہاری خاطر جھوٹ بولتی ہوں تو تم اسے خودغرضی سمجھتے ہو میری"۔ ہیلن کے لہجے شکایت تھی۔

"غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا"۔ ماجد نے کان پکڑتے ہوئے کہا "لیکن تم رے گھر کیوں جانا چاہتی تھیں؟"

"جانا چاہتی تھی نہیں' جانا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے اور اس سے پہلے بھی کئی بار تاکہ جسٹمنٹ دشوار نہ ہو۔ کیا وہ میرا گھر نہیں ہے؟"

"بالکل ہے"۔ ماجد نے کہا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا' جہاں اس وقت خواب ہی ب تھے' جیسے وہ کسی تصور میں کھو گئی ہو۔ "ایڈجسٹمنٹ میں تمہیں کیا دشواری ہو گی؟" ماجد مزید کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ کوئی آسان بات ہے؟"

"اور کیا' ثمینہ اور زرینہ تو تم پر فدا ہو گئی ہیں اور امی نے بھی تمہیں ناپسند نہیں کیا"۔

ثمینہ زرینہ کے ذکر پر ہیلن کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن وہ چمک فوراً معدوم ہو گئی"۔ ہی مجّو! دشواری تو ہوتی ہی ہے۔ ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔ میں تو پھر غیرمذہب کی ہوں تم لوگوں لیے"۔

"ارے چھوڑو نا' یہ کیا باتیں لے بیٹھیں تم"۔

"یہ بہت ضروری ہے۔ میں وقتاً فوقتاً تمہارے گھر جاتی رہوں گی لیکن تمہاری عدم موجودگی میں۔ میں تمہارے گھر کے ہر فرد کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ کس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہیں میری وجہ سے شرمندگی ہو" ہیلن نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں تمہاری وجہ سے کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتا"۔

"ایسی باتیں نہ کرو مجّو! تم بہت غیر عملی آدمی ہو"۔

ماجد کھسیا کر رہ گیا۔

ہیلن نے جو کہا تھا' وہی کیا۔ وہ اس کے بعد بھی کئی بار ماجد کے گھر گئی۔ حالاں کہ اس کے لیے اسے آفس سے چھٹی کرنا پڑی تھی۔ وہ ماجد کی موجودگی میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کا نتیجہ بہرحال مثبت نکلا۔ اب تو شاہد بھی اس کے گن گاتا تھا۔ البتہ امی کے رویے میں اب بھی کھنچاؤ تھا۔ ثمینہ نے تو ایک بار ماجد کے کان میں کہہ بھی دیا تھا کہ اگر ہیلن مسلمان ہو جائے تو اس سے اچھی بھابی دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ یوں ماجد کے ذہن میں پہلی بار یہ بات آئی تھی۔

ایک شام ماجد کو کلفٹن کی سوجھی۔

"ٹھیک ہے۔ مزہ آجائے گا" ہیلن نے خوشی سے کہا "ہم تانگے پر چلیں گے"۔

"تانگے پر!" ماجد کے لہجے میں حیرت تھی"۔

"ہاں نا' آؤ میرے ساتھ" ہیلن بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ ہوگئی۔

ماجد کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت کیفے اوڈین سے نکلے تھے۔ ہیلن اس کا ہاتھ تھام کر تیز قدموں سے چلتی رہی۔ اس کا رخ صدر دواخانے والے تانگا اسٹینڈ کی طرف تھا۔ "کیا پتا رمضانی بابا سواریاں لے کر گئے ہوئے ہوں"۔ ہیلن خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "خیر' ہم انتظار کرلیں گے"۔

ماجد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہیلن نے چونک کر کہا۔ "وہ رہے' رمضانی بابا موجود ہیں"۔ اس نے ایک بڈھے تانگے والے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

تانگے والا ہیلن کو دیکھتے ہی نیچے اتر آیا۔ "آؤ بیٹا" اس نے بڑی محبت سے کہا "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں بابا!" ہیلن نے کہا اور جھٹ ماجد کا تعارف کرادیا۔ "یہ ماجد ہے بابا! میرا........" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جلدی سے بولی"۔ بابا! تمہارا تانگا چاہیے ادھار"۔

"ضرور بیٹا! ادھار کیسا۔ یہ تو ہے ہی تمہارا۔ کہاں چلو گی؟"

"نہیں بابا!" ہیلن نے ٹھنک کر کہا"۔ تانگہ میں چلاؤں گی۔ بس' ہم دونوں ہوں گے

میں پھر یہیں واپس دے جاؤں گی"۔

"ٹھیک ہے بیٹا!"

ماجد بڈھے رمضانی کو حیرت سے دیکھتا رہا' یہ تعلق اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر کچھ خیال آیا۔ اس نے ہیلن سے کہا۔ "یہ چھت والا تانگا تو بہت برا لگے گا"۔

ہیلن نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بڈھے رمضانی کی طرف متوجہ ہوگئی اس کی نظروں میں سوال بھی تھا اور التجا بھی۔

"ارے' یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں ابھی چھت کھول دیتا ہوں اس کی" رمضانی نے کہا اور واقعی دیکھتے ہی دیکھتے تانگے کی چھت کھول دی۔

ہیلن اچھل کر کوچبان کی نشست پر بیٹھ گئی۔ "آؤ مجّو! میرے ساتھ بیٹھو"۔ وہ چہکی "پیچھے نہیں بیٹھنے دوں گی تمہیں ورنہ میری پوزیشن خراب ہوگی۔ لوگ کوچبان سمجھنے لگیں گے"۔

ماجد کو ہنسی آگئی۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پر تشویش لہجے میں ہیلن سے پوچھا۔ "تم چلالوگی تانگا؟"

"ارے بیٹا! ساری عمر چلاتی رہی ہے ہمارا تانگا تم بالکل فکر نہ کرو"۔ ہیلن کے بجائے رمضانی نے جواب دیا۔ ماجد نے ہیلن کو غور سے دیکھا۔ ہیلن نے فخریہ انداز میں سرہلادیا۔

"خدا حافظ بیٹا!" رمضانی نے کہا۔ "میں یہیں ملوں گا۔ دیر ہو جانے کی فکر نہ کرنا"۔

ہیلن نے تانگہ بڑھا دیا۔ "تمہیں بھی سکھادوں گی تانگہ چلانا۔ بڑا مزہ آتا ہے"۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے بابا نے تمہیں تانگا کیسے دے دیا"۔

"کیوں نہ دیتے۔ میری عمر اسی علاقے میں گزری ہے۔ چھوٹی سی تھی' جب سے جانتی ہوں بابا کو۔ بہت چلایا ہے میں نے یہ تانگا"۔

ماجد اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں تانگا چلارہی تھی۔ ماجد کا بھی جی چاہنے لگا۔ اس کی فرمائش پر ہیلن نے اسے تانگے کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ وہ کلفٹن سے ہو کر مزار سے ساحل کی طرف جانے والی سڑک پر مڑے تو گھوڑے کی باگیں ماجد کے ہاتھ میں تھیں۔

"ساحل پر خوب تیز دوڑانا اسے" ہیلن نے بچوں کے سے معصوم لہجے میں فرمائش کی۔

کچھ دیر بعد تانگہ ساحل کے ساتھ ساتھ پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ تیز ہوا ان دونوں کے بال اڑا رہی تھی۔ ان کے لبوں پر معصوم مسکراہٹ تھی اور انداز میں بچوں کی سی بے فکری۔ لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ وہ اس وقت جہاں تھے' وہ ایک عجیب دنیا تھی' خواب خواب دنیا۔

"اب رکو بھی"۔ ہیلن نے کہا۔
"گھوڑے کو کہاں باندھیں گے؟" ماجد کے لہجے میں تشویش تھی۔
"یہاں بڑے پتھروں کی کمی نہیں ہے"۔
ماجد نے تانگا روکا۔ دونوں نیچے اترے۔ ماجد نے گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی۔ پھر وہ کف اڑاتی موجوں کی طرف بڑھ گئے۔

سورج سمندر کے سینے پر اترا ہوا تھا۔ وہ دونوں ساحل پر ننھے بچوں کی طرح سیپیاں ڈھونڈتے رہے، پھر تھک کر ریت پر بیٹھ گئے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ماجد انگلی سے ریت پر لکیریں کھینچ رہا تھا اور ہیلن اپنے پیر کے اوپر ریت جمع کرکے اسے ہاتھوں سے پکا کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گھروندا بنا ڈالا اور اپنا پیر باہر نکال لیا۔ پھر اس نے ماجد کی طرف دیکھا۔ وہ بے خیالی میں ریت پر اس کا نام لکھ رہا تھا۔ ہیلن۔

"اس کے آگے اپنا نام نہیں لکھو گے مجّو؟" ہیلن نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

ماجد نے چونک کر پہلے ہیلن کو اور پھر ریت کو دیکھا۔ ہیلن کا نام دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ "ارے، مجھے تو احساس ہی نہیں تھا"۔ اس نے کہا۔ پھر اس کی نظر گھروندے پر پڑی۔ "اوہ، تم نے کتنا خوب صورت گھروندا بنایا ہے"۔

"اچھا لگا تمہیں؟"

"بہت اچھا، لیکن اس میں دروازہ تو ایک ہی ہے"۔ ماجد نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"ہاں، دروازہ ایک ہی ہونا چاہیے" ہیلن نے پرخیال انداز میں جواب دیا۔ "صرف اندر جانے کے لیے۔ باہر آنے کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔ گھروندے تو محبت سے بنائے جاتے ہیں اور محبت میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا"۔

"اور یہ ہے کس کے لیے؟"

"تمہارے لیے"

"اور تم؟"

ہیلن کا چہرہ زرد ہوگیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ماجد نے بے دھیانی میں کہا ہے "تم مجھے اس میں تھوڑی سی جگہ نہیں دوگے؟ میں اسے تمہارے لیے خوب صورت اور آرام دہ بناؤں گی، اسے محبت سے، ایثار سے، اپنے جذبوں کے ساتوں رنگوں سے آراستہ کروں گی"۔

ہیلن کی آواز دور کہیں خوابوں کے کسی جزیرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ماجد پھر بے دھیانی میں انگلی سے ریت پر اس کا نام لکھ رہا تھا۔ "کیوں نہیں، میرا گھروندا تمہارا گھروندا ہوگا" اس نے بے حد فراخدلی سے کہا۔ "لیکن پھر بھی تمہیں اپنے

لیے بھی ایک گھروندا بنانا چاہیے"۔

"گھروندے تو بنائے ہی دوسروں کے لیے جاتے ہیں"۔ ہیلن کے لہجے میں عجیب سی اداسی اتر آئی۔ "صرف اپنا معاملہ ہو تو گھروندا کون بنائے۔ آدمی خانہ بدوش بھی تو ہوتا ہے۔ نہیں مجّو! گھروندا جب بھی بنایا جاتا ہے تو کسی اور کے لیے ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کوئی اور، اپنوں سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہاں، جب آدمی کسی کا نام لکھتا ہے، خواہ کہیں پر بھی لکھے تو صرف اپنے لیے لکھتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں محبت میں آدمی کے رجحانات ظاہر کرتی ہیں۔ کوئی کسی کا نام لکھتا ہے اپنے لیے، اور کوئی بڑی محنت اور محبت سے گھروندا بناتا ہے، کسی اور کے لیے۔ یہ تو محبت کے مختلف رویے ہیں۔ یہ تم نے ریت پر جو میرا نام لکھا ہے تو اس لیے کہ میں اس کے آگے تمہارے نام کا اضافہ کردوں اور میں اپنے نام کے آگے تمہارا نام لکھنا چاہتی ہوں، لیکن نہیں لکھ سکتی"۔

ماجد کو اس کی گفتگو نے مسحور کردیا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر اترتے دھنک کے رنگوں کو تکتا رہا۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اس کے چہرے پر ناچ رہی تھیں۔ وہ اس وقت بے حد حسین لگ رہی تھی۔ "کیوں نہیں لکھ سکتیں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام ہی ایسا ہے۔ زمین پر کیسے لکھ دوں"۔ ہیلن نے نہایت سادگی سے کہا۔

ماجد ششدر رہ گیا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"محبت سب کچھ بتا دیتی ہے"۔

ماجد کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ حیران تھا کہ ہیلن یہ سب کیسے جانتی ہے۔ بہرحال، اتنا ضرور ہوا کہ اسے وہ بات کہنے کا حوصلہ ہوگیا جو وہ چاہنے کے باوجود کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"ہیلن! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔ اس نے کہا۔

"تو میں تمہارے لیے گھروندا کس لیے بنا رہی ہوں؟"

"تم اپنا مذہب چھوڑ سکوں گی؟"

"کیا یہ شرط ہے شادی کی؟" ہیلن نے چونک کر پوچھا اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگی۔

ماجد بری طرح گڑبڑا گیا۔ "نہیں، لیکن یہ میری خواہش ہے"۔

"تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنا میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے"۔ ہیلن نے پیار سے کہا۔ "اپنا آبائی مذہب چھوڑنا آسان کام نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ انسان کے لیے اپنے نام سے دست بردار ہونا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ میں تمہارے لیے یہ کر سکتی ہوں۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔ یہ ایک ایسا ہے، جو محض میں تمہاری خوشی کی خاطر نہیں کرنا چاہتی"۔

"کیوں؟ اس میں حرج کیا ہے؟"

"میں اپنی خوشی کے لیے ایسا کروں گی۔ میں نے تمہیں پہلی ہی ملاقات میں بتایا تھا کہ میں حق کی تلاش میں ہوں۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن یہ ایک پہلو میں نے تم سے چھپایا ہے۔ میں اس فیصلے میں کوئی کھوٹ نہیں چاہتی۔ جب کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گی۔ میں تمہاری خاطر سب کچھ کر سکتی ہوں مجو! لیکن مجھے اس پر کبھی مجبور نہ کرنا...... پلیز...... پلیز......" وہ سسک رہی تھی۔ ماجد سر جھکائے پشیمان بیٹھا تھا۔ پھر اچانک وہ دونوں بری طرح چونکے۔ پانی کی ایک زوردار موج ان دونوں کو کمر تک بھگو گئی تھی۔

"اوہ، اوہ میرے خدا، یہ کیا ہوا"۔ ہیلن کے لہجے میں کرب تھا۔

ماجد نے نظریں اٹھا کر پہلے اسے دیکھا اور پھر نیچے دیکھنے لگا۔ موج دم توڑ چکی تھی۔ پانی سمندر کی طرف پلٹ رہا تھا۔ ہیلن کا بنایا ہوا گھروندا ڈھیر ہو چکا تھا، اور جہاں ماجد نے ہیلن کا نام لکھا تھا، وہاں اب ریت ہی ریت تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہاں کبھی کچھ لکھا ہی نہ گیا ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔

O=========== ☆ ===========O

ایک روز ماجد دفتر سے لوٹا تو راستے میں شہاب نے اسے روک لیا۔ "ماجد بھائی! آج رات آٹھ بجے شمیم بھائی کے گھر پہنچ جائیے گا"۔

"کیوں بھئی، خیریت تو ہے؟" ماجد نے پوچھا۔

"کوئی میٹنگ ہے۔ ظفر بھائی اور صابر بھائی بھی ہوں گے، کچھ لوگ باہر سے بھی آرہے ہیں"۔ شہاب نے بتایا۔

"سلسلہ کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، بس ہے کوئی اہم معاملہ"۔

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا"۔ ماجد نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

علاقے میں پڑھے لکھے لڑکوں کا ایک گروپ تھا۔ ان سب کی علاقے میں بڑی عزت تھی۔ اکثر و بیشتر وہ لوگ مل بیٹھتے تھے لیکن باقاعدہ قسم کی میٹنگ کا یہ پہلا موقع تھا۔ ماجد سوچتا رہا کہ اس میٹنگ کا کیا سبب ہو سکتا ہے، لیکن وہ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

پونے آٹھ بجے ماجد کھانے سے فارغ ہوا اور گھر سے نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے سگریٹ سلگایا اور معمول کے مطابق دس منٹ چہل قدمی میں گزار دیے۔ پھر وہ شمیم کے گھر پہنچا تو پورے آٹھ بجے تھے۔ کرکٹ کے کھیل سے اس نے پابندی وقت کا سبق سیکھا تھا۔ اس علاقے میں کرکٹ کی ایک ٹیم آرگنائز کی تھی۔ اس وجہ سے علاقے کو نوعمر لڑکے اس سے بہت زیادہ اپنائیت محسوس کرتے تھے۔

بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر چار پانچ نوعمر لڑکے موجود تھے۔ ماجد ان کے پاس جا بیٹھا۔ لڑکے اس سے آئندہ میچ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر گفتگو کا رخ میٹنگ کی

طرف مڑ گیا۔ فاروق نے ماجد سے میٹنگ کی غرض وغایت کے بارے میں دریافت کیا۔

"بھائی! اس سلسلے میں تو مجھے کچھ بھی نہیں معلوم"۔ ماجد نے جواب دیا۔

اسی وقت اندر سے شمیم نمودار ہوا۔ اس نے ماجد سے علیک سلیک کے بعد اسے ایک طرف بلایا۔ ماجد اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"مسئلہ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟" ماجد نے شمیم سے پوچھا۔

"مسئلہ بہت سنگین ہے"۔ شمیم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "تفصیل تو ظفر بھائی اور کرنل ارشاد ہی بتائیں گے۔ میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ مسئلہ پاکستان میں عیسائیوں کی بھرپور تبلیغ کا ہے۔ ان دنوں مشنری والوں کی اس علاقے میں خاص نظر ہے"۔

ماجد چور سا ہو گیا۔ اسے ایسا لگا' جیسے شمیم بلاواسطہ طور پر ہیلن کی آمد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ احساسِ جرم کا شکار ہو گیا۔ تاہم اس نے سنبھل کر کہا۔ "مجھے تو اس میں کوئی سنگینی نظر نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے جس بچے کے کان میں پہلی آواز اذان کی پڑی ہو' وہ مرتے دم تک مسلمان رہے گا' خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ دنیا کی کوئی ترغیب اسے گمراہ نہیں کر سکتی"۔

"صورت حال اتنی سادہ نہیں ہے' ورنہ یہ میٹنگ کیوں بلائی جاتی۔ بہرحال تفصیل کا علم تمہیں میٹنگ میں ہو گا۔ فی الوقت تمہارے سپرد ایک اہم کام ہے۔ ممکن ہے' کرنل ارشاد کو آنے میں کچھ دیر ہو جائے۔ میٹنگ ان کی صدارت میں ہو گی تم ذرا لڑکوں کو سنبھالے رکھنا۔ حاضری کم نہیں ہونا چاہیے"۔

"اگر یہ بات تھی تو تم نے میٹنگ آٹھ بجے کیوں بلائی؟" ماجد نے اعتراض کیا۔

"تم تو جانتے ہی ہو' یہاں کسی کو نو بجے بلانا ہو تو آٹھ بجے کا وقت دینا پڑتا ہے"۔

"ایسا نہیں ہے' میں پورے آٹھ بجے آیا ہوں اور جب میں آیا ہوں تو یہ لڑکے یہاں موجود تھے"۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دیکھو نا' یہ معاملہ مذہبی اہمیت کا ہے"۔

"اور مذہب ہمیں سب سے زیادہ پابندی وقت کی تلقین کرتا ہے۔ فجر کی نماز عشا کے وقت نہیں پڑھی جا سکتی۔ پھر جو لوگ وقت کی پابندی کرتے ہیں' اس طرح انہیں بے وقوف ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ بھی اس رنگ میں رنگنے لگتے ہیں........"

"چھوڑو یار! تم بھی کیا باتیں لے بیٹھے"۔ شمیم نے چڑ کر کہا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔ "اس وقت تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہے۔ پلیز یار! یہ میری عزت کا سوال ہے"۔

"ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا لیکن تمہاری جگہ میں ہوتا تو کرنل صاحب کی عدم موجودگی میں ہی میٹنگ شروع کر دیتا"۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کرنل صاحب کی معلومات ہی سب سے زیادہ

اتنی دیر میں سات آٹھ لڑکے اور آ گئے۔ ماجد انہیں لے کر بیٹھک میں آ گیا۔ پونے نو تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر لڑکے بے چین ہونے لگے۔

"بہت دیر ہو گئی ماجد بھائی! اب ہم چلتے ہیں"۔ فاروق نے کہا۔

"بیٹھو کچھ دیر میرا خیال ہے نو بجے تک میٹنگ شروع ہو جائے گی" ماجد نے دلاسا دیا۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ ہمیں آٹھ بجے بلایا تھا اور ہم آٹھ بجے آ گئے۔ پون گھنٹا ہو ہمیں بیٹھے ہوئے"۔ نصیر نے احتجاج کیا۔ چند اور لڑکوں نے اس کی ہمنوائی کی۔

"دیکھو' یہ میٹنگ بہت اہم ہے"۔ ماجد نے انہیں سمجھایا "مذہبی نوعیت کا معاملہ ہے۔ ی تک تمہاری پابندی وقت کا سوال ہے' یہ ذہن میں رکھو کہ اس سے فائدہ بھی تمہیں ہی گا۔ جو لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے' وہ خود کو ہی نقصان پہنچاتے ہیں"۔

"فی الوقت تو ہمیں ہی نقصان پہنچ رہا ہے"۔ شاکر نے کہا۔ "وقت کی پابندی نہ کرنے لے تو مزے سے اپنے گھر میں بیٹھے ہوں گے"۔

"نقصان تو پہنچتا ہی وقت کی پابندی کرنے والوں کو ہے"۔ فاروق بولا۔ "میرا خیال ہے' جیسے لوگوں کو ان جیسے لوگوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہیے۔ ان سے ہمیں بہت بڑا ان پہنچ سکتا ہے۔ ہم چڑ کر پابندی وقت کا اصول ترک کر سکتے ہیں اور یہ ہمارے ہی لیے ان دہ ہو گا"۔

فضا خاصی مکدر ہو گئی تھی۔ تاہم ماجد نے سمجھا بجھا کر لڑکوں کو روکا۔ سوا نو بجے میٹنگ منتظم اعلیٰ ظفر صاحب تشریف لائے۔ لڑکوں کو امید بندھی کہ شاید اب میٹنگ شروع ہو ے لیکن ظفر نے شمیم کے ساتھ انتظامات کے سلسلے میں کچھ گفتگو کی۔ پھر وہیں بیٹھ گیا۔

"اب کس بات کی دیر ہے؟" ایک لڑکے نے بے صبرے پن سے پوچھا۔

"ابھی مہمانِ خصوصی اور صاحبِ صدر تشریف نہیں لائے ہیں"۔ شمیم نے جواب دیا۔

ماجد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکوں سے اپیل کی۔ ورنہ کئی لڑکوں کے تیور بہت ہی اب تھے۔ پندرہ منٹ تک سکون رہا۔ پھر لڑکوں کا تحمل جواب دینے لگا۔ ماجد کے سمجھانے پر بیٹھے تو رہے' لیکن اب وہ چھینٹے بازی کر رہے تھے' مذاق اڑا رہے تھے' ماجد جانتا تھا کہ وہ سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا اور کچھ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی طبیعت خود اس ناروا جبر پر ار ہو رہی تھی۔ میٹنگ کا مقررہ وقت گزرے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا اور اب تک میٹنگ کے ثار ہی نہیں تھے۔ لڑکے اور مضطرب ہو گئے۔ ان کے اضطراب کی وجہ یہ تھی کے اگلے روز ر تھا اور انہیں کرکٹ میچ کے لیے صبح سویرے اٹھنا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ مذہبی معاملہ ہے تو اس میں مہمان خصوصی اور صاحبِ صدر کے دُم چھلے کی کیا ضرورت ہے؟" نصیر نے کہا۔

"کیوں نہیں ہے!" فاروق نے تیز لہجے میں کہا۔ "ورنہ خودنمائی کا شوق کیسے پورا ہوگا"۔

"اور کیا' یہ کرکٹ تو ہے نہیں کہ خود کو نمایاں کرنے کے لیے عملی کارکردگی کی ضرورت پڑے"۔ شاکر بولا۔

"ہاں' یہاں تو دوسروں کو انتظار کروانے سے بھی آدمی نمایاں ہوتا ہے۔ اب دیکھو نا' ہم ان کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور اس سے ان کی بڑائی ثابت ہو رہی ہے"۔ تنویر نے جھلاہٹ سے کہا۔

"اور آئیں گے تو کیا کرلیں گے' سوائے زبان ہلانے کے کرنا کرانا تو کچھ ہے نہیں"۔ نصیر بولا۔

ظفر نے مداخلت کی اور خاصے ترش لہجے میں لڑکوں سے کہا کہ وہ اپنے سے بڑوں کے بارے میں سنبھل کر بات کرنے کی عادت ڈالیں۔ یوں رنگ محفل اور بگڑ گیا۔ تمام لڑکے واک آؤٹ پر تیار ہوگئے۔ شمیم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماجد سے مداخلت کی اپیل کی۔ ماجد بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا اور جھنجلا بھی رہا تھا۔ تاہم اس نے بڑے رسان سے کہا۔ "بہت دیر ہوچکی ہے۔ اب ہم مہمانِ خصوصی اور صاحبِ صدر کا مزید انتظار نہیں کرسکتے۔ اب آپ میٹنگ کی کاروائی شروع کردیجیے"۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" ظفر صاحب نے چمک کر کہا۔

اس بار ماجد بری طرح چڑ گیا۔ "تو پھر آپ ہمارے بغیر میٹنگ کرلیجیے گا۔ ہماری ویسے بھی یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

خوش قسمتی سے اسی وقت باہر کار رکی اور اس میں سے دونوں متنازعہ شخصیتیں برآمد ہوئیں' مولانا بشیر احمد اور کرنل ارشاد' ظفر اور شمیم ان کی پیشوائی کے لیے لپکے۔

"چلیں ماجد بھائی؟" شاکر نے پوچھا۔ تمام لڑکے کھڑے ہوئے تھے۔

"اب اتنے انتظار کو کیوں اکارت کرتے ہو"۔ ماجد نے انہیں سمجھایا۔

کچھ لڑکے زیادہ چڑے ہوئے تھے' وہ وہیں بیٹھ گئے۔ باقی ماجد کے ساتھ کھڑے رہے۔ ظفر اور شمیم' مولانا اور کرنل کو اندر لائے اور انہیں سب سے متعارف کرایا۔ انہیں توقع تھی کہ لڑکے گرم جوشی کا مظاہرہ کریں گے لیکن اس کے برعکس انہیں سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا۔ کرنل صاحب کو اندازہ ہوگیا کہ اس کھنچاؤ کا سبب ان کی تاخیر سے آمد ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا کی تشریح شروع کی۔ لیکن لڑکوں کی عدم توجہ کا اندازہ لگانے

ند اختصار سے کام لے گئے۔

مہمانِ خصوصی اور صاحبِ صدر کو مسند پر بٹھادیا گیا۔ ظفر نے معلّن کے فرائض لے۔ انہوں نے زبردست لفاظی سے کام لیتے ہوئے صاحبِ صدر کا تعارف شروع کیا ہی فاروق اٹھ کھڑا ہوا۔ "دس بجنے میں دس منٹ ہیں ظفر صاحب!" اس نے کہا "ہم آٹھ کے آئے ہوئے ہیں اور ہمیں گھر بھی جانا ہے۔ آپ رسمی باتیں چھوڑیں اور کام کی بات یا"

ظفر کے چہرے پر تکدّر کا سایہ سا لہرایا' لیکن انہیں صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر کے سے گھونٹ پینے پڑے۔ "جی ہاں' آپ کی بات معقول ہے"۔ انہوں نے فاروق سے میں فوری طور پر میٹنگ کی کاروائی کا آغاز کرتا ہوں۔ سب سے پہلے شمیم صاحب پاکستان مسیحیت کی تبلیغ کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کریں گے' شمیم صاحب"۔

شمیم نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ لڑکے بہت بور ہو رہے تھے' لیکن جیسے جیسے شمیم آواز بلند ہوتی گئی' وہ لوگ مسحور ہوتے گئے' شمیم کے لہجے میں سوز تھا۔ اس کی باتیں دلوں اترتی جا رہی تھیں۔ وہ اعداد و شمار کے حوالے سے حقائق پیش کر رہا تھا۔ اس نے نہایت اک نقشہ کھینچا تھا۔ وطن عزیز میں مسیحیت قبول کرنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ پھر اس یت کے طریق کار کا جائزہ لیا اور اس سلسلے میں مشنریوں کے ہتھکنڈوں کا ذکر کیا۔ تبلیغ دین یت کی تاریخ بھی بیان کی۔ وہ مسلسل دس منٹ تک بولتا رہا۔ اس دوران بیٹھک میں مکمل اتھا۔ سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہر شخص اس کا مضمون پوری توجہ سے سن رہا لڑکوں کے چہرے جوش سے تمتما اٹھے تھے۔ بالآخر شمیم نے اپنا مضمون مکمل کیا۔

اس کے بعد ظفر نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ اس نے مولانا بشیر کو پکارا۔ مولانا نے احت سے بتایا کہ اسلامی ریاست میں اسلام کے علاوہ کسی مذہب کی تبلیغ و ترویج کا شرعاً ال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے عام ٹیکس نہیں لیے جاتے بلکہ ف جزیہ لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان جیسے بڑے ملک میں مسیحیت کی اتنے بڑے پیمانے تبلیغ اور شمیم صاحب کے پیش کردہ اعداد و شمار ہم سب کے لیے باعث شرم ہیں۔ ہیں اس لے میں کوئی مؤثر عملی قدم اٹھانا ہوگا۔

مولانا کے بعد صاحبِ صدر کرنل ارشاد کی باری تھی۔ اب تک میٹنگ نہایت کامیاب ی تھی' لیکن اب زوال کا آغاز ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ کرنل صاحب کو صرف بولنے کا شوق ہے۔ ید گھر پر انہیں بولنے کا موقع نہیں ملتا ہوگا' ان کی باتوں میں ٹھہراؤ تھا نہ تسلسل۔ وہ بے فیض ر غیر متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں یہ حال ہوا کہ لڑکوں نے آپس میں سرگوشیاں روع کردیں۔ پھر بار بار گھڑی دیکھی جانے لگی۔ کرنل صاحب بے مغز تقریر کرتے رہے۔ ان

کا ایک گھنٹے سے پہلے تقریر ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں گم تھے۔ حاضرین سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' لڑکوں کی بے چینی بڑھتی گئی۔ بہ آواز بلند جماہیاں لی جانے لگیں لیکن کرنل صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر لڑکوں نے ایک ایک کرکے کھسکنا شروع کردیا۔ کرنل صاحب اب اسلام کے مختلف فرقوں کے سلسلے میں بتا رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا زیرِ نظر مسئلے کے لحاظ سے وہ کتنی مخدوش گفتگو کر رہے ہیں۔ اس وقت تو ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کی مرکزیت کو اُجاگر کیا جائے۔

ماجد نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لڑکوں کو بڑی مشکل سے روکے رکھا تھا۔ پھر کرنل صاحب کو حاضرین کا احساس ہوا' جن کی تعداد اب صرف چھ رہ گئی تھی۔ انہوں نے جلدی سے گھڑی دیکھی اور بولے۔ "اوہ' شاید میں کچھ زیادہ بول گیا ہوں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اب تک تو مجھے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا"۔

ظفر نے اس درخواست کے ساتھ میٹنگ برخواست کرنے کا اعلان کیا کہ ایک ماہ بعد اس سلسلے میں دوسری میٹنگ ہوگی' جس میں اس میٹنگ کے تمام شرکا' اس مسئلے کے سلسلے میں اپنی اپنی تجاویز پیش کریں گے۔ پھر اس نے کرنل صاحب کو بمشکل چائے کے لیے روکا جو گھر جانے پر مُصر بیٹھے تھے۔

کرنل صاحب اور مولانا بشیر کے جانے کے بعد شمیم اور ماجد کے درمیان اس سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ "مسئلہ واقعی سنگین ہے"۔ ماجد نے کہا۔ "لیکن مجھے آپ کی اپروچ سے اختلاف ہے۔ بات تقریروں کی نہیں بلکہ عمل کی متقاضی ہے۔ لڑکے ہی اس سلسلے میں ہمارا ہراول دستہ ثابت ہوں گے۔ وہ اچھے خاصے پرجوش ہو رہے تھے لیکن کرنل صاحب کی تقریر نے انہیں سلا دیا' بے زار کردیا"۔

"کرنل صاحب کام کے آدمی ہیں"۔ ظفر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "بہرحال' دیکھیں گے فی الحال تو ہمیں عملی تجاویز کا انتظار ہے"۔

○ ☆ ○
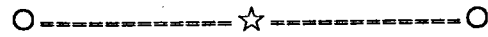
ہیلن سے ملاقات کے بعد ماجد کے لیے وہ پہلی رات تھی جو سہانے خوابوں کی بجائے' اضطراب اور کشمکش میں گزری۔ ایک سوال اسے رہ رہ کر تنگ کر رہا تھا۔ کہیں وہ نادانستگی میں اسلام کے خلاف مسیحیت کا آلۂ کار تو نہیں بن گیا؟ وہ اس رات ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا اور صبح بہت دیر سے اٹھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اتوار کا دن تھا' اور آفس کی چھٹی تھی۔

اگلی شام وہ گھر واپس آیا تو امی کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ "تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے رہے ہو ہیلن کے سلسلے میں؟" انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"جھوٹ...... ہیلن کے سلسلے میں؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"آج نمی نے ہیلن کو دیکھ لیا۔ اس کے جانے کے بعد نمی نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی تو مسیحیت کی تبلیغ کے لیے آئی تھی"۔

ذہن میں
ماجد کو بروقت سُوجھ گئی۔ "ہرگز نہیں' میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ اس سے دفتری کام
سلسلے میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ گھر آنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنا پتہ دے دیا۔ اس روز
تو اتفاق سے اس کا ایک ہم مذہب یہاں لٹریچر بانٹتا پھر رہا تھا بس اتنی سی بات ہے"۔

امی مطمئن نہیں ہوئیں۔ "خیر اب میں اسے منع کردوں گی یہاں آنے سے"۔ انہوں نے
فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ماجد ذہنی پریشانی کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس نے وہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی'
عام حالات میں کبھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ "آپ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے
میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

امی کا چہرہ فق ہوگیا۔ "کیا بک رہا ہے بدبخت' وہ کرسچن ہے"۔

"ہوتی رہے' میں تو اسی سے شادی کروں گا"۔

یوں مقدمہ ابا کی عدالت میں چلا گیا۔ ابا بڑے ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے۔ انہوں نے
دیر سوچا اور پھر ماجد کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ "بھئی' زندگی ماجد کو گزارنا ہے تو فیصلہ بھی
کرے گا کہ اس کا جیون ساتھی کون ہوگا"۔ انہوں نے بیوی سے کہا۔ "مجھے اس کا ہر فیصلہ
ہوگا' کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ یہ صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' مجھے یہ بھی یقین
کہ اس کا کوئی فیصلہ ہمارے لیے تکلیف دہ ثابت نہیں ہوگا' اگر اسے کوئی عیسائی لڑکی پسند
تو ہم اسے اپنی بہو بنائیں گے اور بیٹیوں سے بڑھ کر چاہیں گے"۔

امی احتجاج کرنا چاہتی تھیں' لیکن اپنے شوہر کے اس لہجے کو خوب پہچانتی تھیں۔ انہیں
زہ ہوگیا کہ اب کچھ کہنا بے سود ہے۔ دوسری طرف ماجد کے ذہن پر بوجھ بڑھ گیا۔ ابا کو کتنا
ہے اس پر۔ گویا اسے ابا کے اعتماد کی لاج رکھنا ہے۔

وہ جھنجلا کر گھر سے نکلا اور ہیلن کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ ہیلن کو ایک ریسٹورنٹ
لے گیا۔ ہیلن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ماجد کے
نے چائے کی پیالی رکھنے کے بعد پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آج تم گھر آئی تھیں۔ نمی نے امی کو تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا"۔
نے کہا۔

"کون نمی؟" ہیلن نے پوچھا۔ پھر اسے نمی یاد آ گئی۔ "اوہ وہ خوب صورت لڑکی' جو بڑی
سے چائے بنا کر تمہیں پلاتی ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ امی کہہ رہی تھی کہ تمہیں گھر آنے سے منع کردیں گی"۔

ہیلن کا چہرہ زرد ہوگیا۔ "میں جانتی تھی۔ جھوٹ ہمیشہ ذلیل کراتا ہے آدمی کو"۔ اس نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "اور بھی کوئی بات ہے؟"

ماجد کی دبی ہوئی جھنجلاہٹ قوت بن کر زبان میں آگئی۔ "ہاں' بہت سی باتیں ہیں۔ یہ اسلامی ملک ہے اور تم لوگ تبلیغ کے نام پر یہاں دندناتے پھر رہے ہو۔ تم خود ہمارے علاقے میں پہلی بار آئیں تو تبلیغ ہی کے سلسلے میں آئیں"۔

ہیلن حیران رہ گئی۔ چند لمحے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور نرم لہجے میں بولی۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے' میں تم سے معذرت کرچکی ہوں۔ رہا دوسروں کا سوال تو میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی"

"مجھ سے تو تم نے معذرت کرلی' لیکن تمہارا تبلیغ کا سلسلہ شہر کے دوسروں علاقوں میں تو جاری ہوگا"۔ ماجد نے تند لہجے میں کہا۔

"بہت بدگمانی کرتے ہو" ہیلن نے بڑے پیار سے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تو خود حق کی تلاش میں ہوں۔ میں کیا تبلیغ کروں گی۔ اس دن بھی مجبوراً آئی تھی بادلِ ناخواستہ وہ بھی شاید اس لیے کہ تم سے ملاقات ہونا تھی اسی بہانے۔ مجوّ! میں نے کبھی تبلیغ میں حصہ نہیں لیا۔ اچھا بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟"

ماجد نے اسے میٹنگ کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ ماجد وہ اعداد و شمار دہراتا رہا' جو شمیم کے مضمون کے ذریعے معلوم ہوئے تھے۔

"اور تم جذباتی ہوگئے"۔ ہیلن نے اس کے خاموش ہونے کے بعد کہا۔ "حالاں کہ تمہیں صورت حال پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرکے اس کا تجزیہ کرنا چاہیے"۔

"اگر میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟" ماجد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو نا' بنیادی طور پر یہ حکومت کی ذمے داری ہے اور حکومت کو یہ یاد دلانا علماء کا کام ہے۔ عام لوگ انفرادی واجتماعی سطح پر اس سے زیادہ کیا کرسکتے ہیں کہ ان دونوں پارٹیز کو اپروچ کریں۔ فیصلہ کرنا تو بہرحال اوپر والوں کا کام ہے"

ماجد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ ہیلن کا استدلال واقعی معقول تھا۔

O============☆============O

دوسری میٹنگ میں شرکا کی تعداد بڑھ گئی۔ جب تجاویز پر غور کرنے کا مرحلہ آیا تو پتا چلا کہ کسی کے پاس اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور قابل عمل تجویز نہیں ہے۔ صرف ایک تجویز تھی' جس پر شدومد سے غور کیا جارہا تھا اور وہ تجویز ایک انجمن کی تشکیل کی تھی۔ خاصے غور و خوض کے بعد انجمن کا نام تجویز ہوا۔ انجمن تحفظ اسلام۔ اس کے بعد عہدے دار نامزد ہوئے۔ کرنل ارشاد نے صدارت کی پیش کش معذرت کے ساتھ مسترد کردی' کیوں کہ سرکاری پالیسی

کے مطابق یہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ البتہ یہ طے ہوگیا کہ آف دی ریکارڈ انجمن کے سربراہ وہی ہوں گے۔ صدارت ظفرصاحب کے حصے میں آئی۔ ہمدانی صاحب کو نائب صدر بنایا گیا۔ جنرل سیکرٹری کا عہدہ شمیم کو ملا۔ وہ لوگ ماجد کو جوائنٹ سیکرٹری کا عہدہ دینا چاہتے تھے لیکن ماجد نے معذرت کرلی۔ چنانچہ نفیس کو جوائنٹ سیکرٹری بنادیا گیا۔ نفیس' ماجد کا پڑوسی اور نمی کا بھائی تھا۔ مولانا بشیر انجمن کے خازن مقرر ہوئے۔ کرنل صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ اسی ہفتے انجمن کو رجسٹرڈ کرادیں گے۔

ماجد اس میٹنگ سے خاصا مایوس تھا۔ اصل مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی تجاویز پیش کیں تو اس پر تمام عہدے داروں کے چہرے اتر گئے۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں عملی قدم اٹھائیں گے اور آئندہ ماہ میٹنگ کے دوران بتائیں گے کہ ان اقدامات کا کیا نتیجہ نکلا' لیکن یہ وعدہ کرتے ہوئے ان کا لہجہ نیم دلانہ تھا۔

دوسری طرف گھر میں امی اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ ثمینہ اور زرینہ کئی بار پوچھ چکی تھیں کہ ہیلن کیوں نہیں آتی۔ "بھائی جان نے منع کردیا ہوگا"۔ زرینہ نے چمک کر کہا تھا۔ ماجد نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

اس روز ماجد اور ہیلن کیفے اوڈین میں بیٹھے تھے۔ ماجد ہیلن کو دوسری میٹنگ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہیلن بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تفکر کا غبار تھا۔ "دیکھ لینا' اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا"۔ اس نے ماجد کے خاموش ہونے کے بعد کہا۔

"کیوں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"تم بہت بھولے ہو مجو!" ہیلن نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے ملک کو جو غیرملکی امداد ملتی ہے' وہ مشروط ہوتی ہے"۔

"تو اس سے کیا ہوا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"اس امداد کی ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ مشنریز کو تبلیغ کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی جائے بلکہ انہیں حکومت کی طرف سے ہر ممکن سہولت بھی حاصل ہوگی۔ جو حکومت یہ وعدہ کرچکی ہو' وہ مشنریز پر پابندی کیسے لگا سکتی ہے؟ ذرا سوچو تو سہی"۔

ماجد کا دماغ گھوم گیا۔ "نہیں' یہ ناممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے تند لہجے میں کہا۔

"یہ حقیقت ہے مجوّ! دیکھ لینا' اس ملک میں اسلامی نظام آنے کے بعد بھی یہ پابندی نہیں لگے گی"۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ تمہاری خواہش ہو سکتی ہے' حقیقت نہیں"۔

"تم واقعی بہت بدگمانی کرتے ہو' جذباتیت سے کام لیتے ہو۔ ایسے لوگ تجزیہ کر نہیں سکتے۔ اچھا' ایک بات بتاؤ' اسلام کامل مذہب ہے نا؟"

"یقیناً ہے" ماجد نے تندی سے کہا۔

"اور دلوں میں گھر کرکے باطن میں انقلاب لانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے؟"

"یقیناً اس لیے کہ حق ہے"۔

"تو پھر تم نے کبھی یہ سوچا کہ اتنے سارے مسلمان عیسائی کیوں ہوگئے؟"

"خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہوگی"۔

"نہیں' اس بات کا یہ جواب نہیں ہے۔ یہ تو جذباتیت ہی ہوئی نا۔ اس سوال جواب میں تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس میں مسلمانوں کی کون کون سی کمزوریاں عمل پیرا اور عیسائی مشنری کے پاس لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے بھی یقیناً کچھ ہے' کچھ اچھائیاں' اچھے عمل۔ تمہیں وہ تلاش کرنا چاہئیں' اپنی کمزوریوں سمیت"۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"دیکھو' اسلام نے حقوق اور فرائض کے سلسلے میں جو حد بندی کی ہے' وہ بہت ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں' اسلام عملی مذہب ہے اور عمل کی تلقین کرتا ہے' لیکن ا دور میں وعظ ہی وعظ رہ گیا ہے' تقریریں ہی تقریریں ہیں۔ ہر شخص دوسروں کو ہر وق نصیحتیں تو کرتا ہے لیکن عمل کرکے نہیں دکھاتا۔ اپنے مذہب سے محبت کا دعویٰ تو ہر شخ کو ہے لیکن عملی ثبوت کوئی فراہم نہیں کرتا۔ واعظ لوگوں کو نماز روزے کی تلقین کرتے لیکن انہیں حقوق العباد کی اہمیت کا احساس نہیں دلاتے' یہ تو بات ہے انفرادی سطح کی' ا حکومت کو دیکھو' ہر لیڈر اسلام کو بطور نعرہ استعمال کرتا ہے اپنے سیاسی مفاد کے لیے۔ یہ ا نہیں سوچتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سوچ کر پریشان رہتے تھے کہ وسیع و عریض سلطنت میں ا کتا بھی بھوکا رہ گیا تو انہیں خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ یہاں نہ جانے کتنے گھرانے فا سے ہوتے ہیں اور حکومت کے ارکان تو کجا ان لوگوں کے پڑوسی ان کی فاقہ کشی سے بے دعوتیں اڑاتے ہیں۔ کون سوچتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا نہیں کر رہا ہے۔ دوسروں کے حقو پورے نہیں کر رہا ہے' اگر حکمرانوں کے دلوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سا خوفِ خدا ہو جائے تو بائی گاڈ' یہ ملک جنت بن جائے"۔

ماجد مبہوت ہو کر سن رہا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کیسے مان لیتا ہیلن کی اسلام پر اتنی گہری نظر ہے' پھر ہیلن کے لہجے میں سچی عقیدت تھی۔

"اب ذرا مسیحیت کے تبلیغی طریق کار کا جائزہ لو۔ اس کی بنیاد عمل پر ہے' خدمت ہے جو اسلام کا زریں اصول ہے۔ عیسائی مشن والے تبلیغ اور خدمت کے ایسے جذبے-

سرشار ہوتے ہیں کہ انہیں زندگی تک کی پروا نہیں ہوتی۔ انہوں نے وہاں جاکر بھی تبلیغ کی' جہاں مہذب انسانوں کے قدم کبھی نہیں پہنچتے تھے۔ وہ آدم خور قبیلوں میں بھی پہنچے' لقمہ اجل بھی بنے' لیکن جہاں موقع ملا' انہوں نے خدمت کے ذریعے دلوں کو تسخیر کرلیا۔ یہاں بھی وہ یہی کر رہے ہیں۔ اس بڑے شہر میں اسپتالوں' ڈاکٹروں' نرسوں اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لو۔ یہ بنیادی طور پر خدمت کے پیشے ہیں' معزز پیشے لیکن عالم کیا ہے۔ خیراتی اسپتالوں میں اسپتال کے عملے کا مریضوں کے ساتھ برتاؤ غیرانسانی ہوتا ہے' حالاں کہ مریضوں کو ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوائیں خردبرد ہو جاتی ہیں اور غریب مریضوں کو مہنگی دوائیں لانے کے لیے میڈیکل اسٹور کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے' تاکہ وہ علاج سے ہی تائب ہو جائیں۔ پرائیویٹ اسپتال صرف بل پر توجہ دیتے ہیں۔ مریضوں کی نگہداشت نہیں کی جاتی۔ انہوں صرف ایک بیڈ دے کر ان پر احسان کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی مشنری اسپتال میں جاکر دیکھو' جن لوگوں نے وہاں علاج کرایا ہے' ان سے جاکر پوچھو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔ کوئی دوا موجود نہ ہو' تو باہر سے منگوائی جاتی ہے' خواہ ضرورت مند کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ مشن تبلیغی فنڈ کو بڑے سلیقے سے استعمال کرتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی بدعنوانی نہیں کرتے وہ دگ' پھر مجو! ایک بات اور ہے۔ پیٹ سب سے بڑا مذہب ہے اور غربت سب سے بڑی کمزوری۔ ضرورت مند کی ضرورت جہاں سے پوری ہوگی' وہ وہیں کا ہو جائے گا۔ غریبوں کو اچھوت بنا کر ان کے حال پر چھوڑ دینا مخدوش ہے۔ کبھی تمہاری تبلیغی جماعت کے کھاتے پیتے گ' جن کے لباس بے شکن ہوتے ہیں اور چہروں پر فراغت تحریر ہوتی ہے' گندی بستیوں کی ک گلیوں میں جاتے بھی ہیں تو انہیں نماز کی تلقین کرتے ہیں' برتری کے احساس کے ساتھ' تری کے لہجے میں' جس میں بڑی غیریت ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتے کہ تم نے آج کھانا کھایا ہے یا نہیں' تمہارے بیمار بچے کو دوا میسر ہے یا نہیں' یہ تمہاری بچیاں غربت کی عریانی میں کیوں لا ہیں' ہمارے ہوتے ہوئے۔ آؤ' ہم تمہارے ساتھ تمہارے گھر کے کچے فرش پر بیٹھ کر کھانا ائیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں' وہ یہ ہے کہ ضروریات سے محروم آدمی ان کا وعظ سن کر مذہب ے اور دور ہو جاتا ہے۔ یہ ردعمل فطری ہے۔ اسلام نے خود زور دیا ہے کہ اصرار پر خدمت فوقیت حاصل ہے۔ اسلام نے اکراہ سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

جب عیسائی مشنری کے لوگ انہی گلیوں میں جاتے ہیں تو لوگوں سے ان کے مسائل چھتے ہیں' انہیں ممکنہ طور پر حل کرتے ہیں۔ حل نہ کر پائیں تو کم از کم اپنے اجلے لباسوں ت وہ ان غربت کے مارے لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ وہ انہیں اچھوت ہونے کا احساس ں دلاتے۔ وہ ان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب بتاؤ کامیاب کون ...... تم یا وہ؟"

ماجد خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس وقت بڑی اذیت میں تھا۔ ہیلن کا سچ بے حد سفاک اور کاٹ دار تھا اور اسے پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے بے حد تلخ لہجے میں کہا۔ "تم تو یہی کہو گی او تم سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ تم انہی کی طرف داری کروگی' انہی کو برتر و بہتر ثابت کرو گی"۔

ہیلن کے چہرے پر کرب کا سایہ سا لہرا گیا۔ "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر اسلامی تعلیمات پر عمل کرو تو برتر و بہتر تو تم ہی ہو' اگر عمل نہیں کرتے تو نہیں ہو اور اس میں قصور نہ میرا ہے نہ اسلام کا"۔ اس نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔ "میں تو غیرجانبداری سے بات کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں اپنے لوگ نہیں کہا' اپنے ہم مذہب کہہ کر ان کا تذکرہ نہیں کیا' میں ان میں ہوں ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کسی کی بھی نہیں ہوں۔ میں تو اپنی منزل ڈھونڈ رہی ہوں۔ بہت تنہا ہوں میں۔ یہ سب کچھ میں نے کسی منفی جذبے کے تحت نہیں کہا۔ میں تو تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں تو بس تمہارا آئینہ ہوں اور جب آدمی یا قوم یا نسل آئینے سے ڈرنے لگے' چڑنے لگے تو اس کے لیے اپنا احتساب کرنا' خود کو ٹٹولنا بہت ضروری ہوتا ہے"۔

یہ آخری بات ماجد کو بہت بری لگی' ڈس گئی اسے۔ "بس' بند کرو یہ بکواس" اس نے انتہائی سخت لہجے میں کہا اور جیب سے دس کا نوٹ نکال کر کیتلی کے نیچے دبایا اور ٹھنڈی چائے کی پیالی چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس نے ہیلن کی آنکھوں میں امنڈتے ہوئے آنسو بھی نہیں دیکھے۔

O============☆===========O

تیسری میٹنگ میں وہی کچھ سامنے آیا' جس کی پیش گوئی ہیلن نے پہلے ہی کردی تھی۔ مولانا بشیر نے علماء سے رابطہ قائم کیا تھا۔ علماء کا کہنا تھا کہ اسلامی ملک میں کسی مذہب کے پیروکاروں کو تبلیغ کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ بات وہ لکھ کر دینے کے لیے تیار تھے لیکن وہ حکومت سے یہ مطالبہ کرنے پر آمادہ نہیں تھے کہ مشنریز پر پابندی لگائی جائے۔ نہ انھوں نے اس سلسلے میں تحریک چلانے کی ہامی بھری۔

دوسری طرف کرنل ارشاد اور ظفر نے قومی اسمبلی کے ان گنت ممبروں سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ ممبروں کا کہنا تھا کہ اس طرح غیر ملکی امداد بند ہو سکتی ہے اور ملک کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے معذرت کی کہ وہ اس قسم کی کوئی تحریک قومی اسمبلی میں پیش نہیں کر سکتے۔

ماجد نے جو کچھ سنا تھا' ہیلن کا نام لیے بغیر انجمن کے عہدے داروں کے گوش گزار کر دیا۔ اس بات کی معقولیت سبھی نے تسلیم کی۔ دشواری یہ تھی کہ فی الوقت ان کے پاس فنڈ نہیں تھا۔ طے یہ پایا کہ پہلے اپنے ہی علاقے میں صفائی کی مہم چلائی جائے گی۔ اس کے لیے دن

اور وقت کا تعین کر لیا گیا۔ کرنل ارشاد نے کہا کہ وہ انجمن کے فنڈ کے لیے کچھ صنعت کاروں سے بات کریں گے۔

وہ ماجد کے لیے بے حد عذاب کے دن تھے۔ وہ ہیلن کو بھولنا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے ۲۱ نمبر بس میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ ہیلن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہیلن کے گھر جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ ہیلن کبھی اسے سچی لگتی اور کبھی فریبی۔ اس کے باوجود وہ سونے کے لیے لیٹتا تو وہ اس کے تصور میں آکھڑی ہوتی اور شکایتی نظروں سے اسے تکتی رہتی۔

صفائی کی مہم والے دن ماجد مقررہ جگہ پر اکیلا کھڑا انجمن کے عہدے داروں کا انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے ہوگئے لیکن کوئی نہیں آیا۔ تنگ آکر وہ گھر چلا آیا۔ اگلے روز ظفر اور شمیم سے ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے وعدہ خلافی کی شکایت کی۔ دونوں نے بہانے بنادیے کہ وہ کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ پھر شمیم نے کہا۔ "تم نے بھی تو حد کردی یار! اب ہم لوگ جھاڑو لگاتے ہوئے کیا اچھے لگیں گے۔ یہ بھنگیوں کا کام ہے۔ انہیں پیسے دے کر صفائی کرائی جائے گی۔ ذرا فنڈ تو اکٹھا ہو جائے"۔

ماجد اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا' لیکن کچھ کہنا فضول تھا۔ وہ لوگ اس کام کی افادیت کو سمجھ نہیں رہے تھے۔ ہیلن کی یہ بات بھی درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ بے زاری کے عالم میں وہاں سے چلا آیا:

اگلے روز اسے پتا چلا کہ شہر کی ایک پسماندہ بستی میں ایک بیوہ عورت اپنے بچے سمیت عیسائی ہوگئی ہے۔ اخباروں میں قبول اسلام کی خبریں تو چھپتی ہیں لیکن ایسی عبرت خیز خبروں کو جگہ نہیں ملتی کہ کہیں عوام جذباتی ہو کر حکومت اور مشنریز کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ ماجد نے وہ خبر دفتر میں ایک دوست کی زبانی سنی' جو اسی بستی میں رہتا تھا' جہاں یہ واقعہ ہوا۔

شبیر نے اسے بتایا کہ وہ بیوہ عورت اپنے چھ سالہ بچے کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس کا گزارا سلائی پر تھا۔ ایک سال پہلے اس کے بچے کو کوئی بیماری لاحق ہوگئی۔ خیراتی اسپتال والوں نے جواب دے دیا کہ مرض ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔ عورت نے شہر کے تمام خیراتی اسپتالوں کے چکر کاٹے لیکن ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔ ایسے ہی ایک اسپتال میں اس کی ملاقات ایک کرسچن نرس سے ہوگئی۔ نرس نے اس کا پتا لے لیا۔ اگلے روز مشنری والے اس کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے بچے کو پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا۔ چھ ماہ بعد بچہ صحت مند ہوگیا۔ مشنری والوں نے اس عورت کی روپے پیسے سے بھی مدد کی' کیوں کہ بچے کی بیماری اور اسے لانے لے جانے اور تیمارداری کی وجہ سے سلائی کا کام بھی کم ہوگیا تھا اور فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ پڑوس والے یہ سوچ کر کترانے لگے تھے کہ پیسے دیں گے تو واپس نہیں

ملیں گے۔ "کل اس نے باقاعدہ عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا"۔ شبیر نے بتایا محلے کے لوگوں نے پہلے اسے سمجھایا' پھر لعنت ملامت کی اور دھمکیاں بھی دیں لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ کہتی تھی' میرا بچہ مر رہا تھا تو تم میں سے کسی نے پوچھا؟ میں فاقے کرتی تھی تو تم نظریں چراتے تھے تم سے تو وہ غیر اچھے' جنہوں نے میرے لیے اتنا کچھ کیا اور مجھ سے مذہب تبدیل کرنے کو بھی نہیں کہا۔ میں اپنی خوشی سے عیسائی ہوئی ہوں۔ پھر مشنری والوں نے اسے مسیحیوں کی ایک بستی میں مکان بھی دلا دیا"۔

ماجد کے دل پر چوٹ سی لگی ہیلن کی ایک اور بات درست ثابت ہو گئی تھی۔

○============☆============○

اس رات ماجد نے ہیلن کو خواب میں دیکھا۔ وہ بہت اداس اور دلگیر نظر آ رہی تھی۔ خواب میں ماجد نے بہت کوشش کی کہ اسے بولنے پر مجبور کرے' لیکن وہ خاموش رہی۔ بس وہ اداس نظروں سے اسے تکتی رہی۔ "مجھ سے خفا ہو؟" ماجد نے پوچھا۔

ہیلن نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں نے تمہارا دل دکھایا ہے' تمہیں تکلیف پہنچائی ہے' یہی بات ہے نا؟"

اس بار ہیلن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے معاف کر دو' آئی ایم سوری...... رئیلی سوری"۔

وہ ایک دم خفا ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔ "لو مینز نیور ہیونگ ٹو سے' یو آر سوری"۔

"آئی ایم سوری فار مینٹنگ سوری"۔ ماجد نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر خود ہی سنجیدہ ہو گئی۔ "تم بہت بدگمانی کرتے ہو"۔

"اب نہیں کروں گا"۔

"وعدہ"۔ ہیلن نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ماجد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "وعدہ...... پکا وعدہ"۔

ہیلن کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ "بات نہیں کہ میں تمہارے دیے ہوئے دکھوں سے یا ان دکھوں سے ڈرتی ہوں' جو تم مستقبل میں مجھے دو گے۔ میرے لیے تو وہ بھی سرمایۂ حیات ہوں گے۔ میں تو صرف اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں اس کے باوجود تم مجھے اکیلا نہ چھوڑ دو"۔

"ایسا بھی نہیں ہو گا"۔ ماجد نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنا یہ جملہ اس نے خود بھی سنا تھا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اسے اپنے دل پر ناقابل بیان بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چھ بجے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ اٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا' کپڑے بدلے اور گھر سے نکل آیا۔ امی ناشتے کے لیے کہتی رہ

گئیں۔

وہ ہیلن کے گھر پہنچا تو سوا سات بجے تھے۔ ہیلن اسے دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ شیلا کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ میری آفس کے لیے نکل چکی تھی۔ پاپا بستر پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ ماجد کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ "اومائی سن گڈ مارننگ...... اتنا ڈن کے بعد آیا...... کھفا ہے ام سے؟"

"ارے نہیں پاپا! آپ سے کیسے خفا ہو سکتا ہوں میں؟" ماجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو' اچھا ہوا۔ ناشتہ ساتھ کریں گے۔ اے اسٹیلا! ناشتہ لاؤ امارے اور ماجد کے واسطے"۔ اس نے بیوی کو پکارا۔

ناشتے کے بعد ہیلن دفتر کے لیے تیار ہوئی۔ ماجد ان کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا۔ وہ دونوں بس اسٹاپ کی طرف بڑھتے رہے۔ پھر ماجد نے کہا۔ "آج دفتر سے چھٹی کر سکتی ہو؟"

ہیلن نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟ تم چاہتے ہو کہ میں آج چھٹی کر لوں؟"

"ہاں"

"تو سمجھ لو' ہو گئی چھٹی۔ لیکن کریں گے کیا؟"

"پہلے کہیں چل کر چائے پئیں گے۔ وہاں بیٹھ کر سوچیں گے کہ کیا کیا جائے"۔ ماجد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اسے خوف تھا کہ ہیلن کہے گی۔ وہاں بیٹھ کر تم لڑو گے مجھ سے' لیکن ہیلن نے کچھ نہیں کہا۔ صرف سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گئی۔ "آج میرا جی چاہتا ہے کہ ہم اسکول سے بھاگے ہوئے بچوں کی طرح آوارہ گردی کریں" ماجد نے مزید کہا' پھر پوچھا۔ "پیسے کتنے ہیں تمہارے پاس؟"

ہیلن یہ سن کر کھل اٹھی۔ اس سے پہلے ماجد نے کبھی اسے کوئی بل ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ "بہت پیسے ہیں میرے پاس۔ چار سو روپے سے زیادہ"۔

"اتنے سارے! تب تو وہ گھر کے خرچ کے ہوں گے"۔ ماجد نے کہا

"نہیں مجّو! کل ہی تو مجھے بونس ملا ہے"۔

"تب تو ٹھیک ہے"۔

باتیں کرتے کرتے وہ کیفے اوڈین تک آ گئے تھے۔ وہ اوپر جا بیٹھے اور انہوں نے چائے منگوائی۔ ماجد نے چائے کی ٹرے اپنے سامنے کھینچ لی۔ "آج چائے میں بناؤں گا"۔ اس نے کہا۔

"نہیں مجّو! پلیز" ہیلن نے بچوں کی طرح ضد کی "تمہارے لیے چائے بنا کر مجھے خوشی ملتی ہے"۔

"آج تو میں ہی بناؤں گا۔ ویسے بھی تم گھر پر میرے لیے چائے بنا کر اپنی خوشی پوری کر

چکی ہوں"

"تمہیں کیسے پتا؟" ہیلن کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا میں تمہارے ہاتھ کی چائے کا ذائقہ نہیں پہچانتا"۔ ماجد نے آنکھیں نکال کر کہا اور چائے کی پیالی اس کی طرف کھسکادی۔

"اچھا اس عنایت کی کوئی خاص وجہ؟"

"بڑی بدگمان ہو"۔ ماجد نے کہا اور خود ہی جھینپ گیا۔ بدگمان تو وہ خود تھا۔

"نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے، تم خوامخواہ کسی بات کی تلافی کے چکر میں ہو، حالاں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"ضرورت تو ہے۔ اچھا، یہ بتاؤ تم مجھ سے خفا تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں، میں خفا ہو بھی نہیں سکتی۔ تم سے خفا ہو کر تو مرجاؤں گی میں۔ مجوّ پاگل! تم نے ایسی بات سوچی کیسے؟" وہ جذباتی ہوگئی۔

"میں نے زیادتی جو کی تھی" ماجد نے کہا۔ "اچھا، تم خفا نہیں تھیں تو مجھے فون کیوں نہیں کر لیا تم نے؟"

"آزد خیال تو ہوں"۔ ہیلن نے آہ بھر کے کہا۔ "لیکن نسوانی وقار کا احترام ضروری سمجھتی ہوں۔ یہ انا کی بات نہیں۔ میری غلطی ہوتی تو میں تمہیں اگلے دن ہی فون کر لیتی، لیکن غلطی تمہاری تھی اور پھر مجھے یقین تھا کہ تم لوٹ آؤ گے۔ یہ یقین نہ ہوتا تو خود ہی فون کر لیتی شاید مجوّ! تم میرے لیے بہت قیمتی ہو اور میں گھروندے بنانے والوں میں سے ہوں۔ نام لکھنے والوں میں سے نہیں"۔

ماجد جھینپ گیا۔ "ٹھیک کہتی ہو تم۔ میں خودغرض بھی ہوں اور انا پرست بھی" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری محبت کے قابل........"

ہیلن نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی بات نہ کرو مجوّ!" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ ماجد بہت زیادہ شرمندہ تھا۔ اس دنیا میں کون کسی کو اتنا چاہتا ہے، خود سے بھی زیادہ۔

چائے ختم کرنے کے بعد ماجد نے پیالی ایک طرف کھسکائی اور آہستہ سے کہا۔ "ہیلن! مجھ سے شادی کروگی؟"

"کیوں نہیں، کب شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ہیلن! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں"۔ ماجد نے احتجاج کیا۔

"میں بھی مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ اتنے سنجیدہ اور اہم معاملات میں کون مذاق کر

ہے"۔

"تو تم تیار ہو؟"

"ہاں، حالاں کہ پچھلی بار کی گفتگو کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تمہاری بدگمانیاں مجھے دیتی رہیں گی۔ کاش، میں مسلمان پیدا ہوتی۔ بہرحال، مجھے ان دکھوں کا کوئی خوف نہیں۔ مجھے تم مل جاؤ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے"۔

ماجد کو اس رات کا خواب یاد آگیا۔ "تم نے رات خواب میں بھی تقریباً یہی بات کہی "۔ اس نے کہا اور پھر ہیلن کو پورا خواب سنادیا۔ ہیلن سنتی رہی۔

"اب تو یقین کر لو میری سچائی کا" ہیلن نے کہا۔

"اب کبھی بدگمانی نہیں کروں گا"۔

"وعدہ"۔ ہیلن نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وعدہ........ پکا وعدہ"۔ ماجد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

اس کا خواب سچا ثابت ہوگیا تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر ہیلن نے کہا مجوّ! ایک مسئلہ ہے۔ تمہیں اس وقت کا انتظار نا ہوگا، جب شیلا تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ میں مما اور پاپا کو بے سہارا ا چھوڑ سکتی"۔

ماجد کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، میں خود بھی یہ نہیں چاہتا کہ اور پاپا پر کوئی منفی اثر پڑے، تم یوں کرنا کہ سروس کرتی رہنا۔ ان دونوں کے لیے، مجھے کوئی راض نہیں ہوگا"۔

"تھینک یو مجوّ!" ہیلن کے لہجے میں احسان مندی تھی۔ "اچھا اب کیا پروگرام ہے؟"

"یہاں سے پہلے تو چڑیا گھر چلیں گے، اور پھر........"

"پھر ٹیکسی کر کے ٹیکسی والے سے کہیں گے کہ ہمیں گھماتا رہے، شہر بھر میں۔ میں رے ساتھ ساری دنیا گھومنا چاہتی ہوں۔ کیوں نہ پہلے شہر سے شروعات کریں"۔

"رائٹ، اور آخر میں ہم کلفٹن چلیں گے"۔

"اوکے"۔

وہ سارا دن بچوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بے فکری سے گھومتے رہے۔ انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا۔ شام ہوتے ہی وہ کلفٹن پہنچ گئے۔ آٹھ بجے کے قریب وہ سے اٹھے۔ "اب ہم آج کی آخری چائے پئیں گے، جبیس میں"۔ ماجد نے کہا۔

جبیس میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے ماجد نے کہا۔ "ہیلن! یاد ہے، آج تم نے کہا تھا کہ کاش تم کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوتیں"۔

"ہاں' مجھے یاد ہے"۔

"تو تم مسلمان ہو جاؤ نا"۔

"مجوّ! آج میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میں شروع ہی سے اسلام سے متاثر ہوں لیکن میں تمہاری خاطر مسلمان ہو کر یہ کہلوانا نہیں چاہتی کہ میں تم سے شادی کے لالچ میں مسلمان ہوئی ہوں۔ یہ اسلام کی توہین ہے۔ میں اسلام کی پسندیدگی کی وجہ سے مسلمان ہوں گی۔ پلیز مجوّ! اس معاملے میں تم مجھ سے ضد نہ کرنا"۔ ہیلن کے لہجے میں التجا تھی۔

"ٹھیک ہے"۔ ماجد نے ہچکچاتے ہوئے کہا"۔ لیکن پھر شادی کیسے ہوگی؟"

"ایسی بات نہیں۔ اسلام نے اہلِ کتاب سے نکاح کی اجازت دی ہے"۔

"اچھا"۔ ماجد نے کہا........ لیکن اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں' تم چاہو تو پوچھ لینا"

"ٹھیک ہے۔ آؤ اب چلیں"۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی قربت میں ایک یادگار دن گزارا تھا۔

O============☆============O

اس رات ماجد' ابا کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ابا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ماجد نے ہمت کرکے ڈرتے ڈرتے پوچھا "اباجی! کیا اہلِ کتاب لڑکی سے نکاح جائز ہے؟"

ابا نے کتاب آنکھوں کے سامنے سے ہٹائی اور اسے بہت غور سے دیکھا۔ "ہاں بیٹے! جائز تو ہے"۔ انہوں نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن عموماً" اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہوتا"۔

"کیسے مسائل؟"

"بھئی' بیوی اپنے مذہب پر قائم رہے' تب بھی محبت کے زور پر کام چل جاتا ہے۔ اصل مسئلہ بچوں کی پیدائش کے بعد سامنے آتا ہے"۔

"میں سمجھا نہیں اباجی!"

"مسئلہ یہ کھڑا ہوتا ہے بیٹے کہ بچوں کا کون سا مذہب ہوگا۔ یہ بات طے ہے کہ بچے ما[ں] سے بہت قریب ہوتے ہیں اور اس کا اثر بہت گہرائی میں قبول کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے' تم [یہ] کبھی قبول نہیں کرو گے کہ تمہارے بچے عیسائیت کی طرف مائل بھی ہوں۔ یوں رنجشیں پیدا ہوں گی۔ ازدواجی زندگی الگ متاثر ہوگی اور نسلی بگاڑ کا مسئلہ الگ کھڑا ہوگا"۔

"لیکن اباجی! ہمارے ہاں تو امی بھی ہوں گی اور ثمینہ زرینہ بھی۔ بچے ان سے بھی متاثر ہوا [کریں] گے۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ ابھرنے کا امکان کم ہے"۔

"ہاں بیٹے! کم ہے لیکن ہے تو سہی۔ مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ موہوم سے امکان کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جانا چاہیے"۔

ماجد کے چہرے پر اندیشوں کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ اباجی ایسے ہی تھے۔ ابا بھی اور دوست بھی۔ اپنے طور پر برا بھلا سمجھا دیتے لیکن کبھی کسی چیز سے نہ روکتے۔ سمجھاتے بھی تو استدلال کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ عمل کی آزادی ملنے کے باوجود وہ ان کا فیصلہ قبول کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ محبت کیوں کہ قوی تھی' اس لیے وہ پھر بھی اٹک رہا تھا' لیکن اباجی کی بات کی معقولیت اپنی جگہ تھی۔

ابا نے اسے پریشان دیکھا تو محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارے سوال کا جواب دیا ہے بیٹے! یہ نہ کوئی فیصلہ ہے نہ حکم۔ میں کہہ چکا ہوں کہ جس لڑکی کو تم پسند کرو گے' وہ کوئی بھی ہو اور کیسی بھی ہو' اس گھر میں اسے بہو کا درجہ ملے گا اور محبت اور شفقت بھی' لیکن میں تمہیں مستقبل میں پریشان اور مسائل میں گھرا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔ آگے جو مرضی مالک کی"۔

"میں جانتا ہوں اباجی!" ماجد نے ممنونیت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ بہت اچھے ہیں"۔

اس رات وہ دیر تک سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا۔

O============☆============O

اگلی صبح اس نے ہیلن کو اس کے آفس فون کیا اور چھ بجے کیفے اوڈین میں ملنے کو کہا۔ حسب توقع ہیلن نے ہامی بھرلی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بات کیا ہے۔ ماجد شام تک اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ وہ ہیلن سے محبت کرتا تھا اور اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اپنے بچوں کو خود سے بہتر مسلمان دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات درحقیقت ہیلن کی محبت سے زیادہ اہم تھی۔ اگر ابا سے بات نہ ہوئی ہوتی تو وہ ہیلن کی محبت کو اہم تر قرار دیتا۔ کیوں کہ شادی سے پہلے محبت اہم ترین ہوتی ہے اور اس سے متعلق سنگین مسائل کی طرف آدمی کی نظر کبھی نہیں جاتی۔ البتہ شادی کے بعد چھوٹے چھوٹے مسائل بھی پھیل کر سامنے آتے ہیں۔ بڑے اور سنگین مسائل کی تو بات ہی الگ ہے۔

وہ بھی اسیرِ محبت تھا۔ اگر اسے ہیلن کی بے پناہ محبت پر یقین نہ ہوتا تو شاید وہ ہیلن سے کوئی مطالبہ کرنے کے بجائے اسے جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرلیتا لیکن اتنے دنوں کے ساتھ کے بعد اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہیلن اسے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے فیصلے میں لچک رکھی تھی کیوں کہ وہ بھی ہیلن سے محبت کرتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ہیلن سے مسلمان ہونے کو کہے گا' اگر وہ انکار کرے گی تو اس سے وقتی طور پر قطع تعلق کرلے گا۔ اس صورت میں امکان یہی تھا کہ ہیلن کچھ دن بعد

اس کی بات مان لے گی اور اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ہیلن اڑ گئی ہے تو وہ اس سے معذرت کر لے گا' اسے منا لے گا۔ سارا کھیل تحمل کا تھا' مزاحمت کا تھا۔

یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گیا۔ شام کو وہ دونوں ملے۔ ماجد نے ویٹر سے کوکا کولا لانے کو کہا۔ ہیلن حیران نظر آنے لگی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ ماجد اس سے وہ بات کہنے کا حوصلہ پیدا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا مطالبہ ہیلن کے لیے تکلیف دہ ہو گا۔

"شادی کے بارے میں کیا سوچا تم نے؟" بالآخر ماجد نے بات شروع کی۔

ہیلن نے نظریں اٹھا کر حیران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "سوچنا کیا ہے' اب تو فیصلہ بھی ہو چکا ہے"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں' لیکن ہیلن! میں چاہتا ہوں' تم شادی سے پہلے اسلام قبول کر لو"۔ ماجد نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے' کل ہم اس سلسلے میں حتمی فیصلہ کر چکے تھے"۔

"اس کے باوجود میں تم سے التجا کر رہا ہوں"۔

"آخر ہوا کیا؟" ہیلن کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

ماجد نے اباجی کی تمام دلیلیں اس کے سامنے رکھ دیں' پھر کہا۔ "تم یقیناً یہ نہیں چاہو گی کہ ہماری محبت ازدواجی زندگی کی تلخیوں کی نذر ہو جائے"۔

"ایسا ہو گا بھی نہیں' کم از کم میری طرف سے ایسا نہیں ہو گا"۔ ہیلن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ لیکن بدگمانی انسان کو اندر ہی اندر جلاتی رہتی ہے' اس کا کوئی علاج ہی نہیں ہے"۔

"یہی سہی' لیکن یہ صورت بھی تو تلخی اور اختلاف کی ہے"۔

"میں تو تمہارا دیا ہوا جہنم بھی قبول کرنے کو تیار ہوں"۔ ہیلن جذباتی ہو گئی۔

"لیکن میں تمہیں جنت دینا چاہتا ہوں' اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم میری یہ التجا مان لو۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ بھی نہیں مانگوں گا"۔

"اور اگر میں صرف تمہیں پانے کے لیے بظاہر اسلام قبول کر لوں تو تمہارے خیال میں مسئلہ حل ہو جائے گا؟" ہیلن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم یہ پہلو نظرانداز کر رہے ہو کہ درحقیقت ہر چیز کا انحصار ہماری نیتوں پر ہے اور نیتوں کو جانچنے کا کوئی پیمانہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ یہ کام تو باہمی اعتماد پر چلتا ہے"۔

"میں تمہیں جانتا ہوں"۔ ماجد نے بڑے یقین سے کہا۔ "تم کھوٹی نہیں ہو' منافقت سے بہت دور ہو تم"۔

"لیکن یہ تو سوچو کہ اتنی بڑی آزمائش میں ڈال کر تم مجھے منافقت کی ترغیب دے رہے ہو"۔ ہیلن نے احتجاج کیا۔ "میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی' کسی قیمت پر بھی نہیں"۔

"میں جانتا ہوں' یہ ترغیب بھی کامیاب نہیں ہو سکتی"۔

ہیلن کچھ دیر سوچتی رہی' پھر اس نے ماجد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مجھ پر یقین رکھتے ہو؟"

"اس سوال کا جواب تو تم خود بھی دے سکتی ہو"۔

"نہیں دے سکتی' تم نے کبھی مجھ پر یقین کیا ہی نہیں"۔

ماجد شرمندہ ہو گیا۔ "میں تم پر' تمہاری سچائی پر یقین رکھتا ہوں"۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ جہاں بات عقیدے اور مذہب کی ہو اور دونوں فریقوں کے درمیان یہ فرق موجود ہو' وہاں مکمل یقین اور اعتماد کبھی نہیں پنپ سکتا' لیکن ہیلن اس پر اعتماد کرتی تھی' یقین رکھتی تھی' پھر اس نے سوچا' ممکن ہے' ہیلن کا یقین اور اعتماد محض سطحی ہو' یا ظاہری۔

"میں ضمانت دیتی ہوں کہ ہمارے گھر میں یہ مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہو گا"۔ ہیلن نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"یہ' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں جو کہہ رہی ہوں۔ میں ضمانت دیتی ہوں کہ میری تربیت کردہ اولاد اسلام کی اس قدر شیدائی ہو گی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ جو تمہاری نمی ہے نا' وہ تو مسلمان ہے نا' پھر بھی وہ تمہارے بچوں کی ایسی تربیت نہیں کر سکتی' جیسی میں کروں گی۔ یقین کرو' ہمارے درمیان یہ مسئلہ کبھی نہیں ہو گا۔ مجھ پر اعتماد کرو مجّو!"

ماجد سوچ میں پڑ گیا۔ ہیلن نے بہت بڑا چیلنج کیا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس چیلنج میں نمی کو خوامخواہ ملوث کر لیا تھا۔ کچھ بھی سہی' وہ بہرحال لڑکی تھی اور لڑکیاں ذرا ذرا سی بات پر رقابت محسوس کر لیتی ہیں۔ ماجد کو اس کے لہجے میں جذباتیت محسوس ہوئی تھی اور جذباتیت خود بقول ہیلن کے ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ وہ خود اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے ہیلن پر اعتبار نہیں ہے اور اس کی ضمانت وہ قبول نہیں کر سکتا۔ اچانک اسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ "میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں ہیلن! لیکن امی اور ابا تو نہیں کر سکتے"۔ اس نے کہا اور کہتے ہی اسے ندامت بھی ہوئی' کیوں کہ ابا تو صاف کہہ چکے تھے کہ وہ اس کی پسندیدہ لڑکی کو ہر حال میں بہو کا درجہ دیں گے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ اس نے یہ جھوٹ نہ صرف اپنے خاندان اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے بولا ہے بلکہ اس نے ایک دینی خدمت بھی کی ہے۔ اس نے کسی سے سنا تھا کہ کسی غیرمسلم کو راہِ حق پر لانا کارِ ثواب ہے۔

"یہاں تم نے مجھے لاجواب کر دیا"۔ ہیلن نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "واقعی تمہارے

والدین تو آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے"۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بیرا خالی بوتلیں لے گیا۔ پھر وہ بل لایا اور ماجد نے ادائیگی کردی۔ اس دوران ہیلن کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ اس کی پیشانی پر فکر کی سلوٹیں تھیں۔

"پھر کیا سوچا تم نے؟" ماجد نے پوچھا۔

"تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے' یہ حقیقت ہے کہ اگر میں تمہیں پانے کے لیے اسلام قبول کروں گی تو ہمیشہ ایک خلش میں مبتلا رہوں گی۔ میری روح مضطرب رہے گی ہمیشہ' مجھے کھوٹ کا احساس رہے گا۔ میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا"۔ ہیلن کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"محبت ہر خلش دور کر دیتی ہے' یہ ہر درد کا مداوا ہے۔ کیا تم محبت پر یقین نہیں رکھتیں؟"

"محبت پر تو ایمان ہے میرا' لیکن مجوّ! کچھ جذبے محبت سے بھی ماورا ہوتے ہیں"۔ ہیلن نے کہا اور پھر سوچنے لگی۔ پھر اچانک اس نے پوچھا۔ "سچ سچ بتانا مجوّ! تم نے کسی سے بات کی تھی۔ آج تم اپنی زبان تو نہیں بول رہے ہو"۔

"میں نے اباجی سے بات کی تھی"۔ ماجد نے بتایا۔

ہیلن پھر سوچ میں پڑ گئی۔ "تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا۔

"میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو"۔

"صرف یہی تو نہیں چاہتے تم"۔ ہیلن نے کہا پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی۔ "مجھے مہلت مل سکتی ہے سوچنے کی؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں"۔

"ٹھیک ہے' میں یہ چاہتی ہوں کہ ہم ایک مہینے تک نہ ایک دوسرے سے ملیں' نہ فون کریں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرو گے"۔

ماجد بری طرح چونکا۔ "کیوں' مجھے بھول جانا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں جانتی ہوں کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے"۔

"تو پھر یہ پابندی کیوں لگا رہی ہو؟"

"جاننا چاہتی ہوں کہ مجھ میں تلاشِ حق کا جذبہ توانا تر ہے یا تمہاری محبت کا۔ میں کوئی خلش پالنے کی عادی نہیں ہوں"۔

"لیکن ایک مہینہ' یہ تو بہت ہوتا ہے۔ میں کیسے رہ سکوں گا تمہارے بغیر؟" ماجد نے

احتجاج کیا۔

"رہ لو گے' تمہیں مجھ سے زیادہ اذیت نہیں ہوگی مجھ سے دور رہ کر"۔

ماجد نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھو مجوّ! میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نسبتاً تمہاری ضرورت زیادہ محسوس کرتی ہوں۔ میں تمہیں زیادہ چاہتی ہوں۔ برا نہ ماننا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ محبتیں بھی رزق کی طرح ہوتی ہیں' مالک جس کو جتنی دے دے۔ اس میں کسی کا کمال نہیں"۔

ماجد خاموش رہا۔ جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے لیکن اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے' یہ دکھاوا ہو' پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ شاید وہ اب تک محبت میں یقین کی منزل میں داخل نہیں ہوا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا مجوّ! جو لوگ محبت میں یقین سے محروم ہوتے ہیں' انہیں کچھ بھی نہیں ملتا' لطف کی بات یہ ہے کہ محبت دو طرفہ کھیل ہے۔ یقین دونوں طرف ضروری ہے' اگر ایک طرف گمان ہو' یقین میں کمی ہو تو دوسری طرف خواہ یقین ایمان کی حد کو پہنچا ہوا ہو' رائیگاں ہو جاتا ہے' اور زیاں کی آگ' جدائی کی آگ دونوں کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ یقین والا خوامخواہ مارا جاتا ہے۔ اوہ معاف کرنا' میں بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھی۔ اس وقت ہذیانی کیفیت ہو رہی ہے میری"۔

ماجد کو احساس تھا کہ وہ ہیلن کا ہذیان نہیں تھا۔ وہ اس کے عدم یقین کو پڑھ چکی تھی اور اس نے جو کچھ کہا' وہ ایک طرح کی پیش گوئی تھی۔ وہ ہذیان ہرگز نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے' خاموش بیٹھا رہا۔ ہیلن سے نظریں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔

"تو وعدہ کرتے ہو مجھ سے کہ ایک مہینے تک نہ مجھ سے ملو گے اور نہ مجھے فون کرو گے؟" ہیلن نے پوچھا۔

"یہ بہت ضروری ہے تمہارے لیے؟"

"ہاں' اس کے بغیر میں فیصلہ نہیں کر سکتی"۔

"تب تو مجبوری ہے' لیکن میں ایسا نہیں چاہتا"۔

"وعدہ کرو......... وعدہ کرو مجھ سے"۔ ہیلن نے تند لہجے میں کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں"۔ ماجد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک جانتا تھا کہ یہ کتنی کٹھن آزمائش کا نقطۂ آغاز ہے' لیکن دوسرے کو ابھی اندازہ نہیں تھا۔

O============☆============O

وہ ایک مہینہ ماجد پر بہت بھاری گزرا۔ پابندی اور دوری تو یوں بھی ہر چیز کی قیمت بڑھا دیتی ہے، وہ تو پھر ہیلن سے محبت کرتا تھا۔ ہیلن سے کم ہی سہی، لیکن بے طلب تو وہ بھی نہیں تھا۔ اس ایک مہینے میں وہ دنیا کا کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرسکا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ماحول سے، گھر والوں تک سے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی یہ تبدیلی گھر میں سبھی نے محسوس کی لیکن کسی نے کچھ پوچھا نہیں۔ کوئی پوچھتا تو بھی کیا فرق پڑتا۔ وہ اس سلسلے میں کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتا تھا۔

پہلے ہی ہفتے میں اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ ہیلن کا عادی ہوچکا ہے، اس کی سمجھ میں اس شعر کا مفہوم آگیا، جس کا وہ ہمیشہ مذاق اڑاتا تھا۔

وہ ترا ساتھ ایک گھڑی بھر کا
کیوں ستاتا ہے عادتوں کی طرح

دوسرے ہفتے کے شروع میں یہ حال ہوا کہ اس کے ذہن مین ہر وقت ہیلن کا تصور ہوتا۔ وہ یہ آس لے کہ سوتا کہ اسے خواب میں دیکھے گا لیکن وہ عجیب وغریب خواب دیکھتا، اذیت ناک خواب۔ ہیلن اسے کبھی خواب میں نظر نہیں آئی۔ اسے نیند سے خوف آنے لگا۔ نیند اچھی چیز نہیں رہی تھی۔ بار بار آنکھ کھلتی، اس پر وہ اذیت ناک خواب۔

ہر صبح دفتر جاتے ہوئے وہ سوچتا کہ آج ہیلن کو فون کرے گا۔ دفتر میں کش مکش میں مبتلا رہتا۔ اس کا جی چاہتا کہ فون کرے پھر وہ خود کو سمجھاتا کہ فون کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہوگیا ہے۔ وہ خود کو یاد دلاتا کہ وہ ایک جنگ لڑ رہا ہے، جس میں اہمیت ضبط اور تحمل کی ہے۔ وہ خود کو روک لیتا۔ اسے وہ جنگ بہرحال جیتنا تھی۔ اس ضبط میں بڑی اذیت تھی۔ اسے خیال آتا کہ ہیلن کی اذیت تو اس سے بھی سوا ہوگی۔ پھر وہ سوچتا کہ کون جانے، وہ بڑے سکون سے ہو، سکون سے نہ ہوتی تو فون کرلیتی۔ پھر خیال آتا کہ وہ خود بھی بے سکون ہونے کے باوجود فون نہیں کررہا۔ اس طرح وہ خود ہی سوال گھڑتا اور خود ہی اس کے جواب۔ نتیجے میں وہ بری طرح جھنجلاتا، خود پر بھی اور ہیلن پر بھی۔ خود پر اس لیے کہ ہیلن سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ اسی نے کیا۔ ہیلن پر اس لیے کہ ایک مہینے کی یہ صوتی اور صوری جدائی اسی نے تھوپی تھی۔ اس عالم میں اسے بھوک لگتی لیکن کھانا نہ کھایا جاتا۔ وہ دو چار لقمے زہر مار کر رہ جاتا۔ چائے اور سگریٹ نوشی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ ہر نیا دن گزرے ہوئے دن کی تصویر ہوتا تھا۔ بس اذیت کے کسی نئے رنگ کا اضافہ ہو جاتا تھا اس میں۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہا تھا۔

ایک ماہ پورا ہونے سے ایک دن پہلے ہیڈ کلرک نے اسے بلایا۔ "تمہارا فون ہے"۔

انھوں نے کہا۔

ماجد نے ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو"۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

دوسری طرف سے صرف بے ترتیب سانسوں کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو"۔ اس بار وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ ذہن میں اندیشے کلبلانے لگے تھے۔

"ہیلو مجوّ!" جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"ہاں بول رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے، تم نے فون تو کیا"۔

"بہت ہوچکی مجوّ! اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا"۔ ہیلن کی آواز لرز رہی تھی۔

"تو نہ کرو۔ میرا بھی برا حال ہے۔ آج ہی آجاؤ نا"۔

"ہاں، لیکن نہیں۔ جہاں اتنے دن جھیلے، ایک دن اور سہی"۔

"بہت ضدی ہو؟"

"نہیں، وعدے کے پاس رکھنا جانتی ہوں۔ خواہ وہ کسی اور سے نہیں، خود سے ہی کیا ہو۔ ہم کل ملیں گے مجوّ!"

"ٹھیک ہے۔ کل چھٹی کرلو۔ میں تمہارے گھر آجاؤں گا"۔

"نہیں نہیں........" اس کی آواز میں بے تابی تھی۔ "یہ تو کوئی ضبط نہ ہوا۔ نہ تم چھٹی کروگے نہ میں۔ ہم آفس سے چھٹی کے بعد ملیں گے۔ چھ بجے"۔

"خوامخواہ کی ضد کررہی ہو"۔ ماجد جھنجلا گیا۔

"ضد نہیں، وعدے کی بات ہے۔ پلیز مجوّ! مجھ سے خفا ہو کر بات نہ کرو"۔

"نہیں، میں خفا تو نہیں ہوں"۔ ماجد نے جلدی سے کہا۔ "کہاں ملوگی؟"

"وہیں، کیفے اوڈین"۔

"ٹھیک ہے خدا حافظ"۔

"اللہ حافظ"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ ماجد نے ریسور کریڈل پر ڈالا اور اپنی سیٹ پر واپس آگیا۔ ہیلن کے انداز میں ایک مثبت تبدیلی نظر آئی تھی۔ اس نے گڈبائی کے بجائے اللہ حافظ کہا تھا۔

O============☆============O

وہ ملاقات بھی یادگار تھی۔ ہیلن نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے اور ویٹر کے آنے پر بھی نہیں چھوڑے تھے۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی، جیسے اسے اس کے وجود پر شک ہو۔ ماجد نے ویٹر کو چائے لانے کی ہدایت کی۔ وہ خفت محسوس کررہا تھا۔

"کیسی ہو تم؟" اس نے بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو' کیسی ہوں"۔ ہیلن نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ماجد نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ بہت کمزور نظر آرہی تھی وہ۔ رخسار اندر کو دھنس گئے تھے' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ رنگت دب گئی تھی اور جلد مرجھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک مہینہ اسے چاٹ گیا ہے۔ "یہ کیا حال کر لیا تم نے اپنا؟" ماجد نے پوچھا۔

وہ بھی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ "حال تو تمہارا بھی اچھا نہیں ہے"۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔

اتنی دیر میں ویٹر چائے لے آیا۔ ہیلن نے بے تابی سے ٹرے اپنی طرف کھسکالی۔ "چائے بنانے کو ترس گئی تھی میں۔ سچ پوچھو تو چائے سے نفرت ہوگئی تھی مجھے"۔ اس نے کہا اور چائے بنا کر پیالی ماجد کے سامنے رکھ دی۔ "لو چائے پیو"۔

"تم نے اپنا کیا حشر کرلیا ہے؟" ماجد نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں' چند روز میں ہم دونوں ہی سنبھل جائیں گے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ نہیں پوچھو گے کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"بتاؤ"۔

"میرا تلاش حق کا جذبہ تمہاری محبت سے ہار گیا۔ مجھے خوشی بھی ہے لیکن میں افسردہ بھی ہوں۔ تمہاری محبت کی یہ فتح مجھے بہت مہنگی پڑی ہے' تم جیت گئے مجو!"

ماجد نہ جانے کیوں شرمسار ہوگیا۔ وہ واقعی جیت گیا تھا' لیکن اسے اس جیت کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ "تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں تو اب ذرا سی بھی دیر نہیں چاہتی۔ آج میں مما اور پاپا کو بتا دوں گی"۔

"اور ان کا ردعمل کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ تو برسوں سے یہی توقع کر رہے ہیں۔ انہیں دکھ ہوگا۔ لیکن یقین کرو' مجھے نہیں ہوگا۔ البتہ میں ان کا خیال رکھتی رہوں گی۔ تم سے بھی میری یہی التجا ہے"۔

"میں تم سے اس سلسلے میں وعدہ کر چکا ہوں"۔

"تو پھر؟"

"میں آج ہی اباجی سے بات کروں گا۔ تم کل شام مجھے یہیں ملنا"۔

O============☆============O

اباجی نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ تقریب کے لیے جمعے کا دن طے پایا۔ ابا کی خواہش تھی کہ قبول اسلام کے بعد ماجد ہیلن کو گھر لائے گا اور وہاں مختصر سی تقریب نکاح ہوگی۔ جس

محلے کے کچھ لوگ موجود ہوں گے۔ یہ بھی طے پایا کہ لوگوں کو وقت کے وقت مدعو کیا ئے گا۔

اگلی شام ماجد ہیلن سے ملا۔ اس نے ہیلن کو یہ سب کچھ بتا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں جمعے کے دن اسلام اپنے علاقے کی مسجد میں قبول کروں گی' وہاں سے نے والی اذان کی آواز برسوں سے میرے وجود میں ہلچل مچاتی رہی ہے"۔ ہیلن نے خواب لہجے میں کہا۔ "تم تین بجے مجھے میرے گھر سے لے لینا۔ اب اس سے پہلے میں تم سے ملوں گی"۔

"واہ' یہ تو زیادتی ہے۔ آج پیر ہے۔ ابھی تو درمیان میں تین دن پڑے ہیں"۔ ماجد نے خ لہجے میں کہا۔

"تین دن صبر نہیں کرسکتے۔ پھر تو میں عمر بھر تمہارے ساتھ رہوں گی"۔

"اچھا' ٹھیک ہے۔ چلو' تم بھی کیا یاد کرو گی"۔

ہیلن نے باہر نکل کر تنہا گھر جانے پر اصرار کیا۔ یوں وہ جدا ہو گئے' اس یقین کے ساتھ اب وہ شادی کے بعد ملیں گے۔

O============☆============O

ان کا یقین سچ ثابت ہوا۔ ان دونوں کی ملاقات شادی کے بعد ہی ہوئی۔ اس شام کے پا بارہ سال بعد۔ اس دوران بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے بالوں میں ہلکی ہلکی دی اتر آئی تھی۔ لیکن ہیلن کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور پاکیزگی تھی' جب کہ ماجد کے ے پر بے سکونی اور پچھتاوے لکیروں کی تحریر میں لکھے ہوئے تھے' ہیلن کے انداز میں ٹھہراؤ ناعت تھی۔ ماجد کے انداز میں اضطراب تھا' پریشانی تھی اور شکستگی تھی۔ صرف وہی دونوں ں بدلے تھے' دنیا بدل گئی تھی۔ حکومت بدل گئی تھی۔ نئی حکومت اسلامی نظام کی دعوے تھی۔ سود کا نظام ختم کیا جارہا تھا۔ شاید اس کا نام تبدیل کیا جارہا تھا۔ شرعی عدالتیں قائم دی گئی تھیں۔ محکمہ احتساب قائم کر دیا گیا تھا' جس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ ملک میں ائی مشنریوں کی کامیابی کے اعداد و شمار ہولناک تھے۔ ان اعداد و شمار کے لحاظ سے ملک سرفہرست یں' البتہ ایسے نمایاں ملکوں میں تھا' جہاں مسیحیت کامیاب ہو رہی تھی' قبول کی جارہی تھی۔ خوشگوار تبدیلی بھی تھی۔ بارہ سال پہلے جو شخص...... خدمت خلق کی غرض سے تنہا ان عمل میں اترا تھا' اب وہ ایک ادارہ تھا۔ اس کا نام تھا عبدالستار ایدھی۔ وہ دکھی انسانیت خدمت کر رہا تھا' بے لوث خدمت۔ وہ تبلیغ نہیں کرتا تھا لیکن تبلیغ سے بہتر نتائج حاصل تا تھا۔ دوسری طرف سرکاری سطح پر اسلام اسلام کا شور تھا لیکن لوگ خود کو پنجابی' سندھی' ن' بلوچ' مہاجر اور بہاری کہتے تھے' اس بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے' خون

بہاتے تھے ایک دوسرے کا۔ وہ بڑا پر آشوب دور تھا۔ ہیلن کی ایک اور پیش گوئی درست ثابت ہو گئی تھی۔ اسلامی نظام کے دور میں بھی عیسائی مشنریوں کو کھلے عام تبلیغ کی اجازت تھی۔ ان کا تبلیغی لٹریچر وبا کی طرح پھیل رہا تھا۔ بارہ سال بعد اس روز ماجد نے ہیلن کو بازار میں دیکھا تو اسے نہ جانے کیا کیا یاد آ گیا۔

وہ اس روز اپنے بیٹے ساجد کو جوتا دلانے نکلا تھا کہ اچانک اسے ہیلن نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا' ساجد کا ہم عمر۔ ماجد ہیلن کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ہیلن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے بچے کی انگلی تھامے اس کے قریب آ گئی۔ "اسلام علیکم" اس نے بڑے تپاک سے کہا۔

"کیا حال ہے ہیلن؟" ماجد نے سلام کا جواب دینے سے گریز کیا۔ جانتا تھا کہ غیر مسلموں کے سلام کا جواب نہیں دیا جاتا۔

"ہیلن نہیں' میرا نام آمنہ ہے"۔ تہدیدی لہجے میں جواب ملا۔ اور یہ میرا بیٹا ہے ماجد"۔ اس بار لہجہ فخریہ تھا۔

ماجد سن ہو کر رہ گیا۔ بازار میں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ وہ لوگ سائیڈ میں کھڑے تھے۔ ننھا ماجد بڑی دلچسپی سے ماجد کو دیکھ رہا تھا۔ ساجد کے انداز میں بے زاری تھی۔ اسے اپنے جوتوں کی فکر تھی۔

"بیٹے ماجد! یہ تمہارے انکل ہیں........" آمنہ نے ننھے ماجد سے کہا۔

"السلام علیکم انکل!" بچے نے کہا اور ماجد سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

ماجد نے ساجد کو گھور کر دیکھا۔ ساجد نے بڑی بے زاری سے کہا۔ "ہیلو آنٹی"۔

ماجد کٹ کر رہ گیا۔

"انکل کو سارے کلمے سناؤ ماجد!" آمنہ نے اپنے بچے سے کہا۔

بچے نے بڑی روانی کے ساتھ تمام کلمے مع ترجمہ سنا دیے۔ ماجد کو بچے پر بے ساختہ پیار آیا۔ اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ساجد کو شاید کمتری کا احساس ہوا۔ اس نے آمنہ سے کہا۔ "میں نظمیں سناؤں آنٹی؟"

"ضرور سناؤ بیٹے!" آمنہ نے بڑی شفقت سے کہا۔

ساجد نے بابا بلیک شیپ سمیت تین انگریزی نظمیں فر فر سنا دیں۔ ماجد اندر ہی اند کڑھتا رہا۔

آمنہ نے ساجد کی پیشانی چوم لی۔ "ماشاء اللہ ذہین ہو اپنے ابو کی طرح" اس نے شاپنگ بیگ ایک ہاتھ سے دوسری ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"امی! اب چلیے نا۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے"۔ ننھے ماجد کے لہجے میں تڑپ تھی۔

"ہاں پاپا! چلیے' مجھے جوتے دلائیے"۔ ساجد نے ٹھنک کر کہا۔

ماجد اور آمنہ کی نظریں ایک لمحے کے لیے ملیں۔ "آئی ایم سوری" ماجد نے زیر لب

"سوری کہنے کا تو آپ کو اب بھی کوئی حق نہیں"۔ آمنہ نے کہا۔

ماجد تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"اچھا' خدا حافظ"۔ آمنہ نے کہا۔

"خدا حافظ انکل! آپ ہمارے گھر آئیں گے نا؟" ننھے ماجد نے کہا۔

"بیٹے! ہم نے تو بارہ برس پہلے جنت چھوڑ دی تھی۔ اب ہم کسی جنت میں قدم نہیں
سکتے"۔ ماجد نے دل گرفتگی سے کہا۔

آمنہ نے نظریں اٹھا کر ماجد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماجد کو اس کی آنکھوں میں درگزر کی
نظر آئی۔ اس نے جان لیا کہ آمنہ نے اس کی وجہ سے بڑی اذیت سہی ہے لیکن اسے
کر دیا ہے۔

"اچھا' خدا حافظ"۔ آمنہ نے کہا اور بچے کی انگلی تھام کر آگے بڑھ گئی۔ ماجد انہیں دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن وہ اسی راستے کو تکتا رہا۔

"چلیے نا پاپا!" ساجد نے اسے چونکا دیا۔

اس نے ساجد کو جوتا دلایا اور گھر واپس چلا آیا۔ وہ بہت بجھا بجھا سا تھا۔ اس نے بیوی
ئی بات نہیں کی۔ اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ وہ اس دن کو یاد کر رہا تھا' جب اس
نت گنوائی تھی۔ اسے مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں قربانی دی تھی' اسلام کی
اپنی نسل کی خاطر' اس نے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا تھا' شاید اس نے ہیلن کی زندگی
نے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس کے بچے خالص مسلمان ہوں'
ہیلن برباد نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اب آمنہ تھی' ننھے ماجد کی امی اور وہ خود اپنے بچوں کا پاپا
س کے بچوں کو صرف ایک کلمہ آتا تھا۔ ہیلن کے بچے کو تمام کلمے یاد تھے معنی سمیت۔
کے بچے کو جوتوں کی فکر تھی اور ہیلن کے بچے کو نماز کی۔ یہ سب کیا تھا۔ کیا اس کی قربانی
ںاہی گئی؟

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا۔ اس نے جمعے کے دن ہیلن سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔
ت کی شام وہ دفتر سے آیا تو شمیم کا بلاوا اس کا منتظر تھا۔ وہ چائے پی کر اس طرف چلا گیا۔
میم کے علاوہ ظفر اور مولانا بشیر بھی تھے۔ انہوں نے بڑے پرتپاک انداز میں اس کا
م کیا۔ "فرمائیے' خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں' بس آپ سے نجی نوعیت کا سوال کرنا تھا"۔ ظفر نے کہا۔

"جی؟"

"سنا ہے' کل آپ ایک کرسچن لڑکی سے شادی کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں"۔ اس نے جواب دیا لیکن اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔

"وہ کرسچن لڑکی' جو اس علاقے میں تبلیغ کے سلسلے میں آچکی ہے؟"

"وہ مجبور ہو کر آئی تھی' ورنہ اس نے کبھی تبلیغ کے کام میں حصہ نہیں لیا"۔

"یہ تو اس نے آپ کو بتایا ہوگا اور آپ نے یقین کرلیا ہوگا۔ ہم تو یقین نہیں کرسکتے اس پر"۔

"تو مت کیجئے یقین" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

اس پر ظفر جزبز ہوگیا۔ مولانا بشیر نے بات آگے بڑھائی۔

"دیکھیں ماجد صاحب! میں جانتا ہوں کہ آپ سیدھے سچے مسلمان ہیں' لیکن آپ ایک کرسچن لڑکی سے شادی کرکے اسلام کو نقصان پہنچائیں گے"۔

"وہ کل مسلمان ہو رہی ہے"۔

"یہ بات ناقابل یقین ہے کہ جو لڑکی کل تک مسیحیت کی تبلیغ کرتی رہی ہے' وہ آج مسلمان ہو جائے گی"۔

"اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ آپ کل خود اس سے پوچھ لیجئے گا"۔

"میں سب جانتا ہوں' آپ کو اندازہ نہیں۔ آپ اپنی پوری نسل تباہ کرلیں گے۔ اسلام کو بھی نقصان پہنچے گا"۔

"میں اسلام کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا"۔ اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

"آپ مجھے سمجھائیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے؟"

"دیکھیے' تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں پر سب سے کاری وار اپنی عورتوں کے ذریعے کیا ہے' ہر دور میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اس دور میں مصر کو دیکھ لیجئے' لبنان کو دیکھ لیجئے اور نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے ذریعے مسلمانوں کی نسل تباہ کر دیتے ہیں"۔

"لیکن ہیلن اسلام سے متاثر ہے۔ وہ سچے دل سے اسلام قبول کر رہی ہے"۔

"یہی بات تو حلق سے نہیں اترتی۔ میں نے سنا ہے' اس سے پہلے وہ مسلمان ہونے پر تیار نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اہلِ کتاب سے نکاح جائز ہے"۔

"جی ہاں' اس وقت جو بات آپ کہہ رہے ہیں' میں نے اسی کے حوالے سے اسے سمجھایا تھا"۔

"وہ مسلمان ہونے پر رضامند کیسے ہوئی؟"

"میری محبت کی وجہ سے" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ وہ اسلام سے متاثر ہے۔ اس لیے مسلمان ہو رہی ہے"۔

"جی ہاں' دونوں باتیں ہیں"۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مشنری کی ہدایت پر مصلحتاً ایسا کر رہی ہو۔ اس صورت میں پ کے بچوں کا' آپ کی نسل کا کیا ہوگا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ہاں' یہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ ذہن نے سوچا' لیکن دل نے سختی سے ید کر دی۔ "یہ ممکن نہیں ہے" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں اور آپ اس سے محبت کرتے ہیں ایسے میں آدمی دماغ سے ں' دل سے سوچتا ہے"۔

"نہیں' ایسا نہیں ہے"۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"یہ بھی سوچیں کے علاقے میں آپ کی عزت نہیں رہے گی"۔ ظفر نے کہا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں' عزت ذلت خدا کے ہاتھ ہے' آپ مجھے بلیک میل نہیں کرسکتے"۔

"آپ کو بلیک میل کوئی نہیں کر رہا"۔ شمیم نے جلدی سے کہا۔ "سوچئے تو' اس میں پ کے گھر کے ہر فرد کا نقصان ہے' آپ کی بہنوں کا کیا بنے گا؟"

"آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"اس صورت میں آپ کی بہنوں کو مناسب رشتہ ملنے کا امکان نہیں"۔ مولانا بشیر نے ا۔ "ہمارا خیال ہے کہ وہ کرسچن لڑکی مذموم مقاصد کے تحت اسلام قبول کرکے آپ سے ی کر رہی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سچی ہے اور اسلام سے واقعتاً متاثر ہے۔ مان لیں کہ ہم وں کے لیے امکانات برابر ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ آپ کا خیال درست ہے' تب تو ٹھیک ۔ یہ کار ثواب بھی ہے لیکن ہمارا خیال درست ہے تو آپ بڑے خسارے میں ہیں۔ دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ آپ اپنے طور پر ذاتی نقصان کی صورت میں ہر خطرہ مول لینے کا حق ھتے ہیں' لیکن جہاں آپ کی نسلوں کو اور دین کو خطرہ لاحق ہو' وہاں آپ کو خطرہ مول لینے کا اصل نہیں۔ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔ ہم تو آپ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہے "۔

وہ منطقی انداز میں کہی گئی بات تھی' اس کے دل میں اتر گئی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا' پھر "ٹھیک ہے' میں غور کروں گا"۔

"ہم بھی آپ پر کوئی فیصلہ نہیں تھوپ رہے بلکہ یہی چاہتے ہیں کہ آپ خوب سوچ کر فیصلہ کریں۔ جذباتیت سے بچیں"۔

وہ وہاں سے اٹھ آیا اور سوچتا رہا کہ اس کا سب سے بڑا مسئلہ جذباتیت ہی ہے۔ ہیلن بھی یہی کہتی تھی، سب یہی کہتے ہیں۔ شاید وہ کوئی درست فیصلہ کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ وہ سوچتا رہا کہ کس سے مشورہ لے۔ پھر اسے اباجی کا خیال آیا، جو بزرگ ہی نہیں، دوست بھی تھے۔

اس رات اس نے اباجی کو سب کچھ بتادیا۔ ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ مولانا کی بات معقول ہے۔ ممکن ہے، لڑکی سچی ہو۔ لیکن یہ امکان بھی ہے کہ وہ منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہی ہو اس طرح وہ محلے والوں میں گھل مل کر اور لوگوں کو بھی متاثر کرسکتی ہے۔ "فیصلہ تو تمہی کو کرنا ہے بیٹے!" اباجی نے کہا تھا۔ "لیکن میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ بہرحال تمہارا فیصلہ مجھے منظور ہوگا"۔

یوں اباجی نے اسے آزادی بھی دی اور فیصلہ بھی کردیا۔ تمام رات اس کے ذہن و دل میں جنگ ہوتی رہی۔ وہ جاگتا رہا۔ بالآخر صبح ہوتے ہوتے دل ہار گیا۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی غیرجذباتی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ الجھتا رہا۔ ہیلن کا چہرہ اس کی نگاہوں میں پھرتا رہا۔ وہ جمعے کا دن تھا اور اس زمانے میں جمعے کی چھٹی نہیں ہوتی تھی، بلکہ ہاف ڈے ہوتا تھا۔ وہ عموماً ہاف ڈے کی چھٹی کرنا چھٹی کا زیاں سمجھتا تھا لیکن اس روز وہ دفتر جانے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ بارہ بجے تک وہ سوچتا رہا، الجھتا اور کڑھتا رہا پھر اسے نیند آگئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو پانچ بجے تھے۔ ہیلن نے اس کا کس کس طرح انتظار کیا ہوگا۔ اس کے دل میں کیا کیا وسوسے آئے ہوں گے۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہوگیا۔ دل چاہا کہ وہ ہیلن کے گھر جائے لیکن نہ جانے کیوں، خیال آیا تھا کہ وقت نکل چکا ہے۔

اس روز کے بعد بھی اس نے بارہا ہیلن کے گھر جانے کے متعلق سوچا لیکن پشیمانی کا بوجھ دن بہ دن بڑھتا گیا تھا۔ اب وہ اس کا سامنا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر اس کی شادی ہوگئی اور آہستہ آہستہ ہیلن کی یاد بھی مٹتی گئی لیکن آج اسے دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔

اب گھر میں کیا تھا۔ ثمینہ اور زرینہ کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ دونوں اپنے اپنے گھر خوش تھیں۔ امی اور ابا اللہ کو پیارے ہوچکے تھے۔ شاہد کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہ رہا تھا۔ یہاں وہ تھا، اس کی بیوی تھی اور چار بچے۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ شام ہوگئی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ یہ شام...... یہ شام ہیلن کے نام ہے۔ آمنہ کو وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اب پرائی ہو چکی تھی، کسی اور کی امانت لیکن ہیلن تو اب بھی اسی کی تھی۔ اس نے بیوی سے کہا وہ باہر جا رہا ہے، ممکن ہے، دیر سے واپسی ہو، بیوی بڑبڑا کر رہ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر سمت کا تعین کیے نکل کھڑا ہوا۔ پھر خودکار سے انداز میں اس کے قدم رک گئے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ کیفے اوڈین کے سامنے کھڑا تھا۔ بارہ سال اس نے یہاں آنے سے گریز کیا تھا۔ صرف یہی نہیں، ان بارہ برسوں میں اس نے ہر ایسی جگہ سے گریز کیا تھا، جہاں وہ کبھی ہیلن کے ساتھ گیا تھا۔ ایسی ہر وہ رہ گزر اس کے لیے دکھ کی رہ گزر تھی۔ زندگی میں یونہی کچھ کم دکھ ہوتے ہیں کہ انسان مزید دکھ خریدے۔ وہ بچوں کو فرمائش کے باوجود نہ کبھی چڑیا گھر لے کر گیا تھا اور نہ کلفٹن۔ اسکی بیوی اس بات پر جھنجلاتی تھی، کہتی تھی آپ کو اپنے بچوں کا کوئی خیال نہیں ہے، بچوں سے بالکل محبت نہیں ہے۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ ان بچوں کے لیے تو اس نے اپنی سب سے بڑی خوشی قربان کردی ہے۔ آج شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بچے تو اس کی توقعات پر پورے نہیں اترے۔ اس میں کس کا قصور تھا؟ خود اس کا؟ اس کی بیوی کا؟ درس گاہوں کا یا معاشرے کا، جس نے نئی نسل کو نیم مغربی ماحول دیا تھا اور انہیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا؟

وہ کیفے اوڈین کے سامنے کھڑا ہچکچاتا رہا، لیکن یہ بارہ سال پہلے والی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ وہ ایک پختہ کار مرد تھا، وہ تنہا بھی اوپر جاسکتا تھا۔ فیملی کیبن میں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ ہچکچا رہا تھا اس کے ساتھ ہیلن نہیں تھی، لیکن جو لوگ اس طرح لٹتے ہیں، ان کے ساتھ بچھڑے لوگوں کے آسیب ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر، ان کی آنکھوں پر آسیبی سائے منڈلاتے ہیں۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ بھرا پرا ریسٹورنٹ اس کے لیے یادوں کا قبرستان تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اندر قدم رکھتے ہی بے شمار یادیں اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑی ہوں گی، اس کی پذیرائی کے لیے۔ پھر اس نے سوچا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ حسین یادیں دکھ دیں گی، لیکن وہ دکھ بھی حسین ہوں گے۔ وہ اسے خوشی بھی دیں گے، ایسی خوشی، جو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہوگی، لیکن اس خوشی کو وہ بارہ برس سے ترس رہا تھا۔

طبعاً وہ بے حد ذمے دار آدمی تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ آدمی کی زندگی صرف شادی تک ہوتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی زندگی، اس کا ہر فعل بچوں کی امانت ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ لیکن انسان کو بارہ برس میں چند گھنٹے اپنے لیے بھی ملنے چاہئیں۔ ماضی میں جینے کے لیے۔ کیا وہ ان چند گھنٹوں کا بھی مستحق نہیں۔

وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ وہ اپنے جانے پہچانے کیبن میں گھسا تو جیسے ایک سایہ سا اس کے ساتھ ساتھ تھا، لیکن نہیں، وہ سایہ نہیں تھا، وہ ہیلن تھی۔ البتہ اسے صرف وہی دیکھ سکتا تھا اور کسی کو وہ ہرگز نظر نہ آتی۔ یک لخت ہی کسی نے اسے اسیر کرلیا تھا۔

چند لمحے کے بعد ویٹر آیا۔ اسے جھٹکا لگا، کیوں کہ وہ اسی پرانے ویٹر کی آمد کی توقع کر رہا

تھا، لیکن اسے یہ احساس پھر بھی نہیں ہوا کہ وہ بارہ سال بعد یہاں آیا ہے۔

"آپ اکیلے ہیں صاحب؟" ویٹر نے پوچھا۔

"نہیں، کیا میں تمہیں اکیلا نظر آرہا ہوں؟"

ویٹر گڑبڑا گیا۔ "میرا مطلب تھا صاحب کہ آپ اکیلے ہیں تو باہر بیٹھ جائیں"۔

"پھر وہی بات، میں یہیں بیٹھوں گا"۔ اس نے ترش لہجے میں کہا" کیا یہ بات ریسٹورنٹ کے ضابطوں کے خلاف ہے؟"

"ایسی بات نہیں سر! آپ تشریف رکھیے۔ کیا خدمت کروں آپ کی؟"

"دو چائے لے آؤ"۔

ویٹر نے حیرت اور خوف سے اسے دیکھا اور پھر پلٹ گیا۔ کبھی کبھی ریسٹورنٹ میں پاگل بھی تو آجاتے ہیں۔ اب تو بھگتنا ہی پڑے گا، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

ماجد سامنے بیٹھی ہیلن کو دیکھتا رہا، جو اس کی آنکھوں مین دیکھ رہی تھی، لیکن کسی بت کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ کچھ دیر بعد ویٹر چائے لے آیا۔ ماجد نے ٹرے ہیلن کی طرف کھسکادی اور پلٹ کر ویٹر کو دیکھا۔ ویٹر کو اس کی آنکھوں میں آسیبی سایہ سا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے کھسک لیا۔

ہیلن نے ٹرے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی ماجد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"چائے نہیں بناؤ گی؟" ماجد نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں نہ اقرار ابھرا نہ انکار۔ وہ بے تاثر نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"مجھ سے بہت ناراض ہو؟"

نہ اس کے ہونٹ ہلے، نہ آنکھیں بولیں، لیکن ماجد نے اس کی آواز صاف سنی۔ "میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی مجو! بس بات اتنی سی ہے کہ تمہاری ایک غلطی سے میں پتھر کی ہوگئ ہوں"۔

ماجد کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ایسی چائے کا کیا فائدہ، جو ہیلن نے نہ بنا کر دی ہو۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اسے نمی کا احساس ہوا۔

"ارے! میں تو رو رہا ہوں"۔ اس نے ہیلن سے کہا۔

"اچھا ہے۔ رو لو، دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ چائے نہیں پیو گے؟" ہیلن کے لب اب بھی ساکت تھے لیکن آواز واضح تھی۔ پھر ماجد کو احساس ہوا کہ وہ آواز باہر سے نہیں اس کے اندر سے آرہی ہے۔

"نہیں، اب میں چائے کبھی نہیں پیوں گا"۔

وہ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اسے سب کچھ بتادیا۔ ویٹر بل لے کر آیا تو ہیلن سے کہہ رہا تھا۔ "یہاں سے تمہارے گھر چلیں گے اور پھر کلفٹن، ٹھیک ہے نا؟"

ویٹر کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے بل کی طشتری میز پر رکھی اور برتن میٹ کر بھاگم بھاگ رخصت ہوگیا۔

ماجد نے طشتری کے نیچے دس کا نوٹ دبایا اور کیبن سے نکل آیا۔

O============☆============O

صدر کا علاقہ خاصا تبدیل ہوچکا تھا۔ بیشتر بوسیدہ عمارتوں کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر ہوگئی ہیں۔ تاہم کچھ پرانی عمارتیں ابھی باقی تھیں۔ ہیلن والی عمارت بھی ایسی ہی عمارتوں میں سے ی۔ ہیلن والے فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ ماجد نے دروازے پر دستک دی۔ پھر اس نے اِدھر ھر دیکھا۔ ہیلن اب اس کے ساتھ نہیں تھی۔

کچھ دیر میں دروازہ کھلا اور شیلا نظر آئی۔ شیلا کو پہچاننے میں ماجد کو دشواری نہیں ہوئی۔ بھی پہلے جیسی تھی۔ بس اس کی شادابی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

"کون ہے؟" شیلا نے پوچھا اور اسے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے دروازہ پوری رح کھول دیا اور سنسنی آمیز لہجے میں چیخی۔ "اوہ ماجد بھائی! آئی کانٹ بلیو مائی آئز........"

"یہ میں ہی ہوں شیلا"۔ ماجد نے کمزور آواز میں کہا۔

"او، پلیز کم اِن۔ آئی ایم سو ایکسائیٹڈ ماجد بھائی!"

ماجد اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں سب کچھ پہلے ہی جیسا تھا۔

"آیئے ماجد بھائی! بیٹھئے"۔ شیلا نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

ماجد بیٹھ گیا۔ اسی وقت دو بچے کمرے میں آگئے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا ہو بہو شیلا تصویر تھا۔ لڑکی کی بڑی بڑی شفاف آنکھیں ہیلن کی یاد دلاتی تھیں۔

"یہ میرے بچے ہیں"۔ شیلا نے کہا "یہ ہیلن ہے اور یہ جیکب" پھر اس نے بچوں سے ہا "یہ تمہارے ماجد انکل ہیں، وش کرو انہیں"

"گڈ ایوننگ انکل!" دونوں بچوں نے بیک وقت آواز کہا۔

"گڈ ایوننگ" ماجد نے جواب دیا۔

"اب جاؤ اور کھیلو"۔ شیلا نے دونوں بچوں کو ہدایت دی اور وہ باہر چلے گئے۔

"ماجد بھائی، چائے لاؤں آپ کے لیے؟" شیلا نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے چائے چھوڑ دی ہے"۔ ماجد نے کہا۔

"اب آپ سنایئے، کہاں غائب رہے؟ ہیلن نے بہت انتظار کیا آپ کا"۔

ماجد نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے سب معلوم ہے بھائی! ہیلن نے سب کو بتادیا تھا کہ وہ آپ سے شادی کرنے والی ہے لیکن آپ نہیں آئے۔ میں اس سے کہتی رہی کہ فون کرلے' آپ کے گھر جا کے دیکھے' لیکن وہ کہتی تھی' مجوّ کو کچھ ہوگیا ہے ورنہ وہ ضرور آتا۔ میں فون کرکے یا اس کے گھر جاکر کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتی۔ میں کہتی' ضروری تو نہیں کہ کوئی ٹریجڈی ہوئی ہو۔ ممکن ہے' کوئی اور بات ہو' اس پر وہ کہتی' یہ اور بری بات ہوگی' میں نے اس کی ہر بات مان لی۔ میں لڑکی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتی۔ میری عزت کا اسے خیال کرنا چاہیے۔ اب اسے آنا ہوگا' اسے مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا۔ میں ایسا کیسے کرسکتی ہوں' وہ اسی دن مسلمان ہوگئی تھی۔ ہم سے لڑتی تھی۔ کہتی تھی کہ خبردار اب مجھے ہیلن کے نام سے نہ پکارنا۔ میں اب آمنہ ہوں۔ تمہارے ساتھ مجبوراً رہ رہی ہوں۔ جس دن میرا مجوّ آئے گا' میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ وہ ہم سب سے محبت کرتی تھی' لیکن چڑتی بھی تھی۔ مما اور پاپا نے کبھی اس سے سختی سے بات نہیں کی' لیکن میری کو اس سے نفرت ہوگئی۔ وہ اس گھر میں تمہاری مقدس کتاب پر پڑھتی تھی' نماز جو پڑھتی تھی۔ وہ دو سال آپ کا انتظار کرتی رہی ماجد بھائی! آخر میں میری کا رویہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ ہیلن روتی تھی کہتی تھی کہ میں اکیلی ہوں۔ الگ مکان لے کر بھی نہیں رہ سکتی۔ مما اور پاپا بھی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ پاپا کہتے تھے کہ میرے نصیب میں بیٹا تھا ہی نہیں۔ دو سال بعد ہیلن نے ایک مسلمان سے شادی کرلی۔

اس کا نام حمید ہے۔ اچھا آدمی ہے وہ' لیکن وہ کبھی آپ کی طرح ہمارے گھر نہیں آیا۔ ہیلن شادی کے بعد بھی سروس کرتی رہی۔ پوری تنخواہ لاکر مما کے ہاتھ پر رکھ دیتی لیکن شادی کے بعد اس نے کبھی ہمارے گھر کا پانی تک نہیں پیا۔ ایک سال بعد میری نے بھی شادی کرلی۔ اگلے سال میری شادی بھی ہوگئی۔ میرا ہسبنڈ بھی بہت اچھا ہے۔ اس وقت ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے ورنہ آپ کو اس سے ملاتی"۔

"مما اور پاپا کہاں ہیں؟" ماجد نے پوچھا۔

"دو سال پہلے وہ چلے گئے' آگے پیچھے" شیلا نے اداس لہجے میں بتایا۔ "ماجد بھائی! اس روز آپ کیوں نہیں آئے تھے؟"

"میں مرگیا تھا شیلا!"

"مرگئے تھے!" شیلا نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں' مرگیا تھا' اتنی حیرت سے نہ دیکھو مجھے۔ کبھی کبھی آدمی مر کر بھی چلتا پھرتا ہے۔ زندہ تو میں اب بھی نہیں ہوں" ماجد نے جواب دیا۔ اب وہ شیلا کو کیا بتاتا؟

"ماجد بھائی! آئی ایم سو سوری"۔

"کچھ نہیں ڈیئر' آدمی کا اختیار ہے ہی کتنا۔ وہ بھی کبھی کبھی دوسرے لوگ اور کبھی پورا

معاشرہ سلب کرلیتا ہے۔ اب میں چلوں گا"۔

"رکیں نا کچھ دیر کھانا کھا کر جائیے گا"۔ شیلا نے اصرار کیا۔

"نہیں' میرا جانا بہت ضروری ہے"۔ ماجد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شیلا کو نہیں بتایا کہ اسے ہیلن سے ملنا ہے۔

○============☆============○
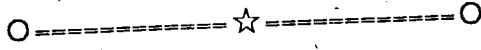
قدم یوں بے اختیاری سے اور اعتماد کے ساتھ اٹھ رہے تھے' جیسے وہ اپنی منزل سے باخبر ہو' حالاں کہ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کس طرف جارہا ہے۔ پھر وہ چونکا تو اس نے خود کو تانگہ اسٹینڈ پر موجود پایا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ یہاں رمضانی بابا کی تلاش میں آیا ہے۔ وہ رمضانی بابا جس سے وہ زندگی میں صرف ایک بار ملا تھا........ جس کے تانگے پر بیٹھ کر وہ ہیلن کے ساتھ کلفٹن گیا تھا' جس نے واپسی پر اس سے پیسے لینے سے سختی کے ساتھ انکار کردیا تھا' یہ کہہ کر کہ ہیلن اس کی اپنی بچیوں کی طرح ہے۔ ہاں' وہ اس تانگے کو کلفٹن لے جانے کے لیے آیا تھا' جس کی اس نے ایک شام کو چبانی بھی کی تھی۔

رمضانی بابا وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے پانچ منٹ انتظار کیا۔ وہ پانچ منٹ اسے ایک صدی کی طرح لگے۔ پھر اس سے صبر نہ ہوسکا' اس نے ایک تانگے والے سے رمضانی بابا کے متعلق پوچھا۔

"کون رمضانی بابا!" تانگے والے نے حیرت سے کہا۔ وہ چند لمحے ذہن پر زور دیتا رہا' پھر چونکا۔ "اوہ' وہ رمضانی بابا' اس کا تو سات سال پہلے انتقال ہوگیا تھا بابو!"

ماجد کے دل میں گھونسا سا لگا۔ اسے شدید دکھ ہوا تھا یہ سن کر۔ اسے ایسا لگا' جیسے اس کے اندر ایک عہد مرگیا ہو۔ اف' ایک شخص' جس سے صرف ایک مختصر ملاقات ہوئی ہو' وہ ناام بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ گم صم کھڑا رہا۔ تانگے والا کچھ کہہ رہا تھا لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ تانگے والا تھک ہار کر خاموش ہوگیا اور اسے عجیب ی نظروں سے دیکھنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ سنبھلا "کہیں چلنا ہے بابو؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"ہاں' چلنا تو تھا' لیکن چھوڑو"۔ ماجد نے آہستہ سے کہا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ بیتے ںوں کے قبرستان' سمندر کی طرف جارہا ہے۔ سمندر جو بہت اچھا امانت دار ہوتا ہے' جو ہمیشہ ئیں واپس کر دیتا ہے۔ وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ اتنے بہت سے تانگوں میں اسے وہی ایک تانگہ رکار تھا' جو اب اسے نہیں مل سکتا۔ کھوئی ہوئی تمام چیزوں' گزرے ہوئے تمام لمحوں اور ہان محبت کرنے والی اور پاکیزہ ہیلن کی طرح۔

وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک

گئی۔ وہ پچھلی نشست کی طرف بڑھا لیکن ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے اگلا دروازہ کھولا۔ "سوری ڈیر! اس طرح تو لوگ تمہیں ڈرائیور سمجھیں گے"۔ اس نے اگلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور بری طرح گڑبڑا گیا۔ "جی صاحب! میں تو ہوں ہی ٹیکسی ڈرائیور"۔

"ہاں' ٹھیک ہے"۔ ماجد نے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں کہا" کلفٹن چلو"۔

ڈرائیور چند لمحے اسے حیرت سے دیکھتا رہا' پھر اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

وہ ٹیکسی سے اترا اور ساحل کی طرف چلنے لگا۔ وہاں بہت تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ پارک میں بے شمار جھولے نصب تھے۔ مختلف کھیلوں کے درجنوں اسٹال بن گئے تھے۔ وہ بڑھتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دل کا بوجھ بھی بڑھ رہا تھا۔ اب تو وہ بے حس وحرکت ہیلن بھی ساتھ نہیں تھی' جسے اس کی ایک غلطی نے پتھر بنا دیا تھا۔

وہ چلتا رہا' اچانک اسے احساس ہوا کہ جس ریت پر اب وہ چل رہا' وہاں تو بارہ سال پہلے سمندر ہوا کرتا تھا۔ اب سمندر بہت دور تھا۔ ایک دیوار کے پیچھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت نے سمندر کو بھی بارہ برس پیچھے دھکیل دیا ہے۔ وہ تانگہ لے کر ساحل تک جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ تانگہ لے کر نہیں آیا۔

وہ دیوار تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سمندر تو دیوار سے بھی خاصا پیچھے ہے۔ اس وقت اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بہت دور نکل آیا۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ دیوار پر چڑھا اور پار اتر گیا۔ نیچے ریت بہت سخت تھی' سیمنٹ کے فرش کی طرح۔ سمندر خاصا پیچھے تھا' لیکن آگے بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔

اچانک اسے جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہیلن اس کے سامنے تھی۔ وہ بے حس وحرکت تھی لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"سیپیاں چنیں؟" ماجد نے پوچھا۔

ہیلن کے لب نہیں ہلے' آنکھیں نہیں بولیں' لیکن اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں"۔

وہ سیپیاں جمع کرتا رہا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ وہ تھک ہار کر کنارے کی طرف چلا آیا۔ موجیں اب مزید پیش قدمی کر رہی تھیں۔ وہ ریت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ہیلن اس کے سامنے تھی۔

"ریت پر میرا نام نہیں لکھو گے؟" ہیلن کی آواز سنائی دی۔

"نہیں' تمہارا نام ہی ایسا ہے کہ میں ریت پر نہیں لکھ سکتا"۔ پھر اب میں فرق سمجھ گیا ہوں۔ نام لکھنے والے خودغرض ہوتے ہیں' وہ کسی اور کا نام لکھتے ہیں تو اپنے لیے۔ گھروندے بنانے والے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ گھروندے اس کے لیے بناتے ہیں' جسے چاہتے ہیں۔ میں تمہارے لیے گھروندا بناؤں گا"۔

"اب نہیں بنا سکتے"۔

"کیوں نہیں بنا سکتا؟"

"دیکھتے نہیں' اب ساحل کی ریت پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے۔ اب تم میرے لیے گھروندا نہیں بنا سکتے مجو!" آواز نے میرے لیے' پر بالخصوص زور دیا تھا۔

"میں بناؤں گا گھروندا' ضرور بناؤں گا"۔ ماجد نے کہا۔ پھر اس نے انگلیوں سے ریت اکھاڑنا شروع کردی۔ کام واقعی دشوار تھا۔ سمندر کے شور میں اضافہ ہوگیا تھا۔ سورج سمندر میں اترنے ہی والا تھا۔ بالآخر ماجد نے گھروندا بھر ریت جمع کرلی۔ پھر اس نے اپنا پاؤں نیچے رکھا اور ریت جمانے لگا۔ اسی وقت ایک زوردار موج آئی اور اس نے جمی ہوئی ریت کو اکھاڑ کر بہادیا۔ ماجد نے ہیلن کو دیکھا۔ اسکی آنکھیں ساکت تھیں۔ ماجد نے پھر کوشش کی۔ اس بار قاتل موج پہلے سے زیادہ تند تھی۔ اس کے باوجود وہ کوشش کرتا رہا لیکن ہر بار موجوں نے گھروندے کو ابتدائی مرحلے ہی میں ڈھا دیا۔ پھر اس نے بارھویں کوشش کی نتیجہ اس بار بھی وہی تھا' بلکہ اب تو پانی وہاں تک آپہنچا تھا' جہاں وہ بیٹھا تھا۔

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ سورج غروب ہوچکا ہے"۔ ہیلن کی آواز نے کہا۔

ماجد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سورج واقعی غروب ہوچکا تھا۔ سمندر رات کی طرح تاریک نظر آرہا تھا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا؟" ماجد کے لہجے میں سوال بھی تھا اور مایوسی بھی۔

"ہاں مجوّ! اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میرے لیے گھروندا بنانے کا وقت گزر چکا ہے"۔

"شعر سنوگی؟"

"سناؤ"۔

"دو شعر سناؤں گا"۔ ماجد نے کہا۔

زمین پر نام میرا روز وہ لکھے محبت سے
ہوا مارے رقابت کے سدا اس کو مٹا جائے
بنائے وہ مری خاطر گھروندا روز ساحل پر
کوئی موج سمندر روز ہی اس گھر کو ڈھا جائے

"واہ بہت خوب۔ بہت اچھے شعر ہیں"۔ ہیلن کی آواز نے کہا۔ "غور سے سنو مجوّ! اب میں جارہی ہوں۔ تمہیں قسم ہے' میرے پیچھے نہ آنا۔ تمہاری زندگی اب تمہارے بچوں کی امانت ہے۔ آج کے بعد میرے بارے میں کبھی نہ سوچنا' یاد رکھنا کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لیے ان پانیوں میں دفن کردیا ہے"۔

ہیلن کا رخ ماجد کی طرف تھا اور وہ الٹے قدموں سمندر کی طرف چل رہی تھی۔ ماجد

سحرزدہ سا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہیلن اب کمر تک پانی میں تھی۔ پھر وہ پیچھے ہٹی۔ اب صرف اس کا چہرہ پانی کے اوپر تھا خود ماجد گھٹنوں گھٹنوں پانی میں تھا۔

"ماجد! تمہیں میری قسم' واپس چلے جاؤ اور آئندہ یہاں نہ آنا۔ دکھ کی کسی رہ گزر پر نہ جانا۔ مجوّ! مجھے حسرت ہے' کبھی مجھ سے کوئی ایسا وعدہ بھی کرلو' جو پورا کرسکو۔ وعدہ کرو مجوّ! آواز میں التجا تھی۔

ماجد کو شدید جھٹکا سا لگا۔ واقعی اس نے ہیلن سے بہت وعدے کیے تھے' وفا ایک بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں ہیلن! اور یہ وعدہ نبھاؤں گا"۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"شکریہ مجوّ! بے حد شکریہ" اسی وقت پانی نے ہیلن کا چہرہ بھی نگل لیا۔ ماجد ایک قدم بڑھا' پھر اسے ہیلن سے کیا ہوا وعدہ یاد آگیا۔ اب وہ وعدہ اسے ہمیشہ یاد رکھنا تھا' وفا کرنا تھا'۔ وہ پلٹا اور دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ پانی اب دیوار کو چھونے لگا تھا۔

میں نے کہا کہ تم سے بچھڑ کر میں کیا جیوں
اس نے کہا کہ عہدوفا تو وفا کرو

وہ دیوار پھاند کر اوپر آیا اور دوسری طرف اتر گیا۔ وہ اپنی ہیلن کو پانیوں میں دفن کر آیا تھا' سورج کے ساتھ۔ اس کے ذہن میں خیالات کا' سوالات کا ایک ہجوم تھا۔ کچھ بوجھ حکومتوں کے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ حکومتیں وہ بوجھ نہ اٹھائیں تو یہ ان کی نااہلی ہے' لیکن جب وہی بوجھ فرد پر لاد دیا جاتا ہے تو فرد کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ کیسا ظلم ہے؟ کب تک ہوتا رہے گا یہ ظلم؟ وہ حکمراں کب آئیں گے' جو زبان سے جو کچھ کہیں گے' اس پر عمل بھی کریں گے؟ لوگ مذہب کے نام پر' معاشرے کے رواج کے نام پر دوسروں کی خوشیوں کو کب تک قتل کرتے رہیں گے؟ دوسروں کی آنکھوں میں تنکے تلاش کرنے والوں کو اپنی آنکھ کے شہتیر کب نظر آئیں گے؟ ان تمام سوالوں کے علاوہ اس کے ذہن میں ایک سوال اور بھی تھا کہ ان تمام سوالوں کے جواب کون دے گا؟

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ روشنیاں دور تھیں' بہت دور۔ وہ تنہائی اور سکون کی تلاش میں بہت دور نکل آیا تھا۔ دور جہاں روشنیاں تھیں' وہیں سے اسے ٹیکسی یا رکشا ملنا تھا۔ اسے وہاں تک پیدل چلنا تھا۔ راستہ بہت طویل تھا۔ اور وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن اسے اپنے وعدے کی لاج رکھنا تھی۔ وہ پہلا اور آخری وعدہ تھا' جسے وہ ہر حال میں وفا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ تھکن کے باوجود چلتا رہا' چلتا گیا۔

زخم نہاں

یونیورسٹی کیمپس پولیس اسٹیشن میں وہ کال اتوار کی شام موصول ہوئی۔ اس وقت انسپکٹر منصور ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور یونیورسٹی کے ہاسٹل کا رخ کیا۔

ہاسٹل کے نگران کا نام جمشید تھا۔ اس نے انسپکٹر کے استفسار پر بتایا۔ ”جی ہاں۔ راشد نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کمرے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن اس نے مجھے تفصیل نہیں بتائی۔ نہ ہی کمرے میں جانے دیا۔ کہنے لگا........ یہ پولیس کیس ہے۔ صرف پولیس ہی اندر جاسکتی ہے“۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ اس نے وہ دن بھی دیکھے تھے جب ہاسٹل میں اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا۔ مگر اب تو زمانہ ہی اور تھا۔ ہاسٹل میں اسلحے کی بھرمار تھی۔ لڑکوں کے لبوں پر دھمکیاں ہوتی تھیں۔ وہ کسی کو روک ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ نوکری پر لات مار کر چل دیتا۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ کر آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔

”اس کمرے میں کون کون رہتا ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”راشد نوید اور مظفر ملک۔ ہر کمرے میں دو لڑکے ہوتے ہیں“۔ جمشید نے جواب دیا۔

”یہ دونوں لڑکے ہیں کیسے؟“

”بہت اچھے“۔ جمشید نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے اسی پر تو حیرت ہے کہ ان کے کمرے میں کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ کبھی کسی ایسی ویسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوئے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور پڑھائی کو فل ٹائم جاب سمجھتے ہیں۔ آج سے پہلے راشد نے مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ میرا احترام کرتا تھا۔ اس جیسے چند لڑکوں ہی کی وجہ سے تو میرا بھرم قائم ہے“۔ اس کے لہجے میں دکھ اتر آیا تھا۔

”آپ ہمیں ان کے کمرے تک لے چلئے“۔

وہ کمرا دوسری منزل پر تھا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر سب

سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جمشید اور پھر ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ کرسی کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ وہ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ بلب روشن نہ ہونے کی وجہ سے کمرے میں روشنی بہت کم تھی۔ لیکن لڑکے کو اس کی پروا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مطالعے میں پوری طرح منہمک تھا۔

انسپکٹر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک جانب ایک بیڈ تھا اور دوسری جانب دوسرا بیڈ تھا۔ درمیان میں ایک میز اور چار کرسیاں تھیں۔ باقی دو دیواروں کے ساتھ دو رائٹنگ ٹیبلز تھیں۔ سامنے والی دیوار سے لگے ہوئے بیڈ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا لڑکا اس نیم تاریکی میں بھی خوب روئی کا بھرپور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ بلکہ ایسے میں اس کی آنکھوں کی بے پناہ چمک اور نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً دراز قد اور خوش بدن بھی تھا۔ چہرے کے نقوش یونانی مجسموں جیسے تھے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے کرسی پر اسی طرح بیٹھا ہے........ ہلا بھی نہیں۔

ان تینوں کے اندر آنے کے بعد لڑکے نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس نے کتاب اپنے سینے پر ٹکائی اور بے نیازی سے سامنے والے بیڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

انسپکٹر بیڈ کی طرف بڑھا لیکن سب کچھ غیر واضح تھا۔

”میرا نام راشد نوید ہے“۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے بتایا۔

”چکر کیا ہے؟“ انسپکٹر نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جمشید نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کر دی۔

ایک لمحے کو انسپکٹر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر اس نے بیڈ پر لیٹے ہوئے لڑکے کا جائزہ لیا۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا تھا۔ پھر انسپکٹر کو اس کے دونوں طرف خون کا تالاب سا نظر آیا........ چہرے کے دونوں طرف، خون کا تالاب سا نظر آیا........ چہرے کے دونوں طرف، جہاں لڑکے کے ہاتھ رکھے تھے۔ اس کی دونوں کلائیاں کٹی ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر داہنی سمت پڑا ہوا بلیڈ نظر آیا جس کے دونوں کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

انسپکٹر بھی، جو موت کو ہر روپ میں دیکھ چکا تھا، یہ منظر دیکھ کر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پھر بھی اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ لیکن وہاں تو دھڑکن کا کوئی زخمی پرندہ بھی نہیں تھا۔ پنجرے میں موت کا سناٹا تھا۔

انسپکٹر کرسی پر بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ اس نے کتاب سے نظریں بھی نہیں ہٹائیں۔ انسپکٹر کو یہ اداکاری نہیں لگی۔ وہ سفید قمیص اور سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ کمرے کی دیوار پر ٹینس کے کئی ریکٹ لٹکے تھے اور

لڑکے کا جسم گواہی دیتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ٹینس کھیلتا ہے۔

"تو یہ لڑکا مظفر ملک ہے؟" انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ راشد نے کتاب سے نظریں اٹھائیں اور بولا۔ "جی ہاں"۔

"اس کی عمر؟"

"انیس سال"۔

"لاش پہلی بار تم نے دیکھی؟"

"نہیں۔ میں نے اسے زندہ دیکھا......... اور پھر قدم قدم موت کی طرف بڑھتے......... وہ آخر کار ختم ہوتے دیکھا"۔

انسپکٹر گنگ ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "کیا مطلب؟"

"میں نے بتایا نا......... جو کچھ ہوا' میری نظروں کے سامنے ہوا"۔ راشد نے جواب دیا۔

"تفصیل سے بتاؤ"۔

"میں دو بجے سے یہاں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کوئی آدھا گھنٹا پہلے مظفر آیا اور مجھ سے بولا......... میں خود کشی کر رہا ہوں۔ پھر اس نے ریزر نکالا اور بستر پر لیٹ کر پہلے داہنی اور پھر بائیں کلائی کاٹ ڈالی"۔

"اور تم نے کچھ بھی نہیں کیا! تماشا دیکھتے رہے؟"

"نہیں"۔ اس نے کہا۔ "میں ایک لمحے کے لیے اٹھا اور اسے دیکھا۔ وہ کلائیاں کاٹ چکا تھا......... اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا"۔

انسپکٹر چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا' پھر بولا۔ "کہتے رہو"۔

"پھر اس نے سر اٹھائے بغیر منہ پھیر لیا......... دیوار کی طرف"۔

"تم نے کیا کیا؟"

"میں پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک باب ختم کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ آپ لوگوں کو مطلع کرنا چاہیے۔ میں نے جمشید صاحب سے تھانے فون کرنے کو کہا"۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ تینوں افراد ساکت کھڑے تھے۔

"یعنی وہ یہیں پڑا مرتا رہا......... اس نے تمہاری موجودگی میں اپنی کلائیاں کاٹیں......... اور تم بیٹھے پڑھتے رہے؟" انسپکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں"۔

"کیوں؟"

"اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے اور فیصلے پر عمل کرنے کا حق تھا۔ وہ بھی ہم سب کی طرح آزاد انسان' آزاد شہری تھا۔ پھر نہ وہ چیخا چلایا' نہ اس نے مدد کے لیے کسی کو پکارا۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں"۔

اب انسپکٹر اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی دیکھ کر راشد خفیف سا

"تمہیں یہ لڑکا اچھا لگتا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ صورت حال اتنی غیر معمولی تھی کہ وہ ے روایتی طریقے بھول گیا تھا۔

"جی ہاں۔ بہت زیادہ"۔

"بہت عرصے سے جانتے تھے اسے؟"

"جی ہاں۔ ہم اسکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے"۔ راشد نے جواب دیا۔ "ہم اچھے تھے۔ مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے"۔

اس کا انداز جذبات سے عاری تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی علمی موضوع پر گفتگو کر رہا ، کی آواز ہموار' لہجہ حقیقت پسندانہ اور بات کرتے ہوئے چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کی ہ اپنی کتاب پر تھی جیسے اس میں سے کچھ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی اسے حیرت رہا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "جب اس نے آکر خود کشی کا ارادہ ظاہر کیا تو تم نے اس سے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں"۔

"تو کیا تم اس سے ناراض تھے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"تم اس سے نفرت کرتے تھے؟ تمہیں وہ برا لگتا تھا؟"

"ہرگز نہیں"۔

"تو تم نے اسے مرنے سے روکا کیوں نہیں؟" انسپکٹر جھنجلا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ ہا تھا۔

"اپنے اوپر سب زیادہ حق اس کا ہی تھا۔ میرا نہیں"۔

"میں اپنے آفس جا رہا ہوں"۔ ہاسٹل انچارج جمشید نے کہا۔ "مجھے ڈی سی صاحب کو ہو گا"۔

"ٹھیک ہے۔ فون کر کسی سائیکاٹرسٹ کو بھی طلب کر لیں"۔ انسپکٹر نے ہدایت دی۔ پھر ے پوچھا۔ "تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"وکیل ہیں"۔ راشد نے جواب دیا۔

"اسے تو قتل قرار دیا جانا چاہیے"۔ ہیڈ کانسٹیبل نے دبی آواز میں انسپکٹر سے کہا۔

"نہیں قانوناً یہ قتل نہیں ہے"۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔

راشد نے یہ بات سن لی تھی......... اور وہ حیران رہ گیا تھا۔ قتل! اس نے تو سوچا بھی کہ اس پر اس طرح کا کوئی الزام بھی عائد ہو سکتا ہے۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔

اس نے بس ایک بدصورت اور افسوسناک فعل سرزد ہوتے دیکھا تھا...... اور وہ بھی کسی اور کے ہاتھوں۔ اس نے خود کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس آگئی۔ راشد ایمبولینس والوں کو اپنے دوست کی لاش اسٹریچر پر رکھ کر لے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ بدستور اسی کرسی پر کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

پھر سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر حشمت آگیا۔ راشد احتراماً اٹھا اور اس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔ ڈاکٹر کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی۔ وہ پستہ قد اور فربہ اندام تھا۔ اس کے آنے کے بعد انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل بغیر ایک لفظ کہے کمرے سے چلے گئے۔

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد ایک سگریٹ سلگایا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر دیا سلائی بجھائی اور راشد سے پوچھا۔ "یہ مظفر کون تھا؟"

"میرا روم میٹ" راشد نے جواب دیا۔

"تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"راشد نوید"۔

"تم مشہور وکیل نوید کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں"۔

"وہی نا جو لاہور بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے ہیں؟"

"جی ہاں"۔

ڈاکٹر حشمت نے میز پر رکھی ایش ٹرے اپنی طرف گھسیٹ لی۔ اس نے ایش ٹرے میں راکھ گراتے ہوئے پوچھا۔ "مظفر ملک نے خودکشی کیوں کی؟"

"مجھے نہیں معلوم"۔

"اگر تم نے خودکشی کی ہوتی تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟"

راشد نے محسوس کیا کہ وہ سوال بڑی ہوشیاری سے اسے گھیرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے مظفر کو خودکشی کیوں کرنے دی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ وہ خاموشی سے ڈاکٹر حشمت کو ایش ٹرے میں راکھ جھاڑتے دیکھتا رہا۔ حالانکہ کافی دیر سے اس نے کش بھی نہیں لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بس ایش ٹرے بھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر حشمت اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

"کوئی وجہ نہیں ہوتی"۔ آخرکار راشد نے جواب دیا۔ "اور آپ کا سوال خلافِ حقیقت بھی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی"۔

"لیکن تم نے اسے خودکشی کرنے دی"۔

"جی ہاں"۔

"کیوں؟"

"کیوں نہ کرنے دیتا۔ وہ سمجھدار تھا' بالغ تھا' اپنا اچھا برا سمجھتا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا' حادثے کی طرح نہیں تھا۔ اس نے باارادہ کیا تھا......"

ایش ٹرے میں راکھ جھاڑنے کا عمل رک گیا۔ ڈاکٹر حشمت کا ہاتھ ٹھٹکا۔ اس نے راشد بغور دیکھا۔ "تم درست کہہ رہے ہو؟ تمہیں اس پر یقین بھی ہے؟"

"جی ہاں۔ میں آزادیِ رائے اور آزادیِ عمل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ آزادیِ عمل غلط ر پر استعمال کی جائے تو سزا بھی عمل کرنے والے ہی کو ملتی ہے۔ قانون کیوں بنایا گیا ہ...... آزادیِ عمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے لیے۔ ورنہ قانون کی ضرورت ہی کیا ی"۔

سائیکاٹرسٹ بیٹھا چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی"۔ کہہ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ روازے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر راشد کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں کے درمیان کوئی خاص لق تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ہم بہت اچھے دوست تھے"۔

"اور کچھ؟"

"جی نہیں"۔

ڈاکٹر حشمت واپس آیا۔ اس نے جیب سے ایک ٹیبلٹ نکال کر میز پر رکھ دی۔ "نیند آئے تو اسے پانی سے لے لینا"۔

"آپ کے خیال میں مجھے اس کی ضرورت پڑے گی؟"

"پڑ سکتی ہے"۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ہاسٹل انچارج کھڑا تھا۔ ہ اندر نہیں آیا۔ اس نے باہر کھڑے کھڑے کہا۔ "راشد...... منگل کے روز تین بجے تمہیں ی سی صاحب سے ملنا ہے"۔ پھر وہ ڈاکٹر حشمت کی طرف مڑا۔ "اور آپ کو بھی"۔

"ٹھیک ہے"۔ راشد نے کہا۔ ڈاکٹر حشمت نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

راشد جانتا تھا کہ سائیکاٹرسٹ اب رخصت ہونے والا ہے۔ لیکن وہ اسے رخصت کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ حالانکہ اس نے اس کا خیر مقدم کھڑے ہو کر کیا تھا۔ لیکن اتنی یر میں وہ راشد کی نظروں میں بے وقعت ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر حشمت نے اس کی طرف وزٹنگ کارڈ بڑھایا۔ "ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لینا۔ م مجھ سے بات کر کے دل کا بوجھ بھی ہلکا کر سکتے ہو"۔

"جی' بہت بہتر"۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اسی کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ کبھی میز پر رکھی اپنی کتاب کو تکتا اور کبھی ایش ٹرے کو......... اور پاؤں جھلاتا رہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کرسی کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور ذہنی طور پر اپنی چیزوں کو مظفر کی چیزوں سے الگ کرتا رہا۔ کمرہ جتنا اس کا تھا اتنا ہی مظفر کا بھی تھا......... اور اب بھی تھا۔ مینٹل پیس پر چار کیمرے رکھے تھے۔ ایک میز پر بھی تھا۔ وہ پانچوں اس کے تھے۔ ٹینس کے تمام ریکٹ بھی اسی کے تھے۔ دیوار پر لٹکی ہوئی پینٹ' شرٹ اور ٹینس کا نیکر مظفر کا تھا۔ تقریباً" آدھی کتابیں بھی مظفر کی تھیں۔ اسے کتابوں کا جائزہ لے کر انہیں الگ الگ بھی کرنا تھا۔

وہ اٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ باہر خاصا اندھیرا ہوگیا تھا۔ وہ باہر دیکھتا رہا۔ کیمپس کے درمیان چھوٹی سڑکوں کے بلب روشن ہوگئے تھے۔ ان کی روشنی دائروں کی شکل میں زمین پر پڑ رہی تھی۔ وہ پلٹا اور کمرے سے نکل کر آفس کی طرف چل دیا۔

آفس میں روشنی تھی۔ جمشید میز کے پیچھے بیٹھا کچھ کاغذات اِدھر اُدھر کر رہا تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی توجہ کاغذات پر نہیں ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ایکسکیوزمی"۔ راشد نے کہا۔ "مجھے ایک فون کرنا ہے"۔

"ضرور......... ضرور"۔ جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم فون کرو میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آفس کا دروازہ لاک کر جانا"۔

اس کے جانے کے بعد راشد نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو اپنا نام اور کمرہ نمبر بتانے کے بعد لاہور کا نمبر دیا۔ پھر وہ کال ملنے کے انتظار میں انگلیاں چٹخاتا رہا۔

کچھ دیر بعد گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "لاہور بات کیجئے"۔ آپریٹر نے کہا۔

اگلے ہی لمحے ممی کی آواز ابھری "ہیلو.........؟"

"ممی......... میں راشد بول رہا ہوں........."

"میں کھانا کھا رہی ہوں۔ راشد......... کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟"

"ممی......... ڈیڈی کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ضروری بات کرنا ہے"۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ تم پریشان معلوم ہو رہے ہو؟"

"آپ مجھے یہ بتائیں' ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ تو فیصل آباد گئے ہیں۔ بات کیا ہے راشد؟ کوئی پریشانی ہے تمہیں؟" ممی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آپ کسی طرح ان سے رابطہ کرکے کہیں کہ وہ مجھے ہاسٹل فون کرلیں"۔

"ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گی۔ لیکن سچ سچ بتاؤ۔ تم کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئے؟"

"آپ بے فکر رہیں۔ بس ان سے میری بات کرادیں"۔ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھا

اور دروازہ لاک کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے ایک کیسٹ لگایا اور موسیقی سننے میں منہمک ہوگیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ "آپ کا فون ہے راشد صاحب!" رات کے چوکیدار نے کہا۔

وہ پھر آفس میں چلا آیا۔ آفس رات بھر کھلا رہتا تھا۔ صرف رات کا چوکیدار ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو"۔

"راشد......... ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری ممی نے مجھے فون کرکے بتایا........."

"جی ہاں ڈیڈی!"

"کیا بات ہے بیٹے!"

"ڈیڈی......... مظفر نے آج شام خودکشی کرلی"۔

"اوہ......... مجھے افسوس ہوا یہ سن کر"۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ممکن ہے عنقریب میں یونیورسٹی چھوڑدوں"۔

"کیا یہ ضروری ہے بیٹے؟"

"جی ہاں۔ ممکن ہے' مجھے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے۔ منگل کو مجھے وائس چانسلر سے ملنا ہے"۔

"کیوں؟ یونیورسٹی سے کیوں خارج کیا جائے گا تمہیں؟"

"اس نے میری موجودگی میں خودکشی کی تھی۔ میں نے وہ پورا منظر دیکھا تھا"۔

"خودکشی کیسے کی اس نے؟"

"بلیڈ سے اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں"۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی' پھر اس کے ڈیڈی نے پوچھا۔ "تم کسی قانونی دشواری میں تو نہیں......... میرا مطلب ہے' نظربندی یا قانونی تحویل میں........."

"نہیں۔ ویسے پولیس والوں نے اس بنیاد پر کہ میں اسے خودکشی کرتے دیکھتا رہا تھا' قتلِ عمد کا تذکرہ ضرور کیا تھا........."

"پاگل ہوگئے ہیں......... اور وہ اس بنیاد پر تمہیں گرفتار بھی نہیں کرسکتے۔ دیکھو بیٹے......... مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ لیکن میں ہفتے تک گھر واپس آجاؤں گا۔ دوسری طرف یونیورسٹی والے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے' وہ اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کرسکیں گے۔ پھر آگے میں دیکھ لوں گا"۔

"بہت بہتر ڈیڈی"۔

"مجھے مظفر کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا بیٹے!"

"ایک دن سبھی کو جانا ہوتا ہے ڈیڈی!"

"ٹھیک ہے بیٹے' پھر ملاقات ہوگی"۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ کیسٹ بدستور بج رہا تھا۔ اس نے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا تاکہ پورا کیسٹ سنا جاسکے.........

O============☆============O

راشد کو فوٹوگرافی سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ اس کی واحد تفریح تھی۔ اس عشق کا آغاز اس وقت ہوا' جب اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ کسی نے سالگرہ کے موقع پر تحفے میں اسے کیمرہ دیا تھا۔ وہ اس کیمرے پر یوں فدا ہوا جیسے بچے کسی بھی من پسند چیز پر فدا ہوتے ہیں۔ وہ کیمرہ کندھے سے لٹکائے پھرتا......... اور موقع پاکر بغیر بتائے کسی کی بھی تصویر کھینچ لیتا۔ بعض اوقات وہ ایک دن میں چھ رول تک استعمال کر لیتا۔ اس ابتدائی دور کی بعض تصویریں تو اب تک اس کے پاس محفوظ تھیں۔ ایک تصویر اس کے کتے کی بھی تھی جس میں وہ گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ ایک تصویر ماں کی تھی جو ایک پارٹی کے دوران لی گئی تھی۔

پھر بتدریج اسے اس فن کا شعور آنے لگا۔ اس کی نظر ایک فنکار کی نظر ہوگئی۔ اس کے انداز کی بے پروائی رخصت ہوگئی۔ وہ بہت احتیاط سے تصویریں لینے لگا۔ اس میں تحمل آگیا۔ وہ مناسب ترین لمحے کا طویل انتظار بھی کرسکتا تھا۔ پہلے وہ کسی منظر کے بارے میں اندازہ لگاتا کہ کسی نہ کسی لمحے وہ قابل دید ہوگا......... اور پھر اس لمحے کا انتظار کرتا۔ پھر اس نے تصویریں خود ہی ڈیولپ کرنا شروع کردیں۔ ایک کمرے کو اس نے ڈارک روم بنالیا۔ پھر رنگین فلموں کا دور آیا......... اور وہ شوق خود بخود کم ہوتا گیا۔

پھر اس کے جیب خرچ کا بیشتر حصہ اچھے کیمروں اور لینز کی خریداری پر صرف ہونے لگا۔ اس کی کارکردگی پروفیشنل فوٹوگرافروں سے بہتر ہوگئی۔ وہ کیمرہ خریدتا تو اس کے متعلق سب کچھ جاننے کی لیے گھنٹوں دکاندار کا دماغ بھی چاٹتا۔ عام طور پر دکاندار خوش ہوتے۔ اس کے شوق اور صدق طلب کو سراہتے۔ کیمروں کے بارے میں اس کی معلومات سے متاثر ہوتے۔

پھر اس کی کھینچی ہوئی تصویریں کوالٹی کے اعتبار سے بہتر ہوتی گئیں۔ چھٹیوں میں اس کا ایک ہی مشغلہ ہوتا۔ وہ کیمرہ کندھے سے لٹکاتا اور گھر سے نکل جاتا۔ وہ لوگوں کو بغور دیکھتا......... اور موقع پاکر تصویر لے لیتا۔ اس کی کھینچی ہوئی کوئی کوئی تصویر تو بے حد آرٹسٹک ہوتی۔ کوئی کرکٹ یا ہاکی میچ ہوتا تو اس کی بن آتی۔ وہ میچ کے علاوہ میچ دیکھنے والوں کا بھی مشاہدہ کرتا اور بعض اوقات کھیل کے میدان کے ایکشن کو نظرانداز کرکے کسی تماشائی کی ایسی تصویر کھینچتا جو یادگار کہلانے کی حقدار ہوتی۔ ایک بار اس کی کھینچی ہوئی ایک تصویر کو ایک روزنامے کے تصویری مقابلے میں انعام بھی ملا تھا۔

وہ اور کیمرہ لازم وملزوم تھے۔ کیمرہ لیے بغیر وہ اسکول بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عام سی صورت حال میں بھی غیر معمولی تصویر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ پھر کالج کے میگزین میں اس کی تصویریں باقاعدگی سے چھپیں۔ وہ کیمرہ ہر وقت اس لیے بھی ساتھ رکھتا تھا کہ لوگ اس کے عادی ہوجائیں......... کیمرا کانشس نہ رہیں۔ ان کے لیے اس کا کیمرہ لباس سے زیادہ اہم نہ رہے۔ اس صورت میں وہ کسی بھی صورت حال میں اپنا فطری ردعمل ظاہر کرسکیں گے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ہر وقت تصویر کھینچتا ہو۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا......... اور جب ہوتا تھا تو وہ بے پناہ مشاہدے اور مہارت کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیمرہ اس کے لیے حرف اظہار کی طرح تھا۔

چنانچہ اس رات وہ کیمرہ کندھے پر ڈال کر چہل قدمی کے لیے نکلا تو کسی نے اس پر خصوصی توجہ نہ دی۔ حالانکہ شام کے وقت جو کچھ ہوا تھا' سب کے علم میں تھا۔ یونیورسٹی اس طرح کے معاملات کو اخبارات کے صفحات سے دور رکھتی تھی کہ یہ اس کی تقدیس کا معاملہ تھا۔ لیکن یونیورسٹی کے اندر خبریں پر لگا کر اڑتی تھیں۔ پھر راشد اور مظفر دونوں یونیورسٹی کے مقبول لڑکوں میں سے تھے۔ فوٹوگرافی کے علاوہ راشد یونیورسٹی کی ٹینس ٹیم کے لیے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ گزشتہ سال انٹریونیورسٹی چیمپئن شپ میں کامیابی اسی کی مرہون منت تھی۔ مظفر بہت اچھا مقرر تھا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ کوئز مقابلوں میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کی مقبولیت میں اس کی خوش مزاجی کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔

دونوں کا موازنہ کیا جاتا تو مظفر زیادہ پسندیدہ قرار پاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طلبا کی رائے میں راشد قدرے مغرور اور بددماغ تھا۔ حالانکہ وہ بس ریزرو رہنے کا قائل تھا۔

مظفر کا تعلق اسلام آباد سے تھا جبکہ راشد لاہور کا تھا۔ مظفر نے ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی تھی۔ وہیں دونوں کا ساتھ ہوا تھا۔ میٹرک کے بعد راشد نے کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو مظفر نے بھی اپنے گھر والوں سے اجازت لے لی اور اب.........

کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ مظفر کی موت کے چند گھنٹے کے بعد ہاسٹل اور کیمپس والوں نے اسے کیمرہ لٹکائے چہل قدمی کرتے دیکھا تو انہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

راشد آٹھ بجے کمرے سے نکلا تھا۔ ہاسٹل میں کھانے کا وقت ساڑھے سات بجے تھا۔ راشد نے دانستہ ڈائننگ ہال سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی میز کے قریب کوئی نہیں پھٹکے گا۔ مگر سب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھیں گے......... جیسے وہ اچانک ہی بغیر کسی اعلان کے تبدیل ہوگیا ہو......... اچھوت ہوگیا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ ہال میں اس کی موجودگی لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی۔ انہیں ایسی باتوں پر اکسائے گی' جس سے وہ گریزاں ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے سے گفتگو کے دوران اس معاملے میں اس کے کردار پر تعجب کا اظہار کریں گے۔ اور راشد کو موضوع گفتگو بننا سخت ناپسند تھا۔

یونیورسٹی کے باہر جھونپڑی میں ایک ہوٹل تھا جسے لڑکوں نے کیفے ڈی پھونس کا نام دے

رکھا تھا۔ وہ جب بھی ڈائننگ ہال میں کھانا نہ کھاتا' کیفے ڈی پھونس کا رخ کرتا۔ ویسے اتوار کی رات وہ ہمیشہ یہی کرتا تھا اور مظفر اس کا ساتھ دیتا تھا۔ اور آج بھی اتوار تھا۔ لیکن مظفر کھانے کی ضرورت سے بے نیاز ہوچکا تھا۔

کھانے کے بعد اس نے چائے پی اور پیسے ادا کرکے نکل آیا۔

یونیورسٹی میں پہلے چوک کے قریب گرلز ہاسٹل کی طرف سے ثمینہ آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔

یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا۔ لیکن لوگ اس کی طرف کھنچتے تھے۔ وہ اسے مداخلت تصور کرتا تھا۔ وہ بس میں بھی ایسی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتا تھا جو خالی ہوتی۔ اور اگر کوئی اس کے پاس آبیٹھتا تو اسے بہت برا لگتا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ڈائننگ ہال میں بھی وہ الگ تھلگ بیٹھتا تھا۔ ہال بہت بڑا تھا...... اور کھانا کھانے ہمیشہ دیر سے جاتا تھا۔ ایسے میں کوئی نہ کوئی خالی میز مل ہی جاتی تھی۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی اس کی میز پر آہی جاتا۔ کبھی کبھی تو بھیڑ لگ جاتی۔ اس کے حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود لوگ اس کی طرف بڑھتے۔ اس نے اس سلسلے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا سبب محض اس کی شخصی خوبصورتی ہے۔ بہرحال وہ ناپسندیدگی کے باوجود سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ اس نے کبھی کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہیں کی تھی...... تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ تو اسے گناہ سمجھتا تھا۔ اور اس کا انداز ہر شخص کو تنبیہہ کرتا تھا کہ اس کی زندگی کے بارے میں بھی کوئی تجسس نہ کرے۔ وہ لوگوں سے ملتا تھا تو اپنی شرائط پر

اس وقت بھی اسے ثمینہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ ثمینہ' مظفر کی پسند تھی۔ مظفر کا ہر انداز اس کی محبت کا غماز تھا۔ ثمینہ بھی اس سے بہت اچھی طرح ملتی تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ مظفر سے محبت نہیں کرتی تھی۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ مظفر فلم دیکھنے جانے کے لیے کہتا تو وہ منع کردیتی۔ البتہ راشد ساتھ ہوتا تو وہ کبھی منع نہ کرتی۔ حالانکہ راشد کے ساتھ کوئی اور لڑکی ہوتی۔ مظفر اور راشد دونوں کو اس بات پر حیرت ہوتی۔ ایسا لگتا کہ وہ صرف راشد کی قربت میں وقت گزارنے کی خاطر مظفر کو قبول کررہی ہے۔ مظفر نے کبھی اس پر کوئی منفی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو ثمینہ کی اس کمزوری سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا۔ ثمینہ کو کہیں جانے کے لیے رضامند کرنا ہوتا تو وہ راشد کو رضامند کرلیتا۔ یہ سنتے ہی کہ راشد بھی ساتھ ہوگا' ثمینہ فوراً تیار ہوجاتی۔ راشد کو یہ بات عجیب لگتی۔ وہ سوچتا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟

ثمینہ اس کے قریب آکر رک گئی۔ "مجھے معلوم تھا' تم یہیں ملو گے"۔ وہ بولی۔ "عظیم راشد نوید اپنے معمولات تو ترک نہیں کرسکتا۔ خواہ اس کا عزیز ترین دوست فرش پر خون کے تالاب میں نہا کر موت سے ہم کنار ہوچکا ہو"۔ اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

"وہ فرش پر خون کے تالاب میں نہیں نہایا......"

"تو پھر؟"

"بیڈ پر۔"

اس نے نفرت آمیز نگاہوں سے راشد کو دیکھا۔ "تم بہت کمینے ہو...... خبیث ہو"۔

اکا دکا طالب علم ان کے پاس سے گزرے۔ مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ قدرے تاریکی میں تھے۔ ثمینہ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"اور تم یہاں کیا کررہی ہو؟ اس کا...... اپنے تفریح کے ساتھی کا سوگ منانے کے لیے مٹرگشت؟" راشد نے ہموار لہجے میں کہا"۔

"میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ تم قاتل ہو"۔

راشد نے نظریں چرالیں۔ اس کے لیے ثمینہ کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت کا سامنا کرنا ممکن نہیں تھا۔ "مجھے افسوس ہے"۔ اس نے کہا۔ "میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تم پر طنز کیا۔ لیکن میں سمجھا تھا' تم مذاق کررہی ہو"۔

"تم ناقابل برداشت' ناقابل فہم آدمی ہو راشد!"

"اور میں بھول گیا تھا کہ جذبات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ ویسے یہ بتادوں' مظفر اس لیے مرا کہ وہ مرنا چاہتا تھا"۔

"مجھے امید ہے کہ تم بھی اسی طرح مرنا چاہو گے"۔

راشد نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔ لیکن وہ اس سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے جذبات سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ بحث کا کیا سوال!

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو راشد؟" وہ تقریباً چلا اٹھی۔

"معلوم نہیں"۔

"تمہارے گلے میں اس وقت بھی کیمرہ جھول رہا ہے۔ مجھے بتاؤ' تم نے کلائیاں کاٹتے ہوئے بھی اس کی کوئی تصویر لی یا نہیں خون کے تالاب کو...... اور اس کی بے نور آنکھوں کو بھی سیلولائیڈ پر منتقل کیا یا نہیں؟"

راشد نے ایک نظر اپنے کیمرے پر ڈالی اور بولا۔ "نہیں"۔

"مجھے شدید حیرت ہے اس پر کہ تم نے مرتے وقت اس کے چہرے پر فلیش لائٹ مار کر اسے چونکایا بھی نہیں"۔

فلیش لائٹ نہیں...... فلیش بلب کہو"۔ راشد نے تصحیح کی۔

ثمینہ پر اچانک جنون طاری ہوگیا۔ اس نے اس کے کندھوں پر گھونسوں کی بارش کردی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"آئی ایم سوری ثمینہ۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا شاید؟" راشد نے ہمدردانہ لہجے میں

کہا۔

"لعنت ہو تم پر تم بے حس آدمی ہو پتھر۔ جانتے ہو' اس کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نے اس کی محبت قبول نہیں کی۔ اگر تمہارا یہ روپ میں پہلے دیکھ لیتی تو کبھی ایسا نہ کرتی۔ اور اب دیکھ لیا ہے تو کچھ کیا نہیں جاسکتا۔ تم نے اسے قتل اور مجھے زندہ درگور کردیا۔ بے رحم آدمی"۔ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اندھا دھند گرلز ہاسٹل کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ "میں تم سے نفرت کرتی ہوں!" اس نے ایک بار پلٹ کر حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

راشد کا ذہن الجھتا رہا۔ کیا ثمینہ بھی......... وہ بھی مظفر سے محبت کرتی تھی......... اور اپنی محبت سے خود بھی بے خبر تھی۔ کیا پتا......... وہ ان دونوں کی دوستی سے چڑتی ہو۔ محبت میں لڑکیاں عجیب و غریب ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا تو اس نے ثمینہ میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی' نہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس نے تو کبھی ثمینہ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ اسے تو متعارف بھی مظفر نے کرایا تھا......... اور وہ اسے مظفر کی محبت کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اور کچھ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ دوست کی محبت پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے ثمینہ کی وحشت' اس کے جذبات کی شدت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

پھر اسے مظفر کے گھر والوں کا خیال آگیا۔ اس کے متعلق ان کے جذبات یقیناً اس سے بھی زیادہ شدید ہوں گے۔ انہیں اکلوتے بیٹے کی موت پر کس قدر صدمہ ہوگا۔ کیسا شاک پہنچے گا۔ اس کا اندازہ تھا کہ مظفر کے والدین نے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی اولاد کو کس طرح آزادی دی ہوگی۔ لیکن اب وہ اپنے بیٹے کے پیرائیہ اظہار پر کس قدر شرمندہ ہوں گے۔ کتنے دکھی ہوں گے کہ مظفر نے آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مظفر نے جو کچھ کیا' اس کے لیے وہ آزاد تھا۔ مگر راشد زندگی اور اس سے متعلق حقائق کا بڑی بے رحمی سے تجزیہ کرنے کا قائل تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مظفر کے والدین کے لیے وہ ہمدردی محسوس کرتا ہے......... یا وہ ہمدردی کے مستحق بھی ہیں۔

پہلے اسے خیال آیا کہ اسے مظفر کی تدفین میں شریک ہونا چاہیے۔ آخر لڑکپن کے زمانے سے اس کا دوست تھا۔ ان کی دلچسپیاں اور پریشانیاں مشترک رہی تھیں۔ ان کے مضامین ایک تھے۔ وہ ہر موضوعات پر گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے بہترین دوست کی تدفین میں شریک ہو۔ لیکن اسے یہ احساس بھی تھا کہ مظفر کے والدین اس موقع پر اس کی موجودگی پسند نہیں کریں گے۔ یونیورسٹی والوں نے تمام حقائق ان کے گوش گزار کردیے ہوں گے۔ ان کے نزدیک بھی مظفر کی موت کا ذمے دار وہی ہوگا۔ ان کا ردعمل خالصتاً جذباتی ہوگا۔ اس کی تدفین میں شرکت ان کے لیے نفرت انگیز ہوگی۔ تدفین میں شرکت نہ کرنا اس کے لیے کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس نے خود کو ہمیشہ جذبات

سے دور اور محفوظ رکھا تھا۔ آدمی مرجائے تو پھر اس کے تعلق کے حوالے سے کسی چیز کی اہمیت نہیں رہتی۔ راشد کا کم از کم یہی خیال تھا۔

O============☆============O

اگلے روز راشد کو کلاس اٹینڈ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ اپنے ہم جماعتوں سے منہ چھپا رہا تھا۔ وہ تو خود ان کی بہتری کی خاطر ان سے گریزاں تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی موجودگی ان کے لیے پریشانی اور خجالت کا باعث ہوگی۔ وہ عادتاً" لوگوں کے جذبات سے خود کو دور رکھتا تھا۔ چنانچہ اس روز وہ کوئی پیریڈ لینے کے بجائے مظفر کا سامان سمیٹنے میں لگا رہا۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ مظفر کے بستر کی خون آلود چادر جلادی۔ یہ کام وہ گزشتہ رات ہی کو کر دیتا مگر اس وقت تک خون سوکھا نہیں تھا۔ چادر سے نمٹنے کے بعد اس نے مظفر کے کپڑے' کتابیں اور دیگر چیزیں یکجا کرکے ایک ٹرنک میں رکھ دیں۔ پھر اس نے چپراسی کو بلا کر ٹرنک نیچے اسٹور میں بھجوایا۔

یہ کام نمٹانا اس کی ذمے داری تھی۔ ایسے المناک موقعوں پر یہ کام مرنے والے کے روم میٹ کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری ضابطہ تھا۔ یہ کام لواحقین نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بے چارے تو وہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ خاص طور پر خودکشی کی صورت میں۔ شدید دکھ کے راستوں سے ہر شخص کتراتا ہے۔ وہ تو کبھی سامان واپس لینے بھی نہیں آتے۔

O============☆============O

میز کی درازیں خالی کرنے کے دوران میں راشد کو ایک تصویر ملی۔ اس نے تصویر کو بغور دیکھا۔ یہ تصویر وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ مظفر کی بہن سمیرا کی تصویر تھی۔ تصویر زیادہ اچھی نہیں تھی۔ لیکن اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سمیرا بہت حسین لڑکی ہے۔ اس کے انداز میں خوداعتمادی تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔

مظفر اور راشد ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن راشد سمیرا سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس بات کی اہمیت کا راشد کو پہلے کبھی احساس نہیں ہوا۔ لیکن اب سمیرا کی تصویر پر نگاہیں جمائے وہ اسی سلسلے میں سوچ رہا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران نہ اسکول میں' نہ کالج میں' نہ یونیورسٹی میں......... اس کے گھر سے کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ موسم گرما کی چھٹیاں مظفر زیادہ تر اس کے ساتھ ہی گزارتا۔ گھر وہ کم ہی جاتا۔ اس نے چھٹیاں گزارنے کے لیے راشد کو کبھی اپنے گھر مدعو بھی نہیں کیا تھا۔

راشد کو مظفر کے گھر والوں کے متعلق علم صرف ان کے خطوط سے ہوتا تھا جو مظفر کو کبھی کبھار موصول ہوتے تھے۔ کبھی کوئی عید کارڈ یا سالگرہ کے موقع پر مبارک باد کا کارڈ بھی موصول ہوتا۔ کبھی کبھی کوئی فون کال بھی آتی۔ لیکن مظفر اپنے گھر والوں کے متعلق زیادہ بات

نہیں کرتا تھا۔ البتہ اصرار کرنے پر وہ اپنے گھر والوں کے متعلق تھوڑی بہت گفتگو کر لیتا۔
مظفر کا باپ آرکیٹیکٹ تھا۔ رہائش اسلام آباد میں تھی۔ ایک بنگلہ مری میں بھی تھا۔
سمیرا مظفر سے ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی تعلیم کے سلسلے میں گھر سے دور رہتی تھی۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اپنی نجی زندگی کے یہ تھوڑے سے حقائق وہ اس طرح بیان کرتا جیسے کسی فائل سے پڑھ کر سنا رہا ہو۔ کچھ عرصے بعد راشد نے اپنے تجسس پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مظفر اپنے گھر والوں کے متعلق بات کرتے ہوئے ہچکچاتا نہیں۔ بس وہ ان کے متعلق زیادہ جانتا نہیں ہے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں ان سے دور تھا........ اور وہ لوگ خود زیادہ تر سفر میں رہتے تھے........ کبھی یہاں' کبھی وہاں۔ ٹک کر بیٹھنا تو جیسے انہیں آتا ہی نہیں تھا۔

راشد' مظفر کی تدفین میں شرکت کے لیے تو نہیں جا رہا تھا مگر وہ اس کے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ سمیرا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی متجسس تھا۔ اس کے دل میں سمیرا سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ سمیرا کی تصویر مظفر کے سامان کی وہ واحد چیز تھی جو اس نے ٹرنک میں نہیں رکھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ٹرنک تاابد اسٹور میں پڑا رہے گا۔ کوئی اسے کھول کر دیکھے گا بھی نہیں۔

O============☆============O

منگل کی صبح وہ ٹینس کورٹ کی طرف نکل گیا اور پریکٹس کی غرض سے ایک لڑکے کے ساتھ تین سیٹ کھیلے۔ وہ سنگلز کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس کی سروس بہت تیز اور صاف تھی اور ریٹرن وہ بہت بے رحمی سے دیتا تھا۔ یونیورسٹی کے دوسرے کھلاڑیوں میں اور اس میں نمایاں فرق یہ تھا کہ اسے کوئی ہلا نہیں سکتا تھا اور وہ اعصاب زدہ کبھی نہیں ہوتا تھا کبھی دباؤ میں نہیں کھیلتا تھا۔ یوں اسے اپنے ہر حریف پر فوقیت حاصل ہوتی تھی........ اور زیادہ تر اس کے حصے میں فتح ہی آتی تھی۔ سنگلز اسے پسند بھی تھا اور اس کے مزاج کے عین مطابق بھی۔ اس میں ساری ذمے داری اس کی ہوتی تھی........ اور سامنے صرف ایک حریف ہوتا تھا۔ اسے ٹیم گیم اچھے نہیں لگتے تھے۔ چند تجربات کے بعد وہ ٹیم گیمز سے متنفر ہی ہو گیا۔ ٹیم کی صورت میں تمام کھلاڑیوں کے درمیان ایک ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی تھی جس کا پیدا ہونا بے حد مشکل تھا۔ کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی سے کوئی گڑبڑ ضرور ہو جاتی تھی جس سے کھیل کی خوبصورتی متاثر ہوتی۔ اسی لیے اس کی تمام تر توجہ ٹینس پر مرکوز ہو گئی تھی۔ وہ ٹینس نہ تو خوشی کے لیے کھیلتا تھا اور نہ ہی کسی کو شکست دینے کے لیے۔ وہ تو بس اس کے لیے ایک جسمانی ورزش تھی۔ اسے ہار جیت سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ لیکن وہ بے داغ کھیل کھیلنے کا قائل تھا........ عیوب سے پاک صاف ستھرا اور خوبصورت کھیل۔
شام تین بجے اسے وائس چانسلر سے ملنا تھا۔ وائس چانسلر کے کمرے میں وائس چانسلر

ے علاوہ ہاسٹل انچارج اور ماہر نفسیات ڈاکٹر حشمت موجود تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے
ب کے انداز میں سردمہری محسوس ہوئی۔ وائس چانسلر نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔
ں کی میز پر کاغذات کا ڈھیر تھا۔
"بیٹھ جاؤ راشد!" بالآخر وائس چانسلر نے کہا۔
لیکن راشد کھڑا رہا۔ اس نے کہا۔ "میں پہلے آپ کو یہ بتادوں کہ میں جلد از جلد
یورسٹی چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے ڈیڈی کو بھی مطلع کر دیا
ے........ اور اس سلسلے میں تحریری اطلاع نامہ میری جیب میں موجود ہے۔"
وائس چانسلر نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اور اسے تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ راشد
ی آواز اور لہجے میں نہ سرکشی تھی' نہ بدتمیزی اور نہ ہی مایوسی اور سوگواری۔ اس کا لہجہ بے
ژ تھا۔ "تم نے یہ کیوں کہا کہ پہلے آپ کو یہ بتادوں؟" وائس چانسلر نے راشد سے پوچھا۔
"آپ کو زحمت سے بچانے کے لیے"۔ راشد کا لہجہ اب بھی بے تاثر تھا۔
"جو کچھ ہم کہنے والے ہیں' تم اس سے خوفزدہ ہو؟" ڈاکٹر حشمت نے پوچھا۔
"نہیں"۔
ان تینوں نے اسے بغور دیکھا........ اور جان لیا کہ اس نے پوری سچائی سے جواب دیا
ے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔
"آپ کیا کہتے ہیں کیا سوچتے ہیں' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں"۔ راشد نے مزید کہا۔ پھر
ں نے نظریں جھکالیں۔ "یہ بات نہیں کہ میں آپ کا احترام نہیں کرتا۔ میری صاف گوئی کو
یزی نہ سمجھیے گا"۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ راشد نے نظریں اٹھاتے ہوئے
ا۔ "مگر میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔ مجھ پر قتل عمد کا الزام تو نہیں عائد کیا گیا؟"
"نہیں"۔ وائس چانسلر نے کہا۔ "میں نے ایس پی سے بات کی تھی۔ تم پر کوئی الزام
ں۔ دراصل تمہارا جرم قانونی نہیں' اخلاقی ہے"۔ پھر اس نے راشد کا ردعمل دیکھنے کے
ے اسے بغور دیکھا لیکن راشد کا چہرہ بے تاثر تھا۔ "ایک بات بتاؤ۔ تم یونیورسٹی کیوں چھوڑنا
تے ہو؟" وائس چانسلر نے پوچھا۔
راشد نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حشمت کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب یونیورسٹی میں رہا تو
ا کی نجی زندگی میں لڑکے ایسے مداخلت کریں گے جیسے ایک دیوار گر جانے سے گھر راہ گزر ہو
اہے۔ "میں اب یہاں خود کو کبھی آزاد محسوس نہیں کر سکوں گا"۔ اس نے جواب دیا۔
"تمہیں یہ خدشہ ہے کہ ہم تمہیں یونیورسٹی سے نکال دیں گے؟"
"میں نے ایسا سوچا ضرور ہے"۔
وائس چانسلر نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا کر ان پر نظریں جمادیں۔ "ہم لڑکوں کو
خطا کی بنیاد پر یونیورسٹی سے نکالنے کے قائل نہیں جسے ہم خود بھی سمجھ نہ سکیں"۔ اس

نے آہستہ سے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ درحقیقت ہم اس سلسلے میں نفسیات کی مدد سے جاننا........ سمجھنا چاہتے ہیں۔ لیکن تم ہم سے دور ہو کر خود کو ہماری مدد سے محروم کر رہے ہو"۔

"میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں"۔ راشد نے جیب سے درخواست نکال کر وی سی کے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر رکھ دی۔ وہ جانتا تھا کہ کاغذات کا وہ ڈھیر بھی اسی سے متعلق ہے۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے وی سی کو دیکھا۔ جیسے اجازت کا خواہاں ہو۔

وائس چانسلر نے ایک آہ بھری' سر اٹھا کر راشد کو دیکھا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا' اس نے راشد کو حیران کر دیا۔ "خدا تمہاری مدد کرے راشد میری دعائیں' میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں"۔

"شکریہ سر!"

○============☆============○

جمعرات کی صبح تک وہ روانگی کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ماں کو فون پر بتا دیا تھا کہ وہ کس گاڑی سے آ رہا ہے۔ چنانچہ عمردراز گاڑی لیے اسٹیشن پر اس کا منتظر تھا۔ اس نے راشد کا سامان ڈکی میں رکھا۔ "کہو عمردراز........ تمہارا کیا حال ہے؟ اور ہاجرہ خالہ کیسی ہیں؟" راشد نے پوچھا۔

"ہم ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم اپنی سناؤ ماسٹر!"

عمردراز بہت پرانا ملازم تھا۔ ہاجرہ اس سے بھی پہلے کی تھی۔ عمردراز نے ان کے ہاں ملازمت کے دوسرے ہی سال ہاجرہ سے شادی کر لی تھی۔ دونوں بے حد مستعد اور نفاست پسند تھے۔ اسی لیے راشد انہیں بہت پسند کرتا تھا۔ دوسری طرف وہ دونوں بھی راشد کو پسند کرتے تھے........ اور شاید اس کی وجہ بھی وہی صفات تھیں۔ وہ اس کی تنہائی پسندی سے بھی واقف تھے........ اور شاید اس کا سبب بھی جانتے تھے۔ گھر میں پارٹیاں کثرت سے ہوتی تھیں۔ ایسے میں ہاجرہ خاموشی سے راشد کا کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیتی تھی۔

"وہ تمہارا دوست کہاں ہے........ مظفر؟" عمردراز نے اچانک پوچھا۔

راشد نے اندازہ لگایا کہ عمردراز حقائق سے بے خبر ہے۔ اس پر اسے حیرت ہوئی۔ کیونکہ عام طور پر ملازمین سے گھر کی کوئی خبر چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے اِدھر اُدھر کی سن کر........ کاغذ کا کوئی پرزہ دیکھ کر سب کچھ جان لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ مظفر کی موت نے ہر شخص کو دہلا دیا ہے کہ کوئی اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ عمردراز کو معلوم نہ ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ وہ تو گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہرحال راشد نے سوچا کہ حقیقت بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ "مظفر کا تو انتقال ہو گیا"۔ اس نے سادگی سے کہا۔

عمردراز کو جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے پر حیرت........ اور پھر دکھ کا تاثر ابھرا۔ راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ عمردراز مظفر کو اتنا زیادہ پسند کرتا ہوگا۔ تاہم عمردراز کے ردعمل سے اسے خوشی ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ عمردراز کو تفتیش کی عادت نہیں ہے۔

گاڑی راشد ہی نے ڈرائیو کی۔ وہ گھر آتا تو اپنا ڈرائیونگ کا شوق ضرور پورا کرتا تھا۔

○============☆============○

اپنے کمرے میں پہنچ کر راشد کو اچانک چکر سے آئے۔ وہ اس کے لیے عجیب سا تجربہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ در و دیوار اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں........ اور اس کا جسم مزاحمت کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جی متلانے لگا اسے ایسے لگا جیسے ابھی قے ہو جائے گی۔ اس نے اپنا منہ سختی سے بھینچا اور گہری گہری سانسیں لیں۔ یہ اس نے بہت پہلے جان لیا تھا کہ سانسیں ہموار کر لی جائیں تو جذبات پر فتح پائی جا سکتی ہے........ آدمی خود کو رونے سے بھی باز رکھ سکتا ہے۔ اس بار بھی سانسوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کا جسم........ اور جسم کے عضلات پرسکون ہو گئے۔ البتہ پیٹ میں گڑبڑ کا احساس بدستور تھا۔ وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گزشتہ چند روز کے دوران وہ کھانے کے معاملے میں بہت بے پرواہ ہو گیا تھا۔

مگر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے فلم سی چلنے لگی۔ وہ کبھی تصوراتی نہیں رہا تھا۔ اس نے خود کو تصوراتی بننے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ فوٹوگرافر تھا۔ جو کچھ حقیقت میں نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا' اسے صرف وہی دکھائی بھی دیتا تھا۔ فوٹوگرافی کی طرف اس کے جھکاؤ کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس کی آنکھ ایک فوٹوگرافر کی تربیت یافتہ آنکھ تھی۔ وہ ان چہروں کو نہیں دیکھتی تھی جو اس کے سامنے نہیں ہوتے تھے۔

لیکن اس لمحے وہ انہونی ہو رہی تھی........ اور وہ کوشش کے باوجود اسے روک نہیں پا رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے اپنا پرانا کتا نظر آیا۔ وہ کتا جو مر گیا تھا۔ پھر اسے ماں کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بانہیں پھیلائے جیسے کسی کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پھر وہی منظر مختلف مقامات کے پس منظر میں اسے نظر آیا۔ کبھی گھر کا ڈرائنگ روم' کبھی ممی کا بیڈروم' کبھی کسی کے گھر ہونے والی کوئی پارٹی........ اور ممی جسے ریسیو کر رہی تھیں' وہ فریم سے باہر تھا۔ لیکن راشد جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ البتہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر اسے مظفر دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سر گھما کر اس سے منہ پھیر رہا تھا........ دیوار کی طرف رخ کر رہا تھا۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں کا تاثر اسے بے حد واضح طور پر نظر آیا۔ وہ آنکھیں کسی زخمی جانور کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ وہ آہستہ سے گھومتا ہوا سر' دیوار کی طرف مڑتا ہوا........ پھر وہ عکس تسلسل کے ساتھ بار بار اسے نظر آتا رہا جیسے ہر بار کوئی اسے ریوائنڈ کر رہا ہو۔ راشد کوشش کے باوجود اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا کہ ان آنکھوں میں اذیت ہے........ شکایت ہے۔ وہ آنکھیں اسے الزام دے رہی تھیں۔ پھر اسے روتی ہوئی ثمینہ

کا چہرہ یاد آیا۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ نفرت جھانک رہی تھی۔ ایک بار پھر مظفر کی نگاہیں ابھریں...... اور اس کے بعد جیسے ہر منظر صاف ہوگیا۔

عمردراز اس کی یہ کیفیت بغور دیکھ رہا تھا' بولا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ چہرہ بالکل سفید ہوگیا ہے"۔

راشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ عمردراز اب مزید کچھ نہیں پوچھے گا۔

O============☆============O

نوید حسن کا مختصر سا گھرانا مثالی خوش حال گھرانا تھا۔ وہ بہت نامور وکیل تھا...... انکم ٹیکس اسپیشلسٹ۔ اس کی پریکٹس بہت کامیاب تھی اور وہ بہت معروف آدمی تھا۔ وکالت کے علاوہ اس نے کچھ اچھی کمپنیوں میں سرمایہ کاری بھی کر رکھی تھی۔ چنانچہ آمدنی بے حد وحساب تھی۔ ہن کا ویسے بھی یہ مزاج ہے کہ برستا ہے تو ٹوٹ کر برستا ہے۔ راشد جانا تھا کہ رات کا کھانا اسے اپنے کمرے میں نہیں ملے گا بلکہ اسے نیچے جانا پڑے گا۔ یہ اصول کی بات تھی۔ اپنی گھر واپسی کی پہلی رات اسے کھانا ڈائننگ ہال مین ہی کھانا پڑتا۔

وہ نہا کر باتھ روم سے نکلا تو عمردراز کو کمرے میں موجود پایا۔

"تمہیں کھانے پر بلایا جارہا ہے"۔ اس نے راشد سے کہا۔

"کون کون ہے؟"

"بیگم صاحبہ اور سلمان صاحب"۔ عمردراز نے جواب دیا۔ "کہو تو جاکر منع کردوں اور تمہارا کھانا اوپر بھجوادوں؟" اس کے لہجے میں شفقت اور تفہیم تھی۔

"نہیں پہلی رات تو مجبوری ہے"۔

"تو پھر چلے آؤ"۔

O============☆============O

راشد نے شلوار کرتا پہنا اور نچلی منزل کی طرف چل دیا۔ ڈائننگ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام سنا تو اندر جانے کے بجائے دروازے پر ہی رک گیا۔ وقت نے اسے ایسے موقعوں پر دروازوں سے کان لگانا سکھا دیا تھا۔

"راشد نیچے آنے ہی والا ہے"۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ "تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟"

"میں کیوں مائنڈ کرنے لگا"۔ یہ سلمان کی آواز تھی۔

"راشد کا ستارہ جدی ہے۔ کہیں یہ سب کچھ اسی وجہ سے تو نہیں۔ سردیوں میں پیدا ہونے والے بچے سردمہر ہوتے ہوں گے"۔

راشد پلٹا اور اسٹڈی میں چلا گیا۔ ڈیڈی کی میز کی دراز سے سگریٹ نکال کر اس نے سلگائی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھار ہی سگریٹ پیتا تھا۔

ممی اور سلمان کا تعلق گزشتہ آٹھ سال سے اس کے علم میں تھا۔ پہلی بار جب اس نے دیکھا تو دھک سے رہ گیا تھا۔ اس روز دنیا کا سب سے قابل احترام رشتہ اس کی نظروں [illegible]قیر ہوگیا تھا لیکن جیسے اس کے سوا کسی کو اس بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بھی بے [illegible]گیا۔ ممی اکثر سلمان کے ساتھ باہر بھی جاتی تھیں۔

سلمان ایک بینک کا نائب صدر تھا۔ ڈیڈی کی اس سے دوستی تھی۔ وہ اسے کافی حد تک [illegible]رتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر تھے...... اور اسکواش بھی ساتھ ہی کھیلتے [illegible]اسے تو ایسا لگتا کہ ڈیڈی بھی سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ان کے اور سلمان کے درمیان [illegible]فاہمت موجود ہے۔ ممکن ہے گھر میں کبھی کوئی جذباتی بحران آیا ہو اور انہوں نے سکون [illegible]ھ کر کوئی تصفیہ کرلیا ہوگا۔ جو کچھ بھی رہا ہو' سامنے کبھی کچھ نہیں آیا تھا۔

تصفیہ تو خود راشد نے بھی کر لیا تھا۔ پہلی آگہی کی اذیت اسے اب بھی یاد تھی۔ اس [illegible]ے لگتا تھا کہ وہ اذیت اسے مار ڈالے گی۔ اور اسی وقت اسے اندازہ ہوا کہ جذبات بڑی [illegible]شے ہوتے ہیں...... دودھاری تلوار کی طرح۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ جذبات کے [illegible]ہی مرے گا۔ چنانچہ بقا کے لیے ضروری تھا کہ جذبات سے اپنا ناتا توڑ لیا جائے۔ خود کو [illegible]ی جذبے میں ملوث ہی نہ کیا جائے۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ کھڑا

وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ سلمان نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی آنکھوں [illegible]دلاہٹ سے راشد کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی حد تک نشے میں ہے۔ ممی نے اٹھ کر یوں [illegible]پھیلائیں' جیسے اس سے بانہوں میں سما جانے کی توقع کر رہی ہوں۔

"واہ...... میرا راشد ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہا ہے"۔

اس نے ممی کی پیشانی پر پیار کیا۔ "میری ممی!"

وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ممی کا استقبال کرنے کا وہ انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔ وہ کسی کا بھی [illegible]ل کرتیں' اسی انداز میں کرتیں۔ وہ راشد ہوتا' سلمان ہوتا' ڈیڈی ہوتے یا کوئی اور۔ ان [illegible]سا یکی رہتا۔ چہرے کا تاثر تک نہ بدلتا۔

"کہو راشد...... ٹینس کیسی جارہی ہے؟" سلمان نے پوچھا۔

"بہت اچھی"۔ راشد نے جواب دیا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہارے ڈیڈی کل شام کی فلائٹ سے واپس آرہے ہیں"۔

راشد نے کوئی جواب نہ دیا۔

"سلمان...... راشد کتنا ہینڈسم ہے۔ ہے نا؟" ممی نے کہا۔ "تم نے اتنا ہینڈسم لڑکا کبھی [illegible]؟"

راشد کو اندازہ تھا کہ وہ دونوں کچھ پریشان ہیں۔ سلمان کچھ نشے میں تھا۔ اس وجہ سے

اس کی بے چینی عیاں تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو صفیہ' لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمہارا بیٹا کہاں سے ہے......... کیسے ہے!" سلمان نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہ میرا بیٹا ہے۔ اتنا خوبصورت' اتنا پرفیکٹ بیٹا کسی ماں کا ہو سکتا ہے......... سوائے میرے؟"

"پرفیکٹ......... اونہہ!" سلمان کا لہجہ خراب ہو گیا۔

راشد کو اندازہ ہو گیا کہ سلمان کو کوئی چیز کاٹ رہی ہے......... کوئی انجانا جذبہ' کوئی دلی تکلیف......... کچھ نہ کچھ تھا ضرور۔

"یہ لڑکا محبت کے قابل نہیں ہے"۔ سلمان نے مزید کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"دیکھو صفیہ' تم میں گرم جوشی ہے......... دردمندی ہے......... زندگی ہے۔ تم ایسے سردمزاج' پتھر جیسے بیٹے کی ماں نہیں ہو سکتیں۔ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہو سکتا"۔

"بس کرو سلمان' راشد بہت خراب وقت گزار کر آیا ہے......... اور یہ گھر میں اس کی پہلی رات ہے"۔

سلمان' راشد کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا گھر میں بند کسی جانور کو دیکھ رہا ہو۔ جواب میں راشد بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"ایک بات بتاؤ"۔ بالآخر راشد نے پوچھا۔ "تم اپنی ماں سے محبت کرتے ہو؟"

راشد نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ "نہیں میرا خیال ہے' مجھے ممی سے محبت نہیں"۔

"اوہ......... میرے خدا!" سلمان نے کہا۔

"آپ نے سوال کیا' میں نے جواب دے دیا"۔

راشد کبھی ایک بار پہلے بھی ممی سے اپنے تعلق کا تجزیہ کر چکا تھا۔ اس نے دوطرفہ دلچسپی کا تجزیہ کیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی حقیقی اور پائیدار جذبہ نہیں تھا۔ اس نے جو جواب دیا تھا' وہ سچا تھا۔ اگرچہ اسے بدتمیزی پر محمول کیا جا سکتا تھا اور وہ طبعاً بدتمیز نہیں تھا۔ وہ ہرگز یہ حقیقت اس طرح نہ اگلتا۔ اس کا کریڈٹ سلمان کو جاتا تھا۔ جس نے اس طرح بلاواسطہ سوال کیا تھا۔ حالانکہ اسے یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ویسے وہ اس کے علاوہ کوئی جواب دیتا تو وہ ممی کے لیے بھی حیران کن ہوتا۔

"تم قاتل ہو......... خونی ہو"۔ سلمان غرایا۔ پھر وہ خاصی کوشش کے بعد کرسی سے اٹھا۔ "صفیہ نے مجھے بتا دیا کہ تم نے یونیورسٹی میں کیا گل کھلایا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے دھچکا پہنچا ہے یہ جان کر"۔

"ممی آزاد ہیں۔ جسے چاہیں' بتادیں"۔ راشد نے سرد لہجے میں کہا۔ اسے یہ سوچ کر

ہ آرہا تھا کہ سلمان کے خیال میں اس کے محسوسات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔

"سلمان......... تم نشے میں ہو۔ مجھے تم کو یہ بات نہیں بتانا چاہیے تھی" ممی نے قدرے لہجے میں کہا۔

"میں نشے میں نہیں ہوں۔ مجھے تکلیف ہوئی ہے"۔ سلمان نے کہا۔ "تم جیسی عورت بیٹا اتنا سفاک......... اتنا سردمزاج......... اتنا بے تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔ راشد......... مجھے بتاؤ اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے؟"

"نہیں......... ذرا بھی نہیں"۔ سلمان نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔ اپ کے نزدیک یہ سب کچھ بے حد ذاتی ہے؟" آپ کا اس سے تعلق ہے؟" راشد نے چھا۔

سلمان پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا......... ڈھیر ہو گیا۔ "راشد......... میرے نزدیک تم ں کی طرح ہو"۔ اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

راشد نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ سلمان کے اپنے بھی دو بیٹے تھے......... اور ہیشہ اس کی توجہ سے محروم رہے تھے۔ ایسے میں پرائے بیٹوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ تاہم نے کہا کچھ نہیں۔ "تم نے جو کچھ کیا' ناقابل معافی ہے"۔ سلمان نے کہا۔ "تم نے اپنے ست کو خود اس کے ہاتھوں مرنے دیا۔ میرے نزدیک تم انسان ہی نہیں رہے"۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" راشد نے بے پروائی سے کہا۔

"مجھے صرف اتنا بتادو کہ تم اپنی ماں سے محبت کرتے ہو؟ زیادہ نہیں' کم سہی۔ بہت ڑی......... برائے نام سہی"۔

"مسٹر سلمان' اگر مجھے اپنی ممی سے برائے نام بھی محبت ہوتی تو تم اب سے آٹھ سال لے میرے ہاتھوں مرچکے ہوتے"۔ راشد نے ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

سلمان کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ الفاظ تھے یا بم کا دھماکا۔ لیکن صفیہ حسن کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مان نے بڑی کوشش کے بعد خود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "صفیہ......... مائنڈ نہ کرنا۔ میری یعت خراب ہو رہی ہے۔ میں کھانے پر تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا"۔

"ٹھیک ہے سلمان' بہتر بھی یہی ہے"۔

"مجھے افسوس ہے راشد' میں تمہارے کسی کام نہیں آسکا۔ تمہارا کوئی مدد نہیں رسکا"۔ سلمان نے جاتے جاتے کہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ راشد نے سلمان کو بے اعتمادی کا شکار دیکھا ورنہ اس گھر میں اس کا یہ مالکانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا۔ دعوتوں کے دوران میں ایسا لگتا کہ میزبان وہ ہے۔ انون کے مذاق پر ہنستا' ان کی خاطر تواضع کرتا۔

وہ سوچتا رہا۔ صفیہ بھی خاموش تھی۔ پھر ہاجرہ نے کھانا میز پر لگا دیا۔

O------------☆------------O

کھانے کے بعد ہاجرہ فروٹ لے آئی۔
صفیہ نے راشد سے پوچھا۔ "بیٹے........ خدا پر تمہارا ایمان ہے؟"
"ہاں' ہے۔ میرا خیال ہے' انسان کو ایمان سے محروم نہیں ہونا چاہیے۔ اور اس کا کو
متبادل بھی نہیں ہوتا"۔
"مولانا نصیر یاد ہیں تمہیں؟"
راشد کو مولانا نصیر یاد تھے۔ ان کا ایک مدرسہ تھا۔ جہاں بچوں کو........ لڑکوں کو د
تعلیم دی جاتی تھی۔ ممی اور ڈیڈی وقتاً فوقتاً مدرسے کی مالی امداد کے ذریعے اپنی اپنی عاقبت
سنوارتے تھے۔ اس طرح ٹیکس کے سلسلے میں بھی بچت ہو جاتی تھی۔ راشد کو باپ کی شخصیت
یہ پہلو بہت برا لگتا تھا۔ خالص کاروباری ذہن........ منافع کی اتنی زیادہ اہمیت۔ اسے لگتا تھا
ڈیڈی نے کسی کاروباری مصلحت ہی کی وجہ سے ممی کی طرف آنکھیں بند کرلی ہیں۔ اسی
انہوں نے سلمان سے بھی ایک طرح کا ذہنی سمجھوتا کر رکھا ہے۔
"جی ہاں........ یاد ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔
"میں تمہیں ان سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے' وہ تمہاری مدد کر سکیں گے"۔
"ممکن ہے"۔
کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کی غرض سے نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جب وہ گھر
نکل رہا تھا تو ممی اسے چھوڑنے دروازے تک آئی تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر نکلنے لگا تو بولیں۔
"ممی کو پپی نہیں کرو گے؟"
اس نے بڑی سعادت مندی سے جھک کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ممی نے اس کا سر
کندھے سے لگا لیا اور بولیں۔ "تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو راشد میں تم سے محبت کرتی
ہوں"۔ پھر ان کے لہجے میں حسرت اتر آئی۔ "راشد........ تم مجھ سے ذرا سی محبت بھی نہیں
کرسکتے؟"
اس نے نرمی سے خود کو چھڑالیا۔ "تکلیف دہ باتیں مت پوچھا کریں ممی!"
اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ سارہ کے گھر کی طرف نکل آیا ہے۔ سارہ اسی علاقے
کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتی تھی۔ وہ ہیروئن بننے کے شوق میں گھر سے بھاگ کر
لاہور چلی آئی تھی۔ فلموں میں اسے چند چھوٹے چھوٹے رول ملے۔ مگر وہ اپنے مزاج کی وجہ
سے کامیاب نہ ہوسکی۔ البتہ ماڈلنگ میں وہ کامیاب رہی۔ وہ بہت حسین اور متناسب الاعضا
لڑکی تھی۔ جب وہ پہلی بار ملے تو سارہ نے اپنے تمام دکھ اسے سنا ڈالے تھے۔ وہ بے حد متلون
مزاج بھی تھی۔ ایک دن کچھ بننا چاہتی اور دوسرے دن کچھ۔ اس کے اندر بڑی ہی بے یقینی
تھی۔ راشد کو اس کا منہ پھٹ ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بہت صاف گو تھی۔

اس وقت شاید اسے سارہ کی ضرورت تھی' تنہائی بہت زیادہ کھل رہی تھی۔
اس نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ سارہ نے پوچھا۔ "کون ہے؟" مگر جواب کا انتظار کیے بغیر
ی دروازہ کھول دیا۔ راشد کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔ "ارے........ یہ تم ہو راشد' کب آئے
تم؟"
"آج ہی آیا ہوں"۔ راشد نے جواب دیا۔
وہ اسے اندر لے آئی۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ میری
ضرورت ہی تمہیں یہاں تک لے آئی ہے"۔
"ٹھیک سمجھیں"۔
وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ "کچھ پیو گی؟"
"ہاں چائے پلا دو"۔
وہ اس کے لیے چائے بنا لائی۔ پھر قریب بیٹھ کر اسے چائے پیتے دیکھتی رہی۔ "مجھے
ماری آمد سے خوشی ہوئی۔ تم بہت خوبصورت آدمی ہو........ اور میں خوبصورتی کو ترس رہی
ل کب سے"۔
"اچھا"۔ راشد نے پیالی خالی کرکے میز پر رکھ دی۔
"روشنی بری لگ رہی ہے نا؟" سارہ نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر لائٹ
ف کر دی۔
وہ سارہ کے پاس بارہا آچکا تھا۔ اس تعلق کی سب سے بڑی خوبی اسے یہ لگتی تھی کہ
ں میں جذبات کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک حقیقت پسندانہ تعلق تھا........ ضرورت کا
ق۔ البتہ سارہ جو جذبات شامل کرتی تھی' وہ اوپری ہوتے تھے........ اور یہ اس کے بزنس کا
ا تھا۔ اسی لیے وہ جذبات راشد کو برے نہیں لگتے تھے۔ البتہ ایک بات وہ سچائی سے کہتی
.... وہ یہ کہ وہ اتنے لوگوں سے ملی ہے مگر آج تک اسے راشد سے اچھا کوئی نہیں ملا۔
ند جانتا تھا کہ سارہ اس سے ڈرتی بھی ہے۔ شاید اس کی مردانہ وجاہت سے۔ مرد اگر اپنی
ات پر مکمل ہو تو عورت اس سے از خود ڈرنے لگتی ہے۔ سارہ بھی راشد سے ڈرتی تھی۔
"راشد........ کیا سوچ رہے ہو؟"
"کچھ بھی نہیں۔ میں سوچتا کب ہوں۔ سوچنے والا آدمی ہی نہیں ہوں میں"۔
"میں تمہیں سکون دے سکتی ہوں؟" سارہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
"میں پرسکون ہوں"۔
سارہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو چھوا۔ "راشد........ تم مجھ سے محبت کرتے ہو
"نہیں"۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

راشد کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا۔ "میرا خیال ہے نہیں"۔

"لیکن انسان محبت کے بغیر زندہ نہیں رہتا"۔

"مجھے تو محبت ایک فضول سی چیز لگتی ہے"۔

"تم سے محبت کرنا ایک لاحاصل عمل ہے"۔ سارہ جھنجلا گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جھنجلائی تھی۔

"آئی ایم سوری"۔ راشد نے کہا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہاری قربت مجھے اچھی لگتی ہے"۔

"لیکن تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"کیوں؟" سارہ نے پوچھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ لیکن جواب نہیں ملتا تھا۔

"راشد......... ایک نہ ایک دن تم کسی سے شادی کرو گے"۔ تھک ہار کر وہ ہی بولی۔

"کیوں کروں گا؟"

"کیونکہ سب کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ مگر اپنی بیوی سے محبت نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ محبت تمہارے خمیر ہی میں نہیں ہے۔ بہرحال......... کبھی نہ کبھی کوئی لڑکی تمہاری طرف بڑھے گی۔ تم سے کہے گی کہ تم اس سے شادی کرلو۔ تو پہلے میں ہی کیوں نہ کہہ دوں"۔ سارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھ سے شادی کرلو راشد پلیز......... پلیز......... پلیز........."

"تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن ہر لمحہ میرے دل سے تمہارے لیے دعا نکلتی ہے۔ یہ وہ انسانی جذبہ ہے راشد' جسے لوگ محبت کہتے ہیں کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے؟"

راشد چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ "نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا"۔ سارہ نے اپنا چہرہ تکیے میں چھپا لیا۔ راشد کھڑا ہوگیا۔ "سنو سارہ محبت ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ محبت میں آدمی اپنے لیے دکھنے کا......... چوٹ کھانے کا سامان کرتا ہے"۔

"کیسی چوٹ؟ کیسا دکھ؟" سارہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "اوہ راشد......... تمہیں محبت نے بہت دکھ پہنچائے ہیں؟ بہت زخم دیئے ہیں"۔ اس نے راشد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

راشد تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ "مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے محبت کبھی دکھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ میں نے یہ راز پہلے ہی جان لیا تھا۔ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں۔ دکھ کیا ملتا"۔

"تم جا رہے ہو؟" سارہ نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں' جانا تو ہے"۔

"پھر آؤ گے؟" سارہ کے لہجے میں خوف تھا۔

"ضرور"۔ راشد نے ہموار لہجے میں کہا۔ "گڈ نائٹ"۔ پھر وہ فلیٹ سے نکل آیا۔

O==========☆==========O

صبح ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ وہ ایک غیر تحریری ضابطہ تھا۔ کھانا ساتھ کھایا جائے یا نہ کھایا جائے' ناشتا بہرحال ساتھ کیا جاتا تھا......... ٹھیک آٹھ بجے۔ ناشتے کی میز پر خاموشی رہی۔ ممی اس سے نظریں چراتی رہیں۔

ناشتے کے بعد اس نے پرس جیب میں ڈال اور ٹہلتا ہوا اس پیٹ شاپ کی طرف چل دیا۔ جو گھر سے کچھ دور تھی۔ سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں ٹفن کیریئر بھی تھے۔ ہر شخص جلدی میں معلوم ہوتا تھا لیکن راشد کو ہر چہرہ نقاب جیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مضامین میں نفسیات کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ وہ نقابوں کے پیچھے چھپے اصل چہرے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے چہرے دیکھنے میں بڑی دلچسپی تھی۔

پیٹ شاپ میں زیادہ تر پرندے تھے۔ لیکن ایک کینل میں اچھی نسل کے چھوٹے چھوٹے پلے بھی تھے۔ وہ بہت صحت مند لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ اس نے شاپ کے مالک سے بات کی اور پلوں کو بغور دیکھتا رہا۔ ایک کوکر اسپینیل اسے بہت اچھا لگا۔ وہ تین ماہ کا رہا ہوگا۔ اس کی براؤن آنکھوں سے ذہانت ہویدا تھی اور کھلنڈرا بھی معلوم ہو رہا تھا۔ شاپ کے مالک نے اسے یقین دلایا کہ اس کا انتخاب بہترین ہے۔

اس نے قیمت ادا کی۔ دکاندار نے پٹا اور زنجیر تحفتاً پیش کی شاید پلے کی قیمت اس نے زیادہ ہی وصول کرلی تھی۔ لیکن پلے کو پٹا پسند نہیں آرہا تھا۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی۔ لیکن بالآخر راشد اسے باندھنے میں کامیاب ہوگیا۔

جیسے ہی وہ پلے کو لے کر سڑک پر آیا۔ پلا بری طرح خوفزدہ ہوگیا اور اکڑ کر بیٹھ گیا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سڑک پر چلا تھا۔ بھیڑ بھاڑ اور ٹریفک کا شور اس کے لیے باعث دہشت ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے قریب سے گزرتی ہوئی ٹانگوں اور پیروں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتا اور سمٹ جاتا۔ راشد نے اس عالم میں اس کی چند تصویریں لیں۔ پلا دکان میں واپس جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس کے خود چلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ راشد کو اسے گھسیٹ کر گھر تک لے جانا پڑا۔

راشد کو مدتوں سے ایک اچھا کتا پالنے کی آرزو تھی۔ پچھلے کتے کی موت کے بعد سے یہ تڑپ اس کے اندر موجود تھی۔ پچھلے کتے کے اور اس کے درمیان محبت اور اعتبار کا ایک عجیب تعلق موجود تھا جس سے وہ کتے کی موت کے بعد محروم ہوگیا تھا۔ اسے وہ تعلق بے حد عجیب لگتا لیکن وہ کوشش کے باوجود کبھی اسے جھٹک نہیں سکا......... اس سے پیچھا نہیں چھڑا

سکا۔ یہ خیال برسوں اس کے ذہن سے چپکا رہا۔ وہ اپنی جذباتیت پر خود بھی ہنستا.......... اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ لیکن اس سے فرق کچھ بھی نہیں پڑتا۔ کتے کی موت کے فوراً بعد اس نے یہ وتیرہ بنا لیا کہ بڑی بہادری اور بے رحمی سے کتے کی موت کو مزاحیہ پیرائے میں بیان کرتا۔ لیکن اس کے اندر کی فضا پر جو سوگ طاری تھا' اس کی سنگینی کم نہ ہوئی۔ وہ ایک اور کتے کی آرزو کرنے لگا۔

اس نے اپنی اس کمزوری کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اداسی جو کتے کی موت کا نتیجہ تھی' برسوں بعد بھی قائم رہی۔ اور وہ بھی تجزیے کی کوشش میں لگا رہا۔ وہ ہر جذباتی تعلق کو اپنے ذہن میں واضح دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان کوئی گڑبڑ.......... کوئی فرق ضرور ہے۔ کتے کی محبت پر وہ اعتبار کر سکتا تھا۔ وہ کئی بار یہ بات کہہ چکا تھا کہ وہ انسانوں پر جانوروں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے اس کا تجزیہ بھی کیا۔ درحقیقت کتا اس کی محبت سے بے نیاز تھا۔ وہ کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ وہ راشد کے آگے پیچھے پھرتا۔ اچھل کر اس کی گود میں چڑھ جاتا۔ وہ زبان سے اس کا جسم چاٹتا۔ کتے نے کبھی اپنی محبت اس سے چھپائی نہیں تھی۔ نہ کبھی اسے اس پر غصہ آیا تھا نہ اس نے کبھی اس سے نفرت کی تھی.......... اور نہ ہی کبھی منہ پھیرا تھا۔ اس نے کبھی بے وفائی بھی نہیں کی تھی۔ وہ غیر مشروط طور پر اس کا وفادار تھا.......... اور اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت میں سرد مہری تھی نہ دوری' نہ کوئی اذیت' کبھی کبھی وہ اسے زیادہ توجہ اور محبت دے کر بگاڑ دیتا۔ مگر ذرا سی دیر میں وہ بگاڑ دور ہو جاتا۔ ایک ہلکی سی ڈپٹ.......... یا ہلکا سا دھپ اسے سیدھا کر دیتا۔ کتا پھر محتاط ہو جاتا۔ لوگوں سے محبت میں یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ گھر پہنچا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ کتے کو اپنے کمرے میں لے گیا اور فوراً ہی اس کی تربیت شروع کر دی۔ اس نے کتے کا نام ٹامی رکھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے بسکٹ کا ایک ڈبا اور گوشت خریدا تھا۔ اوپر آنے سے پہلے اس نے گوشت ہاجرہ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے ابال دے۔

پہلے اس نے پلے سے سخت گفتگو کی ڈانٹا۔ پھر اخبار کا رول بنا کر اس کی ہلکی ہلکی پٹائی کی۔ وہ کتے کو نروس کرنا چاہتا تھا.......... اور ذرا ہی دیر میں وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ٹامی خوفزدہ ہوا تو اس کے اندر اپنے آقا کو خوش کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اب بس اس کی رہنمائی باقی تھی۔ ٹامی اس کے اشاروں کے مطابق ردعمل ظاہر کرنے لگا۔ جلد ہی وہ اپنے نام سے آشنا ہو گیا۔

شام تک وہ تربیتی کورس چلتا رہا۔ راشد نے ٹامی کو ساکٹ میں سے پلگ نکالنا سکھا دیا۔ راشد انعام کے طور پر اسے بسکٹ یا ابلے ہوئے گوشت کی ایک بوٹی دیتا۔ ایسے میں ننھا پلا اسے ممنونیت اور محبت سے دیکھتا۔ اس کے انداز میں والہانہ پن تھا۔

شام تک ٹامی نے سیکھ لیا کہ آقا کو کس طرح خوش کیا.......... اور خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کس طرح انعام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب وہ احکامات کو سمجھنے اور ان کے مطابق ردعمل ظاہر کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ شروع میں پلا' ٹامی ' اور 'بیٹھو' میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ مگر رول کیے ہوئے اخبار کی چند ضربوں نے وہ کنفیوژن بھی دور کر دیا۔ شام تک ٹامی تھک گیا.......... اور اونگھنے لگا۔

ساڑھے پانچ بجے ہاجرہ چائے اور بسکٹ لے آئی۔ اس رات بھی گھر میں دعوت تھی۔ ممی نے اسے بتا دیا تھا۔ حسب معمول اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کھانا اپنے کمرے میں کھائے گا۔ ممی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھیں۔

دعوتوں کا یہ سلسلہ تو مدت سے چل رہا تھا۔ اور وہ لڑکپن ہی سے ان سے گریزاں رہا۔ اسے لوگوں میں گھلنا ملنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ تقریباً تمام لوگ اوپری دل سے ملتے تھے اور سطحی گفتگو کرتے تھے۔ دعوت میں شریک ہونے کا جواز سب کے پاس موجود تھا اور عموماً وہ جواز کاروباری ہوتا۔ ایسی دعوتوں میں تعلقات بنتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو اپنے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے.......... اور کہیں نہ کہیں خود بھی استعمال ہو جاتے تھے۔

راشد کو معلوم تھا کہ آج کی دعوت میں ڈیڈی شریک نہیں ہوں گے۔ میزبانی کے فرائض سلمان اور ممی مل کر انجام دیں گے۔ ڈیڈی کو ساڑھے نو بجے کی فلائٹ سے آنا تھا۔ گویا گھر پہنچتے پہنچتے انہیں دس بج جاتے۔ بشرطیکہ فلائٹ وقت پر پہنچتی' جس کا امکان کم ہی تھا۔

راشد نے کھانا اپنے کمرے میں ہی کھایا۔ پھر وہ موسیقی کا کیسٹ لگا کر سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ کھڑکی میں کھڑا ہوا۔ پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ اجالے کے پیش منظر میں ننھی منی بوندیں چاندی کے تاروں جیسی لگ رہی تھیں۔ سیاہ سڑک یوں چمک رہی تھی جیسے اس کے اوپر شیشہ بچھا دیا گیا ہو۔ پھر اس کی پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ اس نے ٹامی کو جگایا اور چہل قدمی کے لیے چل دیا۔ پارٹی سے بچنے کے لیے وہ عقبی دروازے سے نکلا۔ تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ ٹامی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ راہ میں ایستادہ درخت بارش میں دھل کر چمکدار ہو گئے تھے۔ قریب سے بھری ہوئی ٹیکسیاں گزر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والا کوئی نہیں تھا۔

جب اسے اندازہ ہوا کہ ٹامی تھک گیا ہے تو گھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس نے ٹامی کو گود میں اٹھا لیا۔ کیونکہ ٹامی سے اب چلا نہیں جا رہا تھا۔ ٹامی اس کے سینے سے لگا کپکپاتا رہا۔ گھر پہنچ کر اس نے ٹامی کو خشک کیا اور خود بھی گرم پانی سے نہایا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور ٹامی کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے تھامس مین کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ ٹونیو کروگر نامی کہانی اسے اچھی لگی۔ اسے خود فوٹوگرافی سے عشق تھا۔ لیکن اس نے کبھی خود کو آرٹسٹ نہیں سمجھا تھا۔ کہانی کا مرکزی کردار کروگر ایسا ہی شخص تھا جسے فوٹوگرافی سے عشق تھا۔ اس عشق پر کئی برس صرف کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس چکر میں وہ ان لوگوں سے دور ہو گیا ہے' جن سے محبت کرتا تھا۔ انہیں گنوا بیٹھا ہے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے تڑپنے لگا۔ پھر راشد کہانی کے اس موڑ پر پہنچا جہاں کروگر نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹوٹے ہوئے تعلقات دوبارہ استوار کرنے کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہے.......... ہر چیز سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ وہاں تک پڑھنے کے بعد کہانی میں راشد کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کے لیے یہ حماقت ناقابل یقین تھی کہ ایک ایسا شخص جو ایک فن میں کمال حاصل کرنے والا ہے' محض لوگوں سے ملنے کی آرزو میں اس فن کو لات بھی مار سکتا ہے۔ تھامس مین نے ایک تنہائی زدہ شخص کو لفظوں میں پینٹ کیا تھا۔ اور اس صورت میں راشد کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے نزدیک تنہائی انسان کے لیے قوت کا منبع تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص خود کو تنہا سمجھ کر خود رحمی میں مبتلا ہو جائے تو وہ کمزوری بن جاتی تھی۔ اور ایسے جذبے کو عظیم ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس نے کہانی ختم کی ہی تھی کہ راہ داری میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈیڈی آ رہے ہیں۔ ڈیڈی پہلے ہی جیسے تھے۔ خوبرو' باوقار اور خوش لباس۔ لیکن وہ ڈیڈی کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ ان کی سلمان سے دوستی تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا' اس کی انہیں کچھ پروا بھی نہیں تھی لیکن ان کا اپنا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ہر سال ڈیڑھ دو مہینے کے لیے وہ کہیں غائب ہو جاتے.......... اور اس کا تعلق کام سے نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کا عرصہ تفریح تھا۔ راشد کو شک تھا کہ اس عرصے میں وہ بھی رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اسے احساس تھا کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن اسے کسی کمی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

"ہیلو ڈیڈی!" اس نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ "پارٹی ختم ہوئی یا نہیں؟"

"پارٹی! مجھے تو نیچے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ تمہاری ممی اپنے کمرے میں جا چکی ہیں۔ میری فلائٹ ڈیڑھ گھنٹا لیٹ تھی"۔ نوید حسن نے جیب سے ایک خط نکال کر بیٹے کی طرف بڑھایا۔ "یہ پڑھ لو"

راشد نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ لفافے پر یونیورسٹی پوسٹ آفس کی مہر تھی۔ خط وائس چانسلر کے لیٹر پیڈ پر تحریر کیا گیا تھا۔

ڈیئر مسٹر حسن

آپ کے بیٹے کی تحریری درخواست ہمارے پاس ہے جس میں اس نے یونیورسٹی چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اس سلسلے میں آپ سے اجازت لے لی

ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ چکا ہے.......... اور ہمیں امید ہے کہ اب تک بخیریت گھر پہنچ چکا ہو گا۔

یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کے اس فیصلے کا تعلق اس کے روم میٹ اور دوست مظفر ملک کی موت سے ہے۔ آپ کو یقیناً علم ہو گا کہ آپ کے بیٹے نے اتوار کی شام ساڑھے چار بجے پولیس کی مدد طلب کی تھی۔ پولیس والے آئے تو انہوں نے آپ کے بیٹے کو کمرے میں پایا۔ اس کا ساتھی مظفر ملک اس وقت تک مر چکا تھا۔ اس نے بلیڈ سے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لی تھیں۔ آپ کے بیٹے نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ مظفر ملک نے خودکشی سے پہلے اپنا ارادہ اس پر ظاہر کیا تھا۔ لیکن اس نے اس کی حوصلہ شکنی کی نہ حوصلہ افزائی۔ بلکہ جس دوران میں مظفر نے اپنی کلائیں کاٹیں وہ اسی کمرے میں موجود مطالعہ کرتا رہا۔ پولیس کے استفسار پر آپ کے بیٹے نے کئی بار یہ کہا کہ مظفر آزاد انسان تھا۔ اور اسے اپنے بارے میں آزادی سے فیصلہ اور اس پر عمل درآمد کرنے کا حق تھا۔ اور یہ کہ اسے مظفر کو باز رکھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

یونیورسٹی میں آپ کے بیٹے کی تعلیم اور کھیل کے میدان میں کارکردگی کا ریکارڈ نہایت اعلیٰ رہا ہے وہ اپنے ساتھی طلبا میں مقبول بھی ہے۔ ہم اس ہونہار طالب علم سے تعلق توڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ واپس آنے کا خواہاں ہو تو ہمیں خوشی ہو گی۔ لیکن اس نے ہمارے ماہر نفسیات ڈاکٹر حشمت کو زیادہ وقت نہیں دیا کہ وہ اس کا کیس سمجھ سکتے۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ آپ کے بیٹے کو کسی ماہر نفسیات کی رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہے۔

اگر آپ کو اس سلسلے میں معلومات درکار ہوں اور آپ یہاں آ سکیں تو ہمیں آپ کی مدد کر کے مسرت ہو گی۔ پولیس رپورٹ اور اس ناخوشگوار واقعے کے سلسلے میں مکمل ریکارڈ آپ کو دکھایا جا سکتا ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

راحت وسیم وائس چانسلر

"تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟" نوید حسن نے بیٹے سے پوچھا اور اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔ راشد کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے انہیں کبھی یوں ڈھیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

"آپ کیسے ہیں ڈیڈی؟" اس نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"آپ کا سفر کیسا رہا؟"

"بہت اچھا"۔ انہوں نے جواب دیا۔ "سنو راشد.......... قانونی طور پر تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ لہٰذا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔

"اور قانون سے ہٹ کر؟"

"میرا خیال ہے' تم نے شوپنہار کو بکثرت پڑھا ہے؟"

"جی ہاں"۔ راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں وجود کے بارے میں تم جس طرز عمل کا اظہار کر رہے ہو' وہ حقیقی نہیں ہے اور لوگوں نے اس سلسلے میں سوچا ہے.......... اور اسے اختیار بھی کیا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ان افکار کو آزمانے کا حق ہے۔ جو تمہارے خیال میں اس قابل ہیں"۔

راشد ٹامی کے کان سہلاتا رہا۔ ٹامی سو چکا تھا۔ "کیا آپ کے خیال میں مجھے کسی ماہر نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے؟"

"جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ تمہیں برے اور بھلے کی تمیز نہیں ہے' قانونی طور پر تم ہوش مند انسان ہو۔ یہ ہوش مندی کی بے حد غیر معقول تعریف ہے۔ تمہارا نقطہ نظر یہ ہے کہ تمہیں اسے خودکشی سے روکنے کا حق نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اس حق کا علم نہیں تھا۔ لیکن اس سلسلے میں ایک عام جذباتی آدمی کا نقطہ نظر یقینی طور پر یہی ہوگا کہ تم غلطی پر تھے۔ تم سے اخلاقی جرم سرزد ہوا"۔

راشد کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنا سوال دہرایا۔ "مجھے ماہر نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

"میرے خیال میں ہر شخص کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم چاہو تو مل لو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں"۔

"اب یونیورسٹی تو تم چھوڑ چکے۔ آگے کیا ارادہ ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ فی الوقت میرا کوئی ارادہ نہیں"۔

"ٹھیک ہے۔ سکون سے رہو اور سوچو۔ میرے ساتھ اسکواش کھیلو۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں گا"۔ نوید حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اوکے ڈیڈی!"

"یہ کتا کہاں سے آیا؟" انہوں نے ٹامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج صبح ہی خریدا ہے"۔

"اچھا بیٹے.......... گڈنائٹ"۔

O============☆============O

ڈیڈی نے اسے کلب میں مدعو کیا تھا۔ انہون نے اسے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ ان لوگوں نے خوش مزاجی سے اس سے رسمی گفتگو کی اور پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ ان کا پسندیدہ موضوع کاروبار تھا۔ راشد جانتا تھا کہ وہ اس سے کیا توقع کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی باتیں توجہ سے سنے اور کاروباری اسرار و رموز سمجھے۔

اس نے ڈیڈی کو دوسروں سے بات چیت کرتے بھی دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ جن لوگوں سے اس کے ڈیڈی کا کاروباری تعلق ہوتا ہے' وہ انہیں آرپار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں ان کی کمزوریاں ذرا دیر میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کب کون اپنے موقف پر ابتدا میں سختی سے ڈٹنے کے بعد اچانک پسپا ہو جائے گا۔ اور کون غلطی پر ہونے کے باوجود اڑا رہے گا۔ کس پر بچوں کی طرح قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ ان کے لیے بے حد سادہ و آساں تھا.......... ریاضی کے سوالوں کی طرح۔

پھر وہ اسکواش کھیلنے چلے گئے۔ راشد نے نوید حسن کو ایک پوائنٹ بھی نہیں لینے دیا۔ نوید حسن پورے کورٹ میں دوڑتے رہے۔ یہ نہیں کہ کھیل کے.......... اور تکنیک کے اعتبار سے وہ کمزور ہوں۔ لیکن راشد تو ناممکن قسم کی ریٹرن بھی بڑے آرام سے دے رہا تھا۔ انہوں نے کھیل شروع کرنے سے پہلے راشد سے کہہ دیا تھا کہ وہ یقینی طور پر جیتیں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے پہلے گیم میں اپنی تمام مہارت اور تجربہ اور تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ انہوں نے بہت خوبصورت ڈراپ شاٹ کھیلے لیکن راشد کے پاس جیسے ہر شاٹ کا جواب تھا۔ راشد اتنی آسانی سے اور اتنے وقار سے کھیل رہا تھا کہ اسکواش جیسا سخت کھیل بھی آسان نظر آرہا تھا۔

پھر نوید حسن نے چیلنج کیا کہ وہ کم از کم ایک پوائنٹ ضرور لیں گے۔ مگر سرتوڑ کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ راشد کو اس سے غرض نہیں تھی کہ اس کے مقابل کون ہے۔ کھیل کی حرمت کے علاوہ کھیل کے دوران میں اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ اسے ایک لمحے کو بھی خیال نہ آیا کہ اس کا باپ اب بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کو اس سے بہتر کھیلنا چاہیے۔

کھیل کے اختتام پر نوید حسن نے کہا۔ "اچھی ایکسرسائز ہو گئی۔ ہمیں کھیلتے رہنا چاہیے"۔

وہ باہر نکلے۔ نوید حسن کو حیرت تھی کہ راشد نہ تو پسینے میں نہایا ہوا تھا اور نہ ہی اس کی سانسیں خفیف سی بھی ناہموار تھیں۔

راشد نے اس کے بعد کبھی ان کے ساتھ اسکوائش نہیں کھیلی تاہم وہ ہفتے میں کم از کم تین دن کلب ضرور جاتا اور دو تین گھنٹے ورزش کرتا۔ لیکن ٹینس یا اسکواش کے لیے اسے پارٹنر مشکل ہی سے ملتا تھا۔

منگل کو مولانا نصیر سے ملاقات ہوئی۔ مولانا بڑے نرم خو اور بے حد نرم گفتار تھے۔ ان کی شخصیت ذہن پر بے حد خوشگوار اثر مرتب کرتی تھی۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مولانا نے کہا۔ "بیٹے.......... یونیورسٹی میں تمہارے ساتھی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا' اس کے متعلق تمہاری ماں نے مجھے بتایا ہے۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم تمہاری

پوزیشن سمجھتے ہیں۔ خوف ایک فطری چیز ہے۔ بعض اوقات بڑے مضبوط لوگ بھی خوف کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ اور خوف انسان کو مفلوج کر دیتا ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ مگر تمہیں موقع ہی نہیں ملا۔ خوف نے تمہیں کچھ کرنے نہیں دیا۔ تم ویسے بھی نوجوان ہو۔ یہ ملعون تو پختہ لوگوں کو بھی لرزا دیتا ہے۔ لیکن بیٹے' میں ایک چیز یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف کی طرح محسوس کرنا چاہیے۔ انہیں اس سے بچانے کی...... ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اگر وہ کوئی غلطی کریں تو انہیں ٹوکو۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ خدا کے فضل وکرم سے تم مسلمان پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں خدا کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کرو۔ نماز قائم کرو پھر کوئی خوف تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا"۔ مولانا یہ سب کہہ کر بہت پرسکون ہو گئے۔

راشد کو وہ بہت اچھے لگے۔ انہوں نے جو کچھ کہنا تھا' اس کے لیے وہ تیاری کرکے آئے تھے۔ اور وہ سچ مچ اسے اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ لیکن دوسروں کی طرح صرف ظاہری طور نہیں۔ وہ اپنے طور پر اس کی احساس جرم کے لیے مرہم لے کر آئے تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ خود نہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا اور نہ ہی اسے کوئی احساس جرم تھا۔

راشد انہیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ "راشد...... تم کبھی ہمارے مدرسے میں بھی آؤ۔ وہاں تم جیسے نوجوانوں کی تعداد بھی کم نہیں"۔ مولانا نے کہا۔

"جی حضرت...... میں ضرور آؤں گا"۔

مولانا نے اس سے ہاتھ ملایا اور سلام کرکے رخصت ہو گئے۔

O==========☆==========O

سمیرا کا خط جمعرات کی شام کو موصول ہوا۔ راشد کہیں گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو وہ خط اسے اپنے کمرے میں میز پر رکھا ملا۔ خط پر یونیورسٹی کا پتا لکھا تھا۔ یونیورسٹی والوں نے وہ پتا کاٹ کر اس کی جگہ اس کے گھر کا پتا لکھ دیا تھا۔

اس نے خط کھول کر پڑھا۔

"مسٹر راشد نوید!"

مجھے تم سے نفرت ہے۔ میرا بھائی مظفر اچھا لڑکا تھا...... خوش مزاج۔ اسے لمبی عمر گزارنے کا حق تھا۔ اسے بہت عرصے جینا تھا۔ لیکن وہ یقیناً" شیطانی صحبت اور اثرات کا شکار ہوا ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم شیطان ہو۔ جو شخص اپنی موجودگی میں اپنے عزیز ترین دوست کو کلائیاں کاٹنے دے...... اسے سست روی سے قدم قدم موت کی طرف بڑھتا دیکھے...... اور کچھ نہ کرے' وہ شیطان ہی ہو سکتا ہے...... برائی کا نمائندہ!

مجھے امید ہے کہ اس کی اذیت ناک یاد کبھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے' وہ تمہیں تباہ وبرباد کرکے رکھ دے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم تا ابد جہنم

کی آگ میں جلو گے"۔

سمیرا ملک

راشد نے خط تہ کرکے لفافے میں رکھا اور لفافہ میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے ٹامی کو گود میں اٹھایا اور اسے اگلا سبق دینے لگا۔ ٹامی بہت تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھ گیا تھا۔ وہ راشد کو خوش کرنے اور انعام میں بسکٹ جیتنے کا شدت سے خواہاں تھا۔ راشد نے دو گھنٹے ٹامی پر صرف کیے۔ پھر سمیرا کا خط دوبارہ پڑھا۔ پھر اس نے میز کی دراز سے میرا [illegible] تصو[illegible] نکالی جو مظفر کے سامان سے نکلی تھی۔ وہ دیر تک خط اور تصویر سامنے رکھے نہیں دیکھتا رہا جیسے تحریر اور چہرے کے نقوش کو یکجا کر رہا ہو۔

اس رات اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مظفر کے گھر والوں کو قریب سے دیکھنا' انہیں جاننا چاہتا ہے۔ لفافے پر سمیرا کا پتا درج تھا۔ خط مری سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ یہ سال کا وہ حصہ تھا جب مری کا ماحول اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہاں عام طور پر بڑے لوگوں کو ہجوم رہتا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جانتے تھے کہ مری میں خوشگوار ترین وقت ماہ اگست ہی ہوتا ہے۔ تاہم وہاں جون جولائی جیسی بھیڑ نہیں ہوگی۔

اس نے سوچا' اپنی اصلیت چھپانا کچھ دشوار نہیں ہوگا۔ اب اسے صرف تفصیلات اور جزئیات طے کرنا تھیں۔

لیکن اس کی سمجھ میں اپنی اس خواہش کا جواز نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمیرا کی طرف اس طرح کیوں کھنچ رہا ہے' یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پہلی بار...... زندگی میں پہلی بار وہ بغیر سوچے بوجھے اپنی کسی خواہش پر عمل کر رہا تھا۔

سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنا بینک اکاؤنٹ مری کے بینک میں منتقل کروا دیا۔ وہ اب خرچ سے کچھ زیادہ رقم نہیں بچاتا رہا تھا۔ لیکن ایک سال پہلے بانڈ کے ذریعے اس کا ایک لاکھ روپے کا انعام نکلا تھا۔ اس میں سے اس نے کچھ خرچ نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ ٹامی کے لیے ایک سوٹ کیس میں سوراخ کیے تاکہ ہوا کا بندوبست رہے۔ پھر وہ مری کے لیے روانہ ہو گیا۔

مری میں اختر ملک کا بنگلہ اس حصے میں تھا جہاں ہر سال موسم گرما میں تفریح کی غرض سے آنے والوں کے بے شمار بنگلے تھے۔ اس علاقے میں ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل بھی تھا۔ مری پہنچتے ہی راشد نے اس ہوٹل کا رخ کیا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے نیچے ایک عام سے ہوٹل میں سستا سا کمرا لے لیا۔ اسے اپنی شخصیت بھی تو چھپانا تھی۔ اس نے اپنا راشد حسن لکھوایا

ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد اس نے ٹامی کو لیا اور ٹہلتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں اختر ملک کا بنگلہ تھا۔ وہ بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ بنگلے کے گیٹ پر اختر ملک کی نیم پلیٹ لگی

تھی۔ تمام بنگلے تقریباً ایک جیسے تھے۔ اندر دیوار کے ساتھ درخت لگے تھے۔

ایک چکر لگانے کے بعد وہ قریبی ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل کے ریستوران میں اس نے چائے پی۔ پھر کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے گفتگو کی۔ وہ شخص ہوٹل کا مالک تھا۔ اس کا نام رزاق خان تھا۔ باتوں ہی باتوں میں راشد نے اسے بتایا کہ وہ طالب علم ہے اور تفریح کی غرض سے آیا ہے۔

"کچھ عرصے کے لیے کوئی کام مل سکتا ہے؟" راشد نے پوچھا۔

"اب تو سیزن ختم ہی ہونے والا ہے۔ بہرحال کام مل سکتا ہے۔ گھڑسواری آتی ہے تمہیں؟" رزاق خان نے پوچھا۔

"جی ہاں، مگر کام کی نوعیت کیا ہوگی؟"

"پہلے تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تمہیں گھڑسواری آتی ہے"۔ رزاق خان نے کہا۔ پھر وضاحت کی۔ "صاحب لوگوں کے بیٹے بیٹیاں گھڑسواری کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انہیں گھوڑے اور گھڑسوار فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بیشتر کو گھڑسواری نہیں آتی"۔

راشد کو خاصی مایوسی ہوئی۔ رزاق خان کو اس کے چہرے سے اس کی مایوسی کا اندازہ ہوگیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "ہم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ رہائش اور کھانا الگ.......... ہوٹل کی طرف سے"۔

"یہ بات نہیں"۔

"اور کام بڑا دلچسپ ہے"۔ رزاق خان نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ "تم خوبصورت ہو۔ اسی لیے تو میں تم کو رکھ رہا ہوں"۔

"کیا مطلب؟" راشد سے اپنی حیرانی چھپائی نہیں گئی۔

"یہ صاحبوں کا لڑکی لوگ شہری ہوتے ہیں نا۔ بہت آزاد ہوتے ہیں۔ گھڑسواری سے زیادہ گھڑسوار میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے پاس ایک مقامی لڑکا ہے.......... بہت خوبصورت ہے وہ۔ شمشیر نام ہے۔ شہر کے کالج میں پڑھتا ہے۔ ہر سال گرمیوں میں یہاں آتا ہے تو میرے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے چکر چلتے ہیں۔ لڑکیوں سے دوستی ہو جاتی ہے۔ پیسے الگ۔ مجھے بھی فائدہ ہوتا ہے"۔

راشد کو اچانک کام میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سوچا، اس طرح سمیرا ملک کو قریب سے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ وہ بھی یقیناً یہاں آتی ہوں گی۔ پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔ "بنگلے والے بھی آتے ہیں یہاں گھڑسواری کے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں.......... کبھی آتے ہیں۔ مگر اس وقت بیشتر بنگلے خالی پڑے ہیں"۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے معاوضہ کیا ملے گا؟"

"پہلے گھڑسواری کر کے دکھاؤ"۔

رزاق خان اسے ہوٹل سے ملحق اصطبل کی طرف لے گیا۔ اس نے ایک گھوڑے پر زین ڈالی اور باگیں راشد کو تھما دیں۔ "یہ سامنے میدان ہے۔ اس میں اپنے جوہر دکھاؤ"۔ اس نے ہوٹل کے سامنے والی سرسبز ڈھلان کی طرف اشارہ کیا۔

O============☆============O

رزاق خان راشد کی گھڑسواری سے مطمئن ہوگیا تھا۔ اس نے ہوٹل کے ایک کمرے کی چابی راشد کو دے دی۔ ایک ماہ کا معاوضہ دو ہزار روپے طے پایا۔ کام کے اوقات صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک تھے۔

"اب شمشیر کو مقابلہ کرنا پڑے گا"۔ رزاق خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پہلے ہر لڑکی صرف اسی کے ساتھ گھڑسواری کرنا چاہتی تھی"۔

راشد اپنا سامان نیچے والے ہوٹل سے اٹھا لایا۔ ثامی کی موجودگی پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

شام کو اس کی ملاقات شمشیر سے ہوئی۔ شمشیر کی عمر اکیس بائیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ طویل القامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ لڑکیاں یقیناً اس پر منڈلاتی ہوں گی۔ لیکن راشد کو اندازہ ہوا کہ وہ ذہین نہیں ہے۔ وہ مسکراتا تو چالاک لگتا۔ ویسے اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

ان کی ملاقات راشد کے کمرے میں ہوئی۔ شمشیر نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر سامان کھلوانے اور ترتیب سے لگانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ راشد کو اس بات پر اطمینان ہوا کہ شمشیر باتونی نہیں ہے۔ راشد نے شمشیر کو اپنے بارے میں بتایا لیکن یہ بات چھپا لی کہ وہ متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شمشیر نے بتایا کہ سیزن ابھی ختم نہیں ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگ تو ابھی آنے والے ہیں۔ دونوں بہت جلد گھل مل گئے۔

شمشیر کا پسندیدہ موضوع گھڑسواری اور لڑکیاں تھیں۔ وہ انہی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ اس نے ذرا سی دیر میں دسیوں رومانوی قصے سنا ڈالے۔

اگلے روز سے کام شروع ہوا۔ آنے والی لڑکیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ راشد کی وجہ سے شمشیر کا کام بھی ہلکا ہوگیا۔ توقع کے عین مطابق لڑکیوں نے راشد کو بہت پسند کیا تھا۔

گھڑسواری کے لیے ایک مخصوص روٹ تھا۔ پہلے ہی روز راشد کو اندازہ ہوگیا کہ لڑکیاں بہت آزاد رو ہیں لیکن وہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تاہم اس نے کسی لڑکی کو زیادہ آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔

تین دن گزر گئے۔ سمیرا اس طرف نہیں آئی۔ دوسری طرف اب ہر لڑکی گھڑسواری کے لیے راشد کی خدمات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سب کی سب اسے ترغیب دینے والی نگاہوں

سے دیکھتیں۔ بعض من چلی لڑکیاں تو فقرے بھی چست کر دیتیں۔

تیسری شام راشد نے سمیرا کے سلسلے میں شمشیر کو کریدا۔

"اوہ............ وہ............ تم اسے جانتے ہو؟" شمشیر نے پوچھا۔

"نہیں' اپنے ایک دوست سے اس کا تذکرہ سنا تھا"۔

"وہ یہاں کم ہی آتی ہے۔ اس بار آئی تھی لیکن تین چار دن کے لیے اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔ دو ایک دن میں واپس آجائے گی۔ اس کے والدین عام طور پر سفر میں رہتے ہیں۔ ویسے لڑکی بہت خوبصورت ہے"۔

"واقعی؟"

"ہاں' پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے ایک بھائی نے' جو کراچی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا' اپنے ہاسٹل کے کمرے میں خودکشی کرلی"۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"اسلام آباد اور مری میں قریبی رشتے داری ہے۔ اسلام آباد میں کچھ ہو تو مری والے اس سے بے خبر کبھی نہیں رہتے"۔ شمشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خودکشی کی وجہ؟"

"کسی لڑکی کا چکر تھا اور وہ لڑکی اس کے روم میٹ اور عزیز دوست پر فدا تھی۔ دوست بھی کیا' بہت بے رحم آدمی ہو گا۔ دوست کو اپنی جان لیتے دیکھتا رہا' یہ نہیں ہوا کہ اسے بتا دیتا کہ مجھے اس لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ارے............ اس نے تو اسے خودکشی سے باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تماشا دیکھتا رہا"۔

لڑکی کے حوالے پر راشد کو ثمینہ کا خیال آگیا۔ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ مظفر جانتا تھا کہ اسے ثمینہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے خودکشی کی تو ممکن ہے' ثمینہ کی وجہ سے کی ہو۔ کم از کم وہ اس کا سبب ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے شمشیر سے پوچھا۔ "تو تمہارے خیال میں سمیرا کے بھائی کی موت کا ذمے دار اس کا روم میٹ اور دوست تھا؟"

"سو فی صد وہی ذمے دار تھا۔ میں تو اسے قتل کہوں گا۔ یوں کوئی کسی غیر کو بھی اپنے سامنے خودکشی کرتے نہیں دیکھ سکتا' دوست تو دور کی بات ہے"۔ شمشیر نے کہا۔ پھر اچانک بولا۔ "ایک مشورہ دوں سمیرا سے دور ہی رہنا"۔

"کیوں؟"

"دیکھو۔ وہ بڑے لوگ ہیں' بہت بڑے۔ ان کی زندگی میں مجھ جیسوں اور تم جیسوں کے لیے کوئی جگہ نہیں"۔

"اچھا!"

"ہاں۔ اگر تم بھی دولت مند ہوتے تو اور بات تھی۔ لہٰذا اس سے دور ہی رہنا۔ ویسے

ں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں"۔

"بشرطیکہ تم سے محفوظ رہیں"۔

شمشیر پھول گیا۔ "ارے نہیں۔ ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔ میں نے کچھ نیچے درختوں ، ایک جھنڈ کے درمیان اپنے لیے ایک کیبن بنا لیا ہے تمہیں بھی دکھاؤں گا۔ ضرورت نے پر تم اسے استعمال کر سکتے ہو"۔

"شکریہ دوست!"

O============☆============O

راشد سمیرا کو دیکھنے' اس سے ملنے کو بے چین تھا۔ دوسری لڑکیوں کے لیے وہ پسندیدہ ن موضوع گفتگو بن گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے اس جیسا کوئی لڑکا پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ۔ وہ سرگوشیوں میں اس کے متعلق باتیں کرتیں' آہیں بھرتیں۔ اسے مغرور قرار دیتیں۔ ۔ من چلی نے تو اس کا نام گلیشیر رکھ دیا تھا۔ چند ایک نے تو اسے محبت بھرے خط بھی تھما یے تھے۔

راشد جانتا تھا کہ ان میں سے بیشتر لڑکیاں صرف رومانس اور ایڈونچر کی خواہشمند ہیں۔ ں نے کبھی کسی لڑکی کو اس وقت تک خراب نہیں سمجھا جب تک لڑکی نے خود کو خراب ت نہیں کر دیا۔ ایسے میں وہ کوئی رعایت بھی نہیں کرتا تھا۔

ٹائی کو بہت زیادہ توجہ مل رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ راشد کا پالتو کتا ہے۔ سب ے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ ٹائی اس کا عادی نہیں تھا۔ لیکن اسے وہ سب کچھ بہت ا لگتا تھا۔ اب وہ خاصا بڑا اور موٹا تازہ ہوگیا تھا۔ راشد کے ساتھ اسے تین ماہ ہوگئے تھے اور ، وہ بڑا ہوگیا تھا۔ اس نے طرح طرح کے کھیل سیکھ لیے تھے اور اشاروں پر عمل کرتا تھا۔ ، کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی۔ وہ خوش اطوار تھا اور کبھی کسی کی پریشانی کا باعث نہیں بنتا البتہ اس کا کھلنڈرا پن پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ پھر رزاق خان کی کتیا سے اس کی یں بڑھنے لگیں۔ وہ اس پر بری طرح فدا تھا۔ مگر دوسری طرف سے اسے لفٹ نہیں مل رہی ۔ لڑکیوں کے لیے اس کا ناکام رومانس بھی دلچسپی کا باعث تھا۔ وہ کہتیں کہ راشد کی سنگدلی زا اس کے کتے کو مل رہی ہے............ بے چارہ! وہ ان سب کو ہی پیارا لگتا تھا۔ سچ تو یہ ہے ، وہ اسے راشد تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔ جس وقت راشد کسی کو گھڑسواری کرارہا ا' لڑکیاں ہی ٹائی کا خیال رکھتی تھیں۔

راشد تین چار بار شمشیر کے کیبن جا چکا تھا۔ دن میں جب بھی وہ یکجا ہوتے' شمشیر یوں کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ وہ لڑکیوں کے اصطلاحوں جیسے نام رکھنے میں ماہر تھا۔ کسی کو ، قرار دیتا' کسی کو چھوٹی مرچ اور کسی کو تاڑ کا خطاب دیتا۔ راشد سے کئی لڑکیاں اظہار محبت چکی تھیں لیکن انہیں راشد کے بے تاثر چہرے پر کبھی کوئی ردعمل نظر نہیں آیا تھا............ نہ

مثبت نہ منفی۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ یہ بے ضرر سے رومانوی کھیل کا ایک حصہ ہے۔ البتہ جہاں اسے سنجیدگی محسوس ہوتی' وہ سختی سے ٹوک دیتا۔ کہتا کہ میں تو محبت کے ہجے بھی نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں شمشیر کی پالیسی اور تھی۔ اظہار محبت کے جواب میں وہ اور زیادہ شدت سے اظہار محبت کرتا۔ وہ ہر لڑکی سے یہی کہتا.......... رُوئے زمین پر تم جیسی حسین کوئی اور لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔

پھر ایک دن سمیرا بھی آہی گئی۔ اس وقت تک راشد کے وہاں قیام کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ راشد نے کسی لڑکی کو اس کا نام لیتے سنا تو چونک کر اسے دیکھا۔ ویسے وہ اسے پہچان ہی نہیں پاتا.......... وہ اپنی تصویر سے بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر راشد کو اندازہ ہوگیا کہ وہ ٹینس کھیلتی رہی ہے۔

راشد نے جلد بازی کرنے کے بجائے تحمل سے کام لیا۔ ایک تو یہ کہ وہ دلچسپی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح راستہ طویل بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرے اسے یہ ڈر تھا کہ وہ اسے پہچان نہ لے' ممکن ہے' مظفر کے پاس اس کی کوئی تصویر رہی ہو جو سمیرا نے دیکھی ہو۔ ویسے بھی وہ چاہتا تھا کہ سمیرا اسے اردگرد دیکھنے کی عادی ہو جائے۔ تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔

لیکن دو دن گزر جانے کے بعد اسے یقین ہوگیا کہ سمیرا اسے نہیں پہچانتی۔ وہ اِدھر اُدھر جاتے کن انکھوں سے اسے دیکھتا۔ وہ بھی زیادہ گھلتی ملی نہیں تھی۔ تاہم اسے احساس ہوگیا کہ وہ بار بار اور بغور اسے دیکھتی ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کبھی نہیں جھلکی۔ راشد مطمئن ہوگیا۔

ایک شام وہ گھوڑے کو اصطبل کی طرف لے جا رہا تھا کہ کسی نسوانی آواز نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا.......... وہ سمیرا تھی۔

"میں سمیرا ملک ہوں"۔

راشد ٹھہر گیا۔ وہ اس کی طرف چلی آئی۔ "میں گھڑسواری کرنا چاہتی ہوں"۔ وہ بولی۔

"لیکن اب میری چھٹی ہوگئی ہے"۔

وہ مسکرا دی۔ "اسے اوور ٹائم سمجھ لو"۔

"ٹھیک ہے"۔

راشد نے اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی۔ پھر وہ اسے لے کر مخصوص راستے پر چل دیا۔ گھوڑے کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا سمیرا اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ بے دھیانی سے جواب دیتا رہا پھر اس نے گھوڑے کا رخ شمشیر کے کیبن کی طرف کر دیا۔ سمیرا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اس نظروں سے چوکنا پن جھلکنے لگا۔

راشد نے کیبن پہنچ کر گھوڑے کو قریبی درخت سے باندھا اور جیب سے چابی نکال کر کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ "اندر نہیں چلوگی؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟"

"میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں"۔

"کیوں؟"

"یہ مت بھولو کہ میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں"۔

"تم بھی ایک بات یاد رکھنا۔ میں ابھی آئی" یہ کہہ کر اس نے گھوڑا کھولا' اچھل کر اس پر سوار ہوئی اور بڑی مہارت سے اونچے نیچے راستوں پر دوڑانے لگی۔ راشد حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی اچھی گھڑسوار ہے۔

کچھ دور جا کر سمیرا نے گھوڑے کو واپس موڑا اور اسی رفتار سے دوڑاتی ہوئی کیبن تک لے آئی۔ پھر اس نے گھوڑے کو درخت سے باندھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ "اب چلو"۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔

وہ دونوں کیبن میں داخل ہوئے۔ کیبن میں دو کرسیاں تھیں۔ ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ راشد نے سمیرا کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کونے میں رکھے ہوئے مٹکے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے مٹکے سے پانی نکال کر پیا۔ پھر سمیرا کی طرف بڑھا۔ اس کی طرف سمیرا کی پیٹھ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا رہا۔ قریب پہنچ کر اس نے بڑی نرمی سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے.......... اور پھر اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

سمیرا اچھل کر کھڑی ہوئی۔ پلٹتے پلٹتے اس کا ہاتھ گھوم چکا تھا۔ راشد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں برہمی تھی۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت بدلی۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا۔

دیر تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر سمیرا نے اس کے کندھے سے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "تم وقت ضائع نہیں کرتے؟"

"ہاں' مجھے ڈر لگتا ہے' شاید وقت بہت کم ہے"۔

وہ کیبن سے نکلے اور اسی انداز میں واپس ہوئے جیسے آئے تھے۔ سمیرا اناڑیوں کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔ راشد گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں لیے پیدل چل رہا تھا۔

شمشیر نے انہیں کیبن سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ تنہائی کا موقع ملتے ہی اس نے راشد سے کہا۔ "بے وقوف.......... میں نے تمہیں منع کیا تھا اس حماقت سے"۔

"تم فکر نہ کرو.......... وہ تفریح تھی.......... خالص تفریح"۔ راشد نے جواب دیا۔

O=========== ☆ ===========O

اگلی صبح راشد معمول کے مطابق جاگنگ کر رہا تھا۔ جاگنگ کے بعد وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ہر طرف سکوت اور سناٹا تھا۔ ایسے میں اس نے سمیرا کو اپنی طرف آتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

"صبح بخیر"۔ سمیرا نے اس کے قریب آکر کہا۔

"صبح بخیر' کیسی ہو سمیرا ملک؟"

"ٹھیک ہوں"۔ اس نے کہا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "تمہیں احساس ہے کہ یہاں تمام لڑکیاں تم پر مرتی ہیں"۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے۔ ہے ناخوف ناک بات؟"

"تم خود فریبی کا شکار ہو؟ فریب بھی دیتے ہو؟"

"ذرا بھی نہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں"۔ راشد نے کہا۔ "میرا نام راشد حسن ہے"۔

"مجھے معلوم ہے"۔ سمیرا نے متانت سے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی کل کی حرکت غیر مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔ وہ شرمندہ بھی بھی ہوئی تھی لیکن اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس سے پہلے سمیرا کو کسی نے اس طرح نہیں چھوا ہوگا۔ اب اس کی بے نیازی سمیرا کے لیے پریشان کن ہوگی۔

"تم یقینی طور پر دھوکے باز آدمی ہو"۔ سمیرا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "اور خود فریبی کے مریض بھی ہو"۔

"کیوں؟ یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے کہ کل تم نے میرے ساتھ وہ حرکت کیوں کی؟ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ مجھے برا لگ سکتا ہے؟"

"لیکن وہ حرکت تمہیں بری نہیں.......... اچھی لگی تھی"۔

"میں مانتی ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تمہارے پاس اپنے اس اندازے پر یقین کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بتاؤ.......... تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ اتنی شدت سے کسی چیز کو میرا دل نہیں چاہا"۔ سمیرا کے رخسار تمتما اٹھے۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا کوئی گھٹیا مقصد نہیں تھا۔ نہ میں تمہیں تکلیف پہنچانا چاہتا تھا"۔

"میں جانتی ہوں لیکن تکلیف تو مجھے پہنچی نا"۔ یہ کہہ کر سمیرا نے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے رخسار سے لگالیا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے"۔ وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ کبھی ایسی بھی ہوسکتی ہوں.......... ایسا بھی کرسکتی ہوں"۔

راشد اپنے ردعمل پر خود بھی حیران رہ گیا۔ اس کے پورے جسم میں کیف وانبساط کی

ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ مسرت آمیز سنسنی جو اس کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایسےلمس کا ذائقہ اس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی پچھلی تمام قربتیں بھرپور ہونے کے باوجود اس کے لیے بے رنگ و بے کیف رہی تھیں۔

"تم عجیب آدمی ہو۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ تم بے حس ہو لیکن مجھے تو تم گوشت پوست کے' محسوسات سے لبریز انسان لگتے ہو"۔

محسوسات.......... جذبات! یہ وہ چیزیں تھیں جن سے وہ بچتا.......... دامن چھڑاتا آیا تھا۔ مگر اب صورت حال کچھ اور تھی۔ وہ کچھ خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"میں محسوسات سے عاری نہیں ہوں"۔ اور یہ حقیقت تھی' اس وقت وہ خود کو سرد بالکل محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جیسا کہ لڑکیوں کی قربت میں ہمیشہ کرتا تھا۔ وہ دیر تک اس کے ہاتھ سے رخسار ٹکائے کھڑی رہی۔ پھر اس نے بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور بولی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ پھر ملیں گے"۔ یہ کہہ کر وہ واپس چل دی۔ راشد بھی ہوٹل کی طرف واپس چل دیا۔

سامنے والی پہاڑی کی اوٹ سے سورج کی پہلی پہلی کرن جھانک رہی تھی۔

O============☆============O

اس روز راشد دیر تک خود کو سمجھنے کی کوشش میں الجھتا رہا۔ جو کچھ ہوا' وہ اس کے لیے نیا تھا۔ اس لڑکی نے نہ جانے کیا سحر پھونکا تھا کہ برسوں کے نظریات ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ اس نے بچپن سے جو پہلی چیز سیکھی تھی' وہ جذبات سے اور بالخصوص محبت سے ڈرنا تھا۔ محبت اور توجہ اسے کبھی ملی بھی تو نہیں تھی۔

وہ سمیرا کے لمس کا اب بھی تصور کرتا تو جسم میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ جسم مرتعش ہو جاتا' جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجربے نے اسے ہلا دیا تھا۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ وہ تجربہ بے حد شاندار' نرم اور حدت آفریں تھا۔ اسے لطف آیا تھا مگر وہ اس بات سے پریشان تھا کہ اس میں کوئی گڑبڑ کر دینے والی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

صبح دس بجے وہ باہر آیا تو سمیرا سے سامنا ہوگیا۔ وہ شاید اس کی منتظر تھی۔

"ساڑھے سات بجے مجھے لینے میرے گھر آجانا۔ نیچے وادی میں گھومنے چلیں گے"۔ سمیرا نے کہا اور یوں پلٹ کر چل دی جیسے صرف یہی کہنے آئی تھی۔

اس شام راشد ٹامی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

رزاق خان نے اسے اپنی گاڑی کی چابیاں دیں اور نیچے جاکر گوشت لانے کی ہدایت کی۔ راشد ایسے موقعوں پر خوش ہوتا تھا۔ اس طرح اس کا ڈرائیونگ کا شوق بھی پورا ہوتا تھا۔ راشد کا ارادہ تھا کہ شمشیر کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ لیکن جب اس نے شمشیر کو لڑکیوں میں گھرے دیکھا تو ارادہ ملتوی کر دیا۔ چنانچہ اس نے ٹامی کو عقبی نشست پر بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے ہوٹل سے سڑک پر لے آیا۔ اس نے کار کی کھڑکیوں کے شیشے نہیں چڑھائے تھے۔

ٹامی عقبی نشست پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا تھا۔ پچھلے پاؤں سیٹ پر اور دونوں اگلے پنجے اور تھوتھنی کھلی ہوئی کھڑکی پر رکھی تھی.......... کار میں سیر کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھڑکی سے سر باہر بھی نکال لیتا تھا۔

راشد نے گاڑی سڑک پر موڑی۔ دوسری طرف سے ایک کار آرہی تھی۔ اسی وقت رزاق خان کی کتیا نے بھونکنا شروع کردیا۔ ٹامی ویسے ہی اس پر فدا تھا.......... اور کتیا نے پہلی بار اسے پکارا تھا۔ وہ بے تابانہ کھڑکی پر چڑھا اور باہر چھلانگ لگادی۔ اس وقت تک دوسری طرف سے آنے والی کار بہت قریب آچکی تھی۔ کار کے ڈرائیور نے بریک لگانے کی بھرپور کوشش کی۔

راشد نے تیزی سے گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ دوسری کار کا ڈرائیور بھی نیچے اتر چکا تھا اور بے بسی سے اپنی کار کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ راشد اس طرف جھپٹا۔ اس نے دوسری کار کے ڈرائیور کو بالکل نظرانداز کردیا۔

ٹامی وھیل کے پیچھے پڑا تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ وہ گھسٹ کر اپنی محبوب کتیا کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خود کو گھسیٹنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ راشد نے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر کھینچ لیا۔ کچھ لوگ کار کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ ڈرائیور صفائی پیش کر رہا تھا۔ ٹامی کی نگاہوں میں دہشت تھی۔ اس کی پچھلی ٹانگیں محض دھاگے جیسی کھال کی وجہ سے دھڑ سے جڑی ہوئی تھیں۔ ورنہ ان کے الگ ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔

راشد نے جان لیا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ جلد از جلد موت ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اسے ختم کیسے کرے۔ وہ جتنی دیر زندہ رہتا' اتنی ہی اذیت اٹھاتا۔ راشد نے اپنی جیب ٹٹولی مگر اس میں چاقو موجود نہیں تھا۔ بالآخر اس نے سختی سے کتے کے گلے پر ہاتھ جما دیا لیکن موٹی کھال کی وجہ سے پورا دباؤ نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بھرپور دباؤ ڈالا۔ اسے اپنی انگلیوں کے درمیان ربڑ کی طرح نرم اور لچک دار نرخرہ پھڑپھڑاتا محسوس ہوا۔ کتا زبان باہر نکال کر سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تھوتھنی دوسری طرف تھی لیکن وہ کبھی کبھی سر گھما کر راشد کو دیکھتا۔ اس کی نگاہوں میں خوف بھی تھا' التجا بھی اور تحمل و برداشت بھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا لیکن جیسے اسے راشد پر اب بھی اعتبار تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس کی بہتری ہی کے لیے کر رہا ہے۔

راشد کے ہاتھوں کا.......... انگلیوں کا دباؤ بڑھتا رہا۔ زور لگانے سے اس کے ہاتھ اور کندھے تک لرزنے لگے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کتے کی گردن اتنی سخت ثابت ہوگی۔ راشد کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے آنکھیں بند کرنا پڑیں۔

شمشیر بھی وہاں آگیا تھا۔ اس نے راشد کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن راشد بدستور دباؤ

بڑھاتا.......... اور لرزتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے کندھے تھپک رہا ہے.......... اور کتا بھی بے جان ہوگیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پلٹ کر دیکھا۔ شمشیر اس کے کندھے تھپتھپا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ راشد نے ٹامی کو دیکھا۔ وہ مرچکا تھا۔

راشد وہیں سڑک پر بیٹھا رہا۔ اس نے کتے کی گردن سے انگلیاں ہٹالیں۔ اس کی انگلیاں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں.......... اور بہت زیادہ زور لگانے کی وجہ سے ان میں اینٹھن پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دکھ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبالیے۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنا زور نہیں لگایا تھا۔ تھکن کا احساس اس کے رگ و پے میں اتر گیا تھا۔ پھر وہ اٹھا.......... اور اس نے جھک کر ٹامی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا اور اسے اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ گاڑی کی عقبی نشست پر ایک بڑا شاپنگ بیگ رکھا تھا۔ اس نے کتے کو بیگ میں ٹھونس دیا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

وہ سیدھا بازار گیا اس نے مطلوبہ سامان خریدا۔ اس دوران اس نے کسی کو حادثے کے بارے میں نہیں بتایا۔ سامان کی خریداری کے دوران وہ خوش دلی سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بک اسٹال سے ایک ڈائجسٹ بھی خریدا۔ اس کا انداز ہر روز جیسا تھا۔

سامان خرید کر وہ واپس آیا۔ اس نے سامان رزاق خان کو دیا اب اسے ٹامی کی تدفین کرنا تھی۔

○===========☆===========○
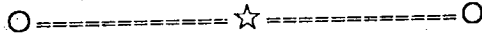
ٹامی کو دفن کرکے آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے شمشیر کے الجھے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ خود اپنی سوچوں کا بھی تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے نزدیک ٹامی کی کتنی اہمیت تھی۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے آج کیا تھا' ایسے منظر لوگ کبھی کبھار ہی دیکھتے ہیں۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں تو ان کا جذباتی ردعمل بھی ہوتا ہے' خواہ ان کی حیثیت ایک عام تماشائی کی ہو اور راشد کو اسے جذباتی ردعمل سے اور ایسے جذباتی لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ جذباتی فضول خرچی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ لوگ خود کو اپنے جذبات سے علیٰحدہ رکھنا سیکھ لیں۔ کیوں کہ جذبات کے چکر میں وہ اپنا قیمتی وقت بھی ضائع کرتے ہیں اور توانائی بھی۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ شمشیر آگیا۔ اس وقت راشد منہ دھونے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا بے دھیانی میں سیٹی بجا رہا تھا۔ شمشیر آتے ہی اس کے بستر پر گر گیا۔

"مجھے افسوس ہے راشد!" اس نے کہا۔

"کیسا افسوس؟" راشد کا سیٹی بجانا موقوف ہوگیا۔

"ٹامی کے بارے میں۔ بہت اچھا کتا تھا وہ"۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس کو اس طرح ختم کرنا پڑا۔ کاش' اس وقت میری جیب میں

چاقو ہوتا!"

"واقعی......... بہت تکلیف دہ کام تھا"۔ شمشیر خان نے کہا۔ "ثامی جس شخص کی گاڑی کے نیچے آیا' وہ بے چارہ دیر تک مجھ سے بات کرتا رہا......... افسوس کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ثامی ایک دم ہی گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ اور وہ کوشش کے باوجود بروقت گاڑی نہ روک سکا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا نام اور پتا بھی دیا"۔ شمشیر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"تمہیں چاہیے اس کا نام پتا؟"

"نہیں"۔

"تو تم اس سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں"۔

"وہ بے چارہ بہت شرمندہ تھا"۔

"خواہ مخواہ......... جبکہ اس کی کوئی غلطی بھی نہیں تھی"۔ راشد نے کہا۔ "اب میں اس سے ملوں گا تو وہ اور شرمندہ ہو گا"۔

"تمہاری مرضی' اب کیا پروگرام ہے؟"

"کسی کے ساتھ سیر کو جانے کا ارادہ ہے۔ ہو سکتا ہے' کیبن کی طرف بھی جاؤں"۔

"ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کس کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"سمیرا ملک کے ساتھ"۔

"حماقت......... بے وقوفی"۔

"وہ کیوں؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ کھیل کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کے لیے تو بڑا آدمی چاہیے"۔

"میں مستقبل کا بڑا آدمی ہوں"۔ راشد نے سینہ پھلا کر کہا۔

"ایک بات سنو راشد' تمہیں اپنے کتے کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنا پڑا۔ یہ ضروری تھا"۔

"ہاں......... ضروری تو تھا"۔

"میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ کر سکتا"۔

"میں جانتا ہوں"۔

"میرا مطلب ہے' اتنی ہمت کم ہی لوگ کر سکتے ہیں"۔

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔ اب اس قصے کو چھوڑو۔ وہ مردود کتا تو مر چکا نا........."

شمشیر حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا.........

O============☆============O

اختر ملک کے بنگلے کا دروازہ ایک پہاڑی عورت نے کھولا۔ راشد نے اسے بتایا کہ وہ

سمیرا سے ملنا چاہتا ہے۔ "آپ اندر آجائیے"۔ ملازمہ نے کہا۔ وہ راشد کو ڈرائنگ روم میں لے گئی اور اسے بٹھا کر خود اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سمیرا آئی۔ عنابی رنگ کے سوٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ راشد اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ہیلو......... یہ اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" سمیرا نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"میرے ساتھ جانے پر تمہارے والدین کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟" اس نے سمیرا کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا بھی نہیں۔ وہ اپنی اولاد کو آزادی دینے کے قائل ہیں اور میں اس آزادی سے کبھی کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھاتی"۔ یہ کہتے کہتے سمیرا کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ شاید اسے مظفر کا خیال آگیا تھا جس نے آزادی کا بدترین استعمال کیا تھا۔

"تو چلو"۔

وہ گھر سے نکل آئے۔ جناح روڈ کے ایک ریستوران میں انہوں نے کافی پی۔ وہاں سے وہ اٹھے تو سمیرا نے پوچھا۔ "اب؟"

"اسی کیبن میں چلیں گے"۔ راشد نے کہا۔

سمیرا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن انکار کیا نہ اعتراض۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ کیبن میں پہنچ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے۔ راشد نے سمیرا کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لمحے راشد کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ معصومیت کے لمس سے اب تک ناآشنا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ لمس اس قدر معصوم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لمس اسے یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کچھ بھی کر لے' سمیرا مدافعت نہیں کرے گی۔ مگر وہ خود کو ایک عجیب سے بندھن میں بندھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سمیرا کے بارے میں مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ وہ تو ایک بے حد حسین' بہت ہی نازک تعلق تھا۔ جو ان دونوں کے درمیان چپکے سے استوار ہو گیا تھا۔ اس انداز میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا' کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ سمیرا کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا......... اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے نزدیک اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ پاکیزہ اور اچھوتی ہے......... بہار کی پہلی کلی کی طرح۔ اگر وہ اسے توڑ لیتا تو بھی وہ اعتراض نہ کرتی۔ مگر وہ خود سے مایوس ہوئے بغیر نہ رہتی۔ اپنے آپ پر اسے جو مان تھا' وہ ٹوٹ جاتا۔ اور وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ اسے بغور دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "سمیرا چلو گھر چلیں"۔

وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ نظریں بول رہی تھیں......... بتا رہی تھیں کہ وہ اس کے تمام محسوسات کو پوری طرح سمجھ رہی ہے۔ پھر اس نے راشد کا ہاتھ اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے کہا۔ "شکریہ راشد"۔ تم بہت اچھے ہو"۔

وہ باہر نکل آئے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اوپر جانے والے راستے پر قدم بڑھاتے رہے۔

"کیا تم ساری لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہو.........؟" سمیرا نے پوچھا۔

راشد نے شاکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا"۔

"مجھے یقین ہے تمہاری بات پر۔ سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں کہ تم بہت سرد مہر ہو"۔

"اچھا! لڑکیاں میرے متعلق بات کرتی ہیں؟"

"تم ان کا پسندیدہ ترین موضوع گفتگو ہو"۔

"لڑکیوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے"۔

"سنو راشد.......... میں تمہیں پسند کرتی ہوں"۔

"تو تم اس بیان کے ذریعے لڑکیوں میں میری ساکھ بحال کردو گی؟"

"ہاں۔ میں کہوں گی' راشد تو بہت پیارا......... بہت ہی اچھا ہے۔ دل کا بھی اچھا ہے اور........."

"اور پیار کرنا بھی جانتا ہے"۔ راشد نے شریر لہجے میں جملہ پورا کیا۔

"ہاں۔ یہ بھی کہوں گی"۔

"یہ تو بہت اچھا ہوگا"۔

"لیکن پھر لڑکیاں مجھے بھی عجیب قرار دینے لگیں گی"۔ سمیرا نے فکرمندی سے کہا۔

"کہیں گی' دونوں ایک جیسے ہوں گے۔ تبھی تو یہ اس کے گن گا رہی ہے۔ نہیں بھئی......... بہتر یہی ہے کہ میں کچھ نہ کہوں۔ بس گردن اکڑائے' سر اونچا کیے پھرتی رہوں۔ اس انداز سے سب سمجھ لیں گی کہ کائنات میرے قدموں میں جھک آئی ہے"۔

"ہاں......... یہ بہتر رہے گا"۔

سمیرا نے چلتے چلتے سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

"راشد......... تم مجھے واقعی بہت اچھے لگتے ہو"۔ اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

"شکریہ"۔ راشد نے کہا۔ پھر بولا۔ "سمیرا......... تم عام طور پر گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں نہیں آتیں۔ اس سال کیوں آئیں؟" پھر اس نے سمیرا کو چونکتے دیکھا تو تیزی سے بات بنائی۔ "مجھ سے ملنے؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ لیکن سمیرا بدستور سنجیدہ رہی۔ اس نے راشد کے کندھے سے سر اٹھالیا۔ "شمشیر نے بتایا تھا کہ تم یہاں کم ہی آتی ہو"۔ راشد نے وضاحت کی۔

"کچھ عرصہ پہلے میرے بھائی کا انتقال ہوگیا"۔ سمیرا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "میں یہ سوچ کر آگئی کہ ممکن ہے' میری موجودگی میں ممی اور پاپا بہل جائیں"۔ پھر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ "لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ دونوں پینے لگے ہیں۔ پاپا نشے میں ہوتے ہیں تو غمگین ہو جاتے اور ممی نشے میں رونے لگتی ہیں"۔

"اور جب دونوں نشے میں نہیں ہوتے تو کیا کرتے ہیں؟"

"پیتے ہیں"۔ سمیرا نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"اور ان کا یہ حال بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے؟"

"نہیں' پیتے تو وہ پہلے بھی تھے۔ ہماری سوسائٹی میں سبھی پیتے ہیں۔ بشرطیکہ میسر آجائے۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پہلے ڈیڈی نشے میں ہوتے تو انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ ان کا ہر نقطہ نظر درست ہے۔ جب کہ ممی کو نشے میں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ پاپا غلطی پر ہیں۔ اب ممی روتی ہیں اور پاپا چپ بیٹھے رہتے ہیں"۔

"بس......... خود پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں"۔

"میں خود رحمی کا شکار ہرگز نہیں ہوں۔ میرے بھائی نے خودکشی کی تھی"۔ سمیرا کے ہاتھ پر راشد کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ جیسے وہ اسے سہارا دینا چاہ رہا ہو۔ "وہ مجھ سے ایک سال بڑا تھا"۔ سمیرا کہتی رہی۔ "صرف انیس سال کا تھا وہ۔ بہت ذہین' بہت خوش شکل تھا۔ تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کا"۔

"مگر اس نے خودکشی کیوں کی؟" راشد نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

"وہ اعصابی طور پر کمزور تھا۔ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکی اس کے عزیز ترین دوست اور روم میٹ کو پسند کرتی تھی۔ میرے بھائی نے اپنے روم میٹ کی موجودگی میں خودکشی کی اور وہ خبیث تماشا دیکھتا رہا۔ اس نے مظفر کو روکنے' اسے سمجھانے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی"۔

"تو کیا نشے میں تھے دونوں؟" راشد کو اپنے سوال پر خود بھی حیرت ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی تیسرے فرد کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ جیسے وہ جو کچھ سن رہا ہے' وہ اس کے اپنے نہیں' کسی اور کے متعلق ہو......... اور پہلی بار سن رہا ہو۔

"نہیں' وہ نشے میں نہیں تھے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مظفر نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔ کاش......... میں تمہیں بتا سکتا"۔

"مجھے مظفر نے اپنے روم میٹ کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ بہت ہینڈسم لڑکا ہے اور اس کا باپ وکیل ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کبھی نہیں بتایا"۔

راشد سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال سر اٹھا رہا تھا۔ مگر اس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے۔

O===========☆===========O

ثامی کا گلا گھونٹنا راشد کے لیے ذرا بھی تکلیف دہ نہیں رہا تھا۔ لیکن اگلے دن ہوٹل میں لوگ اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ بہت افسردہ تھے کہ ثامی کے مقدر میں ایسی موت آئی۔ راشد کا ردعمل کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے سب سے یوں علیک

سلیک کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ معمول کے مطابق ہنس رہا تھا.......... بول رہا تھا.......... مسکرا رہا تھا۔ وہ ذرا بھی افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لیکن راشد کی آنکھوں میں دیکھ کر انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ انسان کتنا ہی گہرا ہو' آنکھوں میں اس کے باطن کا ہلکا سا رنگ ضرور ابھر آتا ہے۔ راشد کی آنکھوں میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

لوگوں کے نزدیک یہ بات بہت عجیب تھی۔ وہ کتے سے بہت محبت کرتا تھا.......... اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے ٹامی کی تربیت پر یقیناً" بہت زیادہ محنت کی ہوگی۔ تو کیا اسے ٹامی سے محبت نہیں تھی۔ اس کے ردعمل سے تو یہی ثابت ہوتا تھا۔ راشد کو اپنی طرف دیکھنے والی نگاہوں میں جو الجھن نظر آئی وہ اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ چیز وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لوگ اس سے جذباتی ردعمل کی توقع رکھتے تھے.......... اور وہ بھی ایک کتے کی موت پر' تو یہ ان کی حماقت تھی۔ یہ ان کی کمزوری تھی' اس کی نہیں۔ شام تک سب کو یقین ہو گیا کہ راشد پر کوئی اثر نہیں ہوا.......... اور کوئی اثر نہیں ہوگا۔ چنانچہ نگاہوں کی الجھن دور ہو گئی۔

اس روز راشد نے بینک سے رقم نکلوائی اور راولپنڈی سے ایک موٹر سائیکل خرید لایا۔ شام کے وقت وہ ٹرائی کر رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر دو تین بڑے خطرناک موڑ تھے۔ وہ وہاں سے پوری رفتار سے موٹر سائیکل کو گزارتا اور اچانک بریک لگاتا۔ کئی بار تو موٹر سائیکل سڑک سے ہٹ کر کچے میں چلی گئی۔ ایک انچ اور باہر ہوتی تو سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جا گرتی۔

راشد کے نزدیک موٹر سائیکل چلانا بھی ایک کھیل تھا اور وہ ہر کھیل پرفیکشن کے ساتھ کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کا اصول تھا کہ اگر ٹھیک طرح سے کھیلا نہ جائے تو آدمی کھیل کو خیرباد ہی کہہ دے اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے موڑ کاٹتے ہوئے کن آنکھیوں سے دیکھا۔ سڑک کے کنارے سمیرا کھڑی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ راشد نے کچھ دور جا کر بریک لگائے۔ سمیرا تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی۔ راشد موٹر سائیکل ہی پر بیٹھا رہا۔

"راشد حسن!" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا"۔

راشد نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس کے سامنے آگیا۔ "کیسا نہ کروں؟" اس نے پوچھا۔

"آئندہ اس طرح موٹر سائیکل کبھی نہ چلانا تم نے مجھے مرجانے کی حد تک خوف زدہ کر دیا تھا۔ آئندہ کبھی.......... کبھی ایسا نہ کرنا.......... کبھی نہیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

سمیرا نے جواب میں جو کچھ کیا' وہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ راشد لڑکھڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"آیندہ کبھی ایسا نہ کرنا سمجھے؟" وہ غرائی۔ اس لمحے وہ بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ پھر وہ پاؤں پٹختے ہوئے' ہوٹل کی طرف چل دی۔ راشد سناٹے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے اسے مارا ہو.......... بالخصوص صنف نازک نے۔ اور کمال یہ تھا کہ سمیرا کی یہ حرکت اسے بری نہیں لگی تھی لیکن اس کی سمجھ میں سمیرا کا اس طرح بپھرنا نہیں آ رہا تھا۔

اس نے سمیرا کو پکارا۔ مگر سمیرا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ دروازے پر ہی وہ اس تک پہنچ سکا۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھتی رہی۔ "میری بات تو سنو"۔ اس نے کہا۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

راشد بونٹ پر کہنی ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ "تم نے تھپڑ کیوں مارا؟" اس نے پوچھا۔

"بچوں کی سی حماقت کرو گے تو تھپڑ ہی کھاؤ گے۔ دکھاوا اور بے پروائی بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ تم زخمی بھی ہو سکتے تھے۔ تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا"۔

"لیکن مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا"۔

"بس.......... ہٹ جاؤ میرے سامنے سے"۔ وہ غصے سے بولی۔

"کیا تم میری ذمے دار ہو۔ میری ذمے داری اپنے سر لے رہی ہو؟" یہ سوال خود بخود راشد کے منہ سے نکلا۔

"ہاں' بالکل لے رہی ہوں"۔ یہ کہہ کر سمیرا نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ راشد بڑی مشکل سے ہٹ پایا۔

وہ چند لمحے سر کھجاتا اور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ اتنا عجیب رویہ کبھی کسی کا نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں.......... لیکن اسے موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر سمیرا خوف زدہ ہوئی تھی اور پھر غصے میں آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس کے زخمی ہو جانے سے سمیرا کو کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

سمیرا نے اس کے موٹر سائیکل چلانے کو دکھاوا کہا تھا.......... شوبازی سمجھا تھا۔ جب کہ وہ دکھاوے کا آدمی ہی نہیں تھا۔ اسے کبھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے.......... کیا سمجھ رہا ہے۔ وہ تو ہر کھیل پورے ڈھنگ سے دیانت داری سے کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں اگر کوئی شخص پرفیکشن کے ساتھ موٹر سائیکل چلانے کا اہل نہیں تو اسے موٹر سائیکل چلانا ہی نہیں چاہیے۔ اور اگر وہ چلائے تو اسی قابل ہے کہ کسی کھڈ میں گر کر مر جائے.......... کسی حادثے سے دو چار ہو جائے۔

یہ سب سوچتے سوچتے راشد کو غصہ آگیا۔ اس سے کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ پھر اس نے ذہن سے غصہ جھٹکا اور سمیرا کے ردعمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سمیرا نے یہ کیوں سوچا کہ وہ اس کی ذمے داری ہے۔ اس کے تحفظ کی سمیرا کو کیوں فکر لاحق ہوئی۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ ڈر گیا۔ بات سادہ سی تھی۔ سمیرا کو اس سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اسے معمولی سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ اسے خطرناک انداز میں موٹرسائیکل چلاتے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی......... مرجانے کی حد تک! ہاں......... یہی تو کیا تھا اس نے اور یہ ردعمل صرف اس لیے تھا کہ اسے اس کی پروا تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔

وہ خودبخود مسکرادیا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کی پروا......... اس کی فکر کی تھی۔ بچپن میں وہ بارش میں ننگے بدن باہر نکل جاتا تو کوئی اسے نہ ٹوکتا......... نہ ممی، نہ ڈیڈی۔ دوسرے بچوں کو ٹوکا جاتا۔ ان کی مائیں دانت پیس پیس کر کہتیں۔ مردود......... اس بارش میں بھیگے گا تو نمونیا ہو جائے گا......... اور بھگتیں گے ہم، لیکن لفظوں کے برعکس لہجہ بتاتا کہ انہیں بھگتنے کی نہیں، اپنی بچے کی جان کی فکر ہے۔ لیکن ممی کبھی اس کے لیے پریشان نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے کبھی اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت نہیں کی تھی۔ شاید اسی لیے وہ خود کو خطرات میں ڈالنے کا عادی ہوگیا تھا کہ کبھی ممی اسے ٹوک دیں۔ مگر ممی نے کبھی نہیں ٹوکا۔ بڑے ہوتے ہوتے یہ خواہش لاشعور میں چلی گئی اور شعور اسے پرفیکشن کے حصول کی خواہش قرار دے بیٹھا۔ عادت فطرت بن گئی۔

وہ آپ ہی آپ ہنس دیا۔ اس کی محبت میں سمیرا نے اس کی ذمے داری کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔

وہ چائے پینے کی غرض سے ہوٹل میں چلا گیا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک خاتون نے اسے پکارا۔ وہ پلٹا اور اس کی میز کی طرف چل دیا۔ خاتون بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ نیا چہرہ تھا۔ خاتون کی آنکھوں میں سرخی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ مگر دیکھنے میں وہ پچاس سے زیادہ کی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ جو مرد بیٹھا تھا، اسکی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں۔

"تم راشد حسن ہونا؟" خاتون نے پوچھا۔

"جی ہاں"۔

"میں سمیرا کی ممی ہوں......... اور یہ اس کے پاپا"۔ خاتون نے کہا۔ "پھر پوچھا چائے پیو گے؟"

"جی نہیں، شکریہ"۔

"پھر بھی کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں"۔

راشد خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"سمیرا تمہیں بہت پسند کرنے لگی ہے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی کا تذکرہ اتنے زور و شور سے نہیں کیا تھا۔ سنا ہے کل تمہارا پالتو کتا مرگیا؟"

"جی ہاں"۔

"مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔ کتے مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں"۔

راشد خاموش رہا۔ خاتون اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے ذلیل کرنے کی کوشش ضرور کریں گی۔

"سمیرا کہہ رہی تھی، تم بہت ذہین ہو"۔

"جی ہاں، ذہین تو میں ہوں"۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے تم پر تو بہت لڑکیاں مرتی ہوں گی"۔

"ممکن ہے، مرتی ہوں۔ میں بہرحال زندہ رہتا ہوں"۔

سمیرا کے باپ نے چونک کر اسے دیکھا......... اور دیر تک بغور دیکھتا رہا۔

"راشد حسن......... تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"وکیل ہیں"۔

"کیا نام ہے ان کا؟"

راشد نے دانستہ ملک کے نامور ترین وکیل کا نام بتایا۔ وہ انہیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اخترملک نے اسے بڑی بے یقینی سے دیکھا۔ جب کہ خاتون کی نگاہوں سے تمسخر جھلکنے لگا۔ تاہم انہوں نے اسے کھل کر جھوٹا قرار نہیں دیا۔

"اور تم مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہو؟"

"میں آرکیٹیکٹ بننا چاہتا ہوں"۔ راشد نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔

لیکن اس پر کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔

"خیر راشد......... میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ سمیرا کا خیال دل سے نکال دو"۔ اچانک ہی خاتون کا لہجہ سخت ہوگیا۔

"آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ میرے دل میں سمیرا کا خیال ہے"۔ راشد نے سادگی سے پوچھا۔

"سمیرا کو تم سے ملے دو دن ہوئے ہیں اور وہ ہم سے ہر وقت تمہاری باتیں کرتی رہتی ہے۔ مجھے ڈر ہے، یہ سلسلہ مزید دو ایک دن جاری رہا تو بات آگے بڑھ جائے گی"۔

"میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن اس کے دل میں کیا ہے، اس سے میرا کوئی تعلق نہیں"۔ راشد نے کہا اور اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا آیا۔

اس شام وہ پھر ملے۔ سمیرا نے سب سے پہلے اس سے تھپڑ کے سلسلے میں معذرت کی۔ راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی بائیں ہاتھ کا تھپڑ باقی ہے"۔

"نہیں...... میں وعدہ کرتی ہوں' آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے معاف کردو...... پلیز!"

"معاف کرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم جب چاہو' یہ حرکت دہرا سکتی ہو"۔

سمیرا کچھ دیر سوچتی رہی' پھر بولی۔ "راشد...... تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟"

"ہاں' میں زندگی بھر محبت سے بچتا رہا۔ لیکن اب اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔

"مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ٹھہرو...... مجھے سوچنے دو۔ میں نے اس انداز میں کبھی نہیں سوچا تھا"۔ راشد نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ سمیرا اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہاں...... میں نے پہلے کبھی اتنی شدت سے کوئی خواہش نہیں کی"۔

"میں نے بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم وقت میں کوئی کسی کے اتنا قریب بھی آسکتا ہے"۔

"میں بھی یہی سوچتا ہوں"۔

"مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ہاں' ضرور کروں گا"۔

"کب؟"

"جب تم کہو"۔

"آج اور ابھی۔ میں اسی وقت تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں"۔

راشد بری طرح چونکا۔ "اتنی جلدی کیوں؟ اور تمہارے والدین......؟"

"میں ان سے بات کر چکی ہوں۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہیں"۔

"انہیں مجھ میں کیا برائی نظر آئی؟"

"برائی تو کوئی نہیں"۔ سمیرا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ممی کہتی ہیں...... تم اتنے خوبرو ہو کہ صرف میرے ہو کر کبھی نہیں رہ سکو گے۔ تمہاری زندگی میں لڑکیاں آتی جاتی رہیں گی"۔

"جب کہ تم جانتی ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں......"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ لیکن انہیں سمجھا نہیں سکتی۔ بس تم مجھ سے شادی کرلو۔ میں ممی اور پاپا کی دی ہوئی آزادی کا غلط استعمال نہیں کر رہی ہوں"۔

"لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ فی الحال میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میری تعلیم بھی مکمل ں ہوئی۔ میں برسرروزگار بھی نہیں ہوں"۔

"مجھے کوئی پراہ نہیں۔ تم اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہو۔ میرے اکاؤنٹ میں خاصی رقم جو ہے"۔

"لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ......"

"فضول باتیں مت کرو"۔ سمیرا نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "محبت میں ں" اور "تو" کا فرق مٹ جاتا ہے۔ میں وہ کروں گی جو تم چاہو گے اور تمہیں وہ کرنا ہوگا' جو چاہتی ہوں"۔

راشد سوچتا رہا۔ شادی کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کجا یہ کہ اتنا بڑا فیصلہ سرعت سے کرنا۔ ان چند لمحوں میں اس نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا لیکن جواب بہت ح تھا۔ اسے سمیرا سے محبت تھی...... اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسے سمیرا پر ار کرنا بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ ورنہ وہ تو والدین کا سہارا لینا بھی ر نہیں کرتا تھا۔

فوری طور پر شادی کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ موٹر سائیکل خریدنے کے بعد ں اس کے پاس خاصی رقم بچی تھی۔ وہ تعلیم مکمل کر سکتا تھا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

"میں تمہاری طرف جس طرح کھنچتی ہوں' وہ خطرناک ہے کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ۔ اس لیے میں تم سے آج ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری محبت کے ن پر کوئی داغ لگے۔ میں جانتی ہوں' تم بھی اسی طرح محسوس کرتے ہو۔ ایسے میں ہم کب اس طرح لڑیں گے؟" سمیرا نے اسے چونکا دیا۔

راشد نے نظریں اٹھا کر سمیرا کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک کہتی آؤ...... چلیں"۔

O============☆============O

شادی کے بعد رزاق کے ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا۔ اس کے کاروبار پر برا اثر سکتا تھا۔ راشد نے نیچے ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا اور رزاق خان کو جا کر بتا دیا کہ اب وہ ں کے لیے کام نہیں کر سکے گا۔ اس نے واپس چلنے کی بھی تجویز پیش کی لیکن سمیرا کچھ روز ں گزارنا چاہتی تھی۔

کچھ بھی سہی۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ اختر ملک اور اس کی بیوی سعدیہ اسلام آباد پس چلے گئے تھے۔ راشد کو ان پر ترس بھی آتا تھا۔ ایک ہی سال میں انہوں نے اپنی اکلوتے ٹے کو بھی گنوا دیا تھا اور اکلوتی بیٹی کو بھی۔ اور ان کے اس دوہرے زیاں کا ذمے دار ایک ہی ص تھا...... وہ خود!...... راشد نوید یا راشد حسن!

پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ ایک عجیب سی بے فکری اور سرشاری نے انہیں اسیر کر لیا۔ وہ دونوں ہی صحرا تھے مگر دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے دریا بھی تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہتے۔

پھر ان کے بیچ وہ دیوار آ گئی جس کے متعلق راشد نے شادی کے وقت سوچا بھی نہیں تھا۔ سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اسے مظفر کا خیال آ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور سرشاری کے رنگ معدوم ہو جاتے۔ اسے خیال آتا کہ سمیرا اس سے شدید اور سچی محبت کرتی ہے اور اس محبت نے اسے کچھ حقوق دے دیے ہیں۔ وہ ان حقوق کی حد کا کبھی تعین نہ کر پاتا۔ وہ ان حقوق کے بارے میں سوچتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتا۔ اس نے پہلے کبھی کسی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کیا تھا......... داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور جب بھی کبھی کوئی اس کی زندگی میں اس کی مرضی کے خلاف بھی داخل ہوا تھا تو اس کا انجام دکھ اور اذیت ہی رہا تھا۔ اور وہ دکھ سے......... اور اذیت سے ہمیشہ ڈرتا آیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ اب یہ مزاحمت اس کی فطرت میں شامل ہو چکی ہے کہ خود سے کسی کو محبت نہ کرنے دے......... اور نہ خود کسی سے محبت کرے۔ اب زندگی میں پہلی بار اس نے اجازت دی تھی......... اس کا دل چاہتا تھا کہ سمیرا اس سے محبت کرے۔ لیکن وہ خوف زدہ تھا کہ وہ سمیرا کو خود سے محبت نہیں کرنے دے گا۔ وہ بہت الجھ گیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے احساس ہو جاتا تھا کہ اب اس کی نگاہوں میں والہانہ پن' محبت' سرشاری اور مسرت کی جگہ اداسی کروٹیں لے رہی ہے۔ اور اگر سمیرا پوچھے تو وہ اس کی کوئی وضاحت بھی نہیں کر سکے گا لیکن وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

پھر ایک دن سمیرا نے ٹوک ہی دیا۔ "راشد......... یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے اچانک؟"

وہ اس وقت بیڈ پر بیٹھے تھے۔ راشد اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ افق سرخ ہو رہا تھا۔

سمیرا بھی اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"چلو' ٹہلنے چلیں........." راشد نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جناح روڈ پر ٹہلتے رہے۔ سمیرا باتیں کیے جا رہی تھی۔ لیکن راشد کا الجھا ہوا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ محض ہوں ہاں کیے جا رہا تھا۔

سمیرا کی قربت میں عجیب سا سحر اور دل آویزی تھی۔ قربت کے لمحوں میں راشد کے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہتی۔ اس وقت تو بھری کائنات میں بس وہ دونوں ہوتے کبھی کسی چیز کا خیال ہی نہ آتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت نرم و گداز اور مہربان ثابت ہوتے۔ وہ

ایک دوسرے کو یوں برتتے جیسے وہ انسان نہیں' نازک کانچ کا آئینہ ہوں۔ جو ایک ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ راشد کے لیے وہ جذبہ' وہ احساس بالکل ہی نئی چیز تھا۔ وہ ڈرتا کہ سمیرا کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔ وہ اسے کوئی مایوسی کوئی پچھتاوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر تکلیف وہ بات یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے دامن میں سمیرا کے لیے پچھتاووں اور اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس تصور ہی سے دہشت زدہ ہو جاتا کہ کبھی سمیرا کو اس سے کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سمیرا بھی اس کو کوئی تکلیف پہنچنے کے......... تکلیف میں دیکھنے کے تصور سے ڈرتی ہے۔ وہ اسے خطرات مول لیتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس دوران شمشیر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ شمشیر اسے جادوگر قرار دیتا تھا کہ اس نے سمیرا جیسی لڑکی کو تسخیر کیا ہے۔

"کیسی گزر رہی ہے دوست؟" شمشیر نے پہلی ملاقات پر راشد سے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ میں بہت خوش ہوں"۔

"تمہارے خوش ہونے سے زیادہ اہم سمیرا کا خوش ہونا ہے"۔

"وہ بھی بہت خوش ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش ہے"۔ راشد نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

"اب تم اوپر بہت کم آتے ہو"۔

"ہم باہر کم ہی نکلتے ہیں"۔

شمشیر نے شرارت بھرا قہقہہ لگایا "وہ تم پر چھا گئی ہے بری طرح........."

"اور کمال یہ ہے کہ یہ مجھے برا نہیں لگتا"۔

"اور اب تم اس کے لیے بڑے آدمی بھی بنو گے"۔

"بڑا آدمی تو میں ہوں"۔ راشد نے سینہ پھلا کر کہا۔

اسی وقت سمیرا بھی آ گئی۔ "کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

"شمشیر کہتا ہے کہ تم سے شادی کے لیے میرا بڑا آدمی ہونا ضروری ہے۔ پہلے نہیں بن سکا تو اب بن جانا چاہیے"۔ راشد نے اسے بتایا۔

"راشد اب بھی بڑا آدمی ہے۔ مستقبل میں اور بڑا ہو جائے گا"۔ سمیرا نے شمشیر سے کہا۔

"یہ درست ہے۔ بڑا آدمی نہ ہوتا تو تم سے شادی کیسے کرتا"۔ شمشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد سمیرا نے راشد سے پوچھا۔ "تم اس سے ذاتی گفتگو تو نہیں کرتے......... خاص طور پر میرے متعلق؟"

"ہرگز نہیں۔ کہہ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی یہ خو تم لڑکیوں ہی میں ہوتی ہے"۔

"ہاں یہ تو ہے۔ بہرحال تم اس سے کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں بھی کسی سے نہیں کرتی۔ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہے' میں اسے ایک حسین اور مقدس راز کی طرح رکھنا چاہتی ہوں۔ طلوعِ آفتاب کا جو منظر ہم دیکھتے ہیں' پھولوں کی جو مہک ہمارے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے' ہوا کے جھونکے جو ہمیں چھوتے ہیں......... اور ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے جو کچھ کہتی ہیں......... یہ سب حسین اور مقدس راز ہیں"۔

"اچھا"۔

"ہاں' بس یہ میرے اور تمہارے لیے ہیں۔ ہمارے درمیان میں۔ میں ان کا شائبہ بھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ تم بھی نہ دینا"۔ وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

سمیرا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ راشد جانتا تھا کہ اس وقت وہ اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس نے سمیرا کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑی نرمی سے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بال ایک طرف ہٹا دیے۔

کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "جانتے ہو' میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں"۔

"کیا سمجھ گئی ہو؟" راشد کے دل میں وسوسے جاگ اٹھے۔

"میں تمہیں پوری طرح سمجھ گئی ہوں راشد حسن!"

وہ مسکرادیا لیکن اس مسکراہٹ میں خوشی نہیں تھی۔

"تم سننا چاہو گے؟" سمیرا نے پوچھا۔

"ہاں......... کیوں نہیں"۔

"میں نے جان لیا ہے کہ تم بے حد حساس ہو......... تکلیف دہ حد تک حساس! وہ حساسیت اتنی شدید اور بے پناہ ہے کہ تمہیں اذیت دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ تم بہت زیادہ محسوس کرتے ہو......... اور بہت زیادہ گہرائی میں محسوس کرتے ہو۔ اتنی گہرائی میں کہ تمہیں محسوس کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں محبت کرنا بہت مشکل لگتا ہے۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ محبت بہت اذیت دیتی ہے۔ دوسرے لوگ محبت کرتے ہیں اور محبت کی دی ہوئی اذیت سہہ بھی لیتے ہیں لیکن تم اتنے حساس ہو کہ سمجھتے ہو' وہ اذیت تمہیں مار ڈالے گی۔ ٹامی سے محبت کرنا تمہاری ضرورت تھی۔ مگر تم اس سے محبت نہ کرسکے۔ تم جانتے تھے کہ وہ کتا ہے اور ایک نہ ایک دن مرجائے گا۔ تم جانتے تھے کہ محبت کی صورت میں تم اس کی موت برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی محبوب ہستی کی موت کا صدمہ تو تم جھیل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے تم نے کسی کو محبوب نہیں ہونے دیا۔ ابھی چند روز پہلے تم نے اپنے کتے کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹا۔ یہ بہت بہادری کا کام تھا......... شریفانہ بھی اور دشوار بھی۔ تم اس مرحلے سے صرف اس وجہ سے گزر گئے کہ کتے کے لیے تمہارے دل میں محسوسات ذرا بھی نہیں تھے"۔

راشد خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ سمیرا نے اپنا

سلسلہ کلام جاری رکھا۔

"تم اس بچے کی طرح ہو جو ماں باپ کے غصے اور پٹائی سے بچنے کے لیے خود کو اپنے کمرے میں بند کرلیتا ہے۔ تم تعلقات قائم کرنے سے گریز کرتے ہو کیوں کہ تمہیں خوف ہے کہ تعلقات کسی بھی وقت تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ تم محسوسات سے ڈرتے ہو کہ اگر تم نے ایک بار انہیں اپنا لیا تو انہیں پابند نہ رکھ سکو گے......... حدود میں نہ رکھ سکو گے۔ وہ تم پر حاوی ہو جائیں گے۔ تم نے اپنے گرد غیرجذباتیت کا حصار قائم کر رکھا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جب تک تم اس حصار میں ہو' محفوظ ومامون ہو"۔

راشد نے دل ہی دل میں کہا......... مگر اب تو وہ حصار ٹوٹ چکا ہے۔

"ہر شخص تمہیں سردمزاج اور تنہائی پسند سمجھتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتی۔ میں جانتی ہوں' تم دنیا کے حساس ترین آدمی ہو"۔

راشد نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ نہ اس نے اتفاق کیا نہ اختلاف۔ سمیرا چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے منہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

راشد نے اس کا ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں نے......... مسکراہٹ سے سمیرا کو جواب دے دیا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا درست ہے۔

O============☆============O

راشد زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں رہا تھا۔ مگر پہلے کبھی اس نے کسی سے محبت بھی تو نہیں کی تھی۔ اسے ہر لمحے زندگی پر فتح مندی کا احساس ہوتا رہتا تھا۔ سمیرا بہت پیاری لڑکی تھی۔ محبت کرنے والی' نرم خو' گداز طبیعت اور خوب صورت۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسے سمجھتی تھی......... جانتی تھی۔ ورنہ اسے تو اس کے والدین نے بھی کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی اپنے آپ سے اتنا واقف نہیں تھا۔ بہت سی باتیں تو اب سمجھ میں آرہی تھیں۔ ماں نے ہمیشہ اس سے سردمہری برتی تھی۔ محبت کی بھی تو اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ اور پھر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کی ماں' اس کے باپ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ یوں وہ صرف ماں کے احترام ہی سے محروم نہیں ہوا' باپ کا احترام بھی گیا......... اور صنف نازک کا احترام بھی۔ اب اسے خیال آتا تھا کہ اس نے صنف نازک پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ اپنی وجاہت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے کھلونے کی طرح استعمال کیا......... اس کی تحقیر کی۔ وہ جو ماں کو سزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا' اس کی صنف کو پیہم سزا دیتا رہا۔ اور اب وہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ صرف گرفتار نہیں' اسے ایک لمحے کے لیے بھی بے اعتباری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک بے حد محترم تھی۔ وہ اسے کوئی دکھ' کوئی تکلیف دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سمیرا نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ عمر بھر خود کو سمجھنے کی بے سود کوشش کرتا رہا ہے۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ اسے اس بات کا احساس پہلے

کیوں نہیں ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ سمیرا کی طرف اس طرح کیوں کھنچا۔ یہ کیفیت پہلے کبھی، کسی اور لڑکی کے ساتھ کیوں نہیں ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان یہ کیسا تعلق استوار ہوا تھا۔ ایک جادو سا تھا۔ محبت ' ایک دوسرے کی فکر ' انڈراسٹینڈنگ......... اور یہ سب کچھ بغیر کسی کوشش کے ہوا تھا۔ خودبخود ہوا تھا......... جیسے پہلے سے موجود ہو۔ اور وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ نافہمی اسے بری طرح الجھا رہی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا غیر منطقی تھا......... لیکن بہت اچھا......... بہت خوب صورت بھی تھا۔

پہلے وہ بھوک کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر اب بھوک اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور بھوک لگ بھی زیادہ رہی تھی۔ بعض اوقات کھانا کھانے کے آدھے گھنٹے بعد پھر بھوک لگتی تھی۔ دس دن میں اس کا وزن تین پونڈ بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بھاری لگنے لگا۔ جسمانی فٹنس کا خیال ایک طرف رکھا رہ گیا۔ سمیرا نے اسے عجیب سا احساس تحفظ دیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ موٹا اور بھدا ہو جائے تب بھی سمیرا اس سے اسی طرح محبت کرے گی اور یہ احساس اس کے لیے بالکل نیا اور اجنبی تھا۔

لوگ اس کے بارے میں کس انداز میں سوچتے ہیں......... اس کی اسے کبھی پروا نہیں رہی تھی۔ اب بھی نہیں تھی۔ مگر اسے اپنے بارے میں سمیرا کے خیالات اور اس کی رائے کی پروا تھی۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ سمیرا پر اس کی شخصیت کا کوئی ناگوار تاثر مرتب ہو۔ اسے کبھی یہ خیال آتا کہ سمیرا کبھی کسی بات پر اسے برا سمجھے گی تو اس کی اذیت کی کوئی حد نہ رہتی۔

وہ سوچتا کہ سمیرا کو کبھی نہیں بتائے گا کہ اس نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے......... کتنی زیادتی کی ہے۔ وہ راشد نوید نامی ایک شخص سے نفرت کرتی تھی۔ اور وہ نفرت معقول اور فطری تھی۔ اور وہی راشد نوید ' راشد حسن بن کر اس سے ملا تھا......... اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ لیکن وہ محبت سمیرا کے دل سے راشد نوید کی نفرت کو نہیں دھکیل سکی تھی۔ دونوں متصادم جذبے اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو مٹا سکتا تھا تو وہ صرف اور صرف محبت تھی۔

راتوں کو سمیرا کے سو جانے کے بعد وہ جاگتا اور پریشان پریشان رہتا......... وہ سمیرا کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک دن اسے سمیرا پر یہ راز کھولنا ہوگا اور راز جتنی دیر میں کھلے گا' اذیتیں اور پیچیدگیاں اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ہر صورت حال کا پوری طرح تجزیہ کرنے کا قائل تھا۔ اس طرح بے خبری دور ہو جاتی تھی اور صرف حقائق اس کے سامنے ہوتے تھے۔ جب کہ اس وقت وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار تھا جہاں ہر چیز نامعلوم تھی......... ہر بات معما تھی۔ سب کچھ جاننے پر سمیرا کا کیا ردعمل ہوگا؟ کیا وہ اسے معاف کر سکے گی؟ وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ باقی ہر بات تو سمیرا

نے سمجھ لی تھی۔ ممکن ہے' یہ بات بھی سمجھ جائے لیکن یہ محض ایک امکان تھا۔ اب وہ خود کو ولن محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنا وجود برا لگنے لگا تھا۔

اس عرصے میں سمیرا نے ایک بار اور اس کی کھنچائی کی تھی وجہ وہی تھی......... پرانی وجہ......... موٹر سائیکل چلانے میں بے پروائی اور شو بازی۔ راشد نے فوراً ہی معذرت کرلی تھی......... اور دل سے تائب بھی ہو گیا تھا۔

اس کا یہ اندازہ بھی درست نکلا کہ وہ ٹینس کھیلتی ہے۔ ایک دن وہ مری کلب گئے اور انہوں نے ٹینس کھیلی۔ سمیرا کی سروس بہت اچھی تھی۔ ورنہ لڑکیاں عموماً اچھی سروس سے محروم ہوتی ہیں۔ کھیل کے معاملے میں وہ اس کے یونیورسٹی کے ساتھیوں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس کی ریٹرن بہت تیز' اچھی اور ذہانت سے بھرپوری ہوتی تھی......... دھوکا دینے والی۔ راشد کو اس کے ساتھ کھیل کر خوشی ہوئی۔ کئی مہینوں سے وہ اتنی اچھی ٹینس نہیں کھیل سکا تھا۔ جب کہ اسے اس کھیل سے عشق تھا۔ سمیرا بہت اچھا کھیل رہی تھی۔ راشد کی اچھی خاصی ورزش ہو گئی۔ اور سمیرا بہت سنجیدگی سے کھیل رہی تھی......... جیتنے کے لیے! راشد نے زندگی میں پہلی بار خوشی سے اپنی شکست قبول کی......... اور اسے وہ شکست بہت اچھی بھی لگی۔ سمیرا کو خوش دیکھ کر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ بظاہر مقابلہ بہت سخت ہوا۔ دونوں کی رفتار میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ مگر جتنا بھی تھا' راشد کے جیتنے کے لیے بہت کافی تھا۔ مگر راشد نے سمیرا کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیا۔ سمیرا کے جیتنے پر شمشیر نے خوب تالیاں پیٹیں۔

سمیرا اپنے گھر' اپنے والدین کے بارے میں کثرت سے گفتگو کرتی تھی۔ وہ اسے اپنے اسلام آباد والے گھر کے متعلق بتاتی۔ وہ بڑی صاف گوئی اور سچائی سے سب کچھ بتاتی......... اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ سب کچھ راشد کے سینے میں محفوظ رہے گا۔ کئی بار اس نے مظفر کی موت کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ راشد خاموشی سے مگر دلچسپی سے سنتا لیکن وہ اپنے بارے میں کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے......... اپنے پس منظر کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اور پھر بتانے کو بھی بہت کچھ تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ راشد کو مظفر کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ اسے خط لکھتا......... بتاتا کہ وہ کتنا خوش ہے۔ کتنا اچھا وقت گزر رہا ہے۔ وہ مظفر سے دل کی بات' اپنے خیالات اور اپنے خواب سنانے سے کبھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ ویسے ان دونوں کے درمیان خط وکتابت کم ہی ہوتی تھی۔ لیکن وہ جب بھی خط لکھتے' وہ دل کی باتوں سے عبارت ہوتا۔ کیا سوچا جا رہا ہے......... کیا دیکھا جا رہا ہے۔ کیا کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت قریب تھے......... اور ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے تھے۔ اسی لیے راشد کو حیرت تھی کہ مظفر نے اس سے ثمینہ کے بارے میں کیوں بات نہیں کی۔ شاید وہ سمجھ بیٹھا ہو کہ ثمینہ کے بارے میں کیوں بات نہیں کی۔ شاید وہ سمجھ بیٹھا ہو کہ وہ ثمینہ میں دلچسپی رکھتا ہے حالانکہ

راشد نے بارہا واضح کر دیا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔

اب راشد اپنی زندگی کے خوش گوار ترین دنوں کے بارے میں کسی کو بتانا چاہتا تھا تو پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوست کو کھو بیٹھا ہے۔ اب وہ کسے بتاتا اور کیسے بتاتا کہ وہ خود کو ہیرو نہیں، وِلن محسوس کرتا ہے......... اور یہ کہ اسے جو خوشیاں ملی ہیں، وہ ان کا حق دار نہیں تھا......... نہیں ہے۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آتی بھی تو کیسے۔ جس لڑکے کی خودکشی کے بارے میں بات کرتے کرتے سمیرا دکھی ہو جاتی، وہ صرف راشد کا دوست نہیں تھا، سمیرا کا بھائی بھی تھا۔ سمیرا اس سے......... راشد حسن سے محبت کرتی تھی۔ لیکن وہ راشد نوید سے نفرت بھی تو کرتی تھی اور راشد نوید......... وِلن وہ خود تھا۔

راشد دل کا یہ بوجھ کسی کے سامنے ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر اس کی زندگی میں کوئی ایسا دوست نہیں تھا۔ ایک تھا تو اسے اس نے خود گنوادیا تھا اور دوست اس نے بنائے ہی کب تھے۔ کون اسے سمجھاتا کہ اس گتھی کو کیسے سلجھایا جائے.........؟ اس نے مظفر کی خودکشی کی وجہ سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ بے سود ثابت ہوئی اس نے سوچا تھا کہ شاید سمیرا اس سلسلے میں زیادہ جانتی ہو......... کچھ مدد کر سکے......... معلومات فراہم کر سکے۔ مگر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ وہ خود کو ایک تنگ دائرے میں گھومتا محسوس کرنے لگا۔ وہ سمیرا کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیتا......... اور اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا......... اس امید پر کہ شاید کبھی سمیرا کی زبان سے عقدہ کشا جملہ ادا ہو جائے لیکن اس کی معلومات میں کبھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

اسے خود سے مایوسی بھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکے گا......... نہیں کرے گا۔ مگر اسے محبت ہو گئی تھی۔ نہ صرف ہو گئی تھی بلکہ وہ محبوب ہستی اس کے مرحوم دوست مظفر کی بہن تھی......... اور مظفر کی موت سے اس کا خود کا گہرا تعلق تھا۔ اب وہ مظفر کی خودکشی کے سلسلے میں سمیرا کا نقطہ نظر سمجھنا چاہتا تھا مگر اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی تھی۔

بالآخر ایک دن اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا تھا۔ وہ جو محبت کا قائل بھی نہیں تھا اور اہل بھی نہیں تھا، اسے سمیرا نے وہ محبت دی تھی جس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ اور وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ اس نے اس سے چھپایا تھا کہ وہ درحقیقت وہ شخص ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی ہے۔ اسے احساس ہو گیا کہ فریب کے سہارے زندگی گزار کر خوش نہیں رہا جا سکتا۔ کون جانے، کتنی عمر پڑی ہے، آدمی تمام عمر تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔

چنانچہ اس نے خود ہی اپنے فریب کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کر لیا.........

○===========☆===========○

اس روز وہ بہت چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا جیسے طبیعت خراب ہو۔ سمیرا

نے دو ایک بار اسے پکارا مگر اس نے اس کی آواز نہیں سنی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج سمیرا کو سب کچھ بتادے گا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی سنجیدگی اور چہرے کے سنگین تاثر نے سمیرا کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ سمیرا کے چہرے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود کو کسی ان ہونی کے لیے تیار کر رہی ہے۔ حالانکہ وہ نوعیت کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتی تھی۔

راشد کو احساس تھا کہ جو کچھ اسے کہنا ہے، وہ بے حد دشوار ہے۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "سمیرا......... جانتی ہو، میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ہر بات سے پہلے اور ہر بات کے بعد اس حقیقت کو یاد رکھو یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے بھی کہ میں نے اس سے پہلے یہ لفظ کبھی کسی سے نہیں کہے......... کسی سے بھی نہیں کہے۔ نہ ہی میں نہ پہلے کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کی تھی۔ میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں......... اتنی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں"۔

سمیرا جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، لفظ بہ لفظ درست ہے۔ "میں جانتی ہوں راشد، اور یہ محبت میری زندگی کا حاصل ہے"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن مجھے ایک خوف ناک بات بتانا ہے تمہیں"۔

یہ تجسس اب سمیرا کے لیے ناقابل برداشت ہوا جا رہا تھا۔

راشد نے بہت آہستگی سے......... ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "سمیرا......... میرا نام راشد نوید ہے"۔

"مجھے معلوم........." وہ کہتے کہتے رکی۔ اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ پھر جیسے اچانک اس کے اعتراف کی......... اس جملے کی اہمیت اور معنویت اس پر واضح ہوئی۔ "اوہ مائی گاڈ......... تم......... تم راشد نوید ہو......... مظفر کے دوست!" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ راشد کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

راشد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔

"سمیرا......... تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟" راشد گڑگڑایا۔ "تم نے مجھے دوسروں سے بہتر سمجھا ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتیں، مجھے معاف نہیں کر سکتیں"۔

"مجھے یقین نہیں آتا......... میں یقین نہیں کر سکتی"۔ وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑانے لگی۔

راشد اسے روتے، ہچکیوں کی لے پر اس کے لرزتے جسم کو بیڈ پر بکھرتے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے اپنے جسم میں سے زندگی دھیرے دھیرے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کا دکھ پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ حالاں کہ اس نے کبھی خود کو بھی پوری طرح نہیں سمجھا تھا......... نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ مجرم تھا۔ اسے خود پر شرم آ رہی تھی۔ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کی سسکیاں سنتے سنتے اس نی خوداپنی

زبان دانتوں سے کاٹ ڈالی۔ وہ اس وقت کوئی بہت بڑی تکلیف اٹھانا چاہتا تھا.......... تاکہ ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ مگر زبان پر خون کے نمکین ذائقے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ بہت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ وہ تو اسے اذیت دینے سے مرجانا بہتر سمجھتا تھا۔

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے سوٹ کیس پیک کرتے دیکھتا رہا۔ مگر نہ منہ سے کچھ بولا' نہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اس کا جسم جیسے پتھر کا ہوگیا تھا۔ وہ سوٹ کیس پیک کرکے کمرے سے نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ وہ لاری اڈے کی طرف جارہی تھی۔

"کہاں جارہی ہو سمیرا؟"

"میں گھر واپس جارہی ہوں"۔ سمیرا نے رکے بغیر جواب دیا۔ اس کی آواز چیخ رہی تھی۔ وہ کسی سہمی ہوئی ننھی سی بچی کی آواز تھی۔ اس آواز نے راشد کا دل چیر ڈالا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا راشد؟ تم کیوں آئے؟ تم نے مجھے اپنی محبت میں کیوں الجھایا؟ کیا ہوگیا تھا تمہیں؟"

راشد کی آواز لرز رہی تھی۔ سڑک پر نظریں جمانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں سمیرا یقین کرو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں ہوگا۔ سمیرا میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔

وہ خاموشی سے قدم قدم چلتے رہے۔ سمیرا چپکے چپکے روئے جارہی تھی۔ راشد کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مرجائے........ یہیں........ اسی وقت!

"تم کبھی مجھے معاف نہیں کر سکو گی؟" راشد نے چلتے چلتے کہا۔

"ممکن ہے راشد' میں تمہیں معاف کر دوں لیکن میں نے ایسا کبھی کیا تو میں کبھی خود سے بھی نہیں مل سکوں گی........ اپنے ساتھ کبھی نہیں رہ سکوں گی"۔

سمیرا پنڈی جانے والی ویگن میں بیٹھ گئی۔ راشد خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ وہ اس سے نظریں چراتی رہی۔ راشد اس سے کہنا چاہتا تھا کہ واپس آجاؤ........ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ لیکن وہ کس منہ سے کہتا۔

ویگن چلی گئی۔ وہ موڑ مڑنے تک خالی خالی نظروں سے اسے تکتا رہا۔ پھر پلٹ کر واپس چل دیا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب توڑ پھوڑ مچائے۔ کانچ کی چیزیں توڑ ڈالے بلکہ دنیا ہی کو تہس نہس کر دے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے سانسیں ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر ناکام رہا۔ بے ترتیب سانسیں ان تیز ہواؤں کی طرح تھیں جو گھنے درختوں کی شاخوں سے الجھ کر شور مچاتی ہیں۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے لیکن سانسوں کا زیروبم وہی رہا........ جسم ویسے ہی لرزتا رہا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ جسم بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ پیٹ کے

بل بستر پر گر کر رونے لگا۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ کبھی رویا ہے۔ آنسوؤں کا ذائقہ لبوں پر........ اور زبان پر بے حد عجیب اور نامانوس لگ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتا رہا........

O============☆============O

اگلے روز شمشیر اس سے ملنے آیا تو وہ بستر پر اسی طرح پڑا تھا نیم جاں۔ اسے بستر پر گرے ہوئے بیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اس نے نہ کچھ کھایا تھا نہ کچھ پیا تھا۔ نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ اٹھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ شمشیر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا لیکن اسے کام پر جانا تھا۔ اس نے چھٹی کرنا چاہی لیکن راشد نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

"سمیرا کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا۔

"وہ کچھ دن کے لیے اسلام آباد چلی گئی ہے"۔

"کوئی گڑ بڑ تو نہیں؟"

"گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے؟"

شمشیر مطمئن تو نہیں ہوا تاہم چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد راشد بستر پر لیٹا رہا۔ کمزوری بہت زیادہ تھی۔ وجود میں عجیب سی تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے خود کو اتنا کمزور' اتنا مردہ کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ روحانی تھکن تھی جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

دوپہر کے قریب وہ اٹھا۔ بھوک اب بھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی کھڑکی میں جاکر کھڑا ہو جاتا۔ اس نے کہانیوں کا ایک مجموعہ اٹھایا اور اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پھر وہ جاکر سگریٹ کا پیکٹ خرید لایا۔ وہ سگریٹ باقاعدگی سے نہیں پیتا تھا۔ مگر انتشار کے عالم میں سگریٹ سے بڑی مدد ملتی تھی۔ اس نے ایک کے بعد ایک' چار سگریٹ پھونک ڈالے لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

شام کے وقت اس نے تھوڑا سا کھانا زہر مار کیا۔ پھر وہ موٹر سائیکل لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہ بے مقصد موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ پھر اس نے رزاق خان کے ہوٹل کا رخ کیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ سمیرا کے گھر جانا چاہتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بے سود ہوگا۔ سمیرا اس کے پاس سے گئی تھی تو بہت برے حال میں تھی۔ اسے ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ تقریباً" ہسٹریائی سی کیفیت تھی اس کی۔ اس نے جاکر یقیناً" اپنے والدین کو سب کچھ بتادیا ہوگا۔ بات اگر سمیرا کی حد تک رہتی تو یقیناً" بہتری کی کوئی صورت نکل آتی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اختر ملک اور سعدیہ ملک سب کچھ جاننے کے بعد سمیرا کو اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنے دیں گے۔ وہ اسے کبھی سمیرا سے ملنے نہیں دیں گے........ کبھی بات نہیں کرنے دیں گے۔

لیکن وہ سمیرا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ سمیرا ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں۔ وہ اس

صدمے سے کس انداز میں گزر رہی ہے۔ کیا گزر رہی ہے اس پر۔ وہ سوچتا رہا کہ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ وہ شمشیر سے فون کرواسکتا تھا لیکن اس صورت میں سمیرا فوراً" سمجھ جائے گی کہ در حقیقت بات وہ کرے گا۔

اس کے باوجود اس نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شمشیر کو فون کرنے پر رضامند کرلیا۔

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے"۔ شمشیر نے کہا۔ تاہم وہ فون کرنے پر رضامند ہو گیا۔

لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ سمیرا نے شمشیر کا نام سنتے ہی فون رکھ دیا۔

راشد کا اندازہ تھا کہ سمیرا کو سنبھلنے کے لیے کم از کم دو ہفتے کی مہلت درکار ہوگی۔ پھر وہ شاید اس سے ملنا گوارا کرلے۔ لیکن دو ہفتے سمیرا کے بغیر گزارنے کا تصور بھی اس کے لیے جان لیوا تھا۔ اس کی منضبط زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ پہلے اس نے زندگی میں کبھی کوئی کام بے قاعدگی سے نہیں کیا تھا۔ وہ زندگی میں نظم اور ترتیب کا قائل تھا۔ لیکن اب تو اسے خود پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ کسی کی بات سنتا تو بے دھیانی سے......... اور خود کوئی بات ہی نہ کرتا۔ زیادہ وقت تنہا بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔

شمشیر کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن شمشیر سمجھتا تھا کہ راشد اور سمیرا کے درمیان کوئی بہت بڑی بات ہو گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے' وہ وجہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ صورت حال کی سنگینی اس کی سمجھ سے بہت زیادہ بالاتر تھی۔ تاہم وہ راشد کا دل بہلانے کی بھرپور کوشش کرتا تھا۔

ایک دن وہ راشد کو مری کلب لے گیا۔ اس نے لوگوں کو ٹینس کھیلتے بارہا دیکھا تھا۔ مگر خود کبھی کھیلا نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے راشد کی خاطر اس سے کھیلنے پر اصرار کیا۔ وہ شور مچاتا' چہکتا رہا لیکن اس کا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ راشد بے دلی سے کھیلتا رہا جیسے الٹا شمشیر کا دل رکھ رہا ہو۔ پھر اس نے جھنجلا کر ریکٹ ایک طرف پھینک دیا۔

اس شام شمشیر اس کے کمرے میں رات بارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ راشد اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلے مگر جب وہ تھک ہار کر اپنے ہوٹل کی طرف واپس چلا' تب بھی اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

اب راشد کا صرف ایک ہی رفیق تھا......... اس کی موٹرسائیکل۔ وہ موٹرسائیکل اٹھاتا اور کسی بھی طرف نکل جاتا۔ وہ نتھیاگلی تک ہو آیا لیکن اس نے دیکھا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نتھیاگلی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ کھانے پینے کی اسے بالکل پروا نہیں رہی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ورزش بھی چھوڑ دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بہت کمزور لگنے لگا تھا۔

دو ہفتے کا عرصہ اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ادھر سیزن ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر ہوٹل بند ہو چکے

تھے۔ سڑکوں پر سناٹا طاری رہنے لگا۔ شمشیر بھی واپس چلا گیا تھا۔ کوئی تنہائی سی تنہائی تھی۔ ان دس بارہ دنوں میں اگرچہ اس نے کسی سے تعلق نہیں رکھا اور پھر یہ کہ بنیادی طور پر وہ تنہائی پسند بھی تھا۔ اس کے باوجود اس تنہائی سے اب اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

سوچنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ خود کو بدترین نتائج کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے تمام جذبے' تمام تعلقات ' تمام اہم لوگوں کی شخصیات ذہن کے نہاں خانوں سے نکال کر اپنی گود میں پھیلا کر بیٹھ جاتا تاکہ ان کا تجزیہ کرسکے' ان کی اہمیت کے لحاظ سے ترجیحات کا تعین کرسکے۔ ممی' ڈیڈی اور اخترملک ' سعدیہ ملک اور سمیرا ملک ' جو اب سمیرا راشد تھی۔ سمیرا نے بتایا تھا کہ ان کے ہاں گھریلو جھگڑے بکثرت ہوتے تھے۔ دو ایک بار تو اختلافات بہت ہی شدید ہوگئے تھے۔ تس ہم راشد کے والدین کے برعکس سمیرا کے والدین جداجدا زندگی گزارنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخیل ہوتے تھے۔ راشد فیصلہ نہ کرسکا کہ اس کے والدین بہتر ہیں یا سمیرا کے۔ اس کے گھر کا ماحول زیادہ اچھا ہے یا سمیرا کے گھر کا۔

تاہم اس کا خیال تھا کہ مظفر کی موت کے سلسلے میں اس کے والدین احساس جرم کا شکار تھے۔ انہوں نے بھی اس کے والدین کی طرح اپنے بیٹے کو توجہ' محبت اور شفقت سے محروم رکھا تھا۔ وہ بس صرف ضروریات پوری کر دینے کو محبت کا نام دیتے تھے۔ چنانچہ مظفر کی موت کے بعد انہیں احساس جرم ستاتا ہوگا۔ مگر اب اگر سمیرا نے انہیں سب کچھ بتادیا تھا تو انہیں اپنے احساس جرم سے چھٹکارا پانے کی سبیل نظر آگئی ہوگی۔ انہیں اس کی صورت میں وہ کندھا مل گیا ہوگا جس پر اپنا بوجھ......... اپنا احساس جرم لاد کر خود ہلکا پھلکا ہوا جاسکے۔

مگر تجزیئے سے اسے حاصل کچھ نہ ہوا۔ صورت حال کی پیچیدگی اپنی جگہ تھی۔ اس کی سنگینی کسی طور بھی کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے احساس شکست بھی ستاتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت نرم پڑتی جارہی تھی۔ یہ وہ شکست تھی جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

O============☆============O

دو ہفتے تک اس نے کسی طرح خود کو باندھے رکھا۔ دو ہفتے پورے ہوتے ہی اس کا ضبط جواب دے گیا۔ سمیرا کا اسلام آباد والا پتا اس کے پاس تھا۔ شام کو اس نے موٹرسائیکل نکالی اور اسلام آباد کی طرف چل دیا۔

اخترملک کا بنگلہ شہر کے جس سیکٹر میں تھا' وہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ راشد وہاں پہنچا تو بوندا باندی شروع ہوگئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بادل زور سے برس پڑے۔ راشد نے موٹرسائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور گیٹ کی طرف لپکا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ خاصا بھیگ گیا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اسے دھکیلا اور تیز قدموں سے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب وہ بارش سے بہرحال محفوظ تھا۔

گھنٹی کے جواب میں ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ وہ ہچکچائی لیکن اس کا پراعتماد انداز دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور اسے راستہ دے دیا۔ پھر اس نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

سمیرا اور اس کی ماں آتش دان کے قریب والے دیوان پر بیٹھی تھیں۔ اخترملک ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ کمرا بے حد وسیع وعریض تھا اور بہت خالی خالی لگ رہا تھا۔

سمیرا اور سعدیہ نے فوراً ہی راشد کو دیکھ لیا۔ انہیں دیکھ کر اخترملک نے بھی پلٹ کر اسے دیکھا۔ راشد کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنی زندگی کے بدترین انسانی رویے کا......... خوف ناک ترین تجربے کا سامنا کرنے والا ہے۔ اسے احساس ہوگیا کہ اسے پوری شدت سے رد کیا جائے گا۔ لیکن وہ منہ نہیں چھپا سکتا تھا۔ اسے حقائق کا سامنا کرنا تھا۔ اسے یہ احساس بھی ہوگیا کہ اسے یہ کرب ان تینوں کی خاطر سہنا ہوگا۔ اس سے انہیں فائدہ ہوگا۔ وہ ہلکے ہو جائیں گے۔ ان کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ اس پر جذبات کے تھپڑ برسنے والے ہیں۔ اسے نفرت کا سامنا کرنا ہے۔ اس نے خود کو اس رول کے لیے تیار کر لیا جو اسے ادا کرنا تھا۔ پھر اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ اس کرب سے اسے بھی کچھ حاصل ہوگا یا نہیں۔ پھر اس نے اس سوال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کچھ ملے یا نہ ملے۔ اس کرب سے تو بہرحال گزرنا ہے۔ وہ راضی بہ رضا ہوگیا۔

اخترملک اتنی تیزی سے کرسی اٹھا کہ کرسی الٹ گئی۔

"خدا کی پناہ......... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ غرایا۔

"میں سمیرا کو دیکھنے آیا ہوں کہ وہ خیریت سے ہے یا نہیں"۔ راشد نرم لہجے میں کہا۔

سمیرا اور سعدیہ اپنی جگہ بیٹھی اسے یوں تکے جارہی تھیں جیسے انہیں سکتہ ہوگیا ہو......... پھر سعدیہ نے یوں سمیرا کا ہاتھ تھاما' جیسے اسے کسی آفت سے بچانا چاہ رہی ہو......... احساس تحفظ فراہم کر رہی ہو۔ سمیرا نے آنکھیں موندلیں۔

"سمیرا تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی"۔ اخترملک نے چیخ کر کہا۔

راشد سمیرا کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ بے حد کمزور اور زرد ہوگئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ "یہ فیصلہ سمیرا ہی کو کرنے دیں کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے یا نہیں"۔

"میں جو تمہیں بتا رہا ہوں۔ سمیرا تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی"۔ اخترملک کی آواز اور بلند ہوگئی"۔ تم اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ"۔

راشد کو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دکھائی دیے۔ اسے ہلکی سی حیرت ہوئی۔ اتنے شدید ردعمل کی تو اسے توقع بھی نہیں تھی۔

"تم بہت خبیث ہو......... ذلیل!" سعدیہ ملک نے کہا۔ وہ اب سمیرا کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھی۔

"بس......... نکل جاؤ یہاں سے۔ ہم تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتے"۔ اس بار اخترملک نے چنگھاڑ کر کہا۔

"سمیرا!" راشد نے پکارا۔

سمیرا نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "راشد......... تم چلے جاؤ۔ میں اب تمہیں کبھی نہیں دیکھنا چاہتی......... کبھی نہیں ملنا چاہتی تم سے........." اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ اس نے یوں رک رک کر الفاظ ادا کیے تھے جیسے انہیں ادا کرنا دنیا کا دشوار ترین کام ہو۔ اس نے بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پایا۔

اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ راشد کے دل میں خنجر کی طرح اتر گیا۔ وہ نفرت کی' تذلیل کی توقع لے کر آیا تھا۔ پھر بھی اس کے لیے یہ سب کچھ سہنا بہت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش نہ کرسکا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ وہ بے بس' ساکت وصامت کھڑا رہا۔ پھر اسے خود پر شرم آنے لگی۔ ان تینوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ شکست خوردہ ہے......... کمزور ہے۔ شاید اسی لیے اخترملک دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ بری طرح دھاڑ رہا تھا......... اسے دھکیل رہا تھا......... دیوانہ وار مار رہا تھا۔ راشد کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ اس نے بچاؤ کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے تھے۔ اب اسے دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ البتہ وہ سن سکتا تھا......... محسوس کر سکتا تھا۔ سعدیہ ملک بری طرح چیخ رہی تھی۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے جسم پر تھپڑ گھونسے پڑ رہے تھے۔ وہ لرز رہا تھا مگر اسے تکلیف کا مطلق احساس نہیں تھا۔

"پلیز راشد......... راشد پلیز......... چلے جاؤ یہاں سے......... پلیز........." سمیرا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ پلٹا اور اندھا دھند دروازے کی طرف بھاگا۔ باہر بارش نے اس کے اوسان کسی حد تک بحال کر دیے۔ مگر وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے گیٹ سے نکلا' موٹرسائیکل کو اسٹینڈ سے ہٹا کر اس نے کک لگائی۔ اس کی نظریں صدر دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ باؤنڈری وال چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ صاف نظر آرہا تھا۔ پورچ روشن تھا۔

موٹرسائیکل اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ اسی لمحے صدر دروازہ کھلا اور اخترملک نمودار ہوا۔ اس نے راشد کی طرف انگلی اٹھائی! اگلے ہی لمحے فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ تب راشد کی سمجھ میں آیا کہ وہ ریوالور ہے۔ دوسرا فائر ہونے سے پہلے راشد نے موٹرسائیکل اسٹارٹ کرکے بڑھادی۔ اس کے باوجود اخترملک نے دو فائر اور کیے۔

اب وہ مری جانے والی سڑک پر تھا۔ موٹرسائیکل کی رفتار بہت زیادہ تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہ سڑک جو ویسے بھی خطرناک ہے' رات کے وقت زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے مگر اس نے موٹرسائیکل کی رفتار کم نہیں کی۔ سڑک پر کئی جگہ پے درپے خطرناک موڑ آتے تھے۔ ان پر اتنی رفتار سے موٹرسائیکل چلانا مہلک ثابت ہوسکتا تھا مگر وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے جس پیچیدگی میں خود کو ملوث کیا تھا اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ صرف موت ہی اس کی الجھن کا حل تھی۔ لیکن اس نے زندگی بھر زندگی سے محبت کی تھی۔ وہ موت کو قبول نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ابھی چند لمحے پہلے کی صورت حال کا تجزیہ کیا تو حیران رہ گیا۔ اخترملک کے فائر کرنے کے بعد وہ بھاگا تھا۔ مگر اس کا سبب زندگی سے محبت نہیں......... یہ احساس تھا کہ جن لوگوں کو وہ پہلے دکھ دے چکا ہے' اب ایک اور الجھن میں نہیں پھنسانا چاہیے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی وہ وہیں ڈٹ گیا ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی اسے سمیرا کا خیال آیا۔ اور سمیرا کا خیال آتے ہی موٹرسائیکل کی رفتار اس نے بلاارادہ کم کردی۔ سمیرا نے کہا تھا......... کبھی کوئی غیرضروری خطرہ مول نہ لینا۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ پر وہ جھنجلا گیا۔ اب سمیرا کو کبھی اس کی پروا نہیں ہوگی۔ اس کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ پھر احتیاط کا کیا فائدہ۔ اس نے موٹرسائیکل کی رفتار انتہا تک پہنچادی۔

اگلے موڑ پر سائن نظر آرہی تھی......... احتیاط سے' موڑ خطرناک ہے۔ پھر دوسری طرف سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھیں چندھیادیں۔ موٹرسائیکل اس کے قابو سے باہر ہوگئی۔ کیونکہ روشنی سے بچنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ موڑ بہت تیزی سے قریب آرہا تھا پھر موڑ پیچھے رہ گیا۔ موٹرسائیکل ریلنگ سے ٹکرائی اور اچھل کر سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جاگری۔

زندگی کی وادی میں موت کا اندھیرا پھیل گیا۔ صرف موٹرسائیکل کا پہیا متحرک تھا۔ ورنہ ہرطرف سکوت ہی سکوت تھا۔

○============☆============○
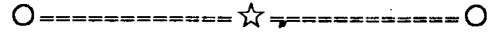
پانچ چھ سال کا وہ بچہ وسیع وعریض لان میں سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ لان کا چکر لگاتا اور پھر سوئمنگ پول کی طرف چلا جاتا۔ وہ سوئمنگ پول کی منڈیر پر چلاتے ہوئے پورا چکر کاٹتا۔ موڑ پر بھی سائیکل کی رفتار کم نہ ہوتی۔ سائیکل چلانا سیکھتے ہوئے وہ اس کا دوسرا ہی دن تھا۔

بوڑھی باوقار عورت بچے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بچہ اس کے اندر ہمیشہ متضاد جذبات جگاتا تھا۔ اس سے نفرت بھی محسوس ہوتی اور ٹوٹ کر پیار بھی آتا۔ اس وقت بھی وہ ان متضاد جذبات میں گھری ہوئی اسے دیکھے جارہی تھی۔

بچہ سائیکل چلانے میں اس طرح محو تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

مگر پھر سوئمنگ پول کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنے وجود میں نگاہوں کی چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے کن آنکھیوں سے دیکھا۔ سفیدے کے درخت کے نیچے اس کی ماں کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ وہ شاید ابھی آئی تھی۔ بچہ گڑبڑا گیا۔ سائیکل کے ہینڈل پر اس کا کنٹرول نہیں رہا"۔ توازن بھی بگڑا وہ سائیکل سمیت نیچے گرگیا۔ تاہم اس کے چوٹ نہیں لگی۔

"مظفرراشد!" ماں نے اسے پکارا۔

اس نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ "جی ممی؟"

"سائیکل وہی چھوڑو اور یہاں آؤ"۔ ماں کا لہجہ سخت تھا۔

"بچہ سائیکل وہیں چھوڑ کر ماں کے پاس آگیا"۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا۔ ماں اس سے کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کرتی تھی۔

اگلے ہی لمحے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ماں نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر طمانچہ مارا تھا۔

بچے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "ممی......... آپ نے مجھے کیوں مارا؟"

"تم اس طرح سائیکل کیوں چلا رہے تھے۔ سوئمنگ پول میں گر پڑتے تو کیا ہوتا؟"

"لیکن ممی......... میں گرا تو نہیں"۔

"گرے نہیں مگر گر تو سکتے تھے۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا بلاوجہ خود کو خطرے میں ڈالنا بہت بری بات ہوتی ہے۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔ بولو......... آئندہ ایسا کرو گے؟"

بچہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "نہیں ممی کبھی نہیں"۔

ماں نے اسے سینے سے بھینچا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کردی۔ اب جاؤ۔ میں نے میز پر تمہارا دودھ کا گلاس رکھ دیا ہے۔ پی لو"۔

بچے کے جانے کے بعد وہ بوڑھی عورت سے مخاطب ہوئی۔

"ممی......... آپ اسے منع نہیں کرسکتی تھیں؟"

"تو اس میں برائی کیا تھی"۔ بوڑھی عورت نے بے نیازی سے کہا۔

"اگر وہ سوئمنگ پول میں گر جاتا تو.........؟ اسے تو تیرنا بھی نہیں آتا"۔

"تو کیا ہوتا۔ مرجاتا"۔

"آپ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں؟" لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیوں ہو۔ وہ میرا کیا لگتا ہے؟"

"نواسا ہے آپ کا"۔

"نہیں۔ وہ میرے بیٹے کے قاتل کا بیٹا ہے"۔

"آپ کب تک اس انداز میں سوچتی رہیں گی۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کا مظفر اور میرا راشد۔ میرے راشد نے جاتے جاتے اپنی غلطی کی تلافی کردی تھی"۔

بوڑھی عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کے چہرے سے اس کی باطنی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی۔

"شاید......... شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں نہ جانے کتنا وقت لگے گا"۔ پھر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔

سمیرا دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ یہ بات میں جانتی تھی ممی' اس نے خودکلامی کی۔ اسی لیے میں نے آپ سے اور پاپا سے یہ راز چھپائے رکھا۔ اس وقت تک' جب تک سب کچھ خودعیاں نہیں ہوگیا اور اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ دن' وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ راشد نے اپنی محبت اور شادی کی نشانی اسے سونپ دی ہے۔ وہ وہی دن تو تھا......... راشد کی زندگی کا آخری دن' جب وہ پہلی اور آخری بار اس گھر میں آیا تھا......... اور اگلے روز اخبار میں اس کی موت کی خبر چھپی تھی.........

ختم شد